بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

جنوری 2018

سالِ نو مبارک



پہلی شعاع، رضیہ جمیل 10
حمد، شاہ عبداللطیف بھٹائی 11
نعت، راہی فدائی 11
نبی کی باتیں، ادارہ 12



کتاب کہانی، سمیرا حمید 17
سید رضی، اقبال بانو 23
دستک، شاہین رشید 29
جب کچھ سے آیا، ا۔ب۔ج 33



خواب شیشے کا، عفت سحر طاہر 36
شہزاد، صائمہ اکرم 174



سنہری دھوپ، سلویٰ علی بٹ 114
محبت کا راج، راشدہ رفعت 74
عشق برہنہ پا، فرح بخاری 208



تیری مہربانی، نازیہ جمال 146



نادانیاں، صدف آصف 56
ہمیں لے جانا، بی سحر ملک 66
زندگی ہو جیسے، ہاجرہ ریحان 106
نیت، قرۃ العین سکندر 140
نین تو ساون بنے، سیر خان 255



غزل، ادا جعفری 265
غزل، مجید امجد 265
نظم، فاطمہ حسن 264
غزل، نثار ناسک 264

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)------ 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ---- 6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا --- 7000 روپے





خط آپ کے، رضیہ جمیل 272
مسکراہٹیں، ادارہ 266
آئینہ خانے میں، واصفہ سہیل 282
بالوں سے خوشبو آئے، شگفتہ جاہ 268
کھلتا کسی پہ، خالدہ جیلانی 271
تاریخ کے جھروکے، امت الصبور 284
موسم کے پکوان، خالدہ جیلانی 287
خوبصورت بنیے، ادارہ 289

جنوری 2018
جلد 32 شمارہ 5
قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

رضیہ جمیل

پہلی شعاع

جنوری 2018ء کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

دسمبر کے آخری دن ہیں۔

جاتے سال کی اُداس ساعتوں میں نئے سال کی روشن امیدیں جھلملاتی ہیں۔

دُنیا ایک اور سال پُرانی ہونے کو ہے۔ ایک اور سال اختتام کی جانب بڑھ رہا ہے۔ یہ احساس دلاتے کہ جو تھا نہیں ہے، جو ہے نہ ہوگا۔ سال آتے جاتے رہیں گے۔ دُنیا اسی طرح چلتی رہے گی۔ وقت اپنے دامن میں خوشیاں اور غم لیے آگے بڑھتا جائے گا۔

یہ وقت ہی تو ہے جو کبھی ہماری جھولی خوشیوں سے بھر دیتا ہے تو کبھی ہم سے سب کچھ چھین کر تہی دامن کر دیتا ہے۔ کبھی بن مانگی دُعائیں قبول ہو جاتی ہیں اور کبھی ہم سوچتے رہ جاتے ہیں کہ ہماری دُعائیں بے اثر کیوں ٹھہریں۔ ان ہی حیرتوں اور حسرتوں کے درمیان زندگی گزرتی چلی جاتی ہے۔ وقت آگے بڑھتا جاتا ہے۔ بدلتے زمانے کے تند و تیز ریلے کے سامنے کوئی بند نہیں باندھ سکتے۔

انسان کا المیہ یہ ہے کہ وہ کبھی حال میں نہیں جیتا۔ وہ بار بار ماضی کو یاد کرتا ہے۔ ماضی جو محض ایک یاد، ایک حسرت، ایک پچھتاوا بن کر رہ جاتا ہے۔ وہ مستقبل کے لیے امیدیں، لمبے لمبے ارادے باندھتا ہے۔ وہ دُنیا جہاں اسے اگلے پل کا علم نہیں ہے، اسے حاصل کرنے، اسے پالنے کی دُھن میں وہ اپنی زندگی کے قیمتی لمحات کھو بیٹھتا ہے۔

زندگی میں لمحۂ موجود ہی سب کچھ ہے، اس لمحے کو تھام لیں۔ اپنا آج اس طرح گزاریں کہ آپ کا ماضی حسرت اور پچھتاوا نہ بنے اور مستقبل کے خواب جو آپ دیکھتے ہیں، روشن تعبیر بن پائیں۔

نئے سال کا استقبال اس پیمان کے ساتھ کریں کہ اپنی زندگی سے تمام منفی جذبات کا خاتمہ کر کے اپنے اندر مثبت جذبوں کو فروغ دیں گے۔

آپ سب قارئین کو نیا سال مبارک۔

سالِ گزشتہ وطنِ عزیز کے لیے اور دُنیا کے لیے بھی امن اور خوش حالی نہ لا سکا۔ دھرتی پر رنج و آلام و مصائب میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ دُعا ہے کہ نیا سال اس دھرتی پر رہنے والوں کے لیے امن اور خوشیوں کا پیام لے کر آئے۔ آمین۔

اس شمارے میں،

- راشدہ رفعت کا مکمل ناول۔ محبت کا راج، ، فرح بخاری کا مکمل ناول۔ عشق برہنہ پا،
- سلویٰ علی بٹ کا مکمل ناول۔ سُنہری دھوپ، ، نازیہ جمال کا ناولٹ۔ تیری مہربانی،
- صدف آصف، بی سحر ملک، ہاجرہ ریحان، قرۃ العین سکندر اور نیر فہیم خان کے افسانے،
- صائمہ اکرم اور عفت سحر طاہر کے ناول، ، معروف مصنفہ اقبال بانو سے ملاقات،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ۔ دستک، ، سمیرا حمید کا سلسلہ۔ کتاب کہانی،
- جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے۔ قارئین کا سلسلہ،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔



تیری ہی ذات اوّل و آخر
تُو ہی قائم اور تُو ہی قدیم

تجھ سے وابستہ ہر تمنا ہے
تیرا ہی آسرا ہے ربِّ کریم

کم ہے جتنی کریں تیری توصیف
تُو ہی اعلیٰ اور تُو ہی علیم

والیٔ شش جہات واحد ذات
رازقِ کائنات ربِّ رحیم

شاہ عبداللطیف بھٹائی



خلوتِ رب میں ستارہ دیکھا
قرب نے پھر نہ دوبارہ دیکھا

نور پر نور کا عقدہ کُھل جائے
وقت نے کب یہ نظارہ دیکھا

قاریٔ دل نے 'الم نشرح' میں
حسنِ مطلق کا سپارہ دیکھا

کہکشاں ہوتی جہاں سے ہے طلوع
زائروں نے وہ منارہ دیکھا

ڈوبتی ناؤ نے آخر راہی
ان کے صدقے میں کنارہ دیکھا

راہی فدائی



کمال اخلاق

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک سیاہ فام عورت یا کوئی نوجوان مسجد میں جھاڑو دیا کرتا تھا۔ (راوی کو شک ہے کہ وہ عورت تھی یا نوجوان) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے گم پایا تو اس کی بابت پوچھا۔ لوگوں نے بتلایا کہ وہ تو فوت ہو گیا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''تم نے مجھے اس کی اطلاع کیوں نہ دی؟''

گویا لوگوں نے اس (کی وفات) کے معاملے کو حقیر گردانا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مجھے اس کی قبر بتلاؤ!''

چنانچہ لوگوں نے آپ کو اس کی قبر بتلائی تو آپ نے اس پر نماز پڑھی، پھر فرمایا:

''بے شک یہ قبریں، قبروں والوں پر تاریکی سے بھری ہوئی ہیں، میرے ان پر نماز پڑھنے سے یقیناً اللہ تعالیٰ یہ ان کے لیے روشن فرما دیتا ہے۔'' (بخاری ومسلم)

فوائد ومسائل:

1- بعض دوسری روایات کی بنیاد پر علماء نے اسی بات کو راجح قرار دیا ہے کہ جھاڑو دینے والی ایک عورت تھی۔

2- اس میں ایک تو مسجد کی صفائی کی فضیلت کا اور دوسرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کمال خلق و تواضع کا بیان ہے۔

3- اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اہل خیر وصلاح کے جنازوں میں شرکت کرنی چاہیے اور شرکت سے محرومی کی صورت میں اس کی قبر کے پاس کھڑے ہو کر بھی نماز جنازہ پڑھی جا سکتی ہے۔

تقویٰ کی فضیلت

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''بہت سے پراگندہ، غبار آلود اشخاص جنہیں دروازوں ہی سے دھکیل دیا جاتا ہے، اگر اللہ پر قسم کھا لیں تو اللہ ان کی قسم پوری فرما دیتا ہے۔'' (مسلم)

فائدہ: اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسان کو گندے کپڑے پہننے اور پراگندہ بال رکھنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ شریعت نے صفائی کو پسند کیا ہے اور اللہ تعالیٰ بھی صاف رہنے والوں سے محبت فرماتا ہے۔ اس حدیث کا مطلب یہ ہے ایسے لوگ جن کا لباس یا حلیہ زیادہ بارعب نہیں ہوتا اور نہ معاشرے میں ان کا کوئی وقار ہی ہوتا ہے اور زہد کی وجہ سے اچھے لباس کا اہتمام بھی نہیں کرتے، تاہم ان کے تقویٰ اور شرعی احکام کی پابندی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق اتنا مضبوط ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی قسم ضرور پوری فرماتا ہے۔

جنت میں جانے والے

حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''میں جنت کے دروازے پر کھڑا ہوا تو (میں نے دیکھا کہ) اس میں داخل ہونے والے اکثر مسکین لوگ ہیں اور دولت مند روکے ہوئے ہیں، البتہ دوزخ والوں کو دوزخ میں لے جانے کا حکم دے دیا گیا۔ اور میں جہنم کے دروازے پر کھڑا ہوا تو (دیکھا) اس میں داخل ہونے والی اکثر عورتیں ہیں۔'' (بخاری ومسلم)

فوائد ومسائل:

1- جنت، دوزخ کے یہ احوال نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی بتلائے گئے اور آپ نے انہیں صیغہ ماضی سے بیان فرمایا کیونکہ ان کا وقوع، ماضی کی طرح، یقینی ہے، یا کشف کے طور پر آپ کو ان کا مشاہدہ کروایا گیا۔

عورتوں کے زیادہ جہنم میں جانے کی ایک بڑی وجہ دوسری احادیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بیان فرمائی ہے کہ وہ اکثر لعنت کرتی اور خاوند کی ناشکری زیادہ کرتی ہیں، جس سے پتا چلا کہ خاوندوں کو آزار پہنچانا بڑے جرائم میں سے ہے۔

یتیموں پر شفقت

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اور اپنے بازو مومنوں کے لیے جھکا دے۔'' (الحجر۔88)

اور فرمایا: ''اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ روکے رکھ جو اپنے رب کو صبح وشام پکارتے ہیں، وہ اس کی رضا چاہتے ہیں اور دنیوی زندگی کی رونق کی تلاش میں تیری آنکھیں ان سے تجاوز نہ کریں۔'' (الکہف۔28)

اور فرمایا: ''چنانچہ جو یتیم ہو، اسے مت دبا اور جو مانگتا ہو، اسے مت جھڑک۔'' (10-9)

اور فرمایا: ''کیا دیکھا تو نے اس شخص کو جو جزا (کے دن) کو جھٹلاتا ہے، تو یہ وہ شخص ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا۔'' (الماعون......3-1)

حقیر سمجھنا

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چھ افراد تھے۔ مشرکین نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: ''انہیں اپنے سے دور کر دیں، یہ ہم پر جری نہ ہو جائیں۔''

(حضرت سعد فرماتے ہیں:) ان میں ابن مسعود، قبیلہ ہذیل کا ایک آدمی، بلال اور دو اور آدمی تھے جن کے نام مجھے معلوم نہیں۔

(مشرکین کے مطالبے پر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جی میں جو اللہ نے چاہا، آیا۔ چنانچہ آپ نے اپنے جی میں کچھ سوچا، جس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمادی: (سورۃ الانعام۔52)

''(اے پیغمبر!) تو ان لوگوں کو اپنے سے دور مت کر جو اللہ کی رضا جوئی کے لیے صبح وشام اسے پکارتے ہیں۔'' (مسلم)

فوائد ومسائل:

1-: اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے ہاں صرف ان لوگوں کی قدر وقیمت ہے جو ایمان اور عمل صالح سے آراستہ ہوں، چاہے اہل دنیا کی نظروں میں، وہ اپنی غربت وناداری کی وجہ سے حقیر اور کم تر ہوں۔ اور جو ایمان وعمل سے محروم ہوں، چاہے دنیوی اعتبار سے وہ کتنے ہی بلند مرتبہ ہوں، اللہ کے ہاں، پرکاہ کے برابر بھی ان کی وقعت نہیں۔

2- اس میں اہل ایمان کو بھی تنبیہ ہے کہ ان کے ہاں بھی عزت وشرف کا معیار دین ہی ہونا چاہیے نہ کہ حسب ونسب اور مال وجاہ۔

حضرت ابوہبیرہ عائذ بن عمرو مزنی رضی اللہ عنہ، یہ اہل بیعت رضوان میں سے ہیں، فرماتے ہیں کہ حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ حضرت سلمان، صہیب اور بلال رضی اللہ عنہم کے پاس چند افراد کی موجودگی میں آئے تو انہوں نے (ابوسفیان کو دیکھ کر) کہا: ''اللہ کی تلواروں نے اللہ کے دشمن (یعنی ابوسفیان) سے اپنا حق وصول نہیں کیا۔''

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''تم یہ بات قریش کے بزرگ اور ان کے سردار کے متعلق کہہ رہے ہو؟''

چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور آپ کو یہ بات بتلائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اے ابوبکر! شاید تو نے انہیں ناراض کر دیا ہے۔ اگر (واقعی) تو نے انہیں ناراض کر دیا تو (یاد رکھ) تو نے اپنے رب کو ناراض کر دیا۔"

(یہ سن کر فوراً) ابوبکر رضی اللہ عنہ ان کے پاس آئے اور ان سے کہا۔

"بھائیو! کیا میں نے تمہیں ناراض کر دیا ہے (یعنی میری بات تمہیں ناگوار گزری ہے؟)"

انہوں نے کہا: "نہیں۔ اے ہمارے بھائی! اللہ تعالیٰ تمہاری مغفرت فرمائے۔ (مسلم)

فوائد و مسائل:

1-اس میں مسلمانوں کو ترغیب دی گئی ہے کہ آپس میں پیار و محبت کے ساتھ رہو اور ایک دوسرے کے بارے میں اپنے دلوں کو صاف رکھو اور اگر کوئی بات، غیر ارادی اور غیر شعوری طور پر، ایسی نکل جائے جس سے دوسرے مسلمانوں کے دلوں کو ٹھیس پہنچے یا ان کے جذبات مجروح ہوں، تو فوراً اس کا ازالہ کرنے کی سعی کرو۔

2-دنیاوی حیثیت سے کمزور لوگ اگر متقی اور پرہیزگار ہوں تو اہل ایمان کو ان کی کسی صورت بھی دل آزاری نہیں کرنی چاہیے کیونکہ اس سے اللہ ناراض ہوتا ہے۔

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا، جنت میں اس طرح ہوں گے۔" اور آپ نے اپنی انگشت شہادت اور درمیان والی انگلی کے درمیان کشادگی فرمائی۔ (یعنی قریب ہوں گے لیکن درجات میں فرق و تفاوت ہوگا۔) (بخاری)

فائدہ: جنت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت اور آپ کا قرب، بہت بڑا اعزاز ہے جو یتیم کے ساتھ حسن سلوک کرنے والے کو ملے گا۔ اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس گھر کو سب سے بہترین گھر قرار دیا ہے جس میں یتیم کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جاتا ہو اور اسے بدترین گھر کہا ہے جس میں اس کے برعکس یتیم کے ساتھ بدسلوکی کا معاملہ روا رکھا جاتا ہو۔

مسکین کون ہے

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"مسکین وہ نہیں ہے جسے کھجور اور دو کھجوریں، لقمہ اور دو لقمے لوٹا دیں، بلکہ مسکین تو وہ ہے جو (غربت کے باوجود) سوال سے بچتا ہے۔" (بخاری و مسلم)

اور صحیحین (بخاری و مسلم) کی ایک اور روایت میں الفاظ اس طرح ہیں:

"مسکین وہ نہیں ہے جو لوگوں (کے گھروں) کے چکر لگائے اور لقمہ، دو لقمے اور کھجور، دو کھجوریں اسے واپس لوٹا دیں۔ لیکن مسکین تو وہ ہے جو اتنی دولت بھی نہ پائے جو اسے (لوگوں سے) بے نیاز کر دے۔ اس کی (غربت کی) بابت احساس بھی نہ کیا جائے کہ اس پر صدقہ کیا جائے اور نہ (وہ خود دست سوال دراز کیے) کھڑا ہو کر لوگوں سے مانگے۔"

فائدہ: اس میں ایک نہایت اہم مسئلے کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی ہے اور وہ یہ کہ گھر گھر جا کر مانگنے والے زیادہ ضرورت مند (مسکین) نہیں ہوتے کیونکہ وہ تو قطرہ قطرہ حاصل کر کے دریا جمع کر لیتے ہیں۔ اصل ضرورت مند تو وہ ہوتے ہیں جو تونگر بھی نہیں ہوتے، نہ ان کا لباس اور ہیئت ہی ایسی ہوتی ہے جو ان کی غربت کی چغلی کھاتی ہو اور نہ ان کی خودداری اور غیرت ہی انہیں سوال کرنے کی اجازت دیتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پیشہ ور گداگروں کے مقابلے میں ایسے سفید پوش لوگوں کی امداد کی جائے' یہ اصل مسکین ہیں نہ کہ وہ جنہوں نے مسکینی کا روپ دھار رکھا ہو۔

مسکین کی خبر گیری کرنا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"بیواؤں اور مسکین کی خبر گیری کرنے والا، اللہ

کی راہ میں جہاد کرنے والے کی طرح ہے۔"

(راوی حدیث کہتے ہیں:) میرا گمان ہے کہ آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا: "وہ اس عبادت کرنے والے کی طرح ہے جو سست نہیں ہوتا اور اس روزے دار کی طرح ہے جو ناغہ نہیں کرتا۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:

1-بیوہ اور مسکین کا نام بطور تمثیل کے ہے، مراد معاشرے کے ضرورت مند، نادار اور معذور افراد ہیں۔ ان کی کفالت، خبر گیری اور ان کے لیے دوڑ دھوپ کو اجر میں جہاد فی سبیل اللہ کے برابر قرار دے کر اسلام نے اس کام کی اہمیت کو کتنا واضح کر دیا ہے۔ مسلمان اس کو نہ سمجھیں تو اور بات ہے، ورنہ اسلام نے معاشرے کے بے سہارا افراد کی امداد اور خیر خواہی کا حق ادا کر دیا ہے۔

2-اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عبادت صرف نماز پڑھ لینا یا روزہ رکھ لینا ہی نہیں ہے بلکہ ہر عمل صالح عبادت ہے اور ضعفاء و مساکین کی خبر گیری بھی عبادت ہے۔

بدترین کھانا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

"بدترین کھانا ولیمے کا وہ کھانا ہے، جس میں جو (ضرورت مند) آنا چاہے اسے تو روک دیا جائے اور جو انکار کرے اسے بلایا جائے۔ اور جس نے دعوت قبول نہیں کی اس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی۔" (مسلم)

اور صحیحین کی ایک اور روایت جو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے، اس میں آپ ﷺ کا قول اس طرح روایت کیا گیا ہے:

"بدترین کھانا ولیمے کا وہ کھانا ہے، جس میں مال داروں کو بلایا جائے اور فقراء کو چھوڑ دیا جائے۔"

فوائد و مسائل:

1-طبقہ امراء نے ولیمے کی دعوت کو جس طرح پرتکلف اور اپنی دولت و امارت کے اظہار کا ذریعہ بنا لیا ہے، اس کے متعدد دینی، اخلاقی اور معاشرتی نقصانات ہیں۔ دینی نقطہ نظر سے یہ اسراف و تبذیر ہے جو شیطانی عمل ہے اور اس کا ارتکاب کرنے والے شیطان کے بھائی۔ یہ اتنا بڑا نقصان اور سخت وعید ہے کہ ہمارے طبقہ امراء میں اگر ایمان ہو تو وہ اس اسراف سے باز آجائیں جس کا دائرہ روز بروز بڑھتا اور پھیلتا ہی جا رہا ہے۔

2-اس کا اخلاقی نقصان یہ ہے کہ انسان اس میں اپنے ہی ہم مرتبہ لوگوں کو دعوت دیتا ہے اور انہیں بہ اصرار اس میں شریک کرتا ہے، جب کہ معاشرے کے غریب اور مسکین قسم کے لوگوں کی اس میں شرکت کو وہ سخت ناگوار اور آداب کے خلاف تصور کرتا ہے، درآں حالیکہ دعوت کے مستحق، اپنی ضرورت مندی کی وجہ سے، مساکین ہی ہوتے ہیں نہ کہ اہل ثروت۔ اور مکارم اخلاق کا تقاضا بھی ہے کہ ضرورت مندوں کو اولیت و فوقیت دی جائے نہ کہ ان کو جو سرے سے ضرورت مند ہی نہیں ہیں۔

3-اس کا معاشرتی نقصان یہ ہے کہ اس قسم کے مظاہروں سے معاشرے کے کمزور طبقات میں احساس محرومی پیدا ہوتا ہے، حالانکہ اسلامی تعلیمات کا تقاضا ہے کہ محروم طبقات کی دل جوئی، دلداری کا اہتمام اور ان کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے نہ کہ ان کے اندر احساس محرومی پیدا کر کے انہیں اذیت اور اضطراب سے دوچار کیا جائے۔

4-اگر مسلمان، ولیموں اور دیگر تقریبات میں انواع و اقسام کے پرتکلف کھانوں کے بجائے، ایک دو قسم کے سادہ کھانوں کا اہتمام اور اس میں قرابت داروں اور دوست احباب کے ساتھ غرباء و مساکین کو بھی شریک کریں تو مذکورہ تینوں خرابیوں سے بچ سکتے ہیں جس کے معاشرے پر بہترین اثرات پڑ سکتے ہیں اور آخرت کی باز پرس سے بھی وہ بچ سکتے ہیں۔

5-حدیث میں دعوت ولیمہ کے قبول کرنے کی جو تاکید کی گئی ہے، اس سے مراد وہی دعوتیں اور ولیمے

ہیں جن میں اسلامی تعلیمات کا احترام اور سادگی وغیرہ کا اہتمام کیا جائے۔ مذکورہ قسم کے ولیمے، جو مذکورہ خرابیوں کے مظہر ہوں، ان میں شرکت نہ صرف یہ کہ ضروری نہیں بلکہ ان کا بائیکاٹ ضروری ہے تاکہ ان برائیوں میں شرکت کے جرم سے وہ بچ جائیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

''جس شخص نے دو بچیوں کی پرورش و تربیت کی حتیٰ کہ وہ بالغ ہوگئیں، قیامت والے دن وہ اس حال میں آئے گا کہ میں اور وہ ان دو انگلیوں کی طرح (قریب قریب) ہوں گے۔'' اور آپ نے اپنی انگلیاں ملائیں (یعنی ملا کر دکھایا کہ اس طرح ہم دونوں ساتھ ساتھ ہوں گے)۔ (مسلم)

فوائد و مسائل :

1- زمانہ جاہلیت میں لڑکیوں کی پیدائش پر جس ناگواری کا اظہار اور عورت کی قدر و منزلت کا انکار کیا جاتا تھا، شریعت اسلامیہ نے ان کی عزت و توقیر کی بحالی کے لیے جو ہدایات دیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بچیوں کی پرورش اور ان کی تعلیم و تربیت کو حصول جنت کا ذریعہ قرار دیا تاکہ لوگ بیٹوں کی ولادت اور ان کی پرورش ہی پر خوشی محسوس نہ کریں۔

بیٹیوں کے ساتھ حسن سلوک

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ میرے پاس ایک عورت اس حال میں آئی کہ اس کے ساتھ اس کی دو بیٹیاں تھیں، وہ سوال کر رہی تھی۔ اس نے میرے پاس سوائے ایک کھجور کے کچھ نہ پایا، چنانچہ وہ کھجور میں نے اسے دے دی۔ اس نے اس کے دو حصے کر کے اپنی دونوں بیٹیوں میں تقسیم کر دی اور خود اس میں سے کچھ نہیں کھایا، پھر کھڑی ہوئی اور چلی گئی۔ پھر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے تو میں نے آپ کو یہ بات بتلائی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''جسے ان بیٹیوں میں سے کسی معاملے کے ساتھ آزمایا جائے، اور وہ ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے تو وہ بیٹیاں اس کے لیے جہنم کی آگ سے بچاؤ کا باعث ہوں گی، اس لیے ان سے نفرت کرنا اور انہیں بوجھ سمجھنا کم از کم ایک مسلمان کو زیب نہیں دیتا۔

عورتوں کا صدقہ کرنا

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں ''کہ میرے پاس ایک مسکین عورت اپنی دو بیٹیاں اٹھائے ہوئے آئی۔ میں نے اسے کھانے کے لیے تین کھجوریں دیں۔ پس اس نے دو کھجوریں تو اپنی دو بیٹیوں کو دے دیں اور ایک کھجور اس نے کھانے کے لیے اپنے منہ کی طرف بڑھائی تو وہ بھی اس سے اس کی بیٹیوں نے کھانے کے لیے مانگ لی، چنانچہ اس نے وہ کھجور بھی، جسے وہ خود کھانا چاہتی تھی، دو حصے کر کے اپنی دونوں بیٹیوں میں تقسیم کر دی۔ مجھے اس کی یہ بات بڑی اچھی لگی۔ میں نے اس واقعے کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ نے اس کے اس عمل کی وجہ سے اس کے لیے جنت واجب فرما دی ہے (یا یہ فرمایا:) کہ اس کی وجہ سے اسے جہنم کی آگ سے آزاد کر دیا ہے۔'' (مسلم)

فائدہ : اس میں لڑکیوں کی پرورش کی فضیلت کے علاوہ اس بات کا بھی بیان ہے کہ اگر عورت کو اپنے خاوند کی طرف سے صدقہ و خیرات کی عمومی اجازت حاصل ہو تو وہ صدقہ کر سکتی ہے۔ اس کے ثواب میں دونوں برابر کے شریک ہوں گے، عورت کو صدقہ کرنے کی وجہ سے اور مرد کو اس پر رضا مند ہونے کی وجہ سے اجر ملے گا۔

کتاب کہانی

سمیرا حمید

سلائی مشین کے موجد الیس ہووے نے جو مشین بنائی تھی اس سے صرف جوتے ہی سیے جا سکتے تھے۔ کیونکہ اس میں جو سوئی لگی تھی وہ اس سوئی جیسی تھی' جو ہم عام طور پر استعمال کرتے ہیں اور جس کے کنارے پر چھید ہوتا ہے۔ الیس کپڑوں کے لیے سلائی مشین تیار کرنا چاہتا تھا لیکن ایسا ہو نہیں پا رہا تھا۔ دھاگا ٹوٹ جاتا تھا۔ ایک رات اس نے خواب دیکھا کہ وہ جنگل میں ہے اور جنگلی اس کی جان کے دشمن ہو کر اپنی برچھیاں لے کر اس کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ برچھیوں کی نوک پر سوراخ تھا۔ (سلائی مشین کی سوئی کی طرح)

اس خواب کے بعد الیس نے سوئی کی نوک پر سوراخ کیا اور اسے مشین میں فٹ کر دیا۔ اس طرح موجودہ سلائی مشین ایجاد ہوگئی اور دنیا میں انقلاب برپا ہوگیا۔

جب انسان کسی چیز کی کوشش میں لگ جاتا ہے تو اللہ اس کی مدد کرتا ہے۔ خواب کی صورت' خیال یا الہام کی صورت' ورنہ عملی صورت میں تو ضرور ہی۔ ضرورت صرف اس امر کی ہوتی ہے کہ ہم اپنی ''کوشش'' جاری رکھیں۔

لکھنا آسان نہیں ہے لیکن مشکل بھی نہیں ہے۔ مشکل تب ہوگا' جب آپ کوشش کرنا چھوڑ دیں گے۔ دو' تین' یا چار پانچ کہانیاں' تھوڑی سی کوشش سے ہر انسان کہہ لیتا ہے' لکھ لیتا ہے۔ لیکن باقاعدہ رائٹر بننے کے لیے' تھوڑی جان جوکھم میں ڈالنی پڑتی ہے۔ خود کو تراشنا پڑتا ہے۔ کوئی بھی ہنر' غور و فکر' مشاہدے' تجربے' مشق اور عقل کے استعمال سے آتا ہے۔ تخلیق ڈگری کی مرہون منت نہیں ہوتی کیونکہ تخلیق کار سیکھنے کے ذرائع خود پیدا کرتا ہے۔ وہ اپنی درس گاہ خود ہوتا ہے۔ استاد بھی' شاگرد بھی۔ اب تک دنیائے ادب میں جتنے بھی بڑے نام پیدا ہوئے ہیں انہوں نے کسی بھی ادارے سے لکھنے کی ڈگری نہیں لی تھی۔ بلکہ بہت سے تو ایسے ہیں جو بہت کم تعلیم یافتہ تھے۔ بظاہر ان کے پاس ڈگریاں نہیں تھیں لیکن ان کے پاس ڈگریوں سے زیادہ علم تھا۔

معاشرے کی پرکھ' رویوں کی جانچ' اور انسانی نفسیات کا علم۔ آپ کے پاس بھی یہی علم ہونا چاہیے۔ آپ کے پاس اپنی پرکھ' اپنی سوچ' اپنا مشاہدہ ہونا چاہیے۔ اپنے الفاظ' اپنا طریقہ' اور اپنی ''کہانی''۔ حقیقی تخلیق کار کے پاس ہمیشہ اپنی سوچ ہوتی ہے۔ اپنا سامان۔ وہ نہ کسی کی آنکھ سے دیکھتا ہے نہ کسی اور کے کان سے سنتا ہے۔ آپ کو بھی یہی بصارت اور سماعت حاصل کرنی ہے۔

ہاتھ کے اشارے سے آپ کو یہ نہ بتانا پڑے کہ دیکھو سامنے' وہ فلاں چیز' واقعہ' انسان' حادثہ قابل غور ہے۔ آپ کی آنکھ کو کوئلے اور کوئلے میں ہیرے کی پہچان ہو۔ آپ کی سماعت' بے آواز سسکی سن لے' قہقہے میں آہ' خاموشی میں کلام۔ آپ کی سوچ' مشاہدے' عقل میں کوئی کمال نہیں ہوگا تو تحریر میں کیسے آئے گا۔ اپنے اندر کا کمال آپ کو خود ''بیدار'' کرنا ہے۔ اسے بیدار کریں۔ اس پر توجہ دیں۔

افسانہ نویسی:

اردو افسانے کی عمر سو سال سے کچھ ہی زیادہ ہے۔ ہمیں فخر ہونا چاہیے کہ اُردو ادب نے بہت بڑے بڑے افسانہ نگار پیدا کیے ہیں۔ اُردو افسانے کی ابتداء کا سہرا ''منشی پریم چند'' کے سر جاتا



ہے۔ پہلے کہانیاں داستان کی طرز پر لکھی جاتی تھیں' لیکن انہوں نے کہانی کو "افسانے" کی طرز پر لکھا۔ ان کے قلم سے ہندوستانی معاشرہ اپنے حقیقی روپ میں نظر آنے لگا تھا۔

افسانہ کیا ہے اس کی دوٹوک تعریف کوئی بھی نہیں کرسکتا۔ ہم میں سے اکثر لوگ افسانے اور مختصر کہانی کو ایک ہی سمجھتے ہیں۔ جبکہ ایسا نہیں ہے۔ افسانے اور چھوٹی یا مختصر کہانی میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ افسانے کی بُنت' ترتیب' ترکیب' لفاظی' مرکزی خیال' اٹھان' اختتام اس کا پورا پورا توازن' وغیرہ اسے "افسانہ" بناتے ہیں۔ جبکہ مختصر کہانی میں یہ سب نہیں ہوتا۔ جیسا کہ قرۃ العین حیدر کہتی ہیں کہ۔

"پلاٹ کا توازن' مکالمات کی برجستگی' غیر ضروری جزدیات سے احتراز۔ یہی سب فن افسانہ نگاری کے ہتھیار ہیں۔"

ایک رائٹر ہونے کی حیثیت سے ہمیں کہانیوں کی اقسام' صنف' ان کی بنیادی تعریف وغیرہ معلوم ہونی چاہیے۔ کیونکہ بنیاد ہی سے عمارت تعمیر ہوگی۔ جیسے کہ ایک ترکھان اپنے سب اوزاروں کو' اور ایک کسان زمین و بیج کو اپنے کھال د بال کی طرح پہچانتا ہے ایسے ہی رائٹر کو اپنی صلاحیت کے بارے میں معلوم ہونا چاہیے تاکہ وہ اپنی کہانیوں کو پورے اعتماد سے لکھ سکے۔ سمجھ بوجھ کر' اندھیرے میں تیر چلا کر نہیں۔

<u>افسانہ کیسے لکھیں:</u>

ادارہ خواتین میں اکثر نئے لکھنے والے ناول لکھ کر بھیجتے ہیں اور چونکہ ان کی ابھی کہانی پر گرفت نہیں ہوتی تو وہ ناول شائع نہیں ہوتے۔ اس میں قصور اُن کا ہے نہ ادارے کا۔ جب ہم کسی خیال کو لے کر لکھنے کے لیے بیٹھتے ہیں تو وہ پھیلتے پھیلتے مختصر کہانی سے طویل کہانی بن جاتا ہے۔ اور وہ پھیلتا ہی جاتا ہے۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کیونکہ ہمیں کہانی کو بیان کرنا' اور پھر اسے سمیٹنا نہیں آتا۔ ہم لکھتے لکھتے کہاں سے کہاں پہنچ جاتے ہیں۔ کہانی اپنی حد سے نکل جاتی ہے۔ دنیا کی کوئی بھی کہانی ہو اس کی ایک حد ہوتی ہے۔ وہ حد معلوم کرنا رائٹر کا کام ہوتا ہے۔ وہ حد طے کرنا بھی رائٹر کا کام ہی ہے۔

ہر کہانی کی حد' اس کہانی کے مرکزی خیال سے طے کی جاتی ہے۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھیں کہ ہر "مرکزی خیال" ایک بپھری ہوئی لہر کی طرح ہوتا ہے۔ اگر اس لہر کو مناسب کنارے نہیں دیے گئے تو وہ سیلاب بن جائے گی۔ نہ دریا بنے گی' نہ



جھیل نہ سمندر' بس سیلاب۔ اور سیلاب نہ دیکھنے میں خوب صورت لگتا ہے' نہ عملی صورت میں اس کا کچھ بھی فائدہ ہوتا ہے۔

ہم ذہن میں آنے والے ہر خیال کو بنا سوچے سمجھے اور غور کیے لکھنے لگتے ہیں۔ ہم یہ جان ہی نہیں پاتے کہ یہ مرکزی خیال افسانے کا ہے' ناول (سنگل) کا یا مکمل ناول (سلسلے وار) کا۔ اس بات کو میں سادہ مثال سے سمجھاتی ہوں۔ آپ کا مرکزی خیال ایک کپ چائے ہے۔ ایک کپ چائے کی مقدار اور حجم آپ جانتے ہیں۔ کتنی چینی چلنے کی پتی دودھ' پانی اور آگ ......اور ایک کپ چائے تیار......

کیسا ہو اگر ہم ایک کپ چائے کے اجزاء یعنی تھوڑا سا دُودھ' تھوڑی سی چینی' پتی' اور پانی کے ساتھ سو کپ چائے بنالیں؟ یقیناً آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ پھر کیا ہوگا۔

یہ بالکل سامنے کی بات ہے کہ مرکزی خیال کوئی بھی ہو اسے پھیلا کر سو صفحات تک بھی لے جایا جاسکتا ہے اور ایک ہزار تک بھی۔

مگر طوالت کہانی کو خوب صورت نہیں بناتی' ایسے ہی اختصار' بھی کہانی کو بدصورت نہیں بناتا۔

"ٹالسٹائی کا ناول اینا کارنینا" دنیا کی خوب صورت ترین اور طویل ترین کہانیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ایسے ہی "پکچر آف ڈورین گرے" مختصر سا ناول ہے۔ دونوں ناول دنیا بھر میں بے حد مقبول ہیں۔ ذوق و شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ دنیا کی شاید ہی کوئی لائبریری ایسی ہوگی جہاں یہ دونوں کتابیں موجود نہیں ہوں گی۔ ترقی کا شاید ہی کوئی ایسا دور آیا ہوگا جس میں ان دونوں کتابوں پر فلم' ڈرامہ یا اسٹیج پلے پیش نہیں کیا گیا ہوگا۔ دنیا بھر کے نصاب میں یہ ناول شامل کیے گئے ہیں۔ یہ دونوں کتابیں طویل یا مختصر ہونے پر مقبول نہیں ہیں۔ یہ مقبول یا کامیاب ہیں تو اس لیے کہ یہ اپنے توازن میں پوری ہیں۔ اپنی ترتیب اور ترکیب میں مکمل اور کامل ہیں۔ بس!

تو آپ کو بھی ایسی ہی کہانیاں لکھنی ہیں۔ جو ترتیب' ترکیب' توازن' اور وزن میں پوری ہوں۔

سب سے پہلے اپنے مرکزی خیال کو سمجھنا سیکھیں۔ اس مرکزی خیال کو اپنی عقل پر پرکھیں۔ اس پر غور کریں کہ یہ خیال' کہانی کی کس قسم کے لیے ہے۔ جس وقت آپ اپنی کہانیوں کی حد' مقدار' حجم' طے کرنا جان جائیں گے' اس وقت آپ "باقاعدہ رائٹر" بننے کے لیے پہلی سیڑھی پر چڑھنے کے لیے تیار ہو چکے ہوں گے۔



آپ کے لیے پہلے افسانہ لکھنا ہی کیوں ضروری ہے۔تاکہ آپ کہانی کو بیان کرنا سیکھ لیں۔جب میں ’’آپ‘‘ کہتی ہوں تو اس سے میرا مطلب ’’اکیلے آپ‘‘ نہیں ہیں۔اس سے میرا مطلب‘ آپ کا قلم‘ آپ کی سوچ‘ مشاہدہ‘ عقل‘ آپ کے دماغ کا پورا سسٹم ہے۔آپ نے پورے سسٹم کو مشق کروانی ہے۔ پورے سسٹم کو تیار کرنا ہے۔

افسانہ نویسی ایک ایسی سواری ہے جو ناول نگاری میں آپ کو گرنے نہیں دے گی۔ جو کردار نگاری میں آپ کو پختہ کرے گی۔جو کہانی کی باریکیاں‘ اس کی گرہیں آپ پر کھولے گی۔

آپ کے پاس کتنا ہی اعلا درجے کا مرکزی خیال کیوں نہ موجود ہو‘ وہ اس صورت میں بے کار ہے‘ جب تک آپ اسے برتنا نہیں سیکھ لیتے۔اس کی باریکیاں نہیں سیکھ لیتے۔کہانی میں سے جھول (تکنیکی غلطیاں‘ ہلکا پن) نکالنا نہیں جان لیتے۔اپنے قلم کو پختہ نہیں کر لیتے۔پختہ قلم کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ہم بڑی بڑی‘ یا گہری باتیں کہنے لگیں۔اس کا مطلب صرف اتنا ہے کہ کہانی‘ کردار نگاری‘ لفاظی اور تکنیک میں کوئی ہلکا پن نہ رہے۔

فرض کرتے ہیں کہ کہانی ڈارک یعنی دکھی یا تلخ ہے۔تو یہ ہوا کہانی کا شیڈ یا رنگ۔اب کہانی شروع کرنے کا انداز‘ اسے اختتام تک لے جانے کا انداز‘ وہ اس شیڈ کے اندر ہی ہوگا۔حتیٰ کہ اگر اس شیڈ (ڈارک) میں آپ مزاحیہ بات بھی لکھیں گے تو وہ بھی اس شیڈ کے مخالف یا الٹ نہیں جانی چاہیے۔ہر لفظ‘ جملے کو مرکزی خیال‘ تھیم‘ اور شیڈ کے مطابق ہی ہونا چاہیے۔

فرض کرتے ہیں کہ افسانہ ایک ایسی لڑکی کا ہے‘ جس کی اس کی مرضی کے خلاف شادی کی جا رہی ہے۔وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے۔باپ کا مزاج‘ ظالمانہ ہے۔

’’سوا نیزے کا سورج‘ ابا جی کے حکم کا صور‘ اور اس کا محبت کر لینے کا گناہ‘ اس پر قیامت لا رہا تھا۔گھر کے سب لوگ چہک —— رہے تھے‘ اور وہ گرمی کی دھوپ کو اپنے لیے صحرا کر رہی تھی۔بارات کے استقبال کے لیے باہر شامیانے لگائے جا رہے تھے۔ساری رات پیٹی جانے والے ڈھولک اب چھوٹی بچیاں پیٹ رہی تھیں۔ابا جی‘ سائے میں کرسی کیے حقہ پی رہے تھے۔ان کی مونچھوں کی اٹھان‘ اس کے گلے کا پھندا بن چکی تھی۔

دن کی دلہن‘ رات سے آہ و بکا کر رہی تھی۔سسکیاں بھر رہی تھی اور کھڑکی سے جھانک کر اپنے باپ کو دیکھ رہی تھی۔وہ دیکھ رہی تھی کہ جس



باپ کی آنکھوں کی سختی‘ اکلوتی بیٹی کی رخصتی کے خیال سے بھی نرمی میں نہ بدلے‘ وہ اس باپ کے پیروں میں گر کر اپنی محبت کا واسطہ کیسے دے۔ان سے رحم کی اُمید کیسے کرے‘ جو صحن میں حلال ہوتی مرغیوں کو دیکھ کر بھی زیر لب ہنس دیتے ہیں۔اور جنہیں اس سے بھی فرق نہیں پڑتا کہ سرخ گھونگھٹ کی آڑ میں وہ اپنا گلا کاٹ لینے پر تو بضد ہے لیکن اپنا دل بدل لینے پر نہیں۔‘‘

اگر آپ ان لفظوں اور ان کی بُنت پر غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ سارے لفظ لڑکی کے جذبات‘ اور اس پر ڈھائی جانے والی قیامت کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ ہر لفظ کی تان ایک دُکھ اور کاٹ پر ختم ہو رہی ہے۔

آئیں اب اسی کہانی کو‘ اور زیادہ کاٹ دار انداز میں لکھتے ہیں اور اس بار کہانی ابا جی سے شروع کرتے ہیں۔

’’ابا جی کے لبوں کی ہنسی‘ دلہن بننے کے لیے تیار کھڑی لڑکی نے کھڑکی سے دیکھی تو وہ مسخرے پن سے ہنس کر رو دی۔اس کے باپ کو اتنی خوشی تھی‘ تو وہ کس لیے اتنا سسک رہی تھی۔اس سستی سی محبت کے لیے جو —— چوک میں الٹا لٹکا کر ذلیل کرنے کے لائق تھی۔کہاں وہ‘ کہاں ابا جی‘ جن کے لیے زمانے بھر کے سارے شریف ذلیل تھے اور زمانے بھر کے سارے اٹھائی گیر‘ بدمعاش‘ کوٹھا نشین‘ شریف الشریف تھے۔ویسے بھی ابا جی کو اونچی حویلیاں‘ اور اونچے شملے والی پگڑیاں بڑا متاثر کرتی تھیں۔ان کی باتیں سونے چاندی سے شروع ہوتی تھیں اور مثالیں نوابوں اور ان کی شاہ خرچیوں پر ختم ہوتی تھیں۔

کہتے تو وہ یہ تھے کہ انہیں دیسی مرغ بہت مرغوب ہے‘ لیکن ثابت کچھ یہ ہوا تھا کہ غریبوں کو چھوڑ کر‘ وہ ہر امیر سے مرعوب تھے۔امیر اور پھر نواب......وہ تو زمین پر بچھ جانے کے لیے تیار تھے۔اکلوتی بیٹی کچھ حسین تھی‘ کچھ اس کے حسن کے چرچے عام تھے کہ انہوں نے اسے بڑی بے وقوفی جانا کہ بچپن کی منگنی کے ’’بتاشوں‘‘ کا لحاظ کریں‘ اور دوسرے درجے کے ہی سہی‘ نواب صاحب کو ہاتھ سے جانے دیں۔جو سفید بالوں کے گچھے کو تاج ہند سمجھتے تھے۔ویسے بھی انسان نواب ہو تو‘ ہر ڈھونگ رچا سکتا ہے۔وہ تھوکے گا بھی تو اس کا تھوک چاٹا جائے گا۔سفید بالوں کی اوقات ہی کیا تھی۔ تھے تو وہ نواب‘ بوڑھے تھے تو کیا ہوا۔‘‘

دونوں صورتوں میں کہانی کا شیڈ نہیں بدلا۔دونوں صورتوں میں صرف چند سطروں میں یہ نظر آنے لگا ہے کہ ابا جی ظالم اور لالچی ہیں۔ بیٹی کے ذریعے اپنا مرتبہ اونچا کرنا چاہتے ہیں۔ بیٹی کی سستی

محبت (لڑکا) کو الٹا لٹکانے کے لیے تیار تھے۔
پوائنٹس:

افسانے میں کہانی کو فوراً واضح کردیں۔ یعنی کہانی فوراً دے دیں۔ افسانے میں بات دوٹوک کرتے ہیں۔ سیدھی' کھری' اور ٹھک کر کے۔ پوائنٹ پر۔ تیسری اور اہم بات کہ افسانے میں کردار نگاری 'ٹیکنیکی' اور صاف صاف ہوتی ہے۔ چونکہ کوزے میں دریا بند کرتا ہوتا ہے اس لیے کردار نگاری' اور کہانی' دونوں کو لکھتے ہوئے ایسے جملوں اور الفاظ کا استعمال کرتے ہیں جو دس یا سو باتوں کو ایک جملے میں کہہ دیں۔ جیسا کہ۔

''ویسے بھی ابا جی کو اونچی حویلیاں' اور اونچے شملے والی پگڑیاں بڑا متاثر کرتی تھیں۔ ان کی باتیں سونے چاندی سے شروع ہوتی تھیں اور مثالیں نوابوں اور ان کی شاہ خرچیوں پر ختم ہوتی تھیں۔''

'' اکلوتی بیٹی کچھ حسین تھی' کچھ اس کے حسن کے چرچے عام تھے کہ انہوں نے اسے بڑی بے وقوفی جانا کہ بچپن کی منگنی کے ''بتاشوں'' کا لحاظ کریں' اور دوسرے درجے کے ہی سہی' نواب صاحب کو ہاتھ سے جانے دیں۔''

''بتاشوں کا لحاظ'' سے منگیتر کی مالی حیثیت ظاہر ہوتی ہے۔ ''بتاشے'' لفظ نے معمولی حیثیت کو ظاہر کر دیا۔ ''نواب صاحب'' نے غیر معمولی حیثیت کو۔

ریشم کا کپڑا' ریشم کے دھاگوں سے ریشم بُنتا ہے۔ سوتی کپڑا سوت سے۔ جو دھاگہ لیں گے وہی کپڑا بن جائے گا۔ الفاظ وہی دھاگے ہوتے ہیں جو کہانی کی بُنت کرتے ہیں۔ آپ جو الفاظ چنیں گے' آپ کی کہانی وہی بن جائے گی۔

اسی کہانی کو میں غیر مناسب الفاظ میں لکھتی ہوں۔ یا الفاظ کے غلط چناؤ سے اس کہانی کو برباد کر کے دکھاتی ہوں۔

''ابو صحن میں کرسی پر پھیل کر بیٹھے ہوئے دھوپ سینک رہے ہیں۔ گھر مہمانوں سے بھرا ہوا ہے۔ باہر دیگیں پک رہی ہیں۔ شور اتنا کہ اف توبہ۔ دلہن اپنے کمرے میں نیچی ابھی بھی رو رہی ہے۔ ابو کو سب پتا تھا لیکن وہ کان بند کر کے بیٹھے ہوئے ہیں۔ شادی ان کی مرضی سے ہو رہی تھی۔ دولہا عمر میں کچھ بڑا تھا۔ نواب تھا۔ بیٹی خوب صورت تھی۔ نواب تک خبر پہنچی تو رشتہ بھی آ گیا۔ مٹھائیوں کے ٹوکروں کے ڈھیر میں وہ بوندیاں دب کر رہ گئیں جو بچپن کی منگنی پر سب نے مل بانٹ کر کھائی تھیں۔''

یہ پورا پیرا نارمل ہے۔ تیسرے پیرے میں روانی بھی نہیں ہے۔ اس میں بات سمجھ میں آتی ہے لیکن بات میں کوئی گہرائی' یا کہیں کسی لفظ میں کوئی نیا پن نہیں ہے۔ آپ کہانی کا پہلا اور دوسرا پیرا پڑھیں اس میں لفظ ''ابا جی'' کے استعمال اور اس تیسرے پیرے میں ''ابو'' کے استعمال سے کتنا فرق پڑا ہے۔ کیا فرق پڑا ہے؟

''ابا جی'' کا لفظ یہ ظاہر کرتا ہے کہ کہانی شاید تھوڑے سے پرانے وقت کی ہے۔ یعنی صرف لفظ ''ابا جی'' نے کہانی کے پورے شیڈ کو بدل دیا۔ پھر جیسے ہی نواب'' کا لفظ آیا۔ خود بخود یہ معلوم ہو گیا کہ کہانی اس وقت سے تھوڑی سی پرانی ہے۔ یہاں آپ کو باقاعدہ دن اور سال نہیں لکھنا پڑا۔ لفظوں سے ہی سب ظاہر ہو چکا ہے۔ شامیانے' دیسی مرغ' بتاشے' ان جیسے الفاظ نے کہانی کو پرانے وقت کا شیڈ دیا ہے۔

آپ تینوں پیروں کا موازنہ کریں۔ آپ کو خود اندازہ ہو جائے گا کہ الفاظ کے چناؤ نے کہانی کو کتنا بدل دیا ہے۔ کہانی وہی ہے' مرکزی خیال وہی ہے۔ بس اسے کہنے کا انداز بدلا' تو کہانی کا رنگ بھی بدل گیا ہے۔ مناسب اور کاٹ دار جملے بنائے تو کہانی کاٹ دار ہوتی گئی۔ ہلکے لفظ لیے تو کہانی ہلکی ہو گئی۔ ابا جی کے کردار پر چار سطریں لکھیں تو ابا کی فطرت واضح ہو گئی۔ نو سے دس سطروں میں دلہن کا دکھ' ابا جی کی سختی اور لالچ' نواب کا بڈھا ہونا' ظاہر ہو گیا۔ بس یہی مشق آپ کو کرنی ہے۔

☆



بندھن

اِقبال بانو، زہرہ ملک، فیض رسول لنگڑیال

شاہین رشید

اقبال بانو بہترین ناول نگار اور افسانہ نگار ہیں اور اب ڈرامہ نگار ہونے کا بھی اعزاز انہیں حاصل ہو گیا ہے۔ ان کی تحریریں اور ان کے ڈرامے نوجوان نسل خاص طور پر لڑکیوں کے لیے مشعل راہ ہوتے ہیں۔ ڈراموں میں اور اپنی تحریروں میں اچھی اچھی باتیں کرنے والی اقبال بانو اپنی ازدواجی زندگی میں کیسی ہیں۔ یہ معلوم کرنے کے لیے اس بار بندھن میں ہم نے ان کا انتخاب کیا۔

''کیسی ہیں اقبال بانو صاحبہ؟''

''اللہ کا شکر ہے۔''

''آج کل کیا معروفیات ہیں۔ ڈائجسٹ وغیرہ میں نظر نہیں آ رہیں؟''

''وہ آج کل میں ڈرامے لکھنے میں مصروف ہوں۔ اس لیے افسانہ نگاری اور ناول نگاری کی طرف توجہ تھوڑی کم ہے۔''

''سنا ہے آپ نے بھی ''ایک نیا چینل'' جوائن کر لیا ہے؟''

''میں نے ''یہ چینل'' اس لیے جوائن کیا ہے کہ یہ چینل والے رائٹرز کی عزت بہت کرتے ہیں۔ پھر ان کا پیکج بہت اچھا ہے اور میں دوبارہ یہ بات کہوں گی کہ جو عزت و احترام رائٹر کو اس چینل والوں نے دیا آج تک کسی نے نہیں دیا۔''

''دوسرے پروڈکشن ہاؤسز والوں سے کیا شکایت ہے آپ کو؟''

''سب سے بڑی شکایت تو یہ ہے کہ وہ ہمیں پے منٹ کے معاملے میں بہت پریشان کرتے تھے، رلا رلا کر پے منٹ دیتے تھے اور آپ کو بتاؤں کہ ایک پروڈکشن ہاؤس نے اور ایک چینل نے میری پے منٹ ابھی تک کلیئر نہیں کی ہے اور پے منٹ ہزاروں میں نہیں بلکہ لاکھوں میں ہوتی ہے اور جب ہم مانگتے ہیں تو ایسا رویہ اختیار کرتے ہیں کہ جیسے ہم اپنی محنت کا معاوضہ نہیں، بلکہ بھیک مانگ رہے ہوں

یا قرض مانگ رہے ہوں۔"
"پہلے تو آپ فری لانسر تھیں تو کیا......؟"
"اب فری لانسر نہیں ہوں۔ بہت لکھ لیا...... نقصان بھی اٹھایا کہ لوگ پیسے کھا جاتے ہیں۔"
"اقبال بانو! آپ ملتان میں اور یہ چینل کراچی میں تو کیا آپ کو کراچی بلایا گیا تھا؟"
"جی...... جی...... کراچی بلایا گیا۔ مجھے اور میرے میاں کو ایئر ٹکٹ دیا گیا۔ کیوں کہ میں اپنے میاں کے بغیر کہیں نہیں جاتی۔" تین دن ہمیں "پی سی" میں ٹھہرایا اور بہت عزت و احترام دیا۔ پک اینڈ ڈراپ بھی دیا۔ جب کہ دوسرے پروڈکشن ہاؤس والے تو گیسٹ ہاؤس بھی بہت خراب دیتے ہیں۔ ایک رائٹر بتا رہی تھیں کہ ایک پروڈکشن ہاؤس نے تو وارڈروب والی خاتون کے گھر ٹھہرایا تھا۔"
"ڈرامے کی باتیں تو بہت ہوگئیں۔ اب آجائیں بندھن کی طرف...... کتنے سال ہوگئے شادی کو؟"
"ماشاء اللہ سے بیس سال، اکیس ستمبر 1998ء میں میری شادی ہوئی اور 2018ء میں پورے بیس سال ہو جائیں گے اور ماشاء اللہ سے میرا ایک ہی بیٹا ہے، جس کا نام "محمد اسماعیل ٹیپو" ہے اور وہ فرسٹ ایر انجینئرنگ کا طالب ہے اور میرے میاں صاحب کا نام "فیض رسول لنگڑیال" ہے۔"
"20 سال میں ایک نسل — جوان ہو جاتی ہے...... ان بیس سالوں میں ترقی بھی بہت ہوئی ہے...... تو اس وقت کے ماحول میں اور آج کے شادی کے ماحول میں کیا فرق دیکھتی ہیں؟"
"شادی تو ہماری بھی بہت دھوم دھام سے ہوئی، لیکن جس طرح آج دھوم دھام سے ہوتی ہے، پہلے نہیں ہوتی تھی، بس سادگی کے ساتھ مایوں مہندی ہو جاتی تھی...... آج جیسے دھوم دھڑکے نہیں تھے۔"
"بیوٹی پارلر سے سج کر آئی تھیں؟"
"ارے نہیں، گھر پر ہی تیار ہوئی تھی اور خود ہی میک اپ کر لیا تھا۔ ملتان میں میری شادی ہوئی تھی اور وہاں اس وقت بیوٹی پارلر کا رواج ہی نہیں تھا اور نہ ہی اس بات کو اچھا سمجھا جاتا تھا کہ بیٹیوں کو میرج ہال سے رخصت کیا جائے۔ چنانچہ میں اپنے گھر سے ہی رخصت ہوئی تھی...... بہت سادگی تھی، جب کہ آج شادیوں میں خرچا بہت ہوتا ہے اور مہنگائی بھی بہت ہوگئی ہے...... تو ہمارا وقت بہت اچھا تھا اور مجھے تو آج کی شادیوں میں مزہ نہیں آتا۔ میری بھانجیوں کی شادیاں ہوئیں، انہوں نے بھی آج کے دور کی طرح خوب ہلا گلا کیا۔ مگر مجھے تو اچھا نہیں لگا۔"
"لوگ کہتے ہیں کہ شادی تو ایک ہی بار ہوتی ہے تو کیوں نہ دھوم دھام سے اور ہلا گلا کر کے کی جائے؟"
"بے شک شادی ایک بار ہی ہوتی ہے۔ مگر کیا ضروری ہے کہ ایک ہی بار میں ماں، باپ کا کباڑا کر دو، ان کے خرچے کروا دو؟"
"جہیز کی فرمائش کی تھی میاں صاحب نے؟"
"نہیں...... نہیں...... بلکہ میرے میاں کو تو آج تک پتا نہیں ہے کہ میرے پاس کیا، کیا ہے...... اور کبھی نہیں پوچھا انہوں نے کہ تم جہیز میں کیا لائی تھیں اور اپنی ساری چیزیں میں نے خود ہی نکالی اور استعمال کیں، میاں کو اچھی لگیں تو پوچھا کہ یہ کب لائی تھیں اور بتایا کہ جہیز کی ہے تو اچھا اچھا کہہ کر خاموش ہوگئے۔"
"جہیز میں کیا آیا، کیا نہیں، میاں کو اتنی پروا نہیں ہوتی، مگر نندوں کو اور ساس کو ضرور ہوتی ہے...... ایسا ہے......"
"میرے میاں ایک بارعب شخصیت کے مالک ہیں۔ شاید اس لیے میرے سسرال والوں نے بھی کچھ کہا نہیں، جو بکسوں (صندوقوں) میں بند ہوئے آیا' ویسا ہی پڑا رہا۔ اس زمانے میں جہیز دکھانے کا بھی رواج تھا۔ ہم نے یہ رواج بھی نہیں کیا کہ اچھا نہیں لگتا بلاوجہ کی نمائش۔"

"کتنی نندیں اور کتنے دیور جیٹھ ہیں؟"
"میری چار نندیں ہیں ماشاء اللہ اور ایک دیور، ایک جیٹھ ہیں، یعنی یہ تین بھائی ہیں اور میں دوسرے نمبر کی بہو بن کے آئی۔"
"جوائنٹ فیملی میں آئیں؟"
"نہیں...... میرے میاں نے پہلے سے ہی علیحدہ گھر بنا لیا تھا۔ پہلے ہم ملتان میں تھے تو وہاں بھی ہمارا گھر تھا...... پھر وہاڑی ٹرانسفر ہوگیا میرے میاں کا تو ہم وہاڑی آگئے۔ میاں صاحب بینک میں جاب کرتے تھے۔ اس طرح جیٹھ بھی علیحدہ رہتے ہیں...... سسرال میں جانا آنا تو لگا رہتا ہے، لیکن جوائنٹ فیملی میں رہنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ جوائنٹ فیملی میں تو میری جٹھانی رہی ہیں۔ میں نے تو سب کا بہت پیار و محبت دیکھا ہے اور میرے میکے میں بہنیں اپنے گھروں کی، بھائی سعودی عرب میں اور والدین ہیں نہیں تو بس وہاں بھی جانے کا اتفاق نہیں ہوتا۔"
"پہلے لڑکیاں شادی کے بعد جوائنٹ فیملی میں رہنا پسند کرتی تھیں، مگر آج کل کی لڑکیاں نہیں رہنا چاہتیں۔ یہ سوچ میں تبدیلی کیوں آئی؟"
"سوچ میں تبدیلی اس لیے آئی کہ سچی بات ہے، سسرال میں بہت مسئلے مسائل بھی ہوتے ہیں۔ ساس، نندیں ہوتی ہیں اور ساس زیادہ تر اپنی ہی بیٹی کی حمایت کرتی ہیں، بہو کے مقابلے میں...... میری چھوٹی بہن بتایا کرتی تھی کہ باجی' میری ساس بالکل میری سہیلی کی طرح ہے، لیکن جب میری نند آجاتی ہے تو پھر میرے لیے وقت گزارنا ایک عذاب ہو جاتا ہے۔ میری ساس کا موڈ خراب ہو جاتا ہے۔ پھر انہیں میرے دُھلے کپڑے اچھے نہیں لگتے۔ میرے ہاتھ کا پکا ہوا سالن نہیں اچھا لگتا۔ شاید اس وجہ سے بھی آج کل کی نسل علیحدہ رہنا پسند کرتی ہے۔"
"اصل میں ساس بہو کے ساتھ بیٹے کی شراکت نہیں برداشت کر سکتیں۔ اب جب آپ کے بیٹے کی شادی ہوگی اور بیٹا، بیوی کو زیادہ وقت دے گا تو آپ کو بھی فیل ہوگا؟"



"ہاں...... بالکل ہوگا...... میری ساس کہتی ہیں کہ میرا بیٹا جب لاہور سے یا ملتان سے آیا کرتا تھا تو میرے ساتھ بڑی باتیں کیا کرتا تھا، مگر اب نہیں کرتا...... اب ہم نزدیک آگئے ہیں، تو ملنا ملانا رہتا ہے، پہلے یہ چھٹیاں گزارنے آتے تھے تو ماں کو زیادہ ٹائم دیتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کے پاس ٹائم ہوتا تھا...... اور اگر میں پہلے والی ماں کا تجزیہ آج کی ماں سے کروں تو آج کی ماں ایک اچھی ماں ہے، چونکہ آج کی ماں پڑھی لکھی ہے، تو وہ سب باتوں کو سمجھتی ہے اور اچھی ساس ثابت ہوتی ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ آج کی ساس بالکل دوستوں کی طرح رہتی ہے۔ نوے فیصد ساسیں آج کی بہت اچھی ہیں۔"
"گھر بنانے کے لیے لڑکیوں کو بہت قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ ایسا ہے کیا؟"
"نہیں، میں نے ایسی کوئی قربانی نہیں دی، کیوں کہ شروع سے ہی علیحدہ رہی...... ہاں یہ ضرور ہے کہ...... میری ساس کہتی تھیں کہ اقبال بانو کے

پاس نوکرانی بھی ہے۔ ہم نے تو ساری زندگی نوکر ہی نہیں رکھے، جب کہ ان کے گھر میں بہنیں تھیں، تو ساری بہنیں مل جُل کر کام کرلیا کرتی تھیں اور چونکہ میں شروع سے ہی علیحدہ رہی تو میرے میاں نے مجھے نوکر رکھ دیا...... اور پھر چونکہ میں ان کی برادری کے باہر سے ہوں، تو یہ بھی بڑا ایشو تھا کہ ہماری لڑکیاں تو بہت کام کرتی ہیں اور چونکہ یہ باہر کی ہے تو یہ کام نہیں کرتی اور اسے نوکر رکھ کے دیا ہوا ہے" "فیض رسول" نے۔ ٹوکا ٹاکی والی باتیں تو سہی ہیں میں نے۔"

"آپ کے میاں کی فیملی زمین دار لوگ ہیں، تو کبھی ساس نے یا کسی نے کہا کہ گھر میں دیور جیٹھ ہیں بناؤ سنگھار نہ کیا کرو؟"

"مجھے بناؤ سنگھار کی عادت ہی نہیں ہے۔ بس ہلکی سی لپ اسٹک لگا لیتی تھی۔ اب تو یہ عادت بھی نہیں رہی ہے...... کیوں کہ یہاں کا ماحول ایسا ہے کہ کوئی میک اپ نہیں کرتا...... تو پھر میں کروں تو اچھا نہیں لگتا...... البتہ شام کو جب صاحب گھر آتے ہیں تو پھر میں لپ اسٹک لگا لیتی ہوں۔ وہ بھی کبھی کبھار۔"

"یہ بتائیں کہ فیض رسول صاحب سے شادی سے پہلے کیا ریلیشن تھے آپ کے؟"

"کوئی ریلیشن نہیں تھے۔ بس جاننے والے تھے اور آپ کو معلوم ہی ہے کہ پہلے میں نے اپنی بہنوں کی شادیاں کیں۔ میں گھر میں سب سے بڑی تھی اور میری خواہش تھی کہ میری بہنوں کی شادیاں ہو جائیں۔ بہنوں کے فرائض سے فارغ ہوئی تو میرا شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ کیوں کہ میں یہ ہی سوچتی تھی کہ ایک تو میں بڑی ہو گئی ہوں، پھر میں خود کماتی بھی ہوں تو کیا ضرورت ہے شادی کرنے کی...... اس زمانے میں میرے "ابو" سعودی عرب میں رہتے تھے...... تو اس وقت انہوں نے مجھے ایک جملہ کہا جو مجھے کبھی بھی نہیں بھولتا کہ "بی بی" (وہ مجھے پیار سے بی بی کہا کرتے تھے۔) دیکھو بیٹا میں ساری زندگی تمہارے ساتھ ہوں۔ لیکن اپنا گھر اپنا ہی ہوتا ہے۔ تم اپنا گھر بسا لو۔"

اور میرے ایک دوست ہیں ان کے کوئی جاننے والے ہیں، تو ان کے یہاں سے تمہارا رشتہ آیا ہے" تو میں نے کہا کہ "ٹھیک ہے، جیسے آپ مناسب سمجھیں اور یوں رشتہ ہو گیا۔"

"کوئی ملاقات ہوئی، یا شادی کے دن ہی دیکھا ایک دوسرے کو؟"

"نہیں ایسا نہیں ہے، میں نے دیکھا تھا کہ دیکھوں تو سہی بندہ کیسا ہے۔ یہ اس وقت بینک کی جاب کرتے تھے۔ ملتان کے زمین دار لوگوں کے رشتے آئے تھے، میری خواہش تھی کہ کوئی ایسا بندہ ہو جو جاب کرتا ہو اور ہر مہینے اس کے ہاتھ میں تنخواہ آتی ہو، یہ انتظار نہیں ہوتا کہ چھ مہینے کے بعد فصل کٹے گی تو پیسے آئیں گے، پھر ہم کپڑے بنائیں گے، پھر ہم فلاں کام کریں گے۔ بندہ ایسا ہو کہ بھلے کم تنخواہ ہو، مگر وہ ہر مہینے آئے اور اللہ نے میری یہ خواہش بھی پوری کر دی۔"

"شادی کے بعد کیسا محسوس کیا کہ اچھا ہوا میرا بھی گھر آباد ہو گیا، یا میں شادی نہ کرتی تو اچھا تھا؟"

"شادی کے بعد نئی زندگی اچھی لگی اور جب تقریباً سات آٹھ ماہ بعد والد صاحب کا انتقال ہو گیا، تب مجھے شدت سے احساس ہوا کہ میرے ابو کا فیصلہ بہت اچھا تھا...... ورنہ میں کہاں جاتی، کس کے پاس رہتی۔ بہنوں کی شادیاں ہوئیں تو ایک بہن بھی ایک ہفتہ میرے پاس رہ کر جاتی، کبھی دوسری بہن رہ کر جاتی، تو ان کے بھی مسائل تھے کہ بچے بھی ہو گئے۔ ان کے اپنے گھر کی ذمہ داریاں تھیں، تو کب تک وہ میرا ساتھ دیتیں۔"

"اور بھائی؟"

"جو میری امی سے ہے میرا بھائی، اس کا نام "محمد اعجاز" ہے اور تین بھائی میری سوتیلی ماں سے ہیں جو کہ چھوٹے ہیں اور سب کی شادیاں ہو گئیں اور میری نہ ہوئی ہوتی تو یقیناً میرے لیے مشکلات ہوتیں۔"

"میری امی کا انتقال 1992ء میں ہو گیا تھا۔ اور 1998ء میں میری شادی ہوئی اور چونکہ ہم زمین دار ٹائپ کے لوگ ہیں تو ابا کو شرم محسوس ہوتی تھی مجھ سے میری شادی کی بات کرتے ہوئے...... لیکن پھر انہوں نے ساری صورت حال کا جائزہ لیا تو بات کی اور یہ بھی کہا کہ تمہیں کوئی پسند ہو تو بتاؤ...... تو ظاہر ہے کہ ایسا کوئی سلسلہ نہیں تھا۔ تو میں نے ابو سے کہا کہ جیسے آپ کی مرضی۔"

"ملاقاتیں ہوتی تھیں، رومانٹک تھے؟"

"نہیں، نہیں...... کبھی کبھار فون پر بات ہو جاتی تھی، کبھی برتھ ڈے ہوتی تھی یا کوئی تہوار تو فون کر لیتے تھے۔ گفٹ بھی دے دیتے تھے اور رومانٹک بھی تھے اور اب بھی ہیں...... اور "ہم ابھی جوان ہیں، کوئی بوڑھے تو نہیں ہو گئے۔" (قہقہہ......)

"لکھاری زیادہ رومانٹک ہوتے ہیں؟"

ہنستے ہوئے...... "میرا سارا رومانس تو کتابوں تک ہی محدود تھا۔ دل میں بات رکھتی تھی اور میں اکثر کہتی تھی کہ "عطا اللہ عیسیٰ خیلوی" کے گانے سن کر محبت کرنے کو دل چاہتا ہے، تو میرا ابھی بھی بڑا دل چاہتا ہے، کوئی اچھا جملہ لکھنے کو، اچھی رومانٹک کہانی لکھنے کو۔"

"نکاح نامہ لڑکی کی زندگی کا ایک اہم سرٹیفکیٹ ہوتا ہے تو پڑھ کر دستخط کیے یا بس کر دیے؟"

"بے وقوفوں کی طرح پڑھے بغیر ہی میں نے دستخط کر دیے تھے۔ (قہقہہ) ابا جی نے کہا کہ یہاں دستخط کر دو...... میں نے کر دیے اور جہاں تک نام کی بات ہے تو شادی کے بعد کی دستاویزات میں ان کا نام ہے۔ عام زندگی میں تو میں پہلے بھی اقبال بانو تھی اور اب بھی اقبال بانو ہوں۔"



"نکاح کے وقت اور رخصتی کے وقت کیا احساسات تھے آپ کے؟"

"جب میرا نکاح ہوا تو میں بہت روئی، جبکہ پہلے میں ایسے ہی ایزی لے رہی تھی کہ شادی ہی تو ہو رہی ہے اور شادی تو سب کی ہوتی ہے۔ لیکن نکاح کے وقت اور رخصتی کے وقت بے اختیار رونا آیا...... اور جب سب بہن، بھائیوں اور ابو اور سوتیلی ماں نے رخصت کیا تو بس اس وقت کے احساسات کی تو کوئی زبان نہیں ہے۔"

"عروسی جوڑا کیسا تھا؟"

"شلوار قمیص بنوایا تھا...... کیوں کہ غرارے، شرارے کا مجھے شوق نہیں تھا۔ تو میں نے یہ سوچ کر شلوار قمیص بنوایا کہ بعد میں بھی پہن سکوں۔ سوٹ سادہ تھا، مگر دوپٹا کام والا تھا۔"

"سسرال والوں کو اس بات کا فخر تھا کہ ہماری بہو ایک معروف رائٹر ہے۔"

"میرے میاں کو فخر تھا اور ہے، مگر میرے سسرال میں کسی کو کوئی فخر نہیں تھا...... میرا چھوٹا دیور پڑھا لکھا ہے، اسے ضرور معلوم ہے کہ میں لکھتی ہوں، وہ اپنے دوستوں کو بھی بتاتا ہے، شعاع میں میرا ایک سلسلہ چھپا تھا۔ "اس گھر سے اس گھر تک۔" تو اس کو پڑھ کر میرے دیور کے دوستوں نے کہا کہ تمہاری بھابھی پڑھی لکھی ہیں؟ اسے اچھا لگتا تھا کہ بلکہ لگتا ہے کہ بھابھی معروف شخصیت ہے۔"

"جب سے ڈراما نگاری شروع کی ہے تو میاں صاحب کیا کہتے ہیں۔ حوصلہ افزائی کرتے ہیں؟"

"ہاں...... کیوں نہیں...... سب خوش ہوتے ہیں اور میرے میاں صاحب تو سب سے پہلے میرا ڈراما دیکھتے ہیں۔ میرا ڈراما جس دن آنا ہو وہ ریموٹ لے کر بیٹھ جاتے ہیں اور انتظار کرتے ہیں اور جب ڈراما شروع ہو جاتا ہے، تو آواز دیتے ہیں کہ "موٹو" آ جاؤ تمہارا ڈراما شروع ہو گیا ہے۔"

"موٹو" اچھا ایک فنی سوال کہ آپ نے کوشش نہیں کی یا دبلی ہوتی ہی نہیں۔"

"موٹاپا ہمارا خاندانی ہے۔ جس کا زیادہ اثر مجھ پر ہوا ہے۔ کوشش کرتی ہوں اور وزن کم بھی ہو جاتا ہے، مگر جب کوشش چھوڑ دیتی ہوں تو پھر چڑھ جاتا ہے موٹاپا...... اب تو کوشش کرنا چھوڑ دی ہے...... ہاں میرے بیٹے کو کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے تو کہتا ہے ماں تھوڑی دبلی ہو جائیں...... تو میں بھی ہنستے ہنستے کہتی ہوں کہ اگر ماں قبول کرنی ہے تو ایسے ہی کرلو۔"

"شادی کے بعد لڑکیاں روٹھ روٹھ کر میکے جا رہی ہوتی ہیں۔ جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں۔ طلاقیں ہو رہی ہوتی ہیں۔ خلع مانگی جا رہی ہوتی ہے تو ایسا کیوں ہوتا ہے؟"

"اصل بات یہ ہے کہ آج کی نوجوان نسل اور خاص طور پر لڑکیوں میں برداشت نہیں ہے۔ اس لیے طلاق کا ریشو بڑھ گیا ہے۔ اگر لڑکی پیار و محبت اور درگزر کے ساتھ رہے تو کبھی بھی، گھر نہیں ٹوٹتے اور یہ روز، روز روٹھ کے میکے جانا مجھے تو قطعی پسند نہیں ہے۔ کوئی لڑائی جھگڑا ہے تو اپنے گھر میں بیٹھ کر حل کرو اپنے ماں، باپ کو کیوں تکلیف پہنچاتے ہو...... کہ ساس نے یہ کہہ دیا۔ سسر نے یہ کہہ دیا۔ بھئی آپ بھی تو کچھ کہتی ہوں گی، جب ہی تو نوبت لڑائی تک آئی ہے۔ اگر گھر کی بڑی ماں کہہ دیں کہ یہ برتن یہاں اچھا نہیں لگ رہا اور تم کہو کہ نہیں یہاں پر ہی اچھا لگ رہا ہے تو جھگڑا تو بڑھے گا...... ماں نے (ساس) نے جو کہا مان لو، میاں نے جو کہا مان لو...... تو پھر جھگڑے کیسے بڑھیں گے۔"

"امور خانہ داری شادی کے بعد آئی یا پہلے سے ہی سگھڑ تھیں؟"

"شادی سے پہلے مجھے کچھ بھی نہیں آتا تھا اور شادی کے بعد جب پہلی بار پراٹھا بنایا تو بالکل بھی صحیح نہیں بنا اور ہمارے یہاں دیسی گھی کے پراٹھے بنتے تھے۔ تو خیر بڑی مشکل سے بنایا، مگر بن گیا اور کھانا میں بہت اچھا بنا لیتی ہوں، میرے ہاتھ میں ذائقہ ہے، شادی سے پہلے تو چائے بھی بنانا نہیں آتی تھی...... اور اب تو بے شک پچاس بندے آ جائیں میں ان کا کھانا بنا لیتی ہوں۔"

"میاں صاحب کو آپ کس نام سے اور وہ آپ کس نام سے بلاتے ہیں؟"

"میں تو "ملک" صاحب ہی کہتی ہوں، اور وہ مجھے شروع سے ہی "موٹو" کہتے ہیں...... اور مجھے ان کا اس طرح بلانا اچھا لگتا ہے۔"

"جن بچوں کی، بچیوں کی شادی نہیں ہوئی ان کے لیے کچھ کہنا چاہیں گی؟"

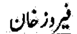
"جن کی شادیاں نہیں ہوئیں، انہیں چاہیے، انتظار کریں اچھے رشتے کا۔ اپنے لیے دعا کریں اور یہ بھی دعا کریں کہ شادی کے بعد جن لوگوں سے ہمارا واسطہ پڑے، وہ بہت اچھے لوگ ہوں اور آپ کے لیے باعث رحمت اور خوشیوں سے بھرپور ہوں...... اور سب سے بڑی بات یہ کہ جہاں بھی جاؤ، اپنی "میں" کو مار دو، کیوں کہ اپنی "میں" کو مارو گی تو گھر بہت اچھے طریقے سے چلے گا اور اپنے ساس، سسر کی خدمت ضرور کرو۔ میں بھی کرتی ہوں اور کرنی چاہیے۔ آپ خود سوچو کہ شوہر کی شکل میں انہوں نے اپنا بیٹا، اپنا جگر آپ کو دیا ہے۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے اقبال بانو سے اجازت چاہی۔ اس شکریہ کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں وقت دیا۔"

☆

دستک دستک دستک

شمائلہ رشید



"کیا حال ہے؟"

"اللہ کا شکر ہے۔"

"ماشاء اللہ جب بھی اسکرین پہ آئے ایک جان دار رول کے ساتھ آئے۔ "خانی" میں بہت پسند کیے جا رہے ہو۔"

"جی بہت شکریہ...... آپا آپ ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔"

"تم کام ہی بہت اچھا کرتے ہو...... ثناء جاوید کے ساتھ تمہارا یہ پہلا سیریل ہے؟"

"جی...... جی...... لیکن ثناء سے میری بہت اچھی دوستی ہے۔ اس لیے اس کے ساتھ کام کرنے میں مزا آ رہا ہے۔"

"دوستی کی وجہ سے ایک دوسرے پہ تنقید بھی نہیں کر سکتے ہو گے کہ یہ سین ٹھیک نہیں ہوا۔ وہ ٹھیک نہیں ہوا۔"

"نہیں، ایسا نہیں ہے۔ دوستی ایک طرف اور کام ایک طرف۔ ویسے ہم انڈراسٹینڈنگ کے ساتھ ہی کام کرتے ہیں۔"

"اس سیریل کی اب کافی اقساط ہو گئی ہیں۔ کیا فیڈ بیک آ رہا ہے؟"

"جی...... بہت اچھا...... اور میں چاہوں گا کہ لوگ اس سیریل کو دیکھ کر ہمیں مزید بھی بتائیں کہ ہم نے کہاں اچھا۔ بہت اچھا اور کہاں بہت برا کام کیا۔"

"جو لوگ ابھی تک اسے دیکھ نہیں پائے ہیں، ان کو اس کے بارے میں کچھ بتاؤ؟"

"خانی درحقیقت ایک لو اسٹوری ہے اور خالصتاً اپنوں سے پیار و محبت کی کہانی ہے۔ اس میں کئی ایسے موڑ آتے ہیں جو خواتین کی زندگی سے ریلیٹڈ ہیں جو خواتین کی حوصلہ افزائی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔"

"رائٹر اور ڈائریکٹر کے بارے میں کچھ کہیں؟"

"جی بالکل...... انجم شہزاد ایک بہترین ڈائریکٹر ہیں اور ان کے پہلے بھی کئی سیریلز بہت شہرت پا چکے ہیں اور اس سیریل میں انہوں نے جس انداز میں ہم سے کام لیا ہے۔ اس کی جتنی بھی تعریف

کی جائے کم ہے اور رائٹر ''اسماء نبیل'' ہیں اور ان کی تحریر اچھی ہے تو کام کرنے کا مزا آرہا ہے۔ ورنہ جب تک ڈائیلاگ جان دار نہ ہوں کام کرنے کا مزا نہیں آتا۔''

''گڈ...... اور آنے والی سیریلز کے بارے میں کچھ بتاؤ۔''

''ابھی کچھ نہیں بتا سکتا۔ کیوں کہ آپ کو معلوم ہے کہ میں کام کے معاملے میں بہت چوزی ہوں۔ کوئی بہت اچھا پروجیکٹ ہو تو لیتا ہوں ورنہ نہیں...... اور سال میں ایک یا دو ہی سیریل کرتا ہوں۔''

''فلمیں بھی کررہے ہو؟''

''جی الحمد للہ...... وہ سلسلہ بھی جاری ہے اور ان شاء اللہ جاری رہے گا۔''

''اوکے...... ان شاء اللہ پھر بات کریں گے۔''

ثنا جاوید

''ڈرا یاد کر'' کے بعد کافی گیپ سے آئیں، وجہ؟''

''وجہ کوئی خاص نہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ درمیان میں ایک فلم بھی کی، پھر میں اچھے رول کے انتظار میں تھی...... کیوں کہ عام رول تو بہت ملتے ہیں...... مگر میں چاہتی ہوں کہ ایسا رول کروں جو بہت عرصے تک یاد رہے اور الحمد للہ مجھے ایسا ہی رول ملا۔''



''اس رول کے لیے آپ کا انتخاب کیسے ہوا؟''

''اب یہ تو نہیں معلوم...... بس مجھے تو یہ معلوم ہے کہ ''عبداللہ کادوانی'' صاحب نے مجھے یہ رول آفر کیا۔ ایک تو عبداللہ کادوانی صاحب کا نام، سیونتھ اسکائی کا بڑا نام...... پھر جب رول پڑھا تو اچھا لگا۔ اس لیے میں نے آفر کو قبول کیا اور اب آپ سب ناظرین فیصلہ کریں گے کہ میں کیسا پرفارم کررہی ہوں۔''

''آپ کی پرفارمنس پہ تو سب فدا ہیں...... اس میں آپ کا نام ''خانی'' ہے۔ یہ بھلا کیا نام ہوا؟''

''اصل میں میرے کردار کا نام ''صنم خان'' ہے اور سب مجھے پیار سے خانی بلاتے ہیں...... تو اس لیے سیریل کا نام بھی خانی ہے۔''

''اس میں اپنے کردار کے بارے میں کچھ بتاؤ؟''

''جیسا کہ پہلی اور پھر خاص طور پر دوسری قسط سے آپ کو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ کہانی کیا ہے اور میرا رول کیا ہوسکتا ہے۔ ایک لڑکی ہونے کی وجہ سے لوگوں کا خیال ہوگا کہ میں کوئی کمزور اور رونی دھوتی لڑکی کا کردار ادا کروں گی...... مگر ایسا نہیں ہے۔ اس میں، میں ایک بہادر لڑکی کا رول کررہی ہوں جو اپنے حقوق اور اپنے بھائی کی موت کا بدلہ لینے کی جنگ لڑتی ہے۔

یہ سیریل سنجیدہ بھی ہے اور زندگی کے دیگر رنگ بھی ہیں، یعنی رومانس بھی ہے۔''

''فیروز خان کے ساتھ آپ کا یہ پہلا سیریل ہے۔ کچھ کہیں گی ان کے بارے میں؟''

''جی...... میرا ان کے ساتھ پہلا سیریل ہے اور فیروز خان ایک اچھے آرٹسٹ ہیں۔ ویسے بھی میری ان کے ساتھ دوستی ہے تو کام کرکے اچھا لگ رہا ہے۔''

''اس سیریل کے بعد بھی گیپ دینے کا ارادہ ہے۔ یا کوئی اور سیریل بھی سیٹ پہ ہے؟''

''یہ میں ابھی نہیں بتاؤں گی کہ کوئی سیریل سیٹ پہ ہے یا نہیں...... لیکن میرا خیال ہے کہ گیپ لمبا نہیں ہوگا...... اور اگر مجھے میری پسند کا کردار مل گیا تو لیں کرنے میں دیر نہیں لگاؤں گی۔''

''بہت شکریہ ثناء بات کرنے کا...... ان شاء اللہ پھر بھی بات ہوگی۔''

''ان شاء اللہ۔''

سعدیہ خان

سعدیہ خان کو آپ آج کل ''شاید'' سیریل میں دیکھ رہے ہیں۔ اس حوالے سے ان سے بات ہوئی، انہوں نے کہا۔

''یہ ایک لو اسٹوری اور وہ اس میں لیڈ رول کررہی ہیں۔''

''جی...... وہ تو ہم دیکھ ہی رہے ہیں اور ماشاءاللہ آپ بہت پیاری بھی لگ رہی ہیں۔ کچھ تفصیل بتائیں اپنے رول کی؟''

''جی...... ڈرامے میں میرا نام ام ہانی ہے اور سب مجھے ہانی کے نام سے پکارتے ہیں۔ اس میں میرا لیڈ رول ہے اور میں ایک یتیم لڑکی کا رول کررہی ہوں اور ام ہانی کی زندگی میں دو لوگ آتے ہیں، ایک تو وہ کہ جن کے گھر میں یہ رہتی ہے اور دوسرا شاہد جو گاؤں میں ڈپٹی کمشنر بن کے آتا ہے۔ یعنی دو ہیرو ہیں۔ ایک نعمان اعجاز اور دوسرا عذیر جیسوال...... اور ام ہانی نے چونکہ زندگی میں بہت محرومیاں دیکھی ہیں، اس لیے وہ اچھی زندگی گزارنے کی خواہاں ہے۔''



''اب تک آپ نے جتنے بھی ڈرامے کیے' بہت مقبول ہوئے۔ اس کے بارے میں کیا کہیں گی؟''

''مجھے اپنے اس سیریل سے بھی بہت سی امیدیں وابستہ ہیں اور ابھی تک تو اس کا فیڈ بیک بہت اچھا آ رہا ہے اور امید ہے کہ مزید بھی اچھا آئے گا۔''

''تحریر اور ہدایت کاری کس کی ہے؟''

''فائزہ افتخار کی تحریر ہے اور وہ ایک بہترین رائٹر ہیں۔ اس کے ڈائریکٹر اسامہ ہیں اور وہ بھی بہترین ڈائریکٹر ہیں۔''

''اسامہ یعنی ''سید علی رضا'' کی بات کر رہی ہیں اور ان کی ہدایت کاری میں کام کرنے کا مزا آیا؟''

''جی...... جی بہت...... پوری ٹیم کے ساتھ کام کر کے اچھا لگ رہا ہے۔ نعمان اعجاز ایک بہترین فن کار ہیں اور سینئر بھی ہیں، ان سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ وہ جتنے بڑے فن کار ہیں، اتنے ہی بڑے اچھے انسان بھی ہیں۔ دوران شوٹس گھر جیسا ماحول رہا اور ہم سب نے یعنی پوری ٹیم نے بہت انجوائے کیا۔''

''مزید کوئی پروجیکٹ؟''

''ابھی نہیں بتاؤں گی...... کیوں کہ پھر مزا نہیں آتا۔ جب اچانک لوگوں کو پتا چلتا ہے تو وہ خوش ہوتے ہیں۔''

''گھر والے پسند کرتے ہیں آپ کی پرفارمنس کو؟''

''جی...... اب تو بہت پسند کرتے ہیں اور میرے ڈرامے شوق سے دیکھتے ہیں۔ البتہ جب میں نے اس فیلڈ میں قدم رکھا تھا تو گھر والوں نے تھوڑی ناراضی کا اظہار کیا تھا کہ اس فیلڈ کے بارے میں بہت کچھ سنا ہوا ہے۔ تو کوئی مسئلہ نہ ہو...... لیکن جب میری خوداعتمادی دیکھی اور خود جائزہ لیا تو پھر مطمئن ہو گئے اور پھر انہیں یہ بھی اندازہ ہوا کہ فیلڈ بری نہیں ہوتی، انسان خود برا ہوتا ہے۔''

''گھر میں آپ سب سے چھوٹی بھی ہیں نا...... اس لیے سب نے بات مان لی ہو گی؟''

''آپ نے بالکل صحیح اندازہ لگایا۔ مجھ سے بڑی ایک بہن اور ایک بھائی ہیں اور والدہ حیات نہیں ہیں۔ والد حیات ہیں۔ اللہ انہیں لمبی زندگی دے۔ اس لیے بھی کہ امی کا سایہ میرے سر پر نہیں ہے۔ دونوں بڑے بہن، بھائی اور والد صاحب میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ میرے لاڈ اٹھاتے ہیں اور میری ہر بات مانتے ہیں۔''

''آپ کی کامیابی اور عزت و شہرت دیکھ کر کسی اور کو بھی خیال آیا کہ اس فیلڈ میں آنا چاہیے؟''

''ارے نہیں...... پہلے بھی کوئی اس فیلڈ میں نہیں تھا اور نہ ہی مجھے دیکھ کر کسی کو شوق ہوا۔ بس میں ہی شوقین نکلی اور اللہ نے مجھے کامیابی بھی دی۔ خواہ ماڈلنگ ہو۔ کمرشلز ہوں۔ میگزین شوٹس ہوں یا پھر ٹی وی پہ اداکاری......''

پھر بات ہو گی سعدیہ آپ سے......''

''جی ٹھیک ہے جی...... اپنا خیال رکھیے گا۔''

☆

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے

ا۔ب۔ج

س۔ شادی کب ہوئی؟

ج۔ میری شادی 1992ء میں ہوئی۔

س۔ شادی سے پہلے کیا مشاغل تھے؟

ج۔ شادی سے پہلے پڑھاکو قسم کی لڑکی تھی۔ ''شعاع'' اور ''خواتین ڈائجسٹ'' کی مستقل قاری تھی۔ رضیہ بٹ کے تقریباً تمام ناولز پڑھ لیے تھے۔ پی ٹی وی ڈرامے دیکھنا بھی بہت اچھا لگتا تھا۔ ایم اے انگلش کرنا چاہتی تھی۔ مگر والدین نے ایڈمیشن نہ لینے دیا۔ بی اے کرنے کے ایک سال بعد شادی کر دی۔

س۔ رشتے میں مرضی؟

ج۔ اس میں میری کوئی مرضی نہیں تھی۔ اصل میں اور میری دوستیں سب پڑھاکو تھیں۔ اس وقت زمانہ بھی اتنا تیز نہیں تھا۔ اس لیے اپنی پسند کوئی بھی نہیں تھی۔ مگر دل میں اک خواب تھا کہ کوئی اچھا سا ہیرو ٹائپ بندہ زندگی کا ساتھی بنے۔ مگر ایسا نہیں ہو سکا۔

س۔ جیون ساتھی کے حوالے سے تصور؟

ج۔ ناولز پڑھ پڑھ کر یہی خیال آتا تھا، کہ بہت کیئرنگ' ڈیشنگ اور ذہین بندہ ہونا چاہیے۔ مگر حقیقت ہمیشہ تلخ ہوتی ہے۔ اس لیے یہ خواب پورا نہیں ہوا۔ میں بتاتی چلوں کہ میرے میاں مجھ سے تقریباً سولہ سال بڑے ہیں۔

س۔ منگنی کتنا عرصہ رہی؟

ج۔ شادی سے پہلے میرے میاں جرمنی میں تھے۔ اس لیے بس میرے والدین نے فون پر رشتہ طے کر دیا۔ میرے میاں کی والدہ حیات نہیں تھیں۔ ان کی بھابھی نے یہ سارا معاملہ طے کروایا۔ میں نے شادی سے پہلے ان کی کوئی تصویر بھی نہیں دیکھی تھی۔

س۔ شادی کے لیے کوئی قربانی؟

ج۔ میرے والد صاحب سرکاری ملازم تھے۔ ہمارا گھر درمیانے طبقے کا خوش حال گھرانہ تھا۔ جہاں ہر طرف اللہ کا شکر تھا۔

مگر سسرال میں میری جٹھانی (جنہوں نے میری شادی کروائی تھی) ان پڑھ تھی۔ اس لیے ماحول بالکل پینڈو تھا۔ بہت دل مار کر گزارہ کیا۔ میں گانے سنتی تھی۔ اس پر بھی پابندی لگی۔ فلمیں دیکھنا بھی بند کر دیا۔ باوجود اس کے کہ میں پانچ نمازیں باقاعدگی سے پڑھتی تھی۔ بہرحال دوپہر کو اگر ٹائم ملتا تو اخبار جہاں پڑھتی تھی۔ مگر سسرال والوں نے کہا کہ یہ شاعری کرتی ہے۔ وہ بھی چھوڑ دیا۔

آپ یقین کریں گی۔ کہ میں نے شادی سے پہلے ''دل دیا دہلیز'' سارا شعاع میں پڑھا تھا۔ میرے پاس پانچ سالوں کے تمام رسالے تھے۔ مگر میرا ایسا دل ٹوٹا کہ سب کچھ ردی میں دے دیا۔

شادی کے ایک سال بعد میری بڑی بیٹی پیدا ہوئی۔ تو میں نے اپنا ہر شوق ختم کر دیا۔ اس کی بہتر انداز سے پرورش کی۔ ساڑھے سات سال کی عمر میں میں نے اپنی بچی کو قرآن پاک ناظرہ کی تعلیم دلوائی۔ تقریباً بیس سال تک میں نے اپنے ہر شوق پر پابندی لگائی تھی۔

میری دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ بس اپنا سارا وقت ان بچوں کی تربیت میں گزارا ہے۔ تینوں بچوں نے ناظرہ قرآن پاک پڑھا ہے۔ بڑی بیٹی نے انگلش میں بی ایس کیا ہے۔ چھوٹی بیٹی سائیکالوجی بی ایس کے سیکنڈ سمسٹر میں ہے۔ بیٹے نے میٹرک کیا ہے۔

بتاتی چلوں میرے بیٹے نے میٹرک میں (1061) نمبر حاصل کیے ہیں۔ شادی کے شروع میں حالات بہت خراب تھے۔ میاں صاحب جرمنی سے بغیر ویزے کے آئے تھے۔ زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے۔ بہت دھکے کھائے آمدنی کم تھی۔ مگر ان کی ساکھ کو قائم

رکھنے کے لیے میں نے اپنا سارا زیور بھی آہستہ آہستہ بیچ دیا تاکہ ان کو کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے۔ غرض یہ کہ اپنا آپ ختم کردیا۔
مگر شکر ہے اللہ نے بچوں کی شکل میں بہترین ثمر عطا کیا۔

س ۔ رسموں کے لین دین پر جھگڑا؟
ج ۔ کوئی خاص ۔ جھگڑا نہیں ہوا۔
س ۔ شادی کے بعد شوہر نے دیکھ کر کیا کہا؟
ج ۔ کچھ بھی نہیں کہا۔ ان کا کہنا ہے کہ میں Express (ظاہر) نہیں کرتا۔ شادی کو 25 سال ہوگئے ہیں مگر تعریف نہیں کی۔
(یہ دوسری بات ہے کہ سارا زمانہ تعریف کرتا ہے۔)
س ۔ کتنے عرصے بعد کام سنبھالا؟
ج ۔ بہت جلدی شاید ایک ہفتہ کام نہ کیا ہو مگر اس کے بعد کام میں جت گئی۔
سسرال والا گھر بہت گندا تھا۔ ان کا فریج ' کچن ' باتھ روم سب جگہ گندگی تھی۔ پہلے تو فریج کو صاف کیا۔ پھر کچن کی تمام شلفوں پر اخبار بچھائے۔ آلو ' پیاز والی ٹوکری کو صاف کیا۔ گھر کی تفصیل سے ڈسٹنگ کو سنبھالا۔ باتھ روم کے ٹب اور صابن دانیوں کو چمکایا۔
پھر سبزی بنانے میں مدد کرنے لگی۔ شام کی چائے بنانے کی ذمہ داری لی۔ میری جٹھانی گندے برتن دیسے ہی چھوڑ دیتی تھی۔ جو مجھے بہت برے لگتے تھے۔ ان کو صاف کرکے رکھتی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ ہانڈی روٹی کی ذمہ داری سے لی۔
س ۔ شادی کے بعد کوئی خاص تبدیلی؟
ج ۔ تبدیلی یہی آئی کہ اپنی ذات کو منفی کرلیا۔ اور بچوں کی تربیت کی۔ اپنے سارے شوق ختم کردیے۔
20 سالوں بعد میری ایک دوست نے مجھے ایک ناول دیا تو پرانی چنگاری پھر بھڑک اٹھی۔ اس لیے اب میں دوبارہ "شعاع" اور "خواتین ڈائجسٹ" پڑھتی ہوں۔ اور خوش ہوتی ہوں۔

س ۔ میکے اور سسرال کے ذائقے میں فرق؟
ج ۔ سسرال والے صبح صبح دکان سے پاپے منگا کر چائے کے ساتھ کھاتے تھے۔ اور ہمارے ہاں بیکری سے اچھا سامان آتا تھا۔ میری امی سب کھانے بہت لذیذ بناتی تھیں۔ مگر سسرال میں ایسا نہیں تھا پھر بھی شکر ہے۔ جو بنتا تھا کھالیتی تھی۔
س ۔ سسرال میں کن باتوں پر تعریف ہوئی اور کن پر تنقید؟
ج ۔ تعریف کسی نے نہیں کی۔ میرے میاں نے بھی نہیں۔ میری میٹرک ' ایف اے اور بی اے میں بھی فرسٹ ڈویژن تھی۔
مگر کسی نے میری تعلیم کو نہیں سراہا۔ الٹا میرے رسالے پڑھنے کو شاعری سے تشبیہ دی۔ میں نے پہلے بھی بتایا کہ میں نے اپنے سارے شوق اس تنقید کی وجہ سے چھوڑ دیے تھے۔
بس گھر داری میں الجھ گئی۔ مگر اتنی جان مارنے کے باوجود بھی تعریف کے دو بول نہیں ملے۔
س ۔ سسرال سے وابستہ توقعات کس حد تک پوری ہوئیں؟
ج ۔ میری کوئی توقع پوری نہیں ہوئی۔ وہ لوگ تعلیم کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ اس لیے میری ان سے کوئی ذہنی ہم آہنگی نہیں ہوسکی۔
س ۔ پہلے بچے کی پیدائش؟
ج ۔ میری بڑی بیٹی کی پیدائش میری والدہ کے گھر پر ہوئی۔ میری امی بہت خوش تھیں۔ انہوں نے میرا بہت ساتھ دیا اور ابھی تک دے رہی ہیں۔ میں نے اپنی بیٹی اور دوسرے بچوں کو بھی بہت مشکل سے پالا ہے۔ آمدنی کم تھی ' اخراجات زیادہ تھے۔ پھر بھی بہت مشکلوں سے اچھی تعلیم دلوائی ہے۔ اللہ سے یہی دعا ہے کہ اللہ میرے بچوں کو مزید کامیابیاں عطا کرے (آمین)۔

بقیہ صفحہ نمبر 281

بیسویں قسط



عفت سحر طاہر

خوشبوئے تشنگی کا

یہ جو میں ہوں ذرا سا باقی ہوں
وہ جو تم تھے وہ مر گئے مجھ میں

میرے اندر تھی ایسی تاریکی
آ کے آسیب ڈر گئے مجھ میں

میں نے چاہا تھا زخم بھر جائیں
زخم ہی زخم بھر گئے مجھ میں

پہلے اترا میں دل کے دریا میں
پھر سمندر اتر گئے مجھ میں

کیسا خاکہ بنا دیا مجھ کو
کون سا رنگ بھر گئے مجھ میں

میں وہ پل تھا جو کھا گیا صدیاں
سب زمانے گزر گئے مجھ میں

بن کے دن یوں وہ سامنے آئے
اور پھر رات کر گئے مجھ میں

رات تو ادھوری نہ رہی مگر ان کی بات ادھوری رہ گئی مہر ماہ کے موبائل کی بیٹری ڈاون ہوگئی تب بھی وہ ایک ٹرانس کی کیفیت میں موبائل کان سے لگائے بیٹھی رہی.... ابھی تو اس میں سے ایک بہت درد بھرا ماضی کی آہوں اور سسکیوں میں لپٹا لہجہ سنائی دے رہا تھا. اور مہر ماہ، آفندی ہاؤس والوں کی بے حسی اور ان کے تکبر کے بارے سن سن کر بے یقین ہوتی رہی.

وقار آفندی کی محبت اور اس محبت کو

جانے کا انداز اسے بہت بھایا۔ مگر آفندی ہاؤس والوں کی بے حسی نے دل مٹھی میں کر لیا۔ زرنگار کی بے بسی اس پر پوری طرح آشکار ہو گئی۔ اسے افسوس ہوا۔ ساری عمر وہ لوگ بڑوں کی سنائی کہانی پر اعتبار کر کے زرنگار کو ایک امیر زادے کو پھانسنے والی طوائف ہی سمجھتے رہے۔۔۔۔

"ہیلو...." وہ دفعتاً چونک کر بے اختیار اسے پکار اٹھی "نمیر...." اس نے موبائل کی اسکرین پر ہاتھ لگایا تو وہ بے جان ہی رہی... سیاہ اور تاریک۔

"شٹ..." وہ شدید جھنجلاہٹ کا شکار ہوئی.... موبائل بستر پر پرے سرکا دیا. ذہن میں سیاہ تاریک رات کا وہ آخری منظر گویا ثبت ہو گیا تھا جو نمیر نے بتایا تھا۔

تو کیا واقعی وہ اس داستان میں بے گناہ ثابت ہونے والا تھا؟

مہر ماہ کا ذہن لحہ بھر کو ٹھٹکا.... مگر اگلے ہی پل نارسائی کا شدید دکھ اس کے حواس پر حاوی ہونے لگا.

"بالکل ٹھیک ہوا تمہارے ساتھ. اسی قابل تھے تم نمیر آفندی... میری زندگی کی خوشیاں' میرے خواب اجاڑے ہیں تم نے. تم کسی بھی طور قابل معافی نہیں ہو سکتے۔" وہ درشتی سے سوچتے ہوئے اپنی جگہ لیٹ گئی زرنگار کب کی سو چکی تھیں. وہ بھی الٹی سیدھی سوچوں میں ابھی نہ جانے کب نیند کی وادی میں اتر گئی۔ ذہن سوتے ہوئے بھی ایک سنسناہٹ کا شکار تھا۔

بڑوں کی سنائی ہر کہانی سچی نہیں ہوا کرتی۔ سچ جھوٹ کا فیصلہ انسان کو خود جانچ پرکھ کر کرنا چاہیے۔

"تم مل سکتے ہو مجھے۔۔۔؟"

میٹنگ کے دوران آنے والی یہ کال عزت مآب مہر ماہ آفندی کی تھی۔

اس کی کمپنی کے پروڈکشن مینیجر کھڑے ہو کر میٹنگ کے اراکین کو آنے والے سال کی پالیسیز کے متعلق بریفنگ دے رہے تھے۔ جب سائلنٹ پڑے موبائل کی تھرتھراہٹ نے موحد کو متوجہ کیا' دوران میٹنگ وہ کال اٹینڈ کرنے کے سخت خلاف تھا مگر مہر ماہ کے نام پر نظر پڑی تو وہ رہ نہ سکا تھا۔ موبائل اٹھا کر کال اٹینڈ کی تو سب سے پہلا سوال یہی اس کے کان سے ٹکرایا۔

"ایکسکیوزمی۔۔۔" وہ کان سے موبائل ہٹا کر معذرت کرتا میٹنگ روم سے باہر کوریڈور میں نکل آیا۔

"ہاں اب بولو۔۔۔ کیا کہہ رہی تھیں؟"

"کیا تم مجھے مل سکتے ہو موحد؟" وہ الجھی ہوئی سی لگ رہی تھی۔ موحد کی مسکراہٹ بے ساختہ تھی' برجستہ بولا۔

"سنا ہے اللہ سے دعا کرو تو سب کچھ مل جاتا ہے۔۔۔"

مسکراتا ہوا لہجہ مہرو کی سماعت سے ٹکرایا تو اپنا سوال اور اس کا جواب سمجھ میں آ گیا' وہ بھنا اٹھی۔

"شادی شدہ ہوں میں۔ سمجھے تم۔"

"سمجھتا ہوں مگر میں نے تو بس تمہارے سوال کا جواب دیا ہے۔" وہ معصوم بنا۔

"فضول باتیں مت کرو موحد۔۔۔ ابھی اسی وقت ملنا ہے تم سے' بتاؤ کہاں آؤں؟"

"ایسی بھی کیا ایمرجنسی ہو گئی ہے؟" وہ درحقیقت حیران ہوا۔

"وہ ملنے پر بتاؤں گی۔"

"بس میٹنگ ختم ہونی ہے تو گھر آ رہا ہوں میں۔ پھر بات کرتے ہیں۔"

"اوفوہ۔۔۔" وہ جھنجلائی۔ "گھر پہ نہیں ابھی اسی وقت۔ مل سکتے ہو تو بتاؤ ورنہ میں کسی اور سے مشورہ کر لوں۔"

"فل بیلڈ ماحول سے نکل کر ایک انتہائی اہم میٹنگ چھوڑ کر سرد کوریڈور میں کھڑا ہوں تمہاری اس کال کے لیے اور محترمہ کے مزاج ہی نہیں مل رہے۔" جتا کر کہا تو وہ قدرے نرم پڑی۔

"کتنا وقت لگے گا اس میٹنگ کو ختم ہونے میں؟"

"بس ایک آدھ گھنٹہ۔۔۔"

"او کے۔ میں تمہارا ویٹ کر لوں گی۔" کال ختم ہو گئی۔ موحد نے گہری سانس بھرتے ہوئے موبائل کان سے ہٹا کر سوچنا چاہا کہ مہر ماہ کو اتنی ایمرجنسی میں کیا بات کرنے کی ضرورت پیش آ سکتی ہے مگر اسے خود سے کوئی جواب نہ ملا تو وہ شانے جھٹکتا میٹنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔ ورکرز کے متعلق مسائل سنتے اور ان کے حل کے متعلق تجاویز دیتے اور سنتے اسے ایک گھنٹے سے اوپر ہی ہو گیا تب کہیں جا کر میٹنگ برخاست ہوئی۔ وہ مینیجر کے ساتھ ہی بات کرتے ہوئے باہر نکلا تو اپنے آفس کے چپراسی کو کھڑے دیکھ کر بات وہیں چھوڑ دی۔ مینیجر کو رخصت کیا اور چپراسی کی طرف مڑا۔

کیا بات ہے۔ تم یہاں کیوں ہو؟"

"وہ۔۔۔ سر جی ایک بی بی آپ کے کمرے میں آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔ آدھا گھنٹہ ہو گیا ہے۔ بار بار کہتی ہیں کہ آپ کو بلا کر لاؤں۔" وہ جھجک آمیز بے بسی سے بولا تو موحد کی آنکھوں میں حیرت اتر آئی۔

"کس کو آفس میں بٹھا آئے ہو نواز! وہ بھی بنا اجازت کے۔" وہ لمبے ڈگ بھرتا لفٹ کی طرف بڑھا۔ دو منزلہ عمارت میں میٹنگ روم گراؤنڈ فلور پر تھا جبکہ موحد کا آفس اوپر تھا۔

"وہ زبردستی گھس گئیں۔ آپ کا نام لیا' کہتی ہیں رشتہ دار ہوں صاحب کی۔" شرمندہ اور گھبرائے ہوئے لہجے میں کہتے نواز نے اس کے پیچھے لفٹ میں داخل ہو کر لفٹ کا بٹن دبایا۔ لفٹ تیزی سے اوپر کی طرف بڑھی۔ موحد کی پیشانی پر شکن تھی۔ پیون کو مناسب لفظوں میں آئندہ کے لیے سختی سے تنبیہہ کر کے وہ لفٹ کا دروازہ کھلتے ہی آفس کی طرف بڑھا۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر بھی سیاہ اسکارف میں لپٹے سر نے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی زحمت نہیں کی تو وہ حیران ہوتا کھنکھارتے ہوئے آگے بڑھا۔ اپنی سیٹ کی طرف بڑھتے اس نے گہری نظر مطمئن سے انداز میں کرسی میں دھنسی شخصیت پر ڈالی تو لحہ بھر کو تھم کر رہ گیا۔

"آئی۔۔ کانٹ۔۔۔ بلیو۔۔۔" وہ رک رک کر کہتا اپنی کرسی پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھا تو مہر ماہ نے تنک کر کہا۔

"کہا تو تھا ابھی ملنا ہے تم سے۔"

"میں کون سا رات گئے باہر آوارہ گردی کرنے کے بعد آتا۔۔۔ گھر آ کر بھی بات ہو سکتی تھی۔" انٹرکام اٹھاتا وہ تادیبی انداز میں بولا پھر پی اے کو کسی اور کو آدھے گھنٹے تک اندر نہ بھیجنے کی ہدایت کی۔ تب تک مہر ماہ نے گویا بہ مشکل ضبط کیا۔

"کچھ باتیں فوری طور پر کرنے والی ہوتی ہیں مسٹر موحد۔ اتنا صبر مجھ میں نہیں ہے کہ شام کا ویٹ کرتی. آدھے گھنٹے سے پیون کو بھیج رکھا تھا میں نے تمہیں بلانے کو۔ مجھے تو لگ رہا تھا وہ بھی جا کر میٹنگ میں بیٹھ گیا ہے۔"

"تم یہاں کیوں آئی ہو بیوقوف لڑکی۔ ابھی تمہارے ابا یا چچا میں سے کوئی آ گیا تب پتا چلے گا تمہیں۔" موحد نے اسے ڈرانے کی کوشش کی۔

"رات میری نمیر سے بات ہوئی ہے۔" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"تو اس میں کیا نئی بات ہے؟" اس نے متاثر ہوئے بغیر کہا تو مہر ماہ مدھم پڑی۔

"اس نے اپنی کہانی سنائی ہے مجھے۔"

"کون بتائے گا کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ!" وہ لاپروائی سے کہنے لگا۔ موحد کی بات کاٹ کر وہ تیزی سے بولی۔

"یہ سب مجھے ثمرہ آنٹی بھی بتا چکی ہیں۔ وہ جھوٹ نہیں بول رہا موحد!"

"یہ تو فلمی سچویشن بن رہی ہے۔۔۔ اب تم اس سے متاثر ہو جاؤ گی۔ جو اس نے کیا وہ بھول بھال کر اسے اپنا سرتاج مان کر معاف کر دو گی۔" وہ تمسخرانہ بولا۔

"شٹ اپ موحد آفندی!" خفگی سے اسے دیکھا۔ پھر آگے جھک کر دانت پیس کر بولی۔

"تمہارا مسئلہ یہ ہے کہ جب تک تم خاموش رہتے ہو تو بہت عقلمند لگتے ہو۔ اور میں اسی دھوکے میں تم سے مدد مانگنے چلی آئی ہوں۔"

موحد کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر جھولتے ہوئے نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ چپ کر کے سینے پر بازو لپیٹے کسی بچی کی طرح خفا سی بیٹھی تھی۔

چند لمحے انتظار کے بعد وہ گہری سانس بھرتا سیدھا ہو بیٹھا۔

"جو مسئلہ ہے وہ بیان کرو یار۔"

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ مجھے اس سے بات کیوں کرنا چاہیے؟ اس نے مجھے ٹارگٹ بنایا میری زندگی برباد کی اور میرے لیے شرم کی بات ہے کہ مجھے اس کے حالات زندگی سن کر دکھ محسوس ہو رہا ہے۔" وہ جیسے خود پر نفرین بھیج رہی تھی۔ بہت الجھی ہوئی اور بے چین۔

اس کی آنکھوں میں نمی چمکنے لگی۔

میرا ساجن بچھڑا مہرباں
میرے آنسو بیچ قطار
میری نیندیں بہہ گئیں آنکھ سے
میرے سینے زار و زار
مجھے غم کے قفل سب کھا گئے
مجھے چاٹے دکھ کی ریت
میری روح بھی ایسی بانجھ ہوئی
میرے من کے اجڑے کھیت
میرے دن کے سوگ عجیب سے
میری رات کے اپنے بین
میں رو رو برہا کاٹتی
میرے نین نہ پائیں چین
میری پوجا مل گئی خاک میں
میری عرضی نامنظور
پھر کیوں کر جل جل راکھ ہوئی

نہ موسیٰ نہ میں طور
مجھے ماریں پھول گلاب کے
مرے نیناں چبھ گئے خار
مرا ساجن بچھڑا مہرباں !

حسرت کی اگر انسانی شکل ہوتی تو اس وقت وہ مجسم مہر ماہ آفندی ہوتی۔ ایک مضبوط اعصاب کا مرد ہو کر بھی اس کے انداز و الفاظ نے موحد کے دل کو دھچکا سا لگایا۔ وہ جو بظاہر اب خود کو مضبوط اور لاپرواہ ظاہر کرتی اپنی زندگی کی سب سے بڑی قیامت کا سامنا کر رہی تھی! اندر سے وہی ٹوٹی پھوٹی مہر ماہ تھی۔

خود پر قابو پاتی وہ کھنکھار کر گلا صاف کرتی پھر سے گویا ہوئی۔

"میں اسے سخت سزا دینا چاہتی ہوں موحد!" وہ خفگی آمیز بے بسی سے بولی تو باوجود ضبط کے آنسو پلکوں تک آ گئے۔ "بس تم یہ بتا دو کہ جس نے تمام عمر آبلہ پائی میں گزاری ہو کیا وہ پھر سے سزا ہی کا حق دار ہوتا ہے؟"

موحد نے دم سادھ کر اس کی مکمل بات سنی اور نظر بھر کے اس کا چہرہ دیکھتا رہا وہ بھیگے لہجے میں پھر سے بولی۔ "زرنگار آنٹی کو دیکھتی ہوں تو ترس آتا ہے ان پر۔ عزت کی زندگی گزارنے کی ڈیمانڈ کرنا کیا جرم ہوتا ہے؟ لیکن جب نمیر کے انتقام کے متعلق سوچتی ہوں تو دل چاہتا ہے وہ میرے سامنے آ جائے تو میں اسے شوٹ کر دوں مجھے کیوں چنا اس نے۔۔۔۔" اس کے آنسو لڑھک کر رخساروں پر آ گئے تھے۔

وہ ساکت بیٹھا دھوپ چھاؤں کا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ خود سے الجھتی کبھی ہمدردی اور کبھی منتقمانہ انداز میں بولتی وہ جانے اس کے دل کا کون کون سا کواڑ اور دماغ کی گرہیں کھولتی جا رہی تھی۔

"مجھے لگا کہ مجھے اس کی بات سن لینی چاہیے۔ مگر اب لگتا ہے کہ الجھے ہوئے ریشم میں ہاتھ پھنسا رہی ہوں کہیں خود بھی الجھ ہی نہ جاؤں۔" وہ دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے رگڑ کر رخساروں کو صاف کرتی دل گرفتی سے ہنس دی۔ موحد طویل سانس بھرتا سیدھا ہو بیٹھا۔ پھر جیسے کسی فیصلے پر پہنچ کر اس سے مخاطب ہوا تو بے حد سنجیدہ تھا۔

"کیا تم ابھی بھی طلال کو مس کرتی ہو؟"

مہر ماہ نے لحہ بھر کو آنکھیں موند کر کھولیں۔

"زندگی نے اتنی بری طرح ٹریٹ کیا ہے کہ اپنے دکھ کی طرف سے دھیان ہٹتا ہی نہیں۔ طلال تو تبھی دل سے اتر گیا تھا جب اس نے راہ بدل لی تھی۔"

"اور اگر نمیر آفندی واقعی مظلوم نکلا تو کیا تم اس رشتے کو نبھانا چاہو گی مہر!" مہر ماہ نے اسے گھور کر دیکھا۔ موحد کے چہرے پر مذاق کا کوئی تاثر موجود نہ تھا لیکن موحد کی بات اسے بہت بری لگی۔

"زندگی کسی مصنف کا لکھا ناول ہوتی تو اس کا انجام شاید یہی ہوتا موحد! لیکن اب جان رکھو کہ وہی ہو گا جس میں میرے اللہ کی مرضی ہو گی۔ اور اللہ میرے لیے یقیناً اچھا ہی کرے گا۔" وہ اپنی بات پر زور دے کر بولی۔

"تو پھر اس کی پوری کہانی سن لو مہر! اگر مناسب لگا تو جہاں تک ہو سکے اس کا ساتھ دینا۔ لیکن سزا لازمی دینا اسے۔ تمہاری خوشیوں کا قاتل ہے وہ۔۔۔ وہ تمہارے ہاتھوں شوٹ ہونا ہی ڈیزرو کرتا ہے۔" موحد نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

"افسوس تو مجھے گھر والوں کی بے حسی کا سن کر ہوا ہے موحد! زندگی کو موت کی جانب دھکیلنے والے لوگ اس دنیا کے ظالم ترین لوگ ہوتے ہیں!" وہ متاسفانہ بولی۔ موحد نے بغور اسے دیکھا اور لہجہ بدل کر ہلکے پھلکے انداز

میں بولا۔

"اور میں۔۔۔میرے بارے میں تم کیا سوچتی ہو؟" مہر ماہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر ڈھیلی سی پڑ گئی اور کرسی کے ساتھ ٹیک لگاتے ہوئے صاف گوئی سے بولی۔

"تم۔۔۔شروع میں تو بہت برے لگے بلکہ دشمن اول۔ مگر اب سوچتی ہوں کہ تم اچھے ہو بلکہ بہت اچھے۔ ثمرہ آنٹی جیسا مہربان دل ہے تمہارا!"

"تو۔۔۔؟" وہ متجسس سا بہ عجلت بولا۔ مہر ماہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"تو کیا؟"

"آئی مین۔۔۔۔ابھی ہم جس ریلیشن میں ہیں اگر تم چاہو تو وہ بعد میں باقاعدہ۔۔۔۔" وہ شانے اچکا کر بہت سرسری انداز میں جو کہنے جارہا تھا مہر ماہ اس کے ادھورے جملے سے بھی فی الفور اس کا مطلب پا گئی تب ہی اس کی بات کاٹ گئی۔

"تم نے میری جتنی مدد کرنا تھی کردی موحد! تھینکس فار دیٹ۔۔۔۔" وہ کرسی دھکیلتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"لیکن میں ابھی آئندہ کے متعلق کچھ بھی سوچنا نہیں چاہتی۔ سوائے نمیر کو بے نقاب کرنے کے"!

"کیسے آئی تھیں۔۔۔؟" موحد کو خیال آیا۔

"رکشہ کیا تھا!" وہ ہنس دی۔

"شاباش۔ گھر میں دو دو گاڑیاں کھڑی رہتی ہیں اور مہر ماہ آفندی رکشہ کر کے آئی ہیں!" وہ طنزیہ بولا اور گاڑی کی چابی اٹھالی۔

"ڈونٹ وری۔ میں واپسی پر کبیر کے ساتھ چلی جاؤں گی!" مہر ماہ نے اسے تسلی دی لیکن وہ اپنی چیزیں سمیٹ کر دراز لاک کرتا اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں چلتا ہوں تمہارے ساتھ۔" وہ سر ہلا کر اسکارف سے نقاب کرنے لگی۔ موحد ایک نظر اسے دیکھ کر اپنا موبائل اٹھانے لگا۔

☆☆☆

تین دنوں سے وہ ملاحہ کی نظر میں نہیں آیا تھا اور یہ تین دن ملاحہ نے راتوں کو نیند کو آوازیں دیتے اور کروٹیں بدلتے گزارے تھے۔

"کیا بکواس کردی میں نے اس روز اس سے۔" اسے رہ رہ کر اپنے آپ پر غصہ آتا تھا۔ کالج بھی وہ دوسرے ڈرائیور کے ساتھ جارہی تھیں۔

"کبیر کہاں ہے؟" فرزین نے پہلے پیپر والے روز دوسرے ڈرائیور کو دیکھ کر اس سے پوچھا تو ملاحہ نے بے بسی سے شانے اچکا دیے۔

"اب بھی اس کی شربتی آنکھوں پر تمہارا کرش ویسا ہی ہے یا اب افاقہ ہے۔؟" گاڑی میں ڈرائیور کی موجودگی کے باعث وہ ملاحہ کے کان میں گھسی۔ ملاحہ نے کہنی اس کی پسلی میں گھسیڑ دی تو وہ کراہ کر دانت پیستی اسے گھورتے ہوئے گاڑی کے دوسرے دروازے کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ ملاحہ نے کھڑکی کے شیشے سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں، وہ دل ہی دل میں کبیر خان سے سخت ناراض ہو چکی تھی۔ محبت کے دعوے دار ایسے ہوا کرتے ہیں بھلا۔ خفا ہو جاتا، اس سے بات نہ کرتا۔۔۔ مگر نگاہ سے چھپ جانا تو انتہا درجہ کی بے اعتنائی تھی اور پھر اس کے آخری پیپر والے روز جب فرزین کی چھٹی تھی۔ سرد ترین موسم میں جبکہ بادل جھکے چلے آرہے تھے۔ صبح سے

ہونے والی مسلسل بارش ابھی کچھ دیر پہلے ہی سردی کی شدت میں اضافہ کر کے بہ مشکل تھمی تھی۔ کالج سے واپسی پر اس نے گیٹ سے نکل کر اپنی گاڑی کی تلاش میں نظر دوڑائی تو انتہائی غیر متوقع طور پر بلیو جینز اور لیدر کی سیاہ جیکٹ میں ملبوس گاڑی کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑے محو انتظار کبیر کو دیکھ کر وہ شاکڈ رہ گئی۔ وہ نا صرف اسے دیکھ چکا تھا بلکہ اس کا ٹھٹکنا اور ایک ہی جگہ قدم جما لینا بھی نوٹ کر چکا تھا۔ تب ہی ہلکا سا سر کو اثبات میں ہلا کر جیسے اس کا سکتہ توڑنے کی سعی کی تو وہ چونک کر خجل سی ادھر ادھر دیکھتی گاڑی کی طرف بڑھی۔ (تو یہ خواب نہیں تھا) وہ شال کو سمیٹتی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی اور گاڑی اسٹارٹ ہوتے ہی یوں شیشے کے ساتھ ناک جوڑ کر باہر جھانکنا شروع کیا جیسے پہلی بار گھر سے باہر نکلی ہو۔ وہ بالکل خاموشی سے گاڑی چلا رہا تھا جیسے بالکل تنہا ہو اور لانگ ڈرائیو پر نکلا ہوا ہو۔ ملاحہ کو اس پل اپنی بے قدری کا احساس اس قدر شدت سے ہوا کہ باوجود ضبط کے اس کے آنسو بہہ نکلے۔ یعنی کہ وہ تین راتوں سے سو نہیں پائی تھی اور مقابل کو اس بات کا احساس تک نہیں تھا۔

ٹپ ٹپ۔۔۔۔ ایک بار پھر بارش کے قطرے تیزی سے ونڈ اسکرین کو بھگونے لگے۔ یا شاید وہ بھی ملاحہ کے دکھ پر دکھی تھے۔

"مین روڈ تو ڈوب چکا ہے صبح سے ہونے والی بارش کے پانی میں۔ لمبا چکر کاٹ کر آنا پڑا مجھے اب بھی وہیں سے واپسی ہوگی۔ دعا کریں خیریت سے گھر پہنچ جائیں۔" بہت دیر کے بعد وہ بولا تو ملاحہ نے لحہ بھر کو آنکھیں موند کر سماعت سے ٹکراتا اس کا خوب صورت لہجہ محسوس کیا۔

"تم خود ہی دعا مانگ لو خان! میری دعاؤں میں اتنا اثر نہیں ہے کہ قبول ہوسکیں!" وہ عام سے انداز میں بولی مگر آنسوؤں کی نمکینی سے بوجھل ہوتا لہجہ سننے والے کو اچھی طرح محسوس ہوا تھا۔ بے اختیار بیک مرر کو موڑ کر کھڑکی کے ساتھ جڑ کر بیٹھی ملاحہ کو دیکھا اور لب بھینچ کر گاڑی کی اسپیڈ کم کردی۔ تند و تیز بارش ویسے بھی ڈرائیونگ کو مشکل بنا رہی تھی. پانی کی مسلسل بہتی دھاریں ونڈ اسکرین کے پار دیکھنا مشکل کررہی تھیں۔ اس نے ایک محفوظ کونے پر گاڑی روک دی۔ ماسوائے بارش کے شور کے گاڑی کے اندر بالکل خاموشی تھی۔ ہیٹر کی گرمی باہر کی سردی کو تو اندر آنے سے روک رہی تھی مگر گاڑی کے اندر پھیلی سرد مہری دونوں ہی نفوس کو محسوس ہو رہی تھی۔ ملاحہ یونہی باہر دیکھتی رہی۔ کبیر نے لحہ بھر کو لب بھینچے۔

"آپ ناراض ہیں تو مجھ سے صاف الفاظ میں کہہ سکتی ہیں!" اس نے سادگی سے کہا تو ملاحہ تڑپ اٹھی اس الزام پر "میں۔۔۔میں ناراض ہوں؟" بے یقینی سے کہتے تاسف اور دکھ کے مارے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

"تین دن سے تم غائب ہو یا میں؟۔۔۔اگر میری بات اچھی نہیں لگی تو اسی وقت کہہ دیتے، ڈانٹ کر بھڑاس نکال لیتے دل کی۔ یوں بن بتائے منظر سے غائب ہو جانا ظاہر کرتا ہے کہ آپ کو کسی دوسرے کی کتنی پرواہ ہے"!

"غلط اندازے مت لگائیں"!

"ہاں۔۔۔زندگی کی بساط پر میرا اندازہ ہی تو غلط ہو گیا!" وہ زخمی سے انداز میں ہنسی اور آنکھیں موند لیں۔ سیاہ وول کی شال میں اس کی کبھی گلابیاں چھلکاتی رنگت اب زرد دکھائی دیتی تھی۔ کبیر کے دل کو دھکا سا لگا تو اس نے بیک مرر سے نگاہ ہٹا کر اسکرین پر بہتی پانی کی دھار پر جمالی۔

"دل کے کہے پر چلنے والے سود و زیاں میں نہیں پڑا کرتے اور نہ ہی محبت کے علاوہ ان کی ترجیحات کے خانے میں کچھ اور ہوا کرتا ہے"!

ملاحہ تڑپ کر سیدھی ہوئی۔ "تو میں نے کون سا جائیداد مانگ لی تم سے کبیر خان"!

"جب آپ اس راہ پر آئیں میں تب بھی آپ کا ڈرائیور تھا۔" وہ جیسے اسے یاد دلا رہا تھا۔
"تو کیا ساری عمر رہو گے؟ نہیں نا؟۔۔۔ تو پھر میرا کہنا تمہارے دل کو اس قدر کیوں چبھا کبیر!"
وہ خاموش رہ گیا۔ ملاحہ کو مارے غصے کے رونا آنے لگا۔
"میں بتاتی ہوں۔۔۔ کیونکہ تم نے کبھی میرے متعلق ایسی فیلنگز رکھی ہی نہیں۔ وہ تو میں ہی بے وقوف تھی۔۔۔ تمہیں بھی کھینچ کر زبردستی اس راہ پر لے آئی اور تم نے ترس کھا لیا مجھ بے چاری پر۔"
"بے چاری۔۔۔؟؟" کبیر کی نگاہ بے اختیار بیک مرر پر اٹھی۔ رونے سے گلابی ہوتی آنکھیں اور بھیگے رخسار۔ وہ بے ساختہ نگاہ پھیر گیا۔

"گاڑی چلاؤ کبیر خان! قسمت میں ہوا تو خیریت سے ہی گھر پہنچیں گے۔"
"مگر میں آپ کو کہیں اور لے جانا چاہتا ہوں۔" وہ ایک دم جیسے کسی نتیجے پر پہنچتے ہوئے بولا تو ملاحہ پریشان ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ اب گاڑی اسٹارٹ کر رہا تھا۔
(اف۔۔۔ کہیں کورٹ میرج کا پلان تو نہیں بنا رہا۔ فلموں اور ڈراموں میں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔)
"مجھے سیدھا گھر جانا ہے کبیر خان!" وہ گھبراہٹ چھپا کر سختی سے بولی تو کبیر نے ان سنی کرتے ہوئے اپنا دھیان آگے ہی رکھا۔
"کبیر۔۔۔ سنا نہیں تم نے۔۔۔ اگر تم کہیں اور لے گئے مجھے تو میں شور مچا دوں گی۔"
"اچھا۔۔۔ تب مجھے بھی بتا دیجیے گا اکٹھے مل کر شور مچائیں گے تو زیادہ لوگ جمع ہوں گے۔" وہ متاثر سا ہو کر بولا تو ملاحہ اسے گھور کر رہ گئی۔ کھڑکی کے باہر آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ یہ واقعی گھر کا راستہ نہیں تھا۔ وہ بے بسی سے بیٹھی رہ گئی۔
"آپ کو ملوانا ہے کسی سے۔" وہ مسکرا رہا تھا۔
"تم پر اعتبار کیا ہے خان۔۔۔ جہاں بھی لے جاؤ۔" وہ نرمی سے کہتی سارا مان اسی پر ڈال گئی تھی۔ اور اس دن وہ پہلی بار کبیر کی دونوں بہنوں سے ملی۔ کبیر نے یہاں بہت خوب صورت نیا گھر خریدا تھا۔
"سرپرائز۔۔۔"
وہ مسکرا رہا تھا ملاحہ کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ "بہت خوب صورت سرپرائز ہے کبیر۔"
وہ وقت ایک شان دار وقت تھا کبیر اور ملاحہ کی مسکراہٹ میں ایک بیساختہ پن تھا اور آنے والے دنوں کے لیے دل میں نیا ولولہ۔

☆☆☆

رات اسے بہت بے صبری سے نمیر کی کال کا انتظار تھا۔ اور کال تھی کہ آ ہی نہیں رہی تھی۔ سب سو چکے تھے۔ وہ موبائل فل چارج کیے ہوئے تھی کہ کل کی طرح بیٹری ڈاؤن نہ ہو جائے۔ مگر انتظار انتظار ہی رہا اور کال نہیں آئی۔ اس نے خود اس کے نمبر پر کال کی مگر ہر بار نمبر بند ہی ملا۔
"اف۔۔۔" وہ جھنجلائی۔ "آگے پتا نہیں کیا ہوا ہو گا۔ زرنگار آنٹی کی یادداشت کیسے متاثر ہوئی اور ہاں ان کے ٹیومر کا آپریشن کس نے کروایا ہو گا۔ پھر اس دارالامان میں ان کو داخل کروانا وہاں انہیں عام مریضوں سے ہٹ کر ہر سہولت اور الگ سے کیئر ٹیکر رکھوا کر دینا۔۔۔ یہ سب کسی کی تو مہربانی ہو گی نا۔" وہ ناخن چباتی مسلسل ایک ٹینشن کی کیفیت میں تھی۔ وہ زرنگار کو لینے گئی تب ان کا کمرہ اور اس کی آرائش دیکھ کر نرس سے پوچھ ہی لیا تو اسی نے بتایا کہ زرنگار کے لیے ان ایکسٹرا سہولیات کو ان کے بیٹے نے باقاعدہ خرید رکھا تھا۔

"یعنی وہ کافی اچھے حالات میں ہو گا۔۔۔ اف۔ تو میں کس کو ایک لاکھ دے آئی۔۔۔" وہ کراہی۔ اسے یاد آیا اس نے تو خود سے مصمم ارادہ کیا ہوا تھا کہ ایک لاکھ کہیں سے ہاتھ لگا تو موحد آفندی کے منہ پر مارنا ہے "(اس نے بھی تو تھپڑ مارا تھا) مہر کو یاد آیا ایسے ہی موحد کی تعریف کر دی آج اس کے منہ پر۔ یہ تھپڑ اس وقت تو یاد ہی نہ آیا تھا۔ خیر اب ایک لاکھ جمع ہوا تو موحد کو منہ پر مارے بغیر شرافت سے ہی واپس کر دوں گی۔ تاریخ گواہ ہے کہ ہر مشکل وقت میں اسی سے مدد لینا پڑتی ہے مجھے۔ وہ الٹی سیدھی سوچوں کی زد میں تھی جب ہاتھ میں تھاما موبائل ایک دم سے زوں زوں کر کے تھرتھرانے لگا تو اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ زرنگار کی ڈسٹربنس کے خیال سے اس نے موبائل کو وائبریشن موڈ پر لگایا ہوا تھا۔ نمیر ہی کی کال تھی۔ اس نے دو تین رنگز آنے دیں۔
(اسے احساس نہ ہو کہ میں اس کی کال کا انتظار کر رہی تھی)
"ہیلو۔۔۔"
"السلام علیکم۔" دوسری طرف سے بشاش لہجے میں سلامتی بھیجی گئی۔ اس نے خفیف سا ہو کر سلام کا جواب دیا۔
"جیتی رہو۔" اس کا بشاش انداز مہر ماہ کو لاپروا سا لگا تو وہ تلملا اٹھی۔
"حد ہے یعنی کہ ہم نے خیر سگالی کے جذبات ایک دوسرے تک پہنچانے کے لیے یہ کال کی ہے۔"
"ہاہ۔۔۔" وہ محظوظ ہو کر ہنسا۔ "میرے جذبات تو خیر سگالی والے ہی ہیں مسز۔ جیتی رہیے شاد و آباد رہیے۔ بلکہ سدا سہاگن بھی رہیے۔" وہ برجستہ بولا۔ مہر ماہ نے اپنے رخسار تپتے محسوس کیے۔
"سیدھی لائن پر آؤ نمیر آفندی! باقی کی کہانی سناؤ اور یہ مت بھولو کہ آخر میں فیصلے کا اختیار تم مجھے دے چکے ہو۔" وہ فوراً اروڈ ہو گئی۔
"اور وہ آخری فیصلہ پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں کیا؟"
"تمہیں شوٹ کرنا ہے نمیر وقار۔۔۔" وہ سلگ کر بولی۔
"کر دینا مہر!" وہ ایک دم سے اس کی بات کاٹ کر اتنی قطعیت سے بولا کہ مہر ماہ کے اگلے الفاظ منہ ہی میں رہ گئے۔
"میں انتقام کی آگ میں جلتا شاید آفندیز ہی کی سطح پر آ گیا تھا مہر! کیا کروں خون کا اثر ہے نا۔ تبھی انتقام پورا کرنے کے لیے تمہیں چن بیٹھا۔" وہ دھیمے اور بوجھل لہجے میں کہہ رہا تھا۔ اور مہر ماہ ساکت سی سن رہی تھی۔ تو اس ظالم انسان کے پاس بھی دل تھا؟؟
"مگر میں نے بہت کڑا وقت دیکھا ہے مہر! دنیا میں آپ کا جان سے پیارا ایک ہی رشتہ ہو اور اسے بھی دنیا آپ سے چھین لینے کی کوشش کرے تو کیا ایسی دنیا کو آگ نہیں لگا دینی چاہیے۔۔۔۔"
"ظلم کی کوئی وضاحت نہیں ہوتی نمیر چاہے وہ مظلوم ہی کیوں نہ کرے۔" مہر ماہ دکھ سے بولی۔
"مانتا ہوں مہر ماہ! لیکن میری زندگی میں تاریک راتیں اتنی آئی ہیں کہ شاید میری سوچ مثبت نہیں رہی۔" وہ اعترافی انداز میں بولا تو مہر ماہ کا دل دکھ سا گیا۔
"اعتراف کی راہ پر آتے بہت دیر لگ گئی تمہیں نمیر۔"
"میں نے اپنی ماں کو خون کے آنسو روتے دیکھا ہے مہر ماہ! آغا ذوالفقار کی جائیداد میں اپنے بھائیوں کے برابر حصہ رکھنے والے اپنے باپ کو بنا دوا کے مرتے دیکھا ہے میں نے اور بچپن کی یتیمی کا دکھ تم کیا جانو مہر بی بی! جس کی عمر پھولوں کی سیج پر گزری ہے۔ میری ماں بھی اس سرد اور تاریک رات میں مر جاتی اور آج شاید تمہیں نمیر آفندی کی یہ کہانی سننے کو نہ ملتی اگر ایک روز فاران آفندی ہمیں ڈھونڈتے پہلے ہمارے گھر اور پھر محلے والوں

سے پوچھ کر اس سرکاری ہسپتال نہ چلے آتے جس کے ایک وارڈ میں زمین پر چادر بچھا کر میری ماں کو وہاں ڈال دیا گیا تھا۔ کیونکہ ہمارے پاس ان کے برین ٹیومر کو آپریٹ کروانے کے لیے روپے نہ تھے۔ اور تب تایا جان کو سامنے پا کر ان کے سینے سے لگ کر مجھے احساس ہوا کہ دنیا میں اچھے لوگ کم سہی مگر باقی ہیں۔" وہ سانس لینے کو رکا۔ مہر ماہ سانس روکے سن رہی تھی۔

"تو فاران چچا نے تم لوگوں کو سہارا دیا۔۔ یعنی کہ پھر تو ثمرہ چچی بھی تمہیں جانتی ہیں؟" مہر ماہ کا وجود سنسنا اٹھا۔

"میری ماں بچ گئی مہر! لیکن آپریشن میں ہونے والی دیر اور ہسپتال کے عملے کی پہلے کی لاپروائی کی وجہ سے ان کی یادداشت شدید متاثر ہوئی یہاں تک کہ وہ مجھے بھی پہچان نہیں پاتی تھیں اور یہ آفندیز ہی کا دیا ہوا دکھ ہے کہ میں پچھلے پندرہ برس سے ترس رہا ہوں کہ میری ماں کب مجھے پہچان کر گلے سے لگائے گی"۔

"تم میرے سوال کا جواب دو نمیر۔۔۔ کیا موحد اور ثمرہ آنٹی جانتے ہیں تمہیں، کبھی ملے ہیں تم سے؟" اس کا حلق خشک ہونے لگا تیزی سے پوچھا۔

"تم میری کہانی سن چکی ہو۔۔۔ تمہارے سوالات کے جواب دینا طے نہیں ہوا تھا مہر ماہ!" وہ رسان سے بولا۔

"اگر تب ان لوگوں نے تمہاری مدد کی تھی تو بعد میں اکیلا تو نہیں چھوڑ دیا ہوگا نا"! اس کا ذہن ابھی تک اسی نکتے پر اٹکا ہوا تھا۔

"اب بتاؤ۔۔۔ اس کہانی میں ظالم کون ہے اور مظلوم کون؟" وہ اس کے کسی بھی سوال کا جواب نہیں دینا چاہتا تھا۔ مہر ماہ کو شدت سے احساس ہوا۔ تو وہ سرتاپا سلگ اٹھی اور تقریباً چلا ہی اٹھی۔

"باقی کہانیوں کا تو مجھے پتا نہیں مگر میری زندگی کی کہانی میں صرف اور صرف تم ہی ظالم ہو"!

"تم نے وعدہ کیا تھا فیصلہ کرنے کا مہر ماہ!"

"میں قائم ہوں اس فیصلے پر نمیر! طلاق تو تم مجھے دو گے ہی۔۔ لیکن اس سے پہلے میں ایک بار ضرور تم سے ملنا چاہتی ہوں" وہ غصے سے غرائی۔

"اور اگر اس کے بعد؟۔۔ آئی مین تمہارا دل نہ چاہا طلاق لینے کو تو؟" اس کے مسکراتے لہجے سے مہر ماہ بدک گئی۔

"شٹ اپ۔۔ بڑے آئے تم پرستان کے شہزادے۔ میں صرف ایک بار تمہارے روبرو آ کر دیکھنا چاہتی ہوں جیسا تم نے کہا۔۔ کہ تم مجھ سے کی گئی زیادتی پر شرمسار ہو تو اتنی ہی ندامت تمہارے چہرے پر بھی ہے یا نہیں" وہ تیزی سے استہزائیہ بولی۔

"کبھی کبھار آگہی سب سے بڑا دکھ بن جاتی ہے تب مہر ماہ الاعلمی اللہ کا کرم لگنے لگتی ہے" وہ ناصحانہ بولا۔

"بے وقوف مت بناؤ مجھے۔" وہ تیز لہجے میں بولی۔ "بنا تمہاری شکل دیکھے نکاح کر لیا اب بنا دیکھے طلاق لے لوں؟ اگر زندگی میں کبھی آمنا سامنا ہو گیا تو تمہیں تھپڑ مارنے کی میری حسرت دل میں ہی رہ جائے گی" وہ بے اختیار ہنسا تھا۔

"ہاہ۔۔ بہت سی بیویوں کی عجیب و غریب خواہشات سنی تھیں تم ان سب سے یونیک (انوکھی) ہو مسز"۔

"اچھا۔۔ کتنی بیویاں رکھی ہوئی ہیں تم نے۔" وہ طنزیہ بولی پھر استہزاء سے اضافہ کیا۔

"سب ہی کو اغوا ہی کیا ہوگا"۔

"کہا نا بہت شرمسار ہوں اپنے کیے پر مہر ماہ! لیکن صرف تمہارے سامنے۔ آفندیز سے تو ان کے جیسا ہی بن کے ملنا ہے مجھے"۔ وہ قطعی لہجے میں بولا۔ پھر اس کی آواز ذرا مدھم ہوئی اور لہجہ ٹھہر سا گیا۔

"رہی بیویوں والی بات تو۔۔۔ بس تم ہو۔۔۔ اور تم ہی پر شاید دنیا ختم ہے اور میری تلاش بھی"! کال شاید ختم ہو چکی تھی لیکن مہر ماہ پسیجے ہاتھ میں مضبوطی سے موبائل تھامے کان سے لگائے سنسناتی سماعتوں کے ساتھ ابھی تک بے یقین بیٹھی تھی۔

خبیث۔۔ کیا بکواس کر رہا تھا بیہودہ شخص۔ اس نے حواس میں لوٹتے ہوئے موبائل کو پرے پھینکا اور نمیر آفندی کو غائبانہ گالیوں سے نوازا۔ وہ یقیناً کوئی بڑا گیم کھیلنا چاہ رہا تھا۔۔۔"

تم سے ہمدردی اپنی جگہ لیکن نمیر آفندی میں اپنی زندگی کی خوشیوں کے قاتل کو کبھی معاف نہیں کر سکتی"۔ وہ تنفر سے خود کلامی کرتی اپنی جگہ پر لیٹ گئی۔۔۔ لیکن نمیر کی آواز و انداز کتنی ہی دیر نیند اور اس کی آنکھوں کے درمیان آنکھ مچولی کرتے رہے۔ پھر نہ جانے کب وہ نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

ناشتے کے بعد آغا جان نے محض مہر ماہ کو بات کرنے کے لیے روکا تو وہ اندر ہی اندر خوف زدہ بھی ہوئی لیکن باادب بیٹھی رہی۔

"تم نے اتنا کچھ غلط کر دیا ہے مہرو کہ میرا دل نہیں چاہتا تمہاری شکل دیکھنے کو" وہ بہت سنگ دلی سے گویا ہوئے تو مہر ماہ کے دل کو دھچکا سا لگا وہ بے اختیار ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔

(تو ظالموں کا چہرہ ایسا ہی ہوا کرتا ہے عام انسانوں جیسا فرق صرف الفاظ اور رویے کا ہوتا ہے)

"ہم نے موحد جیسے شاندار بندے کی زوجیت میں دیا تمہیں اور تم اس بدکردار شخص کے نکاح کو سنبھال کر بیٹھی ہوئی ہو"!

مہر ماہ نظریں گود میں رکھے ہاتھوں پر جما کر بیٹھ گئی۔

"بات ہوئی ہے اس کے ساتھ تمہاری؟" وہ حقارت سے پوچھ رہے تھے۔ مہر ماہ شرم سے ڈوب مرنے والی ہوئی۔

"جی۔۔۔ وہ طلاق کا مطالبہ کیا تھا میں نے اس سے آغا جان۔ لیکن وہ جائیداد میں سے حصہ مانگتا ہے"!

"ہاہ۔۔۔ اس کے باپ کی نہیں یہ سب آغا ذوالفقار کی کمائی سے بنا ہے۔ میری زندگی میں وہ یہ مطالبہ نہیں کر سکتا نا ہنجار۔" وہ تنفر سے بولے۔ "لاؤ دکھاؤ شریعت میں کہاں لکھا ہے کہ باپ کے مرنے کے بعد پوتا وارث ہوتا ہے"!

"موحد کو بھی تو وراثت میں حصہ دار بنایا ہے آپ نے آغا جان"! اس کی زبان پھسل گئی۔ آغا جان کا غیظ سے چہرہ لال ہو گیا۔

"بکواس مت کرو مہرو۔۔۔ موحد کو اس نا ہنجار سے مت ملاؤ۔۔۔۔ موحد تو شان ہے ہمارے گھرانے کی۔ تف ہے ہم پر کہ ایک طوائف کے جنے بچے سے ہم اپنی نسل آگے بڑھائیں"!

مہر ماہ کا دل مارے خوف کے سکڑ گیا۔ (انسان خدا بننے کی (نعوذ باللہ) کوشش کیوں کرتا ہے آخر؟ جبکہ کبھی منہ کے بل گر جانا اس کا مقدر ہے) اس نے اپنی پوری ہمت مجتمع کر کے کہا۔

"میری اس سے ایک دو بار بات ہوئی ہے آغا جان۔۔۔ وہ بس عزت چاہتا ہے اس گھر میں اپنی اور اپنی ماں کی۔ اور موحد۔۔۔۔ وہ بہت اچھا ہے کیونکہ وہ ثمرہ آنٹی کے گھر پیدا ہوا یعنی اس کے اچھے ہونے میں اس کا

کوئی کمال نہیں تو پھر نمیر کا کیا قصور آغا جان اگر وہ ایک طوائف کے گھر پیدا ہوا۔۔۔خون اور نسل تو وقار آفندی کی ہی ہے نا!"

"بکواس مت کرو۔۔۔ بہت زبان چلنے لگی ہے تمہاری!" وہ گرجے۔

"سوری۔۔۔" اس نے سر جھکا لیا۔ لیکن دل و دماغ میں بغاوت کی ایک شدید لہر سی اٹھی تھی۔

"ایک بار وہ سامنے آ جائے اپنے ہاتھوں سے گولی اس کے ناپاک سینے میں اتاروں گا میں!" مہر ماہ نے دانتوں تلے سختی سے لب دبا لیا۔

"اسے بلاؤ گھر۔۔۔ کہو کہ میں ملنا چاہتا ہوں۔ میں بھی تو دیکھوں اس سور ما کو۔ بڑے حساب واجب کر دیے ہیں اس نے مجھ پر۔ اور اگر انکار کرتا ہے تو مجھے بتاؤ میں اس ناپاک عورت کو بھی گھر سے باہر پھنکواتا ہوں!" وہ بہت حقارت سے زرنگار کا تذکرہ کر رہے تھے۔ مہر ماہ کا دل بھیگ بھیگ گیا۔ اسے پہلی بار حقیقتاً زرنگار اور نمیر آفندی سے ہمدردی محسوس ہوئی۔

"ہاں۔۔۔ نمیر آفندی سے بھی۔ یہ لوگ اسی قابل تھے کہ ان کو منہ توڑ جواب دیا جاتا۔۔۔ ہاں میں بیچ میں پس تو گیا۔۔۔ آغا جان کی سوچ پر اس کا ذہن باغی ہو کر اور ہی سمت اڑانیں بھر رہا تھا۔

☆☆☆

"میں تم سے۔ ملنا چاہتی ہوں نمیر۔۔۔" اس نے اسے دل مضبوط کر کے بنا سوچے سمجھے میسج کر دیا تھا۔ اور رات گئے اس کی کال بھی آ گئی۔

"زہے نصیب۔۔۔ کن ساتھ لاؤ گی یا وہ بندوبست میں کروں؟" وہ مذاق کر رہا تھا۔

"میں سیریس ہوں نمیر۔ میں واقعی تم سے ملنا چاہتی ہوں لیکن صرف تم سے۔۔۔ کسی ایکس وائی زیڈ سے نہیں۔" وہ اپنے لفظوں پر زور دے کر بولی تو وہ ہنسا۔ پھر محظوظ ہو کر پوچھنے لگا۔

"اچھا۔ تو تمہیں کیسے پتا چلے گا کہ میں ہی ہوں یا کوئی اور!"

"تم اپنا آئی ڈی کارڈ لاؤ گے ساتھ مسٹر!"

"اور مجھے کیا مجبوری ہے کہ میں تمہارا یہ مطالبہ پورا کروں؟" وہ جیسے کرید رہا تھا۔

"یہ مت بھولو کہ تمہاری ماں اس گھر۔ میں ہمارے رحم و کرم پر ہے!" مہر ماہ نے "آفندی پن" دکھانے کی کوشش کی۔

"وہ اللہ کے رحم و کرم پر ہیں مائی ڈیئر۔ اور تم لوگ جانتے نہیں ہو نمیر آفندی کتنی زہر چیز بن چکا ہے اس معاملے میں۔ میری ماں کا بال بھی بیکا ہوا تو پورا آفندی ہاؤس الٹ دوں گا میں!" اس کے لب و لہجے کی قطعیت بھری سفاکی پر مہر ماہ جھرجھری لے کر رہ گئی۔ پھر اسے دھمکاتے ہوئے بولی۔

"ان کو کچھ نہیں ہوگا۔ لیکن اب یہ لکا چھپی اور فون کالز کا بزدلوں والا سلسلہ بند کرو نمیر! ورنہ آج کے بعد میں تمہاری کوئی کال اٹینڈ نہیں کروں گی۔ شادی تو ویسے بھی میری موحد کے ساتھ ہو ہی چکی ہے اور وہ بہت ہینڈسم بھی ہے!"

اس کی بات سن کر وہ دل کھول کر ہنسا تھا۔

"مائی گڈنیس۔۔۔ یعنی اب تقابل ہوگا میرا اور موحد کا۔۔"

"تم نے دیکھا ہوا ہے اسے؟"

"ہاں۔۔ تمہارے ساتھ کئی بار دیکھا ہے!" وہ مان گیا تھا۔

"اوکے اب بتاؤ کہاں مل رہے ہو پھر؟" مہر ماہ کے دل میں سنسنی سی بھر گئی۔

"کہتی ہو تو آفندی ہاؤس آ جاتا ہوں!" وہ نڈر ہو کر بولا۔

"آغا جان تمہیں قتل کر کے بہت خوشی محسوس کریں گے، یقیناً۔"

"ایک آغا جان اور ایک ان کی پوتی۔۔۔ دونوں کو جان چاہیے میری!" وہ مسکرا رہا تھا یقیناً۔ اب اگر وہ نمیر سے ہونے والی نئی نئی ہمدردی کا بتاتی تو شاید وہ سر پر ہی چڑھ جاتا۔ چپ ہی رہی۔

"کیا گارنٹی ہے کہ اس ملاقات کا تم اور کسی کو نہیں بتاؤ گی؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

مہر ماہ کا دل بے ترتیبی سے دھڑکا۔ کہیں وہ مکر ہی نہ جائے۔

"قسم لے لو۔۔۔ کسی کو نہیں بتاؤں گی۔ تم سے ملنا میری زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ بنا ہوا ہے نمیر۔ اگر تم واقعی خود کو مظلوم سمجھتے ہو تو مجھ سے ایک بار مل لو۔ پلیز۔"

دوسری طرف سے گہری سانس لینے کی آواز آئی۔

"اوکے ڈن۔۔۔ یہ معاملہ بھی ختم کیے دیتے ہیں مہر ماہ نمیر آفندی!" وہ بوجھل سے لہجے میں بولا۔

"لیکن یاد رکھنا۔۔۔ بدلے کے لیے تمہیں چننے پر میں بہت شرمسار ہوں۔ جو سزا دو گی وہ قبول ہوگی مجھے۔ چاہو تو گن مجھ سے لے لینا!" مہر ماہ ساکت سی سنتی رہی۔

"میرے اندر بہت زہر بھرا ہوا تھا مہر ماہ۔ تم سب کے لیے۔ لیکن اب بہت کچھ بدل چکا۔۔۔ میں تمہارے سامنے کچھ اعتراف بھی کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد ہر فیصلہ تمہارا ہوگا!"

باہر لان میں سرد تاریک رات سست روی سے گزر رہی تھی۔

☆☆☆

موحد کے توسط سے ملاحہ کا بہت اچھا پروپوزل آیا تھا۔ ملاحہ تو بھونچکا رہ گئی۔ اس بارے میں تو اس نے کبھی سوچا ہی نہ تھا کہ کوئی پروپوزل بھی آ سکتا ہے۔ دو دن بعد ان لوگ کی آمد متوقع تھی۔ تائی جان نے گہری نظروں سے اس کی اڑتی رنگت دیکھتے ہوئے تفصیل بتائی تو وہ جز بز سی ہو کر خشک پڑتے ہونٹوں پر زبان پھیر کر بس اتنا ہی بولی۔ "ابھی تو بہ مشکل ایگزیمز ختم ہوئے ہیں میرے۔ فرصت کو انجوائے تو کرنے دیں مجھے"

"سسرال جا کر انجوائے کرتی رہنا۔ لڑکیوں کو زیادہ دیر گھر بٹھانا اچھا نہیں ہوتا!" وہ صفا چٹ بولیں تو وہ دل میں ہوتی پکڑ دھکڑ پر قابو پاتی سیدھی موحد کے کمرے میں آئی۔ دستک دے کر اس کی اجازت ملنے پر وہ اندر داخل ہوئی تو موحد سے مکمل ناراض تھی۔ وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ مگر جب وہ سینے پر بازو لپیٹے یونہی کھڑی رہی تو موحد ہی کو حیران ہو کر بولنا پڑا۔

"کیا مسئلہ ہے بھئی زبان ساتھ لانا بھول گئی ہو کیا!"

"آپ نے یہ اچھا نہیں کیا بھائی۔۔۔" وہ رونے کو تھی۔

"کیا برا کر دیا میں نے؟"

"میرے لیے پروپوزل کیوں لائے آپ؟" وہ شدید خفا تھی۔ موحد کے ہونٹ اووو کے انداز میں سکڑے۔

"بہت اچھا بندہ ہے وہ اور ایک اچھی بندی کی تلاش میں ہے"۔

"آپ کو کس نے کہا کہ میں اتنی اچھی ہوں؟"

"اچھا۔۔ تو یعنی تمہارا انکار ہے اس پروپوزل کو؟" ملاحہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اب تو گھر میں بات کر چکا ہوں میں"۔ وہ تاسف سے بولا۔ پھر جیسے بہت سرسری انداز میں پوچھنے لگا۔

"ویسے وجہ پوچھ سکتا ہوں اس قطعی انکار کی۔" ملاحہ نے نفی میں سر ہلایا تو موحد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ چمکی۔

"ہوں۔۔۔ یعنی اس وجہ کا کوئی نام نہیں ہے؟" ملاحہ کا دل سکڑا۔

"ہو بھی تو کیا فرق پڑتا ہے آغا جان کے قوانین سب پر ایک ہی طرح سے لاگو ہوتے ہیں"۔ وہ یاسیت سے بولی۔

"فرق پڑے گا جب تم اپنی والدہ کے سامنے حق کی آواز بلند کرو گی تو۔" وہ اسے حوصلہ دے رہا تھا۔ "اور مجھے تم ہمیشہ اپنی پشت پر پاؤ گی۔" وہ سنجیدہ تھا۔

"آپ فی الحال تو یہ معاملہ ختم کروائیں"۔ اسے رونا آرہا تھا۔

"یہ تو اب تم ہی کر سکتی ہو ملاحہ۔" وہ معذرت خواہانہ بولا۔ تو ملاحہ شکوہ کناں نظروں سے اسے دیکھتی پیر پٹختی واپس پلٹی پھر دروازے میں جا کر طعنہ دینا نہ بھولی۔

"اور ابھی آپ دعوٰی کر رہے تھے میری پشت پر کھڑے ہونے کا۔۔۔ ساتھ دینے والے ہم قدم ہوتے ہیں پیٹھ پیچھے نہیں"۔ وہ چلی گئی تھی موحد سر پر ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔

(دونوں بہنیں ہی ماشاءاللہ۔۔۔)

☆☆☆

"میں نے نمیر سے بات کر لی ہے وہ مجھ سے ملنے کو تیار ہے موحد"۔ وہ موحد کو بتائے بنا رہ نہ سکی تھی (اس نے کون سا قسم دی تھی کسی کو نہ بتانے کے لیے) مہر ماہ نے دل کو تسلی دی۔

موحد آفس میں تھا جب اسے مہر ماہ کا یہ میسج ملا۔ جواباً اس نے مہر ماہ کو کال کی تھی۔

"کہاں مل رہی ہو؟ اور کیسے طے ہوگا کہ وہ اصل نمیر ہی ہے"۔ وہ جرح کر رہا تھا۔ مہر ماہ کا دل عجیب سے سکون سے بھرا۔ کسی کو تو اس کی فکر تھی۔

"ابھی جگہ تو طے نہیں کی لیکن ملوں گی ضرور اسے تھپڑ مارنے کی شدید خواہش ہے دل میں"۔ وہ منتقمانہ لہجے میں بولی۔ پھر تفاخرانہ بتایا۔ "اسے آئی ڈی کارڈ سمیت بلوایا ہے ڈونٹ وری"۔

"ہوں۔۔" وہ خاموش سا تھا۔

"کیا ہوا۔۔ غلط کر رہی ہوں کیا؟" مہر ماہ کو اس کی خاموشی کھلی۔

"ٹھیک کر رہی ہو بالکل۔۔۔۔ لیکن میں تمہارا آخری فیصلہ جان سکتا ہوں اگر تم برا نہ مانو تو"۔ وہ معذرت خواہانہ انداز میں پوچھ رہا تھا۔ مہر ماہ سوچ میں پڑ گئی۔ پھر گہری سانس بھر کے بولی۔

"پتا نہیں۔ شاید اس سے مل کر فوری فیصلہ ہو جائے"۔

"او کے۔۔ بیسٹ آف لک"۔ وہ لیے دیے انداز میں بات ختم کر گیا تو وہ بے جان موبائل کو گھور کر رہ گئی۔

"ہونہہ۔۔۔ جل ککڑا۔ اس نے تو سوچا ہوگا کہ ساری عمر مجھے یونہی اپنے احسان تلے دبا کر رکھے گا"۔ کڑھ کر غلط ہی سوچا۔ اور پھر سوچنے لگی کہ نمیر کو ملنے کے لیے کون سی جگہ بتانی چاہیے۔

"ایک چکر پارلر ہی کا لگا لو۔ کیسی اجڑی شکل بنالی ہے پیپروں کے دوران"۔ تائی جان نے کوئی تیسری بار ملاحہ کو ٹوکا تو وہ جو پہلے ہی بھری بیٹھی تھی چڑ گئی۔

"کیوں۔۔۔ ایسا کیا ہونے والا ہے اس گھر میں جس کی تیاری کے لیے پارلر کے چکر لگانا شروع کر دوں"۔ انہوں نے گہری نگاہ ملاحہ پر ڈالی۔

"لڑکے والے تمہیں دیکھنے آرہے ہیں شکل تو ڈھنگ کی بنا لو تب تک"۔

"جس کو ایسی ہی شکل اچھی لگے وہی آئے بس یہاں۔ میں تو ایسی ہی ہوں" وہ تنک کر بولی۔

"خیر۔ ایسی بھی بہت پیاری ہو۔" انہوں نے فوراً بھانپ کر راستہ روک دیا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ملاحہ کھل کر اس معاملے میں سامنے آئے۔

"میری طرف سے ابھی سے انکار ہے بس"۔ وہ شاید سود و زیاں سے بے نیاز ہو چکی تھی۔ اور کچھ تائی جان کا اس روز کبیر کو بہت زور دے کر ڈرائیور کہنے کا بھی اثر تھا۔

"بکو مت۔۔۔ کنوار کوٹھا ڈال کر بیٹھو گی کیا"۔ انہوں نے درشتی سے کہا اور پھر اسے وہیں ٹوک گئیں۔

"مہر ماہ کو دیکھو اور نصیحت پکڑو۔ زندگی کو گھن لگ گیا ہے اس کی"۔

"وہی تو امی۔۔۔ محبت نہ ملے تو زندگی کو گھن لگ جاتا ہے"۔ وہ آزردہ ہوئی۔ تائی جان کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا۔ یہ ان کی ناک تلے کیسا کھیل کھیلا جاتا رہا تھا جس سے وہ بے خبر رہیں۔

"تم کہنا کیا چاہتی ہو ملاحہ؟" انہوں نے تیز لہجے میں پوچھا تو وہ مرجھا سی گئی۔

"میں ابھی اس جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہتی امی۔۔۔"

"بیٹیاں عزت و آبرو سے وقت پر اپنے گھروں کی ہو جائیں تو والدین کی عزت بھی برقرار رہتی ہے۔" وہ جتانے والے لہجے میں بولیں تو ملاحہ ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔

"اور مجھے اپنی بیٹیوں پر بہت مان ہے۔" وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اٹھ گئی تھیں۔

"امی۔۔۔" وہ اس کی پکار پر دروازے تک جا کر رک گئیں۔

"اگر میں کہیں اور شادی کرنا چاہوں تو۔۔۔؟" اس کا جھجکا ہوا سا لہجہ کانوں سے ٹکرایا تو صدیقہ بیگم کا دل ڈول گیا۔ ملاحہ منتظر نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"تو اسے کہو رشتہ بھیجے۔۔۔ دیکھ لیں گے ہم"۔ وہ مضبوط مگر بظاہر لاپرواہ انداز میں کہتی کمرے سے نکل گئیں تو ملاحہ اچھل کر کھڑی ہوئی۔

"یس۔۔۔۔" خوشی سے بھرپور نعرہ لگا کر اس نے فوراً کبیر کو کال ملانے کے لیے موبائل اٹھا لیا۔

اس نے نمیر کو ایک بہت اچھے ریسٹورنٹ میں ملنے کو کہا۔

☆☆☆

"آآآہ۔۔۔۔ ہماری پہلی ڈیٹ۔۔" اس کا مسکراتا ہوا لہجہ مہر ماہ کو کرنٹ لگا گیا۔

"ہاں۔ گن لے کر آؤں گی تمہاری فوتگی کی یہی ڈیٹ بن جائے شاید" وہ جل کر بولی۔

"چچ چچ۔۔۔" وہ متاسفانہ بولا "اتنا شوق ہے بیوہ ہونے کا"

"فضول باتیں مت کرو نمیر۔ میری زندگی کی بربادی کی وجہ صرف تم ہو' یہ مت بھولا کرو" وہ اسے ٹوک کر بولی۔ ارادہ اس کی گزشتہ گفتگو کا جواب دینا بھی تھا۔ وہ خاموش ہو گیا۔

"تم بتاؤ کتنے بجے تک آؤں میں۔۔۔"

"جگہ طے کرلی ہے تو وقت بھی تم ہی طے کرلو"

"آغا جان تم سے ملنا چاہتے ہیں' میں نے انہیں اس ملاقات کے بارے میں نہیں بتایا کیونکہ پہلے میں تم سے ملنا چاہتی ہوں" اسے وقت بتا کر مہر ماہ نے بتایا تو وہ چونکا۔

"تم سے کہا انہوں نے؟"

"ہاں۔۔۔ وہ تم سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ شریعت میں کہاں لکھا ہے کہ دادا کی زندگی میں پوتا اپنے حصے کا دعویٰ کرسکتا ہے"

"جب کورٹ میں جاؤں گا تب انہیں پتا چلے گا کہ پاکستان کا قانون کیا کہتا ہے اس معاملے میں۔" وہ تلخی سے ہنسا۔

"اب جبکہ تم تسلیم کر چکے ہو کہ تم نے مجھے بدلہ لینے کے لیے استعمال کرکے زیادتی کی ہے تو یاد رکھنا تمہیں جائیداد میں سے حصہ ملے یا نہیں۔۔۔ مجھے تم سے طلاق چاہیے" مہر ماہ نے سختی سے کہا۔ نمیر کے اعتراف جرم نے اس کا حوصلہ بڑھا دیا تھا۔

"اور اگر میں بہت ہینڈسم نکل آیا تو؟" وہ مسکراہٹ آمیز لہجے میں بولا۔

"تم پھر بھی ناقابل معافی ہو نمیر آفندی" مہر ماہ کا لہجہ پھیکا پڑا تو وہ مزید کچھ کہہ نہیں سکا۔

☆☆☆

"دماغ ٹھیک ہے تمہارا۔۔۔ گولی کھانے کا پروگرام ہے کیا؟" سومیہ اس کی بات سن کر بدکی۔ نمیر کا انداز پرسکون تھا۔

"میں سمجھتا ہوں کہ اب میں ساری سچویشن کو بہت اچھی طرح سنبھال سکتا ہوں"

"اور مہرو۔۔۔؟" سومیہ نے طنزیہ کہا۔ تو نمیر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی' اس نے سومیہ کی طرف دیکھا۔ وہ اسی کو دیکھ رہی تھی۔

"وہ بڑی مہربان بندی ہے تم تو جانتی ہی ہو اسے اب"

"فیصلہ تمہارے خلاف بھی آسکتا ہے نمیر. خوش گمان مت ہو" سومیہ نے اسے تیار کرنا چاہا۔ نمیر کی مسکراہٹ سمٹی۔

"جانتا ہوں۔۔۔ اور کسی خوش فہمی کا شکار بھی نہیں ہوں۔ جتنی زبردستی کرچکا اس کے ساتھ اس سے زیادہ اب اور کوئی زیادتی نہیں۔۔۔"

"بیسٹ آف لک" وہ پژمردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی تھی۔

☆☆☆

"آپی۔۔۔ کہاں کی تیاری ہے تم سے ایک بات کرنا تھی" ملاحہ اس کے کمرے میں آئی تو وہ نیوی بلیو گرم کڑھائی والے سوٹ پر لمبا سویٹر پہن رہی تھی۔ بال بنے ہوئے اور دولن شال سلیقے سے بیڈ پر پھیلا رکھی تھی۔ البتہ

چہرہ [illegible] لیپاپوتی سے پاک تھا۔ مہر ماہ نے جلدی سے سویٹر کے سامنے کے بٹن بند کیے اور ذرا جھک کر کورٹ شوز میں پاؤں ڈالے۔

"ابھی تو بالکل بھی نہیں ملی! ایک سیکنڈ بھی نہیں میرے پاس۔ میں آل ریڈی پندرہ منٹ لیٹ ہوں" اس نے ملاحہ کے ستے ہوئے چہرے پر توجہ دیے بنا شولڈر بیگ کندھے پر ڈالا اور شال اٹھا کر لپیٹتے ہوئے اس کا رخسار چھو کر الوداعی انداز میں مسکرا کر ایک نظر خاموش بیٹھی زرنگار پر ڈالی اور کمرے سے نکل گئی۔ ملاحہ دھم سے بستر پر بیٹھی تو دل رونے کو چاہ رہا تھا۔ کبیر کے ساتھ وہ مقررہ ریسٹورنٹ پہنچی تو ساری بہادری جیسے ہوا میں تحلیل ہوگئی۔

"میں یہاں رکتا لیکن موحد صاحب نے آپ کو چھوڑ کر فوراً آفس پہنچنے کا کہا ہے۔" کبیر نے معذرت خواہانہ کہا تو وہ دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کرتی سنجیدگی سے بولی۔

"اٹس او کے۔۔۔ لیکن واپسی کا جو وقت بتایا ہے اس پر ضرور آجانا" وہ سر ہلاتا گاڑی آگے نکال لے گیا تو مہر ماہ ریسٹورنٹ کے داخلی دروازے کی طرف بڑھی۔ دل سخت پریشان اور ہاتھ پاؤں میں عجیب سی سنسناہٹ تھی۔

"یا اللہ۔۔۔ سب خیر رکھنا"

وہ اندر داخل ہوئی۔۔۔ گھبرائی ہوئی ایک نظر سارے ہال پر ڈالی۔۔۔ ہر مرد پر نمیر ہی کا شبہ ہوا تو وہ خود کو تسلی دیتی آہستہ سے آگے بڑھی۔

"ٹیبل نمبر فورٹین" اس نے پاس لپک کر آنے والے بیرے کو بتایا۔

"ادھر آئیے میم۔۔۔" وہ مؤدبانہ کہتا اس کے آگے چل پڑا۔ مہر ماہ کا دل اصل سے دگنی رفتار میں دھڑک رہا تھا۔ اتنی ٹھنڈ میں بھی پیشانی سے پسینہ پھوٹ پڑا۔۔۔ وہ اپنے شوہر سے پہلی بار ملنے والی تھی۔۔۔ بلکہ اسے پہلی بار دیکھنے والی تھی۔ ٹیبل خالی پڑی تھی۔

"یہاں کوئی آیا نہیں ابھی؟" اس نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے بیرے سے پوچھا۔

"جی ایک صاحب آئے ہوئے ہیں' شاید واش روم گئے ہوں گے" وہ بتا کر چلا گیا مہر ماہ ٹھنڈی پڑ گئی۔ کرسی پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھی۔ بیگ میں سے موبائل نکال کر ٹیبل پر رکھا۔ شاید وہ رابطہ کرے۔

اگر آج مجھ سے نہ ملا تو واجب القتل ہوگا یہ انسان وہ بھی میرے ہاتھوں۔ وہ انتقامی انداز میں سوچ رہی تھی۔

"ایکسکیوزمی۔۔۔ مہر ماہ نمیر آفندی!" کوئی بم دھماکا بھی ہوتا تو وہ یوں نہ بدکتی جیسے اس آواز کو سن کر بری طرح چونک کر آنے والے کو دیکھا۔

سنجیدہ وجیہہ چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ شاید مہر ماہ ہی جیسے۔ وہ ابھی پہلے ہی جھٹکے سے نہ سنبھلی تھی کہ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا آئی ڈی کارڈ نکال کر مہر ماہ کے آگے ٹیبل پر ڈالا۔

"نمیر وقار آفندی۔ غور سے چیک کرلو اصلی ہے بالکل" وہ بہت اطمینان سے کہتا اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ رہا تھا۔ بنا کسی ندامت اور شرمندگی کے۔ اور مہرو۔۔۔

وہ پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتی اب کپکپاتے ہاتھوں سے اس کا آئی ڈی کارڈ اٹھا کر دیکھ رہی تھی۔ ڈیجیٹل شناختی کارڈ میں دھوکے والی تو کوئی بات ہی نہ تھی۔ ساتھ اسی شخص کی تصویر اور نام۔۔۔

نمیر وقار آفندی۔

مہر ماہ کی نظر ڈبڈبا گئی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

صدف آصف

نادانیاں

مارننگ شو کا موضوع ''ماں کی عظمت'' تھا۔ ریحانہ بیگم بڑے غور سے لاؤنج میں بیٹھی پروگرام سننے میں مگن تھیں۔

''ماں کی محبت ایک ایسا اتھاہ سمندر ہے جس کی گہرائی ناپنا، انسانی عقل سے بالاتر ہے۔'' میزبان نے مسکرا کر کہا، جس کے بعد دیگر شرکاء بھی ماں جیسی ہستی کو بڑے خوبصورت الفاظ میں خراج تحسین پیش کرنے لگے۔

''جہاں لفظ ماں آجائے سمجھو ادب کا مقام آگیا۔ ماں ایک ایسی ہستی ہے جو اولاد کے دکھوں، مصیبتوں اور پریشانیوں کو اپنے آنچل تلے چھپالیتی ہے مگر اس کے چہرے پہ شکن بھی نہیں آتی۔'' ایک مہمان نے بڑی عقیدت واحترام سے کہا۔

''سنو۔'' ریحانہ بیگم نے کچھ سوچ کر آنکھیں گھمائیں اور چھوٹی بیٹی شائلہ کو گھونسا رسید کیا۔

''کیا ہوا اماں؟'' اس نے بازو سہلاتے ہوئے پلٹ کر پوچھا۔ وہ اسکول جانے کے لیے ماں سے چٹیا بندھوانے آئی تھی۔

''ذرا اس کی آواز تو تیز کردو۔ دیکھو کیسی حق اور سچ بات کر رہے ہیں۔'' انہوں نے مسکرا کر ہدایت دی۔

''اچھا بھئی۔۔ کرتی ہوں۔'' ریحانہ کی ایما پر شائلہ نے منہ بنایا اور ٹی وی کی آواز اتنی بڑھادی کہ آفس جانے کی تیاری میں مشغول بڑے بھائی اور بھابھی کے کانوں تک جاپہنچے۔

پروگرام کے اختتام پر میزبان نے بڑے میٹھے انداز میں کہا کہ ''ماں کسی کو بددعا نہیں دیتی مگر جس شخص نے اپنی ماں کو ناراض کردیا، سمجھو دنیا سے بھی وہ شخص نامراد گیا اور آخرت میں بھی نامراد رہا۔''

''یا اللہ...... مجھے ماں کا فرماں بردار رکھنا۔'' یہ سب سنتے ہوئے سکندر کا دل لرزنے لگا، وہ گڑگڑایا۔ ان ہی باتوں کے زیر اثر بیوی کے پکارنے پر بھی جب کمرے سے باہر نہیں نکلا تو مجبوراً ضوباریہ کو اسے بلانے کے لیے واپس آنا پڑا۔

''چلیں...... ناشتہ کرلیں...... آفس جانا ہے یا نہیں؟'' اس نے شوہر کو خیالوں میں گم پایا تو بازو پر ہاتھ رکھ کر چونکایا۔

''میں اماں کے پاس جارہا ہوں، تم ناشتہ وہیں لے آؤ۔'' وہ زودھے پن سے بولتا ہوا تیز قدموں سے لاؤنج کی طرف بڑھ گیا۔ ضوباریہ نے صبح صبح شوہر کی بے رخی محسوس کی تو پیر پٹختی ہوئی کچن کی جانب بڑھ گئی۔

☆☆☆

سکندر شاہ کے دفتر جانے کے بعد ضوبی نے ایک نگاہ آئینے پر ڈالی اور اپنا تنقیدی جائزہ لیا، تھکا تھکا سا چہرہ، خشک جلد، بے رونق بال اور نڈھال سا وجود۔ شادی شدہ زندگی میں جاری چپقلش نے اس پر گہرے اثرات چھوڑے تھے، وہ جو یونی ورسٹی کی انتہائی باصلاحیت، نرم طبیعت اور پرکشش لڑکی کہلاتی تھی۔ شادی کے ایک سال میں اتنی بدل گئی کہ



دوسروں کے ساتھ ساتھ سکندر کو بھی حیرت ہوتی۔ کہیں لڑکی بدل تو نہیں گئی، اسے وہ ضوباریہ احتشام یاد آتی جس کی سریلی گھنٹیوں جیسی ہنسی پورے ڈپارٹمنٹ میں گونجتی رہتی تھی۔

ضوبی بھی کیا کرتی، پیا کی دہلیز پار کرتے ہوئے اس کی حسین آنکھوں میں سکندر کے ساتھ ایک خوشگوار زندگی کے خواب سجے تھے مگر شادی کے چند ہفتوں میں ہی خواب نہ صرف ادھورے رہ گئے، بلکہ ان کی تعبیر الٹی نکلی۔ ریحانہ بیگم ایک سخت گیر ڈکٹیٹر ٹائپ کی خاتون تھیں۔ سکندر کی چار بہنیں تھیں، بڑی والی شادی شدہ بہن کا آنا جانا ہر وقت میکے میں لگا رہتا، ہفتے میں ایک بار اس کے پورے سسرال کی دعوت کرنا لازمی ہوتا ورنہ بقول نائلہ اس کی ساس طعنے دیتی ہیں کہ بھائی پوچھتا نہیں۔ ایسے روایتی ماحول میں ساری ذمہ داریوں کا بوجھ اس کے نازک کاندھوں پر آگرا۔ ریحانہ نے پہلے دن سے بہو کو دبا

کرر کھنے والی پالیسی اپنائے رکھی۔ وہ صبح چھ بجے سے اٹھ کر جو گھر کے کاموں میں الجھتی تو رات گئے تک اسے آئینہ دیکھنے کی بھی فرصت نہ ملتی۔ تھکا ہارا وجود کمرے میں آتا تو صرف بستر پر گرنے کی خواہش من میں جاگ اٹھتی۔

سکندر ایک کمپنی میں بڑے اچھے عہدے پر فائز تھا، آمدنی بھی معقول تھی لیکن گھر کرائے کا تھا۔ بجلی و گیس کے بل، گھر کا راشن بھرنے کے بعد اس کے چھوٹی بہنوں کے تعلیمی اخراجات کی مد میں معقول رقم خرچ ہو جاتی۔ اس پر ہر وقت کی مہمان داری، اسی لیے جو رقم وہ مہینے کے خرچ کے لیے ضوباریہ کے ہاتھوں پر رکھتا تو اتنی قلیل ہو چکی ہوتی کہ اس میں گزارا مشکل ہو جاتا۔

وہ صبر و شکر کے ساتھ کم پیسوں میں بھی جیسے تیسے کھینچ تان کر گزارا کر لیتی مگر گھر کے باقی امور نمٹانے میں اسے اپنی ساس کے ساتھ ساتھ تینوں نندوں کا ذرا سا بھی تعاون حاصل نہیں تھا۔ سکندر کی بہنیں بھائی کے سامنے تو مارے باندھے ہاتھ پیر ہلا لیتیں مگر اس کے جاتے ہی فلموں کی رسیا عائلہ کوئی موی لگا کر بیٹھ جاتی تو دوسری فائزہ کے چہرے کے آگے کوئی ڈائجسٹ سج جاتا، وہ ناولوں کی دیوانی تھی۔ چھوٹی والی شائلہ کو ریحانہ نے اپنے قابو میں کیا ہوا تھا۔ وہ ہر وقت اس سے بالوں میں تیل لگواتیں یا ہاتھ پیروں کی مالش کروانے کے ساتھ ساتھ بہو پر کڑی تنقید کرتیں تو اس کا دل سکڑنے لگتا۔ ان کا بس ایک ہی مقصد ہوتا کسی طرح ضوباریہ یہ مان جائے کہ وہ بڑی خوش قسمت ہے جو اس گھر میں اس کا بیاہ ہوا ورنہ ان کی شادی شدہ بیٹی نائلہ کے سسرال والے اس پر جتنا ظلم کرتے ہیں وہ بے چاری تو کسی سے کہہ سن بھی نہیں سکتی۔ باقی کا پورا زور وہ بہو کو پھوہڑ اور بدسلیقہ ثابت کرنے پر لگا دیتیں۔ اسی وجہ سے ضوباریہ کے مزاج میں کڑواہٹ بڑھنے لگی۔

☆☆☆

''یہ سائیں تو بہوؤں کو کبھی خوش نہیں دیکھ سکتیں۔'' اس نے ٹی وی آن کیا تو ڈرامے کے ڈائیلاگ اس کے دل میں اترتے چلے گئے۔ منظر میں کچھ سہیلیاں، اپنی دوست کو سمجھا رہی تھیں، جس کی شادی ہونے والی تھی۔ وہ دلچسپی سے بیٹھ کر ڈراما دیکھنے لگی۔

''ہاں..... تو اور کیا جب تک بیٹے اور بہو میں لڑائی نہ کروا لیں ان کا کھانا ہضم نہیں ہوتا۔'' ایک لڑکی نے ہاتھ نچا نچا کر گواہی دی۔

''یہ تو چیکے چیکے بیٹوں کے کان بھر کر جانے کون سا ثواب کماتی ہیں۔'' اس ڈائیلاگ پر تو لاؤنج میں آتی ریحانہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی، یوں لگا جیسے دل کی چوری پکڑی گئی ہو۔ ضوباریہ نے نگاہ اٹھا کر معنی خیز نگاہوں سے ساس کی طرف دیکھا تو ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

''بہو کبھی اللہ رسول بھی کر لیا کرو۔ یہ کیا ہر وقت فضول باتوں میں پڑی رہتی ہو۔'' کچھ اور نہ بن پڑا تو اس پر ابل پڑیں۔

''چلو نماز کا ٹائم ہو رہا ہے، اس وقت یہ شیطانی چرخہ بند ہی رکھا کرو تو اچھا ہے۔'' جھٹ سے ریموٹ اس کے ہاتھ سے لیا اور ٹی وی بند کر دیا۔ ضوباریہ نے ہکا بکا ہو کر انہیں دیکھا۔ اور نم آنکھوں کے ساتھ اٹھ گئی۔

اس دن اس کی شامت آگئی۔ ریحانہ پورے دن بلاوجہ اسے بات بہ بات سناتی رہیں، ضوبی چپ چاپ اندر ہی اندر گھٹتی رہی۔ سکندر شام کو گھر لوٹا اور کمرے میں تھکن اتارنے کے بہانے بیوی سے پیار بھری دو باتیں کرنے کا خواہش مند ہوا۔ اس نے اپنے اندر کی بھڑاس اس پر نکالنے میں دیر نہیں لگائی۔ یہ کوئی ایک دن کی بات تو تھی نہیں، آئے دن اسے ریحانہ سے کوئی نہ کوئی شکایت رہتی تھی، جس میں وہ کسی حد تک حق بجانب بھی تھی۔ شروع شروع میں تو سکندر نے بیوی کی دلجوئی کرنے کی بڑی کوشش کی، گھر کے گھٹے گھٹے ماحول سے نکالنے کے لیے بھی

باہر کھانا کھلانے لے جاتا اسے پیار سے مناتا کچھ اور نہیں بن پاتا تو واک کے بہانے دونوں میاں بیوی نکل جاتے اور مٹھایاں کھا کر واپسی ہوتی۔ اس طرح سے ضوبی کا موڈ خوشگوار ہو جاتا، چہرے کی چمک بڑھ جاتی مگر جب روزانہ کا ایک ہی معمول بن گیا تو وہ بھی چڑنے لگا، اس پر ریحانہ کو بھی بیٹے کے چونچلے زہر لگنے لگے۔ تنہائی میں بٹھا کر اسے خوب سنایا تو سکندر نے مجبوراً باہر جانا کم کر دیا۔ یہ بات ان دونوں کے بیچ میں لڑائی کی پہلی وجہ بنی اور پھر اس کے شکوے شکایت بڑھتے چلے گئے۔

سکندر کو بھی ایک دوست ایک ہمدرد کی ضرورت تھی مگر روتی صورت والی بیوی کو دیکھ کر پشیمان ہونے لگتا کہ جس کو خوشیوں کی ضمانت دینے کا بول کر بڑے اعتماد سے شادی کر کے لایا تھا، اس کو ایک لمحے کی خوشی دینا بھی مشکل ہو گیا تھا۔

☆☆☆

ضوباریہ احتشام سب سے منفرد اور یکتا دکھائی دیتی تھی۔ شاید سکندر کو بھی اس کی خوبصورتی کے ساتھ ساتھ شیریں زبانی نے متاثر کیا تھا، وہ دونوں ایک ہی یونی ورسٹی میں پڑھتے تھے۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کر ضوباریہ کا انتخاب کیا تھا۔ وہ اسے نرم مزاج اور صلح جو قسم کی لڑکی سمجھتا تھا مگر گزرتے وقت کے ساتھ سکندر کو بہت مایوسی ہوئی تھی۔

ان حالات میں ضوباریہ بھی منفی ہوتی گئی، اس پر بھی منفی سوچیں اس قدر حاوی ہو جاتیں کہ اسے سکندر سے شادی پر پچھتاوا ہونے لگتا۔ یہ وہ شخص نہیں جس نے اسے گھر بھر کی مخالفت مول لے کر اپنایا تھا، یہ تو کوئی اور ہی انسان تھا، جس کے دل میں بیوی کی نہیں صرف اپنی ماں اور بہنوں کے لیے گنجائش تھی۔

بات یہ نہیں تھی کہ سکندر کو ضوباریہ سے محبت نہیں رہی یا اسے گھر کے مسائل کا ادراک نہیں تھا۔ بلکہ وہ تو دل میں اعتراف کرتا تھا کہ اس کی ماں اکثر ضوباریہ سے زیادتی کر جاتی ہیں مگر فی الحال اس مسئلے کا کوئی

ایسا حل موجود نہیں تھا جس پر دونوں فریق مطمئن ہو سکیں۔ وہ ان دونوں کے بیچ گھن چکر بنا رہتا۔ پھر دوستوں کے سمجھانے پر بیوی کو سمجھاتا کہ یہ کسی اس ایک گھر کی کہانی نہیں، یا ضوبی کوئی پہلی بہو نہیں، جسے ایک بڑے سسرال کے ساتھ گزارا کرنا پڑ رہا ہے۔ مگر جب وہ اس کی ماں کے حوالے سے سوال اٹھاتی تو سکندر زچ ہونے لگتا۔

سکندر کا موقف تھا کہ اکثر والدین بڑھاپے میں ایسے ہی بچوں جیسی ضد باندھ کر بیٹھ جاتے ہیں مگر انہیں چھوٹوں کی طرح ڈانٹا پھٹکارا تو نہیں جا سکتا۔ اس نے بیوی سے درخواست بھی کی کہ ایک بوڑھی عورت کو اس عمر میں آ کر بدلنے کی کوشش کرنے کے بجائے خود کو بدلنے کی سوچے اور اس گھر کے ماحول میں ایڈجسٹ کرنے کی کوشش کرے۔ مگر وہ منہ بنا کر اٹھ جاتی۔

سکندر بڑے پیار سے سمجھانے کی کوشش کرتا کہ وہ ساس کی باتوں پر درگزر سے کام لینا شروع کر دے، تب ہی گھر کا ماحول پر امن رہ سکتا ہے۔ چند دنوں تک تو اس کی باتوں کا اثر قائم رہتا مگر پھر کوئی نہ کوئی نئی بات ہو جاتی اور ضوباریہ تن فن کرتی ہوئی شوہر کے سامنے کھڑی ہو جاتی اور اس کی ماں کو برا بھلا کہنے لگتی۔ یہ ہی بات سکندر کے لیے ناقابل قبول تھی، جیسی بھی تھی ریحانہ اس کی ماں تھیں اور وہ اپنی ماں کی برائی کسی کے منہ سے نہیں سن سکتا تھا پھر چاہے وہ جان سے عزیز بیوی ہی کیوں نہ ہو۔

☆☆☆

ریحانہ بیگم نے گھر میں چند دنوں سے ایک نیا جھگڑا کھڑا کر رکھا تھا، جس کی وجہ سے ایک دفعہ پھر گھر کا ماحول بالکل خراب ہو گیا تھا۔ اس بار ضوباریہ بالکل بھی ایسا نہیں چاہتی تھی۔ ویسے بھی جب سے ڈاکٹر نے اسے خوش خبری سنائی تھی کہ وہ امید سے ہے، اس کا ذہن دوسری باتوں میں الجھا ہوا تھا خاص طور پر اسے آنے والے اخراجات کی فکر ابھی سے ستانے لگی، بہت سوچ بچار کے بعد اس نے بچت کا

ایک نیا طریقہ ڈھونڈا۔ اب وہ اپنی منجھلی نند کو لے کر ہفتہ بازار چلی جاتی جہاں شام کے وقت سبزیوں اور دوسری اشیاء کے دام کم ہو جاتے تھے۔ اسی لیے وہ پورے ہفتے کی سبزی ترکاری خریدنے کے بعد لدی پھندی گھر واپس آتی اور پھر انہیں کاٹ کر فریج میں اس طرح سے محفوظ کرتی کہ پورے ہفتے گزارا ہو جائے۔ اتنی مشقت کے باوجود کسی جانب سے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی الٹا ہر روز سبزیاں پکانے پر اس کی جی بھر کر کلاس لگائی جاتی۔ حالاں کہ اس کے ہاتھ میں بہت ذائقہ تھا اور وہ ہر بار ہنڈیا ایک نئے انداز میں پکاتی۔ اس کے باوجود اسے صبر کے گھونٹ پیتے ہوئے اپنے معمولات پر کاربند رہنا پڑا۔

اب گھر میں صرف چھٹی والے دن بھنا گوشت پکتا یا پھر جس دن نائلہ کے سسرال والوں کو آنا ہوتا ورنہ باقی کے دنوں میں تھوڑے سے قیمے میں ڈھیروں سبزی ڈال دی جاتی یا کبھی دال چاول کے ساتھ آلو کے کباب تل دیے جاتے یا بھنی مونگ کی دال کے ساتھ پودینے کی چٹنی اس طرح سے کچھ بچت ہونے لگی تو اس نے سکون کا سانس لیا اور ان پیسوں کو جوڑ کر اپنے میکے کی طرف کمیٹی ڈالنے کا سوچنے لگی تاکہ ڈلیوری کے وقت شوہر پر ایک دم سے بوجھ نہ پڑے مگر برا ہو اس کی شادی شدہ نند نائلہ کا جو ایک دن بغیر اطلاع کے آگئی اور ماں کو مونگ کی دال کھاتا دیکھ کر خوب گرم ہوئی، بھابی کو چار باتیں سنانے کے ساتھ بھائی کو بھی جورو کا غلام کہہ ڈالا۔ ضوباریہ نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر وہ آپے سے باہر ہوئی جا رہی تھی۔ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی کہ ”باپ نہیں رہا تو تم لوگ ہماری ماں کی ایسی درگت بنا رہے ہو۔ اماں کے حلق سے ایسے کھانے کبھی نہ اترے۔ جو آج بیٹے کے راج میں کھانے پڑ رہے ہیں“۔

بیٹی کی باتوں سے ریحانہ کے دل میں بھی گرہ پڑ گئی اور دوسرے دن جب ضوباریہ نے رات کے کھانے پر بینگن کا بھرتا اور روٹی لا کر ان کے سامنے رکھی تو انہوں نے منہ سے کچھ نہ کہا۔ ہاتھ سے پلیٹ سرکا کر کر منہ موڑ کر لیٹ گئیں۔ ضوباریہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئی۔ چھوٹی بہن نے بھائی کے گھر میں گھستے ہی ماں کے کھانا نہ کھانے کی اطلاع پہنچا دی تو وہ بیوی سے کھانے کی ٹرے لگوا کر ریحانہ کے کمرے کی جانب بڑھا۔

”مجھ سے نہیں کھائی جاتی یہ موئی سبزیاں اور بیماروں جیسی دال۔“ انہوں ناک بھوں چڑھا کر بیٹے کو گھورا۔

”اماں۔ اتنی مہنگائی میں کہاں سے روزانہ گوشت پکاؤں۔۔ وہ بھی بکرے کا۔“ وہ جو شوہر کے پیچھے ساس کے کمرے میں داخل ہوئی تھی چڑ کر بولی۔

”بہو کیا تمہارے میکے سے اس گھر کا خرچ چلتا ہے؟ “ بات سمجھنے کے بجائے وہ ضوباریہ پر الٹ پڑیں۔

”میرا۔۔ یہ مطلب نہیں تھا۔ اماں۔ مگر“ وہ اپنی صفائی دینے لگی مگر سکندر نے اس کا ہاتھ دبا کر مزید بولنے سے روک دیا۔

”اگر ماں کو ایک ٹائم من پسند کھانا نہیں کھلا سکتے تو تف ہے تمہاری ایسی کمائی پر۔“ ریحانہ بیگم نے بیٹے کو آنکھیں دکھائیں تو اس نے سر جھکا کر ہاتھ جوڑ دیے اور ماں کو یقین دلایا کہ کل سے ان کو کھانے میں بکرے کا گوشت مل جائے گا مگر خالی پیٹ سو کر وہ اسے گناہ گار نہ کریں۔

بیٹے کی منت سماجت کے بعد ریحانہ بیگم نے مزے لے لے کر بھرتہ روٹی کھائی اور پانی کا گلاس تھامتے ہوئے بہو کو فتح مندی سے دیکھا۔ ضوباریہ کا دل ٹوٹ گیا۔ وہ یہ سب خالی اپنے لیے تو نہیں کر رہی تھی، اگر چار پیسے بچتے تو ان کے بیٹے کے ہی کام آتے۔ وہ اتری ہوئی صورت کے ساتھ ٹرے اٹھا کر ساس کے کمرے سے باہر نکل آئی۔ سکندر کو ضوبی کی دل آزاری کا خیال آیا تو وہ سر جھکائے اس کے پیچھے چل دیا۔ کمرے میں جاتے ہی اس نے بیوی کو پاس بٹھایا اور پیار سے دھیرے دھیرے سمجھانے

لگا۔ ضوباریہ کچھ سمجھنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ جل کر جب اس نے شوہر سے اس مسئلے کا حل پوچھا تو سکندر سوچ میں پڑ گیا۔

ماں کی شکایت کے ازالے کے لیے سکندر نے ایک بیچ کا راستہ نکالنے کا فیصلہ کیا اور ضوباریہ سے کہا کہ وہ صرف ماں جی کے لیے بکرے کا تھوڑا سا گوشت پکا دیا کرے باقی لوگ وہ ہی کھائیں گے جو گھر میں پکے گا۔ سکندر کی اس منطق پر ضوباریہ کا بلڈ پریشر ہائی ہونے لگا۔ ایسی حالت میں جب کام کرنا بھاری لگتا تھا اب اسے دو طرح کی ہنڈیا پکانا پڑیں گی۔ ساس کی وجہ سے اس کا دماغ پہلے ہی گھوما ہوا تھا، شوہر کی بات سن کر اس نے نہ صرف لڑائی کی بلکہ طعنے بھی دیے کہ اس کی ماں کے حلق سے کیوں دال سبزی نہیں اتر سکتی جب کہ گھر کے باقی لوگ بھی تو سادہ کھانا کھا رہے ہیں، انہیں کیوں ہر دوسرے دن بکرے کا گوشت چاہیے ہوتا ہے، ان کی فرمائش تو کبھی ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی وغیرہ وغیرہ۔ بیوی کی بدزبانی پر سکندر کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ اپنی ماں کے بارے میں ایسے کلمات سننا اسے بہت ناگوار گزر رہا تھا، اس نے ضوباریہ کو بری طرح سے جھڑکا اور باہر نکل گیا۔ وہ حق دق رہ گئی۔

”زندگی کی چکی میں پستے پستے میرا وجود نڈھال ہونے لگا ہے مگر یہ شخص میری قربانیوں کی قدر کرنے کی جگہ الٹا مجھ سے خفا رہتا ہے۔ وہ اس کی چوڑی پشت کو دیکھتے ہوئے سوچنے لگی۔

☆☆☆

”اگر تم گھر کے کام کر رہی ہو تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں، ساری عورتیں ایسے ہی گھر چلاتی ہیں۔“ دفتر سے واپسی پر سکندر نے اسے پھیکے سے لباس اور اجڑے حلیے میں دیکھا تو چڑ کر رہ گیا۔

”میں اپنی طاقت سے بڑھ کر کام کرتی ہوں، روزانہ دو دو کھانے بناتی ہوں، برتن دھوتی ہوں، کپڑے دھوتی ہوں پھر بھی آپ کی اماں بیگم کو مجھ سے شکایت ہی رہتی ہے، ہمیشہ کی طرح اس کی تان ساس پر آ کر ٹوٹی۔

”اب تمہارے حلیہ بگاڑ کر پھرنے کے پیچھے بھی میری ماں کا قصور نکل آیا۔“ اس نے طنز کیا تو وہ سنبھل گئی۔

”کیا کروں، بچت کے چکر میں ماسی نکال دی ہے۔“ ضوبی نے منہ بنا کر جواب دیا۔

”ٹھیک میں مانتا ہوں سب کچھ لیکن کوئی ایسی چڑیل جیسی شکل بنا کر نہیں پھرتا“۔ اس نے جان کر کہا۔

”کیا میں چڑیل لگتی ہوں؟“ وہ ایک دم شیشے کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔

”ویسے یہ تم جیسی ناعاقبت اندیش بیویاں ہیں جو اپنے شوہروں کو خود باہر کا راستہ اپنانے پر مجبور کرتی ہیں۔“ سکندر نے اس کے پیچھے کھڑے ہو کر کہا تو ضوباریہ نے چونک کر آئینے میں شوہر کا عکس دیکھا۔

”آپ کو ایسی باتیں کرتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ اب کیا مجھ سے دل بھر گیا ہے۔“ وہ ایک دم پلٹی اور سکندر کا گریبان پکڑ کر ——— رونے لگی۔

”یار ضوبی...... میں تو مذاق کر رہا تھا۔“ بیوی کو سچ مچ میں روتا دیکھ کر سکندر کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اسے خود سے لگا کر دلاسہ دیا۔

”سنو، تو میری جھلی کے سوا اس پاگل من میں کوئی سما سکتا ہے بھلا۔“ اسے منانے کے لیے دل پہ ہاتھ رکھ کر ڈائیلاگ بھی مار دیا۔

”ایسی حالت میں میرا ہی دم ہے جو گھر کے سارے بکھیڑے تن تنہا نمٹاتی ہوں“۔ شوہر کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے وہ کمر دباتے ہوئے کراہی تو اسے سچ مچ میں اس کی حالت پر ترس آیا۔

”ویسے ان تینوں کو بھی گھر کے کام بانٹو، انہیں بھی دوسرے گھر جانا ہے کہ نہیں؟“ وہ چند دنوں سے جو بات محسوس کر رہا تھا زبان پر لے آیا۔

”میں تو باری باندھ دوں گی مگر اماں۔۔؟“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی، ماحول خراب نہیں کرنا چاہتی

تھی۔
"تم میرے سامنے ان میں کام تقسیم کرنا پھر میں دیکھتا ہوں کہ کون منع کرتا ہے" سکندر کے اعتماد نے اسے اندر تک پرسکون کر دیا۔
"اچھا چھوڑو ان باتوں کو چلو۔ کہیں باہر چلتے ہیں" سکندر نے اسے مسکراتا دیکھا تو جھٹ پٹ پروگرام بنالیا۔ وہ بالوں میں کنگھا کرکے ان ہی کپڑوں میں جانے کو تیار ہوگئی تو سکندر نے ماتھا پیٹ ڈالا۔
"بیوی بنی سنوری رہے تو شوہر کا دل بھی خوش رہتا ہے مگر تم جیسی بے وقوف لڑکی کو کون یہ بات سمجھائے۔" لہجے میں واضح فرمائش تھی۔
"کمر میں شدید درد ہو رہا ہے، اب مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ کپڑے نکالوں" ضوباریہ کے لہجے کی تھکن اس کے دل میں اتر گئی۔
اچھا۔ جناب آپ یہاں بیٹھیں۔ میں اچھا سا ڈریس سلیکٹ کرتا ہوں۔" سکندر نے پیار سے تھام کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بٹھاتے ہوئے اس کے بالوں پر نرمی سے بوسہ دیا۔ وہ اس کی وارڈ روب کی طرف بڑھ گیا مگر ضوباریہ مسحور سی رہ گئی۔ شوہر کے اس پیار بھرے چھوٹے سے عمل نے جیسے اسے دوبارہ زندہ کر دیا۔ یاسیت اڑن چھو ہوگئی، وہ مسکراتی ہوئی بڑے دل سے خود کو سجانے میں لگ گئی۔ بیوی کے کپڑے پریس کرتے سکندر کے کانوں میں بڑے دنوں بعد اس کی سریلی گنگناہٹ گونجی تو لبوں کے گوشوں سے ہنسی چھلک اٹھی۔

☆☆☆

سکندر کی سختی پر ان تینوں نے ڈر کے مارے بھابھی کا ہاتھ تو بٹانا شروع کر دیا، جس کی وجہ سے اس پر کاموں کا بوجھ کچھ کم ہوگیا، مگر اس کے لیے اب ایک نیا امتحان شروع ہوگیا تھا۔ ریحانہ بیگم کو یہ بات بہت ناگوار گزری کہ ان کی لاڈلیاں کام کریں۔ بہو کے لیے ان کی لعن طعن میں مزید تیزی پیدا ہوگئی۔ وہ اب بات بہ بات اسے نشانے پر رکھتیں۔ وہ ایک بار پھر شوہر سے روتے دھوتے ساس کی شکایتیں کرنے لگ گئی۔ اس بات کا کوئی حل تو سکندر کے پاس بھی نہیں تھا۔ وہ ماں کو کیسے سمجھاتا اسی لیے ضوبی کے اندر ایک عجیب سی یاسیت پنپنے لگی، وہ ایسے ماحول کی عادی نہیں تھی خوش اخلاقی اس کے مزاج کا خاص وصف تھی جس کے بل پر پورا خاندان اس کا شیدائی تھا، اس نے ہمیشہ لوگوں کی تعریفیں سمیٹی تھی مگر شادی کے بعد سے اس کے کان اپنے بارے میں ایک اچھا جملہ سننے کو ترس گئے تھے۔ تنگ آکر اس نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا مگر کبھی کبھی من میں ہوک سی اٹھتی تھی۔
حالات اس کے مخالف یوں ہو جاتے کہ وہ چاہ کر بھی سکندر کو خوش نہیں رکھ پاتی تھی۔۔ جس دن انہیں کسی پارٹی میں جانا ہوتا، ریحانہ بیگم اپنی طبعیت خراب کرکے لیٹ جاتیں۔ اسے ان کے لیے پرہیزی کھانے پکانے کے ساتھ ساتھ دوا وغیرہ کا بھی خیال رکھنا پڑتا۔ ایسے میں ضوباریہ بڑی بے دلی سے تیار ہوتی۔ جو سوٹ ہاتھ میں آتا پہن کر چل دیتی۔ حالاں کہ شادی سے قبل اس کا شمار خوش لباس لڑکیوں میں ہوتا تھا اور اسے بننا سنورنا بہت پسند تھا مگر اب تو جیسے ہر شے سے جی اچاٹ سا رہتا۔ سکندر اکثر اوقات اس کی خود سے لاپروائی پر خوب بگڑتا اور اسے پہلے کی طرح خوش لباس دیکھنا چاہتا تھا مگر وہ ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیتی۔ مگر پھر جب اسے حقیقت کا ادراک ہونے لگا کہ پژمردہ چہرے والی نڈھال عورت سے اس کا مرد کبھی خوش نہیں رہ سکتا تو اس نے خود پر توجہ دینا شروع کر دی۔

☆☆☆

ضوباریہ کے بھائی کے یہاں کئی سالوں کے بعد بیٹا ہوا تو وہ بہت خوش ہوئی بڑے دنوں بعد میکے سے خوشی کی خبر آئی تھی، اس کے بھائی نے بیٹے کا عقیقہ کیا تو اس کے پورے سسرال کو دعوت دی تو وہ اندر سے سہم گئی مگر جب ریحانہ نے بیماری کا بہانہ بنا کر جانے سے معذرت کرلی، اس نے سکون کا

سانس لیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس نے میکے والوں کے سامنے جو بھرم قائم رکھا ہے، وہ ریحانہ کی کسی ایک بات پر کھل جائے۔ عقیقے والے دن اس نے بڑے اہتمام سے تیار ہونے کی ٹھانی۔ خوبصورت اور اسٹائلش بلیو شفون کا سوٹ نکال کر پہنا۔ سلیقے سے کیا گیا میک اپ اسے مزید جاذب نظر بنا رہا تھا۔ کانوں میں سکندر کی طرف سے منہ دکھائی میں دیے جانے والے گولڈ کے نازک سے ٹاپس پہن لیے ہاتھوں پر لوشن لگانے کے بعد چوڑیاں پہنیں آخر میں اسٹائلش سی بلیک سینڈل کا اسٹریپ باندھنے کے بعد سیدھی ہوئی تو سکندر کی توصیفی نگاہیں خود پر مرکوز پائیں۔
سکندر نے کمرے میں گھستے ہی اسے چھیڑا۔ "ماشاءاللہ کس پر بجلیاں گرانے کا ارادہ ہے؟"
"بھئی پھوپھو بنی ہوں، بھتیجے کا عقیقہ ہے، اتنا تیار ہونے کا حق تو مجھے بھی ہے۔" ضوباریہ نے شوخ رنگ کی لپ اسٹک کی ایک اور تہہ نرم ہونٹوں پر سجاتے ہوئے بات بنائی۔
"لو...... جی...... میں ایسے ہی خوش ہو رہا تھا کہ بیگم کو شوہر نامدار کے ارمانوں کا خیال آگیا۔" اس نے سینہ مسلتے ہوئے دکھی ہونے کی ایکٹنگ کی۔
"ہاں تو خوش رہنا اچھی بات ہے۔" وہ نگاہیں چراتے ہوئے اس کے کپڑے نکالنے لگی۔
"سچ بتاؤ نا۔۔ یہ ہار سنگھار میرے لیے کیا ہے نا؟" اس نے ضوباریہ کا چہرہ اپنی جانب موڑا۔
"آپ کی وجہ سے ہی تو میرا ہار سنگھار ہے۔" اسے نگاہیں جھکا کر اعتراف کرتے ہی بنی۔
"ہمیشہ ایسی رہا کرو نا، سچ میں مجھے پشیمانی ہوتی ہے کہ میری وجہ سے تمہاری ہنسی کہیں کھو گئی ہے۔۔" وہ جھک کر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔
"اچھا جناب مگر اس وقت تو آپ جلدی سے چینج کرلیں، کیوں کہ ہم لیٹ ہو رہے ہیں۔" ہنستے ہوئے، گھڑی کی طرف اشارہ کیا۔
"آ بیٹھ میرے پاس تجھے دیکھتا رہوں۔۔ تو کچھ

کہے، نہ میں کچھ کہوں۔" سکندر نے شرارت سے اسے گھسیٹ کر سامنے والے صوفے پر بٹھا دیا اور گنگنانے لگا۔ اس نے قریب ہو کر سکندر کی ٹائی کی ناٹ کسنا شروع کی تو منہ سے چس چس کی آواز نکلنے لگی۔ وہ کھلکھلا کر ہنستی ہوئی بہت پیاری لگی۔ وہ دیکھتا رہ گیا تو۔ ضوباریہ اسے کرتا شلوار تھما کر واش روم کی طرف دھکیلا۔

☆☆☆

کتنے دنوں کے بعد وہ ماں کی فرمائش پر میکے میں رات کو رکی تھی، ورنہ سکندر اسے میکے میں چھوڑتا ہی نہیں تھا اور وہ بھی اس کی محبت کے آگے ہار جاتی۔ کل رات بھی وہ آنکھیں دکھاتا ہوا اکیلا واپس لوٹا تھا، آج اکتیس دسمبر تھی کل یکم جنوری ہونے کے ساتھ ساتھ ان دونوں کی ویڈنگ اینورسری بھی تھی۔ اسی وجہ سے اس نے سکندر کے ساتھ جانے کا ارادہ باندھا، مگر پھر بہنوں کے اصرار پر ایک دن کے لیے رک گئی۔ سو کر اٹھی تو سکندر کی کال آئی ہوئی تھی۔۔ اس نے پورا پلان طے کر رکھا تھا، اپنی زندگی کے یہ حسین پل وہ دنوں ایک دوسرے کی سنگت میں گزارنا چاہتے تھے۔ اسی لیے سکندر نے سمندر کے کنارے جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ اس کے بعد بڑی اچھی جگہ پر انہوں نے ڈنر کرنا تھا۔ فون رکھنے سے پہلے جب سکندر نے اسے بتایا کہ وہ دوپہر تک ضوباریہ کو لینے آرہا ہے تو اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ سارا گھر الٹا پڑا تھا۔ کچھ قریبی مہمان ابھی رکے ہوئے تھے۔ اس نے بہانے سے روکنا چاہا مگر ماں کے آنکھ دکھانے پر شوہر کو لنچ یہیں کرنے کا کہہ دیا اور فون رکھتے ہی کچن کی طرف دوڑ لگا دی تاکہ بھابھی کو بتا سکے کہ اس کا میاں آرہا ہے۔ ابھی وہ کچن کے دروازے تک پہنچی تھی کہ وہاں کا منظر دیکھ کر اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اس کے بھائی اور بھابھی جن کی پیٹھ اس کی طرف تھی، دیگ پر جھکے مصروف تھے۔ الماس کی ہدایت پر اخلاق کل کے بچے ہوئے بکرے کے قورمے میں سے بوٹیاں چھانٹ کر چھوٹے چھوٹے پیکٹ بنا کر فریزر میں رکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کے یہ دونوں ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ اچانک الماس کی غصیلی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی اور جیسے زمین گھومنے لگی۔

"چلیں اور پیکٹ بنائیں تاکہ پورا مہینہ تو آرام سے گزر جائے۔" الماس بولی۔

"اب بس بھی کرو۔" اخلاق نے ناگواری سے بیوی کو گھورا۔

"بس تو ان کو کرنا چاہیے مگر اس مہنگائی میں بھی آپ کے اماں ابا کو تو بس بکرے کا گوشت چاہیے، یہ نہیں دیکھتے کے بیٹا کتنی محنت سے کماتا ہے۔" الماس نے شوہر کو مزید شاپر پکڑاتے ہوئے تقریر جھاڑی تو اخلاق سر جھکا کر دیگ میں چمچ گھما کر بوٹیاں ڈھونڈنے لگا۔

"اب کم از کم ایک دو مہینے کی تو چھٹی ہو جائے گی، کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا اور میں اسی میں سبزیاں ڈال ڈال کر تازہ سالن پکا کر ان دونوں کے آگے پیش کرتی رہوں گی۔" وہ جھلائے ہوئے لہجے میں بولی۔

"ان کا دماغ تو میں ٹھیک کرتی ہوں۔" ضوباریہ کے اندر غصے کی لہر جاگ اٹھی اس نے آستینیں چڑھائیں۔

"بھابھی کی ہمت کیسے ہوئی کہ وہ میرے والدین کے بارے میں ایسی بات کریں۔

اور یہ بھائی کیسے جورو کا غلام بنا ہوا ہے۔" اسے بھائی سے بھی شکوہ ہوا۔ اچانک منظر بدل گیا اور اس نے الماس کی جگہ خود کو اور اخلاق کی جگہ سکندر کو کھڑا پایا۔ دل میں ایک چبھن سی ہوئی۔ کانوں میں اس کی اپنی آواز کی بازگشت گونجنے لگی، ایسے کئی جملے تو اس نے خود بھی سکندر کے سامنے کہے تھے۔ اچانک اسے احساس ہوا کے جب وہ سکندر کے سامنے اس کی ماں کو برا بھلا بولتی ہوگی تو وہ کیسا محسوس کرتا ہوگا۔ بھائی کے چہرے پر چھائی بیچارگی اسے بہت کچھ سمجھا گئی اور وہ چپ چاپ پلٹ گئی۔

☆☆☆

میری باتوں پر آپ کے دل میں بے زاری کے سوا کوئی جذبہ نہیں ابھرتا ہوگا نا۔" ساحل پر بیٹھ کر وہ روٹھی ہوئی تو سکندر نے حیرت سے اس کا چہرہ دیکھا۔

"تم نے ایسا کیوں سوچا؟" اس نے کپکپاتی ضوبی کو شال اوڑھاتے ہوئے نرمی سے پوچھا۔

"کیا آپ بحالتِ مجبوری میرے ساتھ گزارہ کر رہے ہیں۔" اس نے شرمساری سے سوال کیا تو ایک لمحے کے لیے سکندر سے بولا نہیں گیا۔

"میں اپنی نادانیوں پر شرمسار ہوں، مجھے احساس ہو گیا ہے کہ اپنی ماں کے بارے میں برا سننا کتنا اذیت ناک عمل ہے۔" ضوباریہ کی نگاہیں جھکتی گئیں۔

"ضوبی! یہ سچ ہے کہ میں اماں کے بارے میں ایک لفظ نہیں سن سکتا مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کی جانب سے کی گئی زیادتیوں کا مجھے ادراک ہے، اسی لیے میں نے تم سے کبھی نفرت نہیں کی، بس سمجھاتا رہا کہ ان کے مزاج کے چڑچڑے پن کو میری وجہ سے برداشت کرلو، تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ ابا کے گزر جانے کے بعد انہوں نے پوری جوانی مشقتیں کر کے ہمیں پالا پوسا۔ کیا اب ان کے بڑھاپے میں ہمارا فرض نہیں کہ ان کا خیال رکھیں۔" سکندر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور ساحل پر ٹہلتے ہوئے بولا۔

"سچی بات ہے، کوشش کروں گی آئندہ مجھ سے کوئی کوتاہی نہ ہو، مگر آپ میری نادانیوں پر مجھ سے کبھی بھی خفا نہ ہوئیے گا۔" اس نے نگاہیں اٹھا کر شوہر سے التجا کی۔

"ضوبی! ہم نے زندگی اکٹھے گزارنی ہے۔ میں بھلا کیوں تم سے خفا ہوں گا، ویسے بھی تم اب خود ماں بننے جا رہی ہو تو پھر میری ماں کی تکلیفوں کو کیسے نہیں سمجھو گی۔" اس نے بڑی گہری بات کہی۔

"چلو۔۔ اب اس ٹاپک کو کلوز کر دو۔" سکندر نے کچھ دیر بعد بیوی کو تسلی دیتے ہوئے ہاتھ تھاما تو وہ تھوڑا پرسکون ہوئی اور اس کے ساتھ ریت پر ننگے پاؤں چلنے لگی۔۔

"ویسے۔۔ ایک بات پر میں اب بھی خفا ہو سکتا ہوں۔" سکندر نے مڑ کر اسے گھورا۔

"وہ کس بات پر؟" ضوبی نے خوفزدہ نظروں سے شوہر کی جانب دیکھا۔

"میڈم! گھر کا کام کرنے کے ساتھ ساتھ خود کو سجا سنوار کر رکھنا بھی تمہاری ذمہ داری ہے۔" وہ شرارتی ہوا۔

"اچھا...... جی۔" اس نے سکون کا سانس لیتے ہوئے بالوں کو سمیٹا جو تیز ہوا سے بکھر گئے تھے۔

"یار کام والی مائی اور بیوی میں کچھ تو فرق تو ہونا چاہیے۔" سکندر نے اس کی ناک چھوتے ہوئے یوں کہا کہ ضوباریہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔

شوہر کی بے زاری کو خوش دلی میں بدلنے کے لیے ضوباریہ نے بھی نئے سال کی شروعات میں خود سے بہت سارے عہد کر لیے تھے۔ گو کہ یہ راہ آسان نہ تھی مگر اسے بڑے صبر و ضبط کا مظاہرہ کرنا تھا کیوں کہ وہ میکے سے ایک سبق سیکھ کر آئی تھی۔

اسے یقین تھا کہ اب وہ جب بھی سکندر سے ساس کی شکایت کرنے کا سوچے گی تو ذہن پر اپنے بھائی کا مظلومیت بھرا چہرہ ابھر آئے گا، جس کے ساتھ میکے میں الماس بھی وہ ہی سلوک کرتی تھی، جو ضوباریہ نے اپنے شوہر کے ساتھ یہاں روا رکھا تھا۔

"ڈنر پر چلیں؟" اسے کھویا کھویا سا دیکھ کر سکندر کے لہجے میں ترنگ سی آگئی۔

"جی ضرور، شادی کی سالگرہ پر اتنا خرچا کرانے کا تو میرا حق بنتا ہے۔" ضوباریہ نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ ہاتھوں پر لگی ریت جھاڑتا ہوا کار پارکنگ کی جانب بڑھنے لگا۔

ہم نے جانا

بی سحر ملک

چوبی دروازے کے عین وسط میں تہ کیا ہوا کاغذ آ کر گرا۔ میں سمجھ گیا یہ رقعہ یقیناً اسی کے نام ہو گا۔ اگلے ہی لمحے میرے اندازے پر یقین کی مہر ثبت کرتے ہوئے اس کی موی مخروطی انگلیوں نے کسی کی نظر میں آنے سے پہلے جھک کر اس محبت نامے کو اٹھایا اور اپنے رنگین آنچل تلے چھپالیا۔ اس وقت اس کی سنہری آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ اس کی عنابی ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ تھی جس سے مجھے شدید نفرت تھی ۔ بلکہ مجھے تو اسی سے نفرت تھی۔ پڑھائی کے نام پر اکیڈمی آ کر ایسی حیا سوز حرکتیں کرتی موول مجھے زہر لگتی تھی حالانکہ وہ میری کلاس فیلو نہیں تھی۔ میری اس سے کبھی دو حرفی بات بھی نہیں ہوئی تھی۔ پھر بھی مجھے وہ بے حد بری لگتی تھی۔

اپنی بے تحاشا خوب صورتی کے باوجود جونیئر اور سینئر کلاسز کے لڑکے اکثر اس کے بارے میں بات کرتے پائے جاتے تھے۔ وجہ نہ اس کی حد درجہ خوب صورتی تھی اور نہ ہی غیر معمولی ذہانت' وجہ تھی اس کی بے باکی۔ پتا نہیں اسے بے باکی کہیں گے یا کچھ اور لیکن میری لغت میں وہ صرف بے حیا تھی۔ لڑکیاں تو لڑکیاں، لڑکوں سے بھی کھلے عام بے تکلفانہ گفتگو کرتی۔ نہ کسی ٹیچر کا لحاظ آڑے آتا نہ ضمیر ہی شرم دلاتا حالانکہ اس کی عمر کی لڑکیاں شرمیلی نہ بھی ہوں تو بات کرتے جھجکتی ضرور ہیں لیکن وہ تو وہ تھی ناں موول رضا۔

لمبی گھنیری پلکیں' بات کرتے یوں پٹپٹاتی گویا معصومیت کا کوئی ایوارڈ لینا چاہ رہی ہو اور اس کی ہنسی ''' جیسے مٹی کے گلے میں کھنکتے چاندی کے سکے۔ ''بات بے بات ہنستی۔ بلاشبہ بندے کی توجہ کھینچ لیتی تھی۔ اسے توجہ کھینچنے کا فن آتا تھا۔

وہ ایسی لڑکی تھی کہ لڑکیاں بھی اس سے بات کر کے فخر محسوس کرتی تھیں۔ یہ مبالغہ نہیں حقیقت ہے کہ اس جیسی چھا جانے والی ساحر شخصیت میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی یہ اور بات کہ اس کا سحر مجھ پر نہیں چل سکا۔ شاید اس لیے کہ میرے ذہن میں خوب صورتی اور شخصیت کا معیار کچھ اور تھا اور کچھ اس لیے بھی کہ اسے دیکھنے سے پہلے ہی میں اس کے کردار کے بارے میں جان چکا تھا۔

مجھے آج بھی وہ دن اپنے پورے جزئیات کے ساتھ یاد ہے جب آئی کام کے پہلے سال کے لیے میں اس اکیڈمی میں آیا تھا۔ دوران کلاس میرے عین ساتھ بیٹھے لڑکے بات کر رہے تھے۔ موضوع کوئی لڑکی تھی جیسے کہ عام طور پر ہوتا ہے۔ وہ لڑکی کسی لڑکے کے ساتھ انوالو تھی اور اس لڑکے کے اکیڈمی چھوڑتے ہی وہ کسی دوسرے لڑکے میں دلچسپی لینے لگی تھی۔ میں اس وقت تک خاموش بیٹھا رہا جب تک انہوں نے مجھے مخاطب نہیں کرلیا۔

''آج وہ آئی نہیں' کل آئے گی تو دیکھنا۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیوں؟''

''تو ان میں سے ایک نے بڑے بے ہودہ سے انداز میں کہا تھا۔ ''دیکھنے کی چیز ہے۔''

مجھے بہت برا لگا تھا اور اگلے دن اسے دیکھ کر اور بھی برا لگا۔ کل وہ لڑکے جو کچھ کہہ رہے تھے وہ آج بالکل واضح دکھائی دے رہا تھا۔ اس چھوٹی سی اکیڈمی کے ہر لڑکے لڑکی اور ہر ٹیچر سے وہ مخاطب ہوتی اور



بات کرتی تھی سوائے میرے۔ کیونکہ میں نے اسے کبھی ان دیکھی دیوار عبور نہیں کرنے دی۔ ہمیشہ ایک فاصلہ بنائے رکھا۔ وقت گزرتا رہا۔ خطوط کی جگہ موبائل نمبرز کے تبادلے ہونے لگے۔ پہلے نوید تھا پھر عذیر اس کے بعد سفیر اور اب وقاص تھا۔ جانے اس نے کہاں جا کر رکنا تھا۔

تین سالوں میں میں نے اس سے کبھی کلام بھی نہیں کیا تھا۔ البتہ میری کلاس فیلو تھی نوین وقار۔ وہ واقعی پر وقار تھی۔ اس سے میری اچھی دوستی ہوگئی تھی۔ وہ موول رضا کا بالکل الٹ تھی۔ موول زمین تھی تو وہ آسمان۔ اگرچہ وہ سانولی تھی۔ اس کے چہرے پر ہلکے گہرے کھڈے تھے۔ شاید کبھی دانے وغیرہ رہے ہوں۔ پڑھائی میں بھی بڑی عام سی تھی۔ عمر میں موول سے کچھ بڑی ہونے کے باوجود اس میں خود اعتمادی نام کو نہیں تھی۔ جب بھی کسی استاد نے ذرا سختی سے مخاطب کیا اس کی بڑی بڑی گہری آنکھیں بہنے کو بے تاب ہوئیں۔ اس میں ایسا کچھ نہیں تھا کہ اس کی طرف متوجہ ہوا جاتا لیکن جیسا کہ میں بتا چکا ہوں میرا انداز میری سوچ ذرا مختلف ہے۔ مجھے اس کی خاموشی نے متوجہ کیا تھا۔ اس کا سادہ اور الگ تھلگ رہنے کا انداز مجھے اچھا لگا تھا۔

ایک دن جب سب جا چکے تو وہ آخر میں نکلنے کے بعد بڑی سست روی اور گھبراہٹ سے اکیلی سڑک کی طرف جانے لگی۔ مجھے لگا شاید کوئی مسئلہ ہے سو میں نے قدرے فاصلے پر چلتے ہوئے اس سے

بات کی۔ وہ میرے مخاطب کرنے پر اتنی حیران تھی کہ میں اس کے نقاب میں سے بھی اس کی حیرت محسوس کر رہا تھا۔

اس کے گھر سے کوئی لینے نہیں آیا تھا اور وہ اکیلی جاتے ہوئے گھبرا رہی تھی۔ میں خاموشی سے فاصلے پر چلتا ہوا اس کے گھر تک ساتھ گیا تھا۔ اس کا گھر بہت زیادہ دور نہیں تھا۔ پھر کچھ دن بعد ایسا ہی ہوا۔ اب کی بار اس نے ساتھ آنے سے منع کر دیا۔ اس نے کہا اسے اپنی عزت سے زیادہ کچھ عزیز نہیں۔ اگر کوئی دیکھے گا تو اس سے وضاحت مانگنے نہیں آئے گا بلکہ سیدھا الزام لگا دے گا جو وہ نہیں چاہتی۔ اس کی اس بات نے مجھے اس کا گرویدہ کر دیا۔ اس لڑکی کو اپنی عزت کی کتنی فکر تھی۔

جانے کس جذبے کے تحت میں نے اپنا نمبر اسے دے دیا۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ کبھی مجھے فون بھی کرے گی لیکن ایسا ہوا اور پھر اکثر ہی ایسا ہونے لگا۔ میں اس کی دل سے عزت کرنے لگا تھا۔ وہ اتنی سلجھی ہوئی باتیں کرتی تھی کہ میں حیران ہو کر سوچتا لڑکیاں ایسی بھی ہوتی ہیں۔ ایک اور بات جو ہوئی وہ یہ کہ جانے کیوں میں دل ہی دل میں مومل اور نوین کا موازنہ کرتا رہتا تھا۔ ایک وہ تھی جس سے ملنے سے پہلے ہی میں اس کے بارے میں جان گیا تھا اور دوسری وہ جسے دیکھ کر جاننے تک میں' مجھے تین سال سے بھی زیادہ وقت لگا تھا۔

میرا بی کام مکمل ہوا تو ایم بی اے کے لیے میں باہر چلا گیا۔ باہر جانے کے بعد بھی میرا نوین کے ساتھ رابطہ رہا۔ وہ اکثر مومل کے بارے میں بتاتی رہتی تھی۔ یہاں تک کہ میرا ایم بی اے مکمل ہو گیا۔ میں ان دنوں مزید بزنس کورسز کے سلسلے میں مغزماری کرتا پھر رہا تھا جب نوین کی شادی ہو گئی۔

وہ میرے لیے ایک دوست ایک بہترین سامع تھی جبکہ میرے بارے میں اس نے جانے کیا سوچ لیا تھا اگرچہ کبھی اس نے کہا نہیں پھر بھی جن دنوں اس کے رشتے کی بات چل رہی تھی' مجھے ایسا لگتا تھا جیسے وہ مجھ سے ہمارے تعلق کے بارے میں کھل کر بات کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ اس نے کبھی کچھ کہا نہیں ورنہ یہ ہماری دوستی کا اختتام ہوتا۔

اس کی شادی کا سن کر مجھ پر کچھ خاص اثر نہیں ہوا کیونکہ میں شادی کے لیے نوین جیسی لڑکی کو آئیڈیلائز ضرور کرتا تھا لیکن وہ نوین نہیں ہو سکتی تھی۔ میرا بچپن نوجوانی اور یہاں تک کہ جوانی بھی بڑی صاف گزری تھی۔ میں نے کبھی اپنے معیار سے اتر کر کوئی حرکت مذاق میں بھی نہیں کی تھی۔

میرا دل چاہتا تھا مجھے بھی کبھی محبت ہو۔ میں بھی دیکھوں وہ کیا چیز ہے بے اختیاری کہیں جسے۔ ورنہ نوین تو کیا کسی بھی لڑکی سے شادی کرنے پر میرے گھر والے میرے ساتھ تھے۔

خیر نوین کی شادی کے کچھ عرصہ تک ہمارا رابطہ نہیں ہوا۔ میں بھی اپنی پڑھائی اور پارٹ ٹائم جاب میں مصروف رہا۔ میں جو صرف ایم بی اے کے لیے گیا تھا واپسی میں سات سال لگا آیا۔ نوین کے ساتھ رابطہ بحال ہی تھا۔ اس کی شادی عمر میں اس سے کافی بڑے شخص سے ہوئی تھی جو کہ پڑھا لکھا بھی نہیں تھا اور اس کی نوکری بھی نہیں تھی۔ عجیب خاندانی سسٹم تھا۔ نوین بتاتی تو میں حیران ہوتا کہ دنیا میں ابھی بھی ایسا ہوتا ہے۔ غیر مہذب' بدتمیز لوگوں میں وہ بیچاری بری طرح پھنسی تھی۔

میرے باہر قیام کے دوران ہی اس کے اوپر تلے دو بچے ہوئے تھے۔ پہلی بار تو سب ٹھیک تھا۔ دوسری بار سیزرین تھا۔ اس نے بتایا اس کے شوہر نے اسے اس کے والدین کے گھر بھیج دیا ہے اور اس کے والدین کسی نجی اسپتال میں اس کے آپریشن کا خرچ برداشت نہیں کر سکتے اور سرکاری اسپتال میں وہ جانا نہیں چاہتی۔ اتنے عرصے کے تعلق کا لحاظ کرتے میں نے اس کے سیزرین کا پورا خرچ اٹھایا تھا۔ میکے والوں کو اس نے سسرال والوں کے خرچ کا کہا اور سسرال والے جانتے تھے کہ میکے والوں نے اخراجات اٹھائے ہیں۔

مجھے خوشی تھی کہ میں اس کے کسی کام آیا۔ اس کے بعد میں اکثر ہی اسے کچھ پیسے بھیج دیتا۔ وہ شرمندہ ہوتی اور مجھے منع کرتی تھی لیکن اس کے منع کرنے میں مجھے سچائی نظر نہیں آتی تھی۔ جانے کتنی مجبور تھی' خیر۔ اس سب کے علاوہ میرے باہر قیام کے دوران شروع کے دو تین سال وہ مجھے مومل کے بارے میں آگاہی دیتی رہی تھی۔ اس کے بعد مومل نام کے آگے صرف سوالیہ نشان رہ گئے تھے۔ میرا دل چاہتا تھا کہ وہ کبھی اس کے بارے میں کچھ بتائے لیکن وہ تو شاید بھول ہی گئی تھی اور خود سے پوچھنے کی میں اپنے آپ کو کبھی اجازت نہیں دے پایا۔

میری واپسی سے چند ماہ پہل ایک دن باتوں باتوں میں اس کا ذکر نکل آیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اب وہ کبھی ملی تو نوین کا جواب تھا نہیں۔ یہ بڑی عام سی بات تھی صرف تب تک جب تک میں پاکستان واپس نہیں آ گیا۔

☆☆☆

واپسی پر سب سے پہلا شور تو میری شادی کا اٹھا تھا۔ میں نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ پہلے اپنی ڈگریاں استعمال کر کے کوئی کاروبار سیٹ کر لوں پھر سوچوں گا۔ وقتی طور پر یہ معاملہ دب گیا تھا۔ ان ہی دنوں میری ملاقات اکیڈمی کے پرانے دوستوں سے فرداً فرداً ہوئی۔ اور یہ ملاقاتیں میرے لیے حیرت کے شدید ترین جھٹکوں سے کم نہیں تھیں۔ مومل کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا تھا کہ اس نے تعلیم مکمل کی یا نہیں۔ وہ کہاں ہے کیا اس کی شادی ہو گئی یا کہاں گئی۔ میں حیران تھا۔ اسے تو دوستیوں کا بہت شوق تھا تو کیا دوستیاں صرف اکیڈمی کی حد تک تھیں؟ ہاں ٹھیک ہے کسی ایک سے ہو تو وفا کی جا سکتی ہے اب اتنے لوگوں سے وفا کیسے ہو۔ لیکن میرے لیے یہ حیرت تھی صرف۔ شاکنگ تو میرے لیے یہ بات تھی کہ نوین کے بارے میں جتنا میں جانتا تھا' زیر زبر کے بغیر تقریباً ہر ملنے والا دوست بھی اتنا ہی جانتا تھا۔

کیسے؟ یہ بات شاید سوچنے والی نہیں تھی۔ جیسے میں جانتا تھا وہ سب بھی ویسے ہی جانتے تھے۔ نوین وقار سب کے ساتھ رابطے میں تھی' اس بات نے مجھے جھنجھوڑا تھا۔ شاہراہ عام پر چلنا میری فطرت کے خلاف ہے سو نوین کے ساتھ میرا رابطہ یوں ہی خاموشی سے ختم ہو گیا۔

ایک دن میں نے اسے ایک مہنگے ترین شاپنگ مال میں دیکھا۔ کاندھوں پر بال بکھرائے، درمیانی عمر کے مہذب مرد اور دو بچوں کے ساتھ وہی تھی۔ اس کی سادگی جانے کب اس سے منہ موڑ گئی تھی۔ چہرے پر میک اپ کی گہری تہ اور نہایت فیشن ایبل لباس کے ساتھ وہ اکیڈمی والی نوین وقار نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ڈیسنٹ سا وہ شخص کہیں سے بھی اس سے زیادہ عمر کا غیر مہذب ان پڑھ اور بدتمیز نہیں لگ رہا تھا۔ بچے ان دونوں کو مخاطب کر کے میرا رہا سہا شک بھی دور کر گئے۔ وہ اس کا شوہر ہی تھا۔ بلاشبہ میں اس کے ہاتھوں بے وقوف بنتا رہا تھا۔ نوین کی مجھ پر نظر پڑی تو وہ آنکھیں چرا کر چلی گئی۔ اس دن میں نے نوین وقار نامی باب ہمیشہ کے لیے بند کر دیا تھا۔

☆☆☆

پاکستان آ کر میں نے اپنا کاروبار شروع کر لیا تھا۔ امی چاہتی تھیں کہ جلد از جلد میری شادی کر دیں۔ میں کام کا' کاروبار کا مصروفیت کا بہانہ کرنے کے ٹالتا جا رہا تھا یہاں تک کہ چند ماہ بعد ہی امی کا انتقال ہو گیا۔ مجھے بے حد افسوس تھا کہ میں نے ان کی بات نہیں مانی لیکن میں کیا کرتا' میرا دل اس طرف آتا ہی تھا۔

وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزرتا رہا۔ میرا کاروبار اللہ کے کرم اور میری دن رات محنت کے نتیجے میں اچھی طرح جم چکا تھا۔ میں نے اپنے ذاتی پیسوں سے اپنے لیے گاڑی بھی لے لی تھی۔ زندگی ایک مخصوص ڈگر پر چلتی جا رہی تھی۔ اسی یکسانیت میں دو سال گزر گئے۔

پاکستان آنے کے بعد سے میری ایک ہی روٹین تھی۔ صبح قریبی پارک جا کر جاگنگ اور ایکسر سائز کرنا' اس کے بعد ہلکا پھلکا ناشتہ کر کے آفس۔ آفس سے واپسی پر کسی اچھے ریسٹورنٹ سے ڈنر اور گھر جا کر نیند۔ سونے سے پہلے ایک تسلسل سے موول کو سوچنا بھی میری روٹین میں ہی شامل تھا۔ میں اکثر سوچتا تھا کہ پھول پھول بیٹھنے والی تتلی کس کونے میں چھپ گئی ہے۔

دو سال پہلے جب میں پاکستان آیا تھا تب بھی اس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا۔ اب بھی سب لاعلم تھے۔ نوین کے بارے میں اکثر ہی کوئی نہ کوئی بات پتا چلتی رہتی تھی جو کہ میرے نزدیک جھوٹ کے علاوہ کچھ نہیں تھی۔ اگرچہ میں نے کبھی کسی سے اس کی حقیقت کا ذکر نہیں کیا تھا اور سچ کہوں تو مجھے فرق پڑتا بھی نہیں تھا۔ نوین کے نام کی کوئی خلش کوئی چبھن باقی نہیں تھی۔ کانٹا بن کر تو موول میری خاموشیوں میں چبھی ہوئی تھی۔ دل چاہتا تھا کوئی اس کے بارے میں بتائے۔ وہ کہاں ہے' کیسی ہے۔ اب بھی وہی عادتیں ہیں یا بدل گئی ہیں۔ لیکن بتاتا کون ؟ وہ تو چھپ ہی گئی تھی۔

ان ہی دنوں میں نے اپنا ایک آفس کراچی میں کھولنے کا منصوبہ بنایا اور فوری عملدرآمد بھی شروع کر دیا۔ مجھے کراچی میں آئے دوسرا ہفتہ تھا۔ میں چونکہ ایک منظم طریقے سے کام کرنے کا عادی تھا تو مجھے کوئی افراتفری نہیں مچانی پڑی۔ کچھ مجھ پر ابھی اپنی ذات کے علاوہ کوئی ذمہ داری نہیں تھی تو میں ہر چیز آہستگی لیکن مکمل طرح سے آگے بڑھا رہا تھا۔

سمندر...... میرے لیے اتنی کشش رکھتا تھا کہ میرا ارادہ تھا پہلے سمندر جایا جائے اور پھر کام شروع کیا جائے لیکن ایسا ہو نہیں سکا۔ سو آج ہفتہ تھا۔ میں کام پر نکلنے کی بجائے سادہ سا حلیے میں ساحل سمندر چلا گیا۔ نم ریت کی آغوش میں مچلتا سمندر اور اس میں اگتے سورج کا عکس۔ میں مسحور رہ گیا تھا۔ پانی کی جھاگ اڑاتی لہریں جانے کیوں مجھے موول کی بے قابو طبیعت کی یاد دلاتی رہیں۔ اس دن کے بعد میں اکثر ہی ساحل سمندر پر جانے لگا تھا۔ ساحل سے لپٹتی، دامن چھڑاتی لہریں دیکھتا اور موول کو سوچتا رہتا۔ جانے کیوں وہ حواسوں پر اتنا طاری رہنے لگی تھی۔

جس دن مجھے کراچی سے واپس جانا تھا' اس دن میں جانے کیوں بے حد اداس ہو رہا تھا۔ میں اپنی ساری اداسیاں وسیع القلب دوست سمندر کے حوالے کرنے چلا گیا۔ چھٹی کا دن ہونے کی وجہ سے خاصی چہل پہل تھی۔ میں قدرے پرسکون گوشے کی تلاش میں ایک طرف چل پڑا۔

''ماما' اللہ تعالیٰ کیسے ہیں؟'' میرے آگے ایک عورت اور ایک بچہ چل رہے تھے۔

''اللہ تعالیٰ معاف کرنے والے، بہت پیار کرنے والے ہیں۔'' اس عورت نے جواب دیا۔

میرا سانس ایک بار ضرور رکا تھا۔ میرے خالی دل میں وہ آواز مندر کی گھنٹی کی طرح گونجتی جا رہی تھی۔

''آپ جیسے؟'' وہ بچہ پھر بولا۔

''نہیں بیٹا' میں تو بہت گنہ گار ہوں۔'' تھکن زدہ پست آواز میں اس نے جواب دیا۔

''گناہ گار کیا ہوتا ہے؟''

''جس نے بہت غلط کام کیا ہو۔''

''آپ نے کیا غلط کام کیا ہے؟''

''یہ میرا اور اللہ تعالیٰ کا معاملہ ہے' آپ کو کیوں بتاؤں؟ آپ بال لے جا کر کھیلیں اور زیادہ دور نہیں جانا۔'' ایک پتھر کے قریب وہ رک کر بولی تو سر ہلا کر بچہ اس سے دور ہوتا چلا گیا۔

وہ وہیں بیٹھ گئی۔ اس کی پشت میری طرف تھی سو وہ مجھے دیکھ نہیں پائی اور میں...... میں اس آواز کے تنویمی عمل کے زیر اثر ایک قدم بھی نہیں اٹھا پایا۔

''موول۔'' میرے ہونٹوں نے ایک سرگوشی جاتی سانس کے ہاتھ تھمائی جو اس نے ذمہ داری سے سمندر کی نم ہوا کے سپرد کی تھی۔ اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔

زمین و زماں کی گردشیں رک جانے کا کیا مطلب ہوتا ہے یہ میں اس نظر کے بعد سمجھا تھا۔ قیس اور رانجھے کی بے قراری میں نے اب جانی تھی۔ مجھے لگا پس منظر میں سب ساکن ہے۔ اس ایک نگاہ نے وحشتوں' بے تابیوں کے سارے جہاں میری روح پر کھول دیے تھے۔ بے چینیوں کے سب راز یک دم مجھ پر کھلے تھے۔ مجھے احساس ہوا اور بڑی شدت سے احساس ہوا کہ دل کو اس کے علاوہ نہ کبھی کسی کی طلب تھی نہ ہو گی اور سچ کہوں تو یہ ایک لمحہ مجھے پہلے نصیب ہو جاتا تو اتنا لمبا عرصہ تو کیا میں ایک لمحہ اس کے بغیر نہ جی پاتا۔

خاک اڑاتی خشک پیاسی زمین پر ابر رحمت کی بوندیں گرنے سے جس طرح گرد کے بادل بیٹھ جانے سے ہواؤں میں شفاف تاثر ابھرتا ہے ویسا ہی اس کی آنکھوں میں بھی تھا۔ میں اس سے ذرا فاصلے پر ریت پر ہی بیٹھ گیا۔

''کیسی ہو؟''

''آپ جانتے تو ہیں'' ایک شکایت سی تھی لہجے میں۔

''اچھی ہو۔ بہت پیاری...... جانتا ہوں۔'' گو کہ میری آواز سرگوشی سے کچھ زیادہ بلند نہیں تھی لیکن بے قراریوں کی گواہ یہ باد صبا کچھ مہربان سی تھی۔ اس نے پھر سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور منہ سمندر کی طرف موڑ لیا۔ مٹھی میں دبائی ریت کو اس نے مزید شدت سے دبوچا جیسے وقت کے لمحے گزرنے سے روک رہی ہو۔

''گزرے برسوں میں کوئی دن ایسا نہیں گزرا جب کم از کم ایک بار ہی سہی میں نے تم سے ملنے کی دعا نہ کی ہو۔''

میرا دل جیسے پسلیاں توڑ کر باہر آنے کو تھا۔ اس سے منسلک کوئی کہانی، کوئی حقیقت مجھے یاد نہیں تھی۔ سوائے اس کے کہ وہ میرے سامنے موجود تھی۔

”شاید اس لیے کہ گئے سالوں میں کوئی ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا جب ذہن کے پردے پر تمہاری دو آنکھوں نے حقارت لیے میری تذلیل نہ کی ہو۔ میں زندگی میں بہت ناسمجھ رہی ہوں لیکن حیرت انگیز بات ہے' پہلی بار دیکھتے ہی میں نے تمہارے دل میں اپنے لیے ناپسندیدگی سے کچھ بڑھ کر شاید نفرت دیکھ لی تھی۔ ہاں وجہ مجھے دیر سے سہی پر سمجھ میں ضرور آگئی تھی۔ سولہ سال کی عمر میں بغیر ماں کے، بغیر کسی بھائی بہن کے سہارے کے' مجھ میں اتنی ہی عقل تھی کہ میں کسی نادان بچے کی طرح کچرے کے ڈھیر سے ہیرا ڈھونڈ رہی تھی۔

چند سال پہلے جب میری والدہ کی قبر کی مٹی بھی خشک نہیں ہوئی ہوگی' جس وقت مجھے ماں نام کے سوتیلے رشتے کی چھاؤں میں بٹھادیا گیا تھا۔ میں اکثر سوچتی ہوں کبھی کوئی جان سکے گا اس نام نہاد چھاؤں نے مجھے جون جولائی کی دھوپ سے بھی زیادہ جلایا ہے۔

اس عورت نے دو تین سال مجھ پر کھلے ہاتھ سے خرچ کیا اور پھر سود سمیت وصول کرنے کے لیے مجھے، مجھے استعمال کرنا چاہا لیکن ایک فطری شرم تھی۔ میں منہ پر انکار نہ کرکے بھی اس کے مطابق کچھ کرنے کا سوچ بھی نہیں سکی۔ اس کی طلب بڑھتی جارہی تھی۔ میرے نزدیک اس بات کا صرف ایک حل تھا کہ میں اپنے طور پر کوشش کرکے اس دلدل سے نکل جاؤں لیکن مجھے بہت دیر میں سمجھ میں آیا کہ میں جتنے مرضی ہاتھ پاؤں چلالی' خود کچھ نہیں کرسکتی تھی۔ اپنی طرف بڑھنے والا ہر ہاتھ...... ہر ہاتھ میں نے ایک کے بعد ایک کرکے تھاما۔ مگر آہستہ آہستہ مجھے احساس ہوا کہ ہر ہاتھ مجھے اس دلدل میں مزید تیزی سے دھکیل رہا ہے تب میں نے اپنا ہر معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا دیر سے ہی سہی...... باپ نام کا نام نہاد سہارا چھنتے ہی مجھے چند روپوں کے عوض بیچ دیا گیا۔

دنیا والوں کی نظر میں یہ ایک شادی تھی جبکہ میں تو جانتی تھی اور دیکھو' یہ بات کتنی حیران کن ہے کہ مجھے ذلت کے گڑھے میں دفنانے والے ہاتھوں نے ہی مجھے عزت کے تخت پر بٹھادیا۔ میرے اللہ نے میری ساری ناکام کوششیں معاف کرکے مجھے توصیف احمد کا ساتھ عطا کیا۔ بلاشبہ اس شخص کے ساتھ گزرے سال میری زندگی کا اہم سرمایہ ہیں۔ اس نے مجھے اتنی عزت دی کہ اب کسی سے عزت کی خواہش نہیں۔“

”تمہارا شوہر......“ مجھے بات مکمل کرنے کا حوصلہ نہ ہوا۔

”شادی کے تین سال بعد ہی داغ مفارقت دے کر قبر میں جا سوئے۔“

”اف...... اب کہاں' کیسے رہتی ہو؟“ میرا دل سینے سے نکل کر اس کے قدموں سے لپٹتا جارہا تھا۔

”یہاں میرے شوہر کا گھر ہے جو میرے نام ہے۔ اسی میں بوتیک کھول رکھی ہے۔“ بڑی غیر دلچسپی سے جواب آیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی کپڑے جھاڑتی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”تم اپنے گھر کیوں نہیں چلی گئیں؟“

اس نے ایک طنزیہ نظر میرے چہرے پر ڈالی تو مجھے اپنے احمقانہ سوال کا اندازہ ہوا۔ میں بھی اٹھ کر اس کے ساتھ چل پڑا۔

”تو تم نے کسی اکیڈمی فیلو' کسی سے بھی رابطہ کیوں نہیں کیا؟“

”کیا کرتی رابطہ کرکے؟ جو غلطیاں پہلے کرچکی تھی وہ دہرانے سے بہتر مرنا پسند کروں گی۔“

”میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ بس ایک سہارا۔“

”کیسا سہارا؟ اس نے بات کاٹی۔“ مجھے اکیلی کو تو سہارا ملا نہیں وہ بھی تب' جب میں جوان تھی۔ اب ڈھلتی عمر اور ایک بچے کے ساتھ مجھے کیا سہارا ملتا۔“

عمر کے پچیسویں یا چھبیسویں سال میں وہ ڈھلتی عمر کی بات کررہی تھی۔

”مدد کے نام پر نیلے ہرے نوٹ عزت نفس کی قیمت ہوتے ہیں احتشام حسن! عزت نفس کی قیمت پر کچھ نہیں چاہیے۔“

”اور محبت کی قیمت پر؟“ وہ حیرت سے میری طرف پلٹی۔

”پچھلے کتنے سالوں سے تمہیں سوچ رہا ہوں۔ ہر جگہ ہر رستے تمہیں کھوجتا رہا ہوں۔ مجھے لگا تھا میرے تجسس نے میرا چین برباد کیا ہے۔ آج پتا چلا ہے مجھے تم سے نفرت کبھی تھی ہی نہیں۔ میں احتشام حسن اقرار کرتا ہوں کہ میری ناپسندیدگی مصنوعی تھی۔ میرے حسد، میری جلن کا پردہ تھی کہ تم جیسی لڑکی مجھے کیوں نہیں ملی تم مجھے کیوں نہیں ملیں میں تم سے عشق......“

”بس...... بس کرو۔ مجھے یہ محبت اور عشق کی کہانی مت سناؤ۔ تم نے میرے اتنے برسوں کی دعائیں ضائع کردیں۔ میرے دل میں تمہارا مقام تھا' اسی لیے تمہاری نظروں کی پرواہ تھی۔ اتنی سطحی بات کی مجھے تم سے امید نہیں تھی۔ مجھے نہیں چاہیے تم سے عزت۔“

”اور محبت؟“ اس کی بات کاٹ کر میں اس کے آگے جا کھڑا ہوا۔

آسمان پر سیاہی کے قافلے فروکش ہونے کو تھے۔ ڈوبتے سورج کی لالی نے پانی کو بھی نارنجی کردیا تھا۔ پانی کی موج ہمارے قدموں تلے آٹھہری تھی اور فیصلے کی گھڑی بھی۔

”احتشام حسن...... میری دعاؤں کی مجھے اس طرح سزا نہ دو۔“ نمکین موجوں کی نمی اس کی آواز میں جاگنے لگی تھی۔

”میری، میرے جذبوں سے لاعلمی کی سزا تم بھی مت دو۔“

”میں بدکردار اور آوارہ ہوتی تو آج بھی اسی روش پر ہوتی۔ ٹین ایج میں بغیر مجبوریوں کے بھی غلطیاں ہوجاتی ہیں اور تم مجھے اتنی سی رعایت دینے پر بھی تیار نہیں تھے۔ احتشام حسن! جو نظر آئے' لازمی نہیں وہی سچ ہو۔“ وہ اب بھی وہیں تھی۔

”موحل رضا...... یہ بات لکھ کر رکھ لو۔ آسمان کو گواہ کردیا یا زمین کو۔ میری زندگی میں آج یا کل...... آنا تمہیں ہی ہے۔ پھر چاہے کتنا وقت لگے۔ میں چاہوں تو آج اسی وقت تم سے ہاں کرواسکتا ہوں لیکن۔“

”اچھا؟“ وہ طنزیہ بولی۔ میں نے دو قدم آگے بڑھ کر باقی فاصلہ سمیٹا اور اس کا ہاتھ پکڑلیا۔ وہ جھٹکا کھا کر پیچھے ہٹی۔ اس کے لیے یہ غیر متوقع حرکت تھی۔ ویسے بھی اس طرف رش کم تھا اور اب تو سب جا ہی چکے تھے تقریباً۔

”پلیز...... جانے دو مجھے۔“

”بولو ہاں۔“ اپنی مضبوط گرفت میں' میں نے اس کا ہاتھ بھیگتا محسوس کیا۔

مزاحمت ترک کرکے اس نے میرے چہرے کی طرف دیکھا۔ غیر مبہم مسکراہٹ کی خوب صورتی نے مجھے اتنا مسحور کیا کہ میری گرفت از خود ڈھیلی ہوگئی۔ اس نے نرمی سے ہاتھ چھڑوالیا۔

”چاہے سمندر کو گواہ کردیا نم ریت کی پیاس کو...... میں موحل رضا اپنی مرضی سے ہاں کرتی ہوں۔“ یہ کہہ کر ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر زندگی سے بھرپور مسکراہٹ میری نظروں کی نذر کرتی وہ تیزی سے اذان کی طرف چلی گئی۔

☆☆

راشدہ رفعت

محبت کا راج

اگر دنیا میں پریشان حال، دکھی اور غم زدہ لوگوں کی کوئی کمی نہیں تو بہت سے بے فکرے لوگوں کا مسکن بھی یہ ہی دنیا ہے۔ وہ لڑکی جس کی سالگرہ کی تقریب اس وقت یولی ورسٹی کیفے ٹیریا میں دھوم دھڑکے سے منائی جا رہی تھی۔ اس کا شمار فکر نہ فاقہ عیش کر کاکا ٹائپ لوگوں میں بہت آسانی سے کیا جا سکتا تھا اور اگر ایک کو وہ لڑکی زہر سے بدتر نہ سہی تو زہر سے کم تر بھی نہ لگتی تھی۔ اوسط درجے کی ذہانت والی وہ لڑکی بے تحاشا حسین و جمیل بھی نہ تھی، اس کے باوجود وہ یونی کی جانی پہچانی شخصیت تھی۔ اسٹوڈنٹس کے ساتھ اساتذہ بھی اس سے بخوبی واقف تھے اور بہت شفقت سے پیش آتے تھے۔

وجہ صرف اتنی ہی تھی کہ وہ اپنی دادی کی اکلوتی اور لاڈلی ترین پوتی تھی اور دادی صاحبہ ملک کی مشہور ترین ادیبہ اور شاعرہ تھیں۔ قریبی تعلق ہونے کے باوجود ایک کو دونوں دادی، پوتی سے چڑ تھی۔ دادی سے تو اس کا آمنا سامنا نہ ہونے کے برابر تھا۔ ہاں یولی فیلو ہونے کی وجہ سے گل خنداں سے آمنا سامنا ہوتا رہتا تھا اور یہ بھی سچ تھا کہ جیسے وہ گل خنداں سے سلام دعا تک کرنے کا روادار نہ تھا۔ ویسے ہی وہ بھی اسے کسی کھیت کی گاجر مولی نہ گردانتی تھی۔ وہ یعنی

مکمل ناول



ایک انصار جو یونی ورسٹی کے لڑکوں میں اپنی ذہانت، متانت اور فطانت کی وجہ سے اور لڑکیوں میں اپنی خوبرو شخصیت کی وجہ سے یکساں مقبول تھا۔ گل خنداں اسے رتی برابر اہمیت نہ دیتی تھی۔ بلکہ اگر کوئی یونی — فیلوان دونوں کی رشتہ داری کے بارے میں اڑتی اڑتی خبر سن کر گل خنداں سے اس کی تصدیق چاہتا تو وہ تردید کرنے میں دو سیکنڈ بھی نہ لگاتی۔

"ارے نہیں یار، کیسی رشتہ داری، وہ میری سوتیلی دادی کا پوتا ہے اور بس۔"

"سوتیلی دادی کا پوتا؟" سوال کرنے والا کچھ اچنبھے میں پڑ جاتا۔

"اُفوہ بھئی، یوں سمجھ لو کہ میرے سگے دادا کا سوتیلا پوتا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ ہم نے ساری عمر اپنے دادا سے کوئی لینا دینا نہیں رکھا، تو اب ان کے سوتیلے پوتے سے ہمیں کیا سروکار۔"

وہ بے نیازی سے جواب دیتی۔ کوئی "بہی خواہ" یہ جواب ایک تک بھی پہنچا دیتا۔ ایک یہ سب سن کر بھناتو جاتا، لیکن جوابی تبصرے سے گریز کرتا۔ ہاں گھر جاکر اپنی جھنجلاہٹ انصار بابا پر ضرور نکالتا۔

"جن دو خواتین کی خبر گیری کرنا آپ نے اپنی زندگی کا اولین نصب العین بنا رکھا ہے، وہ ہمیں سرے سے اپنا رشتہ دار ہی نہیں گردانتی ہیں۔ فرماتی ہیں محترمہ گل خنداں کہ میں ان کے سگے دادا کا سوتیلا پوتا ہوں۔"

انصار احمد بیٹے کے بھنائے ہوئے انداز کو غور سے دیکھتے، پھر ان کے چہرے پر مدھم سی مسکراہٹ بکھر جاتی۔

"ہاں تو رشتہ تو کچھ یہ ہی بنتا ہے تمہارا ان کے ساتھ۔ گل خنداں نے کچھ ایسا غلط بھی نہیں کہا۔"

"تو مانا کہ وہ ہمارے اور ہم ان کے سوتیلے رشتہ دار ہیں اور بس۔ تو آخر آپ کیوں ایک خطیر رقم کا نذرانہ ان سوتیلے رشتہ داروں کی بارگاہ میں ہر ماہ پیش کرتے آتے ہیں۔" انصار احمد کے خدشے کے عین مطابق اس کی تان وہیں آکر ٹوٹی تھی۔

"ایک! تم ہر بار یہ بات کرکے مجھے نئے سرے سے دکھ میں مبتلا کر دیتے ہو، آخر تمہاری تربیت میں مجھ سے کہاں کوتاہی ہو گئی۔" وہ تاسف بھرے لہجے میں مخاطب ہوتے۔ اس بار خدشہ ایک کا سچا ہو تا کہ انصار بابا ہمیشہ کی طرح بات کو گھما پھرا کر اپنی تربیت اور اس کی ناخلفی پر لے آئے تھے۔

"معذرت چاہتا ہوں، آئندہ یہ ذکر میری زبان پر نہیں آئے گا، خواہ مخواہ اپنی تربیت کو دوش مت دیں۔" وہ روٹھے لہجے میں بولا۔

"اچھی بات ہے۔" انہوں نے رسانیت بھرے انداز میں سر ہلایا۔

"اور تم نے اچھا یاد دلایا، آج مجھے بیگم صاحبہ کے ہاں جانا تھا، اگر فارغ ہو تو ڈراپ کر دو گے وہاں تک۔" انہوں نے بیٹے سے پوچھا۔

"فارغ بھی ہوں اور ڈراپ بھی کر سکتا ہوں، لیکن آج وہاں جانے کا کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ آج وہاں بیگم صاحبہ کی پوتی کی سالگرہ کی تقریب بہت دھوم دھام سے منائی جا رہی ہوگی، حالانکہ صبح یونی ورسٹی میں بھی اپنی سہیلیوں کے ساتھ کم غل غپاڑہ نہیں کیا محترمہ نے، لیکن محترمہ اپنی سہیلیوں سے فرما رہی تھیں کہ اصل گرینڈ فنکشن تو شام کو گھر پر ہوگا۔ اگر آپ بن بلائے مہمان بن کر وہاں جانا چاہتے ہیں تو شوق سے جائیں، میں کون ہوتا ہوں منع کرنے والا۔"

وہ ہنوز خفا تھا۔ انصار احمد بس اس پر تیکھی نگاہ ڈال کر رہ گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

دادو نے اس کا نام گل خنداں رکھا تھا، لیکن اب وہ باقی دنیا کے لیے گل خنداں تھی تو اپنی دادو کی پارو۔ دونوں دادی پوتی آپس میں گہری سہیلیوں کی مانند تھیں۔ اس وقت بھی دادی کی پارو بہت لاڈ سے دادو کی گود میں سر رکھے صوفے پر نیم دراز تھی۔ ہاتھ میں سیل فون تھا، جس پر وہ آج کی تقریب کے دوران

اتاری گئی تصویریں دیکھ رہی تھی۔

"دادو! آج آپ بہت شان دار لگ رہی تھیں۔ ذرا دیکھیے اپنا کلوز اپ۔" اس نے سیل فون کا رخ ان کی طرف کیا۔ اسی لمحے رحمت بوا ٹرے میں چائے کے مگ لیے چلی آئی تھیں۔

"مجھے تو اس عمر میں نظر لگنے سے رہی، لیکن رحمت! آپ میری پارو کی نظر اتار دیجیے گا۔ ماشاءاللہ اتنی پیاری لگ رہی تھی کہ میری ہی نظر نہیں ٹک رہی تھی۔" فلک ناز نے پوتی کو وارفتگی سے دیکھتے ہوئے رحمت بوا کو مخاطب کیا۔

"بیگم جی! میں آپ کی بھی نظر اتار دوں گی اور پارو بٹیا کی بھی، لیکن خدا لگتی کہوں تو اب بٹیا کی سالگرہ وغیرہ کی تقریب منانا چھوڑیں اور کوئی بڑی تقریب منانے کا سوچیں۔" رحمت بوا نے ٹرے میز پر رکھی اور خود بھی سنگل صوفے پر بیٹھ گئیں۔

"کمال میاں آج ہماری بٹیا کی سالگرہ میں آئے تھے اور اپنی صاحب زادی کی شادی کا کارڈ دے کر چلے گئے۔ ان کی بیٹی اپنی بٹیا کی ہم عمر ہیں یا نہیں۔"

"صحیح کہتی ہیں رحمت آپ۔ میں خود آج کل اسی سوچ بچار میں ہوں۔" گل خنداں کے کچھ بولنے سے پہلے ہی دادو نے سنجیدگی بھرے انداز میں ان کی بات کی تائید کی۔

"کیا مطلب دادو، کس قسم کی سوچ بچار؟" وہ یک دم اٹھ بیٹھی تھی۔ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر دادو کو دیکھا۔

"اتنا حیران ہونے کی ضرورت نہیں بٹیا! آخر بیگم جی نے آپ کو اپنے گھربار کا کرنا ہے یا نہیں۔"

"میں اپنے گھر میں ہی بیٹھی ہوں بوا، آپ دادو کو الٹی پٹیاں مت پڑھائیں۔" اس نے انہیں خفگی سے دیکھا۔

"تمہاری بوا کچھ غلط نہیں کہہ رہی پارو۔" دادو نے گہری سانس اندر کھینچی۔

"میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی دادو۔"

وہ یک دم ہی روہانسی ہو گئی۔

"تم نہیں جاؤ گی پارو، لیکن تمہاری دادو تو جا سکتی ہے نا۔" فلک ناز ذرا افسردگی سے مسکرائیں۔

"کیا مطلب، آپ نارووے والے مشاعرے میں جا رہی ہیں کیا؟" اس نے فوراً پوچھا، لیکن سوال پوچھتے کے ساتھ ہی احساس ہو گیا کہ ان کی بات کا کیا مطلب ہے۔

"آج میری زندگی کا خوب صورت ترین اور یادگار دن ہے اور آپ دونوں نے طے کر لیا کہ دن کے اختتام پر آپ مجھے رُلا کر دم لیں گی۔" اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

"پارو، دادو کی جان، اپنا دل مضبوط کرو بٹیا۔ اتنی سی بات پر اتنے ڈھیر سارے آنسو۔" دادو نے پیار سے اس کے بال سنوارے۔ "چلو چائے پیو۔ رحمت بہت تھکی ہوئی ہیں، پھر گرم کرکے نہیں لائیں گی۔"

وہ ان کے کندھے سے سر لگا کر مزید آنسو بہانے کا پروگرام بنانے لگی تھی کہ انہوں نے پیار سے اسے خود سے الگ کیا۔

"آپ آج کل بہت غلط باتیں کرنے لگی ہیں دادو۔ جانتی ہیں نا میں آپ کے بغیر ایک پل نہیں رہ سکتی' پھر ایسی باتیں کرکے میری جان کیوں نکالتی ہیں۔" وہ آنکھوں میں آنسو لیے ان سے مخاطب تھی۔

دادو کو مسکرانے میں بہت وقت پیش آئی تھی' لیکن انہوں نے زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر سجا کر لہجے کو بشاش بنایا۔

"اچھا بھئی' میری توبہ جو آئندہ ایسی بات کی۔ چلو ساری باتیں چھوڑو اور چائے پی لو۔" وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ذرا سا مسکرائی' پھر دادو اور رحمت بوا کو ان کے کپ تھما کر خود بھی چائے کے گھونٹ بھرنے لگی تھی۔



ایک نے کوفت کے عالم میں کال بیل پر دوبارہ انگلی رکھی۔ وہ بیگم فلک ناز صاحبہ کو ان دکانوں کا کرایہ دینے آیا تھا' جن کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔ ان کی مالی معاونت کے لیے یہ کہانی انصار بابا نے گھڑی تھی۔ حیرت اسے اس بات پر ہوئی تھی کہ بیگم فلک ناز جو خیر سے اس کی سوتیلی دادی کے عہدے پر فائز تھیں۔ ملک کی مشہور اور معروف ادیبہ' ان کے ذہین فطین ہونے میں کسی کو کوئی شبہ نہ تھا' پھر کیوں ان کا زرخیز دماغ انصار بابا کی گھڑی اس کہانی کے جھول پکڑنے پر قادر نہ تھا۔ وہ ہر مہینے اپنا حق سمجھتے ہوئے یہ رقم وصول کرتی تھیں۔ انصار بابا اتنے ممنون ہوتے گویا بیگم صاحبہ نے ان پر کوئی احسان کر دیا ہو۔

ایک کو انصار بابا کے اس عمل سے شدید اختلاف تھا' لیکن اختلاف کے اظہار کے نتیجے میں بات اس کی تربیت کی خامیوں کی طرف جا نکلتی۔ وہ باپ کو ملول اور دلگرفتہ نہ دیکھ سکتا تھا۔ سو اپنی ناگواری اور اپنے اختلاف کو دل میں ہی دبا کر رکھنے پر مجبور تھا۔

آج انصار بابا ان ہی نادیدہ دکانوں کا کرایہ لے کر بڑی کوٹھی کا رخ کرنے والے تھے۔ جب ایک نے انہیں ٹوکا۔ "اتنی گرمی میں کہاں رکشا' ٹیکسی میں خوار ہوں گے آپ' پھر کسی دن۔۔۔"

"نہیں ہوتا خوار' تم لے چلو مجھے وہاں۔" انہوں نے ایک کی بات پوری ہونے کا انتظار بھی نہ کیا۔ وہ خود کسی دوست کے پاس ضروری کام سے جا رہا تھا۔ باپ کی بات سن کر ٹھنڈی سانس اندر کھینچی۔

"میں آپ کو وہاں چھوڑ کر آگے تو نہیں جا سکتا۔ میری تربیت کا تقاضا ہے کہ بوڑھے باپ کو واپس گھر بھی ڈراپ کروں اور اتنا میرے پاس وقت نہیں۔ آپ مجھے پیسے دے دیجیے' میں آپ کی سوتیلی والدہ صاحبہ کی خدمت میں پیش کرکے آگے نکل لوں گا۔"

"باپ سے کیسے اکھڑے لہجے میں مخاطب ہو' پھر کہتے ہو کہ میں تمہاری غلط تربیت پر خود کو دوش نہ دوں۔" انصار بابا نے مسکرا کر اسے چھیڑا اور پھر رقم کا لفافہ اسے تھما دیا۔

وہ اس وقت یہ ہی "امانت" امانت داروں کے سپرد کرنے ان کے دروازے پر کھڑا تھا۔ دروازہ کھولنے والی رحمت بوا تھیں جو تیز تیز چل کر آنے کی وجہ سے ہانپ گئی تھیں۔

"میاں! اندر سے باہر آنے میں اتنا وقت تو لگتا ہے۔ تم بنا انتظار کیے بار' بار گھنٹی بجائے جا رہے تھے۔ کیا کام ہے' کس سے ملنا ہے؟" رحمت بوا ذرا جھلائے ہوئے انداز میں اس سے مخاطب تھیں۔

"آپ کی بیگم صاحبہ سے ملنا ہے' مجھے انصار بابا نے بھیجا ہے۔" ایک نے بھی جواباً کھردرے سے انداز میں بتایا۔

رحمت بوا کے چہرے کے تاثرات یک دم بدلے تھے۔ "او معاف کرنا بیٹا۔ چشمہ نہیں لگایا ہوا تھا' اس لیے تمہیں پہچان نہ پائی' ورنہ تمہیں تو میں اچھی طرح پہچانتی ہوں۔ ایک نام ہے نا تمہارا' آؤ' آؤ اندر آؤ' باہر کیوں کھڑے ہو۔" رحمت بوا نے پرتپاک انداز میں اسے مخاطب کرتے ہوئے اندر آنے کا راستہ دیا۔

"دراصل بیگم جی سے وقت' بے وقت لوگ ملنے آتے رہتے ہیں۔ کچھ تو کالج والج کے لڑکے لڑکیاں ہوتے ہیں' انہیں وہ لکھنا ہوتا ہے۔ کیا کہتے ہیں وہ مواعتیس۔ کچھ ویسے ہی ملنے کے شوقین ہوتے ہیں' اکثر تو بغیر وقت لیے بس منہ اٹھائے چلے آتے ہیں اور ہم تو بھئی۔۔۔" بوڑھی خاتون جو بیگم فلک ناز کی خاندانی ملازمہ تھیں۔ ضرورت سے زیادہ باتونی تھیں۔ ڈرائنگ روم میں اسے بٹھانے تک وہ مستقل بولتی رہی تھیں۔

"میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے' اگر آپ مہربانی فرما کر بیگم صاحبہ کو بلا دیں تو۔۔۔" اس نے کوفت اور بے زاری چھپاتے ہوئے رسانیت بھرے انداز میں انہیں مخاطب کیا۔

"بیگم جی تو وہاں گئی ہیں' کیا کہتے ہیں وہ ادیبوں کی بیٹھک۔ اللہ جانے ہر دوسرے تیسرے دن سارے ادیب اکٹھے کرکے کیا پنچایت کرتے ہیں۔"

ایک کو ادیبوں کی کسی بیٹھک یا پنچایت سے کیا سروکار تھا۔ اسے تو صرف اس لفافے سے جان چھڑانی تھی جو انصار بابا نے اس کے سپرد کیا تھا۔ پھر بھی ہزاروں روپے اس خاتون کے ہاتھ میں تھمانے کو ایک کا جی نہ مانا۔

"آپ بیٹھیں بیٹا۔ پارو بٹیا نماز پڑھ رہی ہیں۔ وہ جیسے ہی نماز پڑھ کر فارغ ہوتی ہیں' میں آپ کے پاس بھیجتی ہوں۔ جو ضروری بات ہے وہ ان سے کر لیجیے۔" جہاندیدہ بزرگ خاتون "ضروری بات" سے بھی واقف تھیں اور اس کے چہرے کا تذبذب بھی بھانپ چکی تھیں۔ سوا سے بیٹھنے کا کہہ کر خود بٹیا رانی کو بلانے چلی گئیں۔

وہ دل میں ایک لمحے کو شرمندہ ہوا۔ کیا تھا جو خاتون پر اعتماد کرکے رقم کا لفافہ ان کے سپرد کر دیتا' اب جانے اس مغرور حسینہ کا کب تک انتظار کرنا پڑے۔ جی ہی جی میں وہ اس کے نماز پڑھنے کا سن کر حیران بھی ہوا تھا' شاید جن لوگوں کے بارے میں ذہن میں منفی تاثر قائم ہو جاتا ہے۔ دماغ ان کی کسی خوبی کو مشکل سے ہی ہضم کر پاتا ہے۔

"مسلمان گھر میں پیدا ہوئی ہے۔ نماز پڑھ رہی ہے تو کون سا کمال کر رہی ہے۔" اس نے لاپروا انداز اختیار کرتے ہوئے سوچا' لیکن اسی وقت ضمیر صاحب نے آئینہ دکھایا۔

اسے مسجد کی شکل دیکھے آج پورے چار دن ہو چکے تھے۔ وہ شرمندہ تو ہوا' لیکن شرمندگی کا دورانیہ زیادہ طویل نہ تھا۔ گل خنداں ڈرائنگ روم میں داخل ہو رہی تھی۔ ایک اٹھ کھڑا ہوا۔

"جی؟" اس نے سوالیہ نگاہوں سے ایک کو دیکھا۔

نہ سلام' نہ دعا' بس اجنبیت میں لپٹا ہوا سوالیہ سا "جی" اس کی طرف لڑھکا دیا گیا تھا۔ گھر آئے مہمان کو سلام کر لینے سے اس کی شان تو نہ گھٹ جاتی تھی۔ ایک کو جی ہی جی میں اس پر خوب تاؤ چڑھا تھا۔

"بابا نے یہ پیسے بھجوائے تھے۔ دکانوں کا کرایہ۔ اپنی دادی جان کو دے دیجیے گا۔" اس نے روکھے سے لہجے میں مخاطب کرتے ہوئے لفافہ اس کی جانب بڑھا دیا۔

"بہتر۔۔۔" اب بھی یک حرفی جواب ملا۔ لفافہ بھی تھام لیا تھا۔

"چلتا ہوں۔" وہ فوراً" ہی ڈرائنگ روم سے نکل گیا۔

رحمت بوا کولڈ ڈرنک لیے ڈرائنگ روم میں آئیں' تو گل خنداں صوفے پر بیٹھی اپنے سیل فون پر میسج چیک کرنے میں مصروف تھی۔

"ہائیں! صاحب زادے چلے بھی گئے۔" انہیں اچنبھا ہوا۔ "آپ انہیں روک لیتیں بٹیا۔ کم از کم پانی تو پی جاتے۔"

"آپ پہلے کہہ دیتیں' مجھے خیال ہی نہیں آیا۔" اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔

"ویسے بوا! یہ انصار صاحب کس خوشی میں ہر ماہ ہمیں۔۔۔ دکان کا کرایہ بھیجتے ہیں' اگر دادا جان کی کوئی دکانیں وغیرہ تھیں تو ہمیں الہام تھوڑی ہونا تھا' رکھتے رہتے یہ کرایہ وغیرہ اپنے پاس۔" اس نے کئی بار کی

سوچی ہوئی بات بوا سے شیئر کی۔

"ارے نہیں بٹیا! بڑے بھلے مانس شخص ہیں انصار احمد' بے ایمانی ان کی فطرت میں ہی شامل نہیں ہے۔ صالحہ بیگم نے بہت اچھی تربیت کی ہے بیٹے کی۔" بوا نے جھٹ ان لوگوں کی سائڈ لی تھی۔

"آپ میرے منہ پر تو دادو کی سوتن کی تعریف کر رہی ہیں۔ دادو کے سامنے مت کہہ دیجیے گا۔" اس نے بوا کو مخاطب کیا۔

"ایسی بات نہیں بٹیا! بیگم جی کو صالحہ بیگم سے کوئی پرخاش نہ تھی۔ وہ تو کئی بار یہاں بیگم جی سے ملنے بھی آئی تھیں۔ اللہ جنت نصیب کرے' اچھی خاتون تھیں۔" بوا نے خود کلامی کا سا انداز اپنایا۔

"ویسے بوا! دادو اور دادا جان کی تو محبت کی شادی تھی' پھر دادا جان نے ان سے بے وفائی کیوں کی۔ میری دادو جیسی شان دار بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری شادی کیوں کی۔"

"ارے چھوڑو بٹیا! برسوں پرانے قصے کی گرد جھاڑنے سے کیا حاصل۔" رحمت بوا نے اسے ٹالنا چاہا۔

"بتائیں نا بوا۔ میں اس بارے میں دادو سے صرف اس وجہ سے نہیں پوچھتی کہ وہ ہرٹ ہوں گی' آپ بتائیں ناں دادا جان اور دادو نے اس زمانے میں لو میرج کی' پھر یہ محبت کیوں دم توڑ گئی۔" اس نے ذہن میں کلبلاتا سوال پوچھا تھا۔

رحمت بوا نے ٹھنڈا سانس بھرا تھا۔ پھر ماضی کے اوراق پلٹنے لگی تھیں۔

✡ ✡ ✡

شافع علی کی نسبت بچپن سے ہی اپنی خالہ زاد صالحہ سے طے تھی' لیکن یونی ورسٹی گئے تو اپنی کلاس فیلو فلک ناز کو دل دے بیٹھے۔ اس زمانے میں جب گنی چنی لڑکیاں ہی اعلا تعلیم کی درس گاہوں کا رخ کرتی تھیں' فلک ناز نہ صرف اعلا تعلیم حاصل کر رہی تھیں' بلکہ اپنی ذہانت' خوب صورتی اور اعتماد کی وجہ سے اسٹوڈنٹس اور اساتذہ میں یکساں مقبول تھیں۔ شعر و شاعری سے شغف تھا۔ یونی ورسٹی کے ادبی مجلے کی مدیرہ تھیں۔

شافع علی کو شعر و ادب سے تو دور' دور کا واسطہ نہ تھا' لیکن ان کی ذہانت اور وجاہت میں کوئی کلام نہ تھا۔ فلک ناز کے حسن نے انہیں اپنا اسیر بنا لیا۔ بہت جلد یہ یک طرفہ محبت دو طرفہ محبت میں بدل گئی۔ گھر والوں نے شادی کے لیے صالحہ کا نام لیا تو وہ برسوں پرانی ٹھہرائی گئی نسبت سے ہی منکر ہو گئے اور بہت دھڑلے سے اپنی پسند سے گھر والوں کو آگاہ کر دیا۔ بہت ہنگامے کے بعد ماں' باپ کو جوان بیٹے کی ضد کے آگے ہتھیار ڈالنے پڑے۔

فلک ناز والدین کی اکلوتی اولاد تھیں۔ ان کا گھرانہ پڑھا لکھا تھا۔ معمولی سے تحفظات کے اظہار کے بعد انہوں نے بیٹی کی پسند کو شرف قبولیت بخش دی۔ دھوم دھام سے شادی ہوئی۔ شادی کے بعد فلک ناز کی شاعری کی پہلی کتاب منظر عام پر آئی اور کتاب نے ادبی افق پر مقبولیت کے جھنڈے گاڑ دیے۔ شافع علی بیوی کی کامیابی پر خوش تھے' لیکن ان کا خیال تھا کہ بیوی گھر کی چار دیواری میں بیٹھ کر اپنے شوق کی تکمیل کرے۔ فلک ناز کو ادبی تقریبوں اور مشاعروں میں مدعو کیا جانے لگا۔ یہیں سے میاں' بیوی کے اختلافات کا آغاز ہوا۔

فلک ناز اپنے تعلیم یافتہ اور بظاہر روشن خیال شوہر کے خیالات سے متفق نہ تھیں۔ وہ جن ادبی محفلوں میں جاتی تھیں وہاں ادبی ذوق رکھنے والے بالغ نظر اور باشعور لوگ مدعو ہوتے تھے۔ عامیانہ مشاعروں میں جانے سے تو وہ خود ہی انکار کر دیتی تھیں۔ ملک کے نامی گرامی شاعر اور ادیب اس نئی ابھرتی ہوئی شاعرہ کے ساتھ بہت مشفقانہ برتاؤ کرتے تھے۔ کبھی جن لوگوں کا کلام پڑھ کر فلک ناز بہت متاثر ہوتی تھیں۔ اب انہیں ادبی افق کے ان چمکتے دمکتے ستاروں کی شفقت اور رہنمائی میسر آ رہی تھی۔ انہیں ان بڑے ناموں کی صحبت میں بیٹھ کر ادبی فیض حاصل ہوتا تھا۔ کلام کی اصلاح ہوتی تھی۔ ان لوگوں کی پُر مغز گفتگو سے سوچ

کے نئے در وا ہوتے تھے اور شافع چاہتے تھے کہ وہ گھر میں بیٹھ کر ہی اپنا ادبی اور قلمی سفر جاری رکھیں۔

"میں گھر کی ذمہ داری بخوبی نبھا رہی ہوں شافع! اگر مہینے میں دو چار بار کسی ادبی محفل میں شرکت کر لیتی ہوں تو اس میں کیا مضائقہ ہے۔"

پہلے پہل وہ بہت رسانیت سے شوہر سے بات کرتیں' لیکن شوہر نے ان کے باہر نکلنے پر مزید سختی شروع کر دی تو ان کا لہجہ بھی تلخ ہو تا گیا۔

ننھے عمار کی پیدائش کے باوجود میاں بیوی کے تعلقات میں کھنچاؤ بڑھتا گیا۔ شافع کے گھر والے صورت حال کو مزید بگاڑنے اور بیوی کے خلاف شافع کے کان بھرنے میں اپنا ہر ممکن کردار ادا کر رہے تھے۔

ان کی سابقہ منگیتر صالحہ شادی کے چار برس بعد بیوہ ہو کر یہاں کی دہلیز پر واپس پہنچ چکی تھیں' یہ چار برس بھی انہوں نے اجڈ اور گنوار سسرال میں بہت مشکل سے گزارے تھے۔ بیوگی کے بعد تین سالہ بیٹے کے ساتھ واپس میکے لوٹنا پڑا تھا۔ وہاں بھاوجوں نے زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔

شافع علی کی والدہ بیٹے کے سامنے بھانجی کی لاچاری بیان کرتیں اور اس سب کا ذمہ دار شافع علی کو ہی ٹھہراتیں۔ دوسری طرف وہ بیٹے اور بہو کے تعلقات میں بڑھتی خلیج سے بھی بخوبی آگاہ تھیں۔ انہوں نے بیٹے پر زور دینا شروع کر دیا کہ وہ صالحہ کو سہارا دینے کی غرض سے ان سے عقد ثانی کر لیں۔ شافع علی نے ماں کے مطالبے کو قطعاً "سنجیدگی سے نہ لیا' لیکن گزرتے وقت کے ساتھ ان کی ازدواجی مزید ہچکولے کھانے لگی۔ دونوں میاں' بیوی نے اسے اپنی ضد اور انا کا مسئلہ بنا لیا تھا۔

شدید غصے اور طیش کے عالم میں شافع علی نے ماں کا مطالبہ پورا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ویسے بھی انہوں نے فلک ناز سے کہہ دیا تھا کہ اگر وہ شوہر کی مرضی کے آگے سر نہیں جھکاتیں تو انہیں سنگین نتائج بھگتنا ہوں گے۔ محبوب شوہر جب انہیں محکوم رعایا سمجھ کر حکم چلانے لگا تو وہ شوہر سے مزید متنفر ہو گئیں اور ان کی ضد میں کھلم کھلا حکم عدولی شروع کر دی۔

یہ کوٹھی شافع علی نے بیوی کے نام کر رکھی تھی اور اب اس کوٹھی کے لان میں بھی ادبی محفلیں ہونا شروع ہو گئی تھیں۔

شافع علی اپنے آبائی گھر چلے گئے اور ماں کے سامنے صالحہ سے شادی پر رضامندی کا اظہار کر دیا۔ صالحہ کی زندگی مصائب سے دوچار تھی' لیکن وہ کسی دوسری عورت کے سہاگ پر ڈاکا نہیں ڈالنا چاہتی تھیں۔ ان کے گھر والے ان کی کوئی بات سننے پر تیار نہ تھے۔ انہوں نے بہت مشکلوں سے فلک ناز کے گھر کا ٹیلی فون نمبر حاصل کر کے ان سے رابطہ کیا اور انہیں آگاہ کیا کہ شافع علی کے گھر والے صالحہ کے ساتھ شافع علی کی شادی کروا رہے ہیں' وہ کسی بھی طرح یہ شادی رکوا لیں۔

فلک ناز' صالحہ کا فون سن کر ششدر رہ گئی تھیں۔ وہ محض یہ سوچے بیٹھی تھیں کہ شافع علی ان سے ناراض ہو کر چند دن کے لیے اپنے والدین کے گھر چلے گئے ہیں۔ پہلی بار شوہر کی ناراضی کو سنجیدگی سے لیتے ہوئے وہ سرینڈر کرنے کا سوچ ہی رہی تھیں کہ شوہر کی بے وفائی کا "مژدہ" بھی سننے کو مل گیا۔ انہوں نے صالحہ سے کہہ دیا کہ صالحہ سے انہیں کوئی شکایت نہیں' وہ بخوشی ان کے شوہر کی دوسری بیوی بن سکتی ہیں۔

شافع علی کو شادی کے بعد ایک مشترکہ دوست سے پتا چلا کہ فلک ناز نے ادبی کیریئر ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ پچھتاوے میں گھر کر وہ بیوی سے ملنے اور معافی مانگ کر اسے منانے اس کے پاس گئے' لیکن اب فلک ناز کو ان کی معافی سے کوئی سروکار نہ تھا' وہ شوہر کی شکل بھی دیکھنے کی روادار نہ تھیں۔

مشترکہ دوستوں نے دونوں کی صلح کی بہت کوشش کی' لیکن فلک ناز کو اپنی محبت کی توہین گوارا نہ تھی۔ صالحہ بھی انہیں منانے آئیں' یہ تک کہا کہ انہیں صرف شافع علی کا نام درکار ہے' فلک ناز شافع علی کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی گزاریں' صالحہ ان کے گھر کے کسی گوشے میں پڑ کر اپنا وقت گزار لیں گی۔ فلک ناز

کے لبوں پر مغموم مسکراہٹ پھیل گئی۔

"آپ کو پورے کا پورا شافع علی مبارک ہو صالحہ! بس میری محبت نے مجھے اتنا کمزور بنا دیا ہے کہ میں اپنے نام سے اس کا نام ہٹانے کی خود میں ہمت نہیں پاتی' لیکن اسے بتا دیجیے کہ ہماری راہیں الگ ہو چکی ہیں اور اگر اس نے میرے بیٹے پر کوئی حق جتانے کی کوشش کی تو میں نام کی حد تک جڑا رشتہ بھی توڑ لوں گی۔ پھر مجھے خلع لینے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔"

شافع علی جانتے تھے کہ وہ اپنی ہٹ کی کتنی پکی ہیں۔ انہیں یہ مطالبہ مانتے ہی بنی تھی۔ وہ سرکاری ملازم تھے۔ ٹرانسفر ہوا تو یہ شہر بھی چھوٹ گیا۔

صالحہ فرماں بردار اور خدمت گزار بیوی تھیں۔ وہ صالحہ کی دل سے قدر کرتے تھے' لیکن صالحہ جانتی تھیں کہ اس دل کے کواڑ ان کے لیے کبھی نہ کھلیں گے۔ وہ صابر شاکر خاتون تھیں۔ شافع علی کا یہ احسان ہی انہیں ان کے سامنے سر نہ اٹھانے دیتا تھا کہ وہ ان کے بیٹے کو اپنی شفقت کے سائے تلے پروان چڑھا رہے تھے۔

فلک ناز کی زندگی کا محور و مرکز عمار تھا۔ وہ اپنے والدین کی واحد وارث تھیں۔ والدین کے انتقال کے بعد جائیداد ان ہی کو ملی۔ مالی طور پر کوئی پریشانی لاحق نہ تھی' لیکن تن تنہا بیٹے کی پرورش آسان کام نہ تھا۔ مزاج کی تندی اور تیزی بیٹے کو والدین سے ورثے میں ملی تھی۔

فلک ناز کی خواہش تھی کہ وہ اعلا تعلیم حاصل کرلے' لیکن عمار نے تعلیم کا سلسلہ ادھورا چھوڑ کر کاروبار کرنے کی ٹھانی' کم عمری میں ہی اسے محبت نامی مرض بھی لاحق ہو گیا' فلک ناز جلد شادی پر راضی نہ ہوئیں تو اس نے پسند کی لڑکی سے کورٹ میرج کرلی۔ طوعاً" و کرہاً" انہیں اس شادی کو قبول کرنا پڑا تھا' لیکن زندگی ابھی بھی آزمائشوں سے عبارت تھی۔

پہلے شافع علی کی موت کا صدمہ سہنا پڑا' وہ عمرہ کی ادائیگی کے لیے حجاز مقدس گئے تھے اور وہیں دل کا دورہ جان لیوا ثابت ہوا۔ ان کا وجود اس مقدس سرزمین میں پیوند خاک ہوا۔ عملی طور پر دونوں میاں' بیوی علیحدگی کی زندگی گزار رہے تھے' لیکن اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود وہ آج بھی ان کے دل کے مکین تھے۔

صالحہ اپنا غم منانے میں آزاد تھیں' جبکہ فلک ناز تو مرحوم شوہر کے لیے دو آنسو بھی نہ بہا سکتی تھیں۔ ان کے دل کی حالت سے بہت اپنے ہی واقف تھے اور رحمت بوا ان اپنوں میں سرفہرست تھیں۔ وہ فلک ناز کے والد کے منشی کی بیٹی تھیں۔

رفیق کاکا کو فلک ناز کے میکے میں گھر کے فرد کی حیثیت حاصل تھی۔ رحمت کو شادی کے بعد بانجھ پن کی وجہ سے طلاق کا صدمہ سہنا پڑا تھا۔ رفیق کاکا بیٹی کی ابتر ذہنی حالت کی وجہ سے بہت پریشان تھے۔ ان دنوں فلک ناز کی بھی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ وہ شافع علی کی اجازت سے رحمت کو اپنے گھر لے آئیں۔ اس وقت سے رحمت گھر کا فرد ہی بن گئی تھیں۔ عمار ان ہی کی گود میں پلا بڑھا اور پھر عمار کی گل خنداں نے بھی ان ہی کی گود میں آنکھ کھولی۔

گل خنداں پانچ برس کی تھی جب عمار کو ناتجربہ کاری کے باعث کاروبار میں بڑے گھاٹے کا سامنا کرنا پڑا۔ پے در پے ہونے والے نقصانات نے کاروبار کا دیوالیہ نکال دیا۔ فلک ناز پہلے ہی سارے اثاثے بیٹے کے کاروبار میں لگا چکی تھیں' اب بیٹے کی جذباتی ڈھارس بندھانے کے سوا کسی قسم کی مدد کرنے سے قاصر تھیں۔

عمار کو دوسرا دھچکا بیوی کی بے وفائی کی صورت ملا۔ وہ لڑکی جو کبھی والدین کی رضامندی کے بغیر ہنسی خوشی ان کی زندگی میں شامل ہو گئی تھی۔ مالی تنگ دستی برداشت نہ کر پائی اور ایک رات چپکے سے شوہر کے نام رقعہ چھوڑ کر ان کی زندگیوں سے دور چلی گئی' اسے اپنی بیٹی سے بھی کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ محض طلاق چاہتی تھی' تاکہ بنا کسی رکاوٹ کے زندگی کا نیا سفر شروع کر سکے۔ طلاق کی نوبت ہی نہ آئی۔ عمار اتنا ذہنی دباؤ برداشت نہ کر پائے اور برین ہیمرج کے نتیجے میں زندگی کی بازی ہار گئے۔

فلک ناز کی دنیا اندھیر ہو گئی تھی' لیکن اپنی پاروکی

خاطر انہیں خود کو سنبھالنا پڑا تھا۔ کتابِ زندگی کے گوشوارے میں گل خنداں کے سوا سب خسارہ تھا۔ گل خنداں ہی ان کی سب سے قیمتی متاع تھی۔ وہ پوتی کو دیکھ دیکھ کر جیتی تھیں۔ عمار کے انتقال کے وقت صالحہ اپنے بیٹے انصار کے ساتھ ان سے تعزیت کے لیے آئی تھیں۔

صالحہ کے لیے بھی زندگی آسان نہ تھی۔ کچھ عرصہ پہلے اکلوتی بہو بچے کی زچگی کے دوران جانبر نہ ہو پائی تھی۔ صالحہ کا ایک ہی پوتا تھا اور بیٹا دوسری شادی پر راضی نہ ہوتا تھا۔ فلک ناز کے خیال میں صالحہ خوش قسمت تھیں جو جلد ہی دنیا کے غموں سے چھٹکارا پاکر اپنے ابدی سفر پر روانہ ہو گئیں۔

ماں کے انتقال کے کچھ عرصے بعد انصار نے فلک ناز سے رابطہ کیا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ شافع علی نے ترکے میں دو دکانیں چھوڑی ہیں اور صالحہ کے بعد وہ ان دکانوں پر اپنا کوئی حق نہیں سمجھتے۔ دکانوں کا ہر ماہ معقول کرایہ آتا ہے۔ ان کے خیال میں اس رقم پر گل خنداں کا حق تھا اور اگر بیگم صاحبہ اجازت دیں تو وہ ہر ماہ یہ کرایہ انہیں پہنچا دیا کریں۔ معمولی ہچکچاہٹ کے بعد فلک ناز اس امر پر راضی ہو گئی تھیں۔

اب کتابوں کی رائلٹی کے سوا ان کا کوئی ذریعہ آمدن تھا بھی نہیں، لیکن یہ رقم بھی گزارے کے لیے کافی نہ تھی۔ ساری عمر انہوں نے شاہانہ طرزِ زندگی اپنایا تھا، اب پوتی کو ناز و نعم سے کیوں نہ پالتیں۔ انہوں نے بہت سوچ و بچار کے بعد یہ کوٹھی اپنے دیرینہ شناسا کمال انصاری کو فروخت کر دی، اس شرط کے ساتھ کہ گل خنداں کی شادی تک وہ یہاں کی سکونت نہیں چھوڑیں گی اور ہر ماہ کوٹھی کا کرایہ کمال صاحب کو ادا کریں گی۔ کمال انصاری ان کے اور شافع علی کے مشترکہ دوست تھے۔ انہیں یہ شرط ماننے میں کوئی تامل نہ ہوا۔ اب ایک بار پھر پیسے کی فراوانی تھی۔

ایک پرائیویٹ ٹی وی چینل پر ادبی پروگرام کی میزبانی بھی مل گئی۔ کتابوں کی رائلٹی بھی ملتی تھی یوں وہ اپنی پارو کو شہزادیوں کی طرح پروان چڑھا رہی تھیں۔

رحمت کو البتہ ان کے طرزِ عمل سے اختلاف رہتا تھا۔

"بیٹھے بٹھائے تو قارون کا خزانہ بھی ختم ہو جاتا ہے بیگم جی! ان بچے ہوئے چند لاکھ کی اوقات ہی کیا ہے، کل کو بٹیا کی شادی بھی کرنی ہے۔ اب ان آلتو فالتو خرچوں کے بجائے بٹیا کا جہیز بنانے کا سوچیں۔" اس بار بھی گل خنداں کی دھوم دھڑکے سے منائی جانے والی سالگرہ کے بعد رحمت نے انہیں صلاح دی تھی اور اب بھی گل خنداں کو ماضی کی سیر کروانے کے بعد ان کی تان وہیں آکر ٹوٹی تھی۔

"بس اب تو اللہ سے یہ ہی دعا ہے بٹیا کہ آپ کے لیے کوئی اچھا سا بر بھیج دے، تاکہ بیگم جی آپ کے فرض سے بخیر و خوبی سبک دوش ہو جائیں۔"

"بوا جی! آپ کے پاس میری شادی کے سوا کوئی دوسرا موضوع نہیں۔" وہ ٹھنکی تھی۔ "شادی میں رکھا ہی کیا ہے اور ویسے بھی ہمارے خاندان کو شادی راس نہیں آتی۔ دادو کو کیا ملا شادی کرکے اور پھر پاپا نے کیا پایا۔ اس لیے میں شادی کروں گی ہی نہیں۔"

"شادی کے بعد آپ کی دادو کو ملے پاپا اور پاپا کو ملیں آپ اور میں کہے دے رہی ہوں، فالتو باتیں منہ سے مت نکالا کریں، اللہ بہت جلد آپ کو اپنے گھر بار کا کرے۔" رحمت بوا نے خفگی سے ٹوکا تھا اور پھر دعا سے بھی نوازا تھا۔

"شادی اگر اتنی ہی ضروری ہے تو پھر میری شرط گھر داماد کی ہوگی بوا جی۔" اس نے انہیں سنجیدگی سے مخاطب کیا، لیکن آنکھوں میں شرارت رقصاں تھی۔

بوا جی حسبِ توقع تلملا کر اسے کچھ سنانے والی تھیں، لیکن پھر اس کے چہرے پر دبی مسکراہٹ دیکھ کر اس کی شرارت بھانپ گئیں۔

"بوڑھی بوا سے چہلیں کرتی ہیں، ٹھیک ہے، بٹیا مرضی آپ کی۔"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ رحمت بوا بھی مسکرا دی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"انصار بابا! آپ نے مجھے صحیح اپنا ڈرائیور بنا لیا ہے، بھلا آج کی تقریب میں میرے آنے کا کیا کام تھا۔" ایبک جھنجلائے ہوئے انداز میں بابا سے مخاطب تھا۔

اس وقت وہ شہر کے مشہور میرج ہال میں موجود تھے۔ کمال صاحب کی بیٹی بینش کی شادی کی تقریب تھی۔ کمال انصاری، فلک ناز اور شافع علی دونوں کے مشترکہ دوست تھے۔ دونوں میاں، بیوی میں علیحدگی کے باوجود انہوں نے دونوں سے دوستی نبھائی تھی۔ مرحوم والد کی اسی دوستی کو نبھانے کی خاطر انصار احمد نے بھی ان سے رابطہ استوار رکھا تھا، آج وہ ان کی بیٹی کی شادی میں شریک تھے اور ان کے ساتھ آیا بیٹا مسلسل بے زاری کا اظہار کر رہا تھا۔

"تم بہت آدم بے زار ہو چکے ہو ایبک! انسانوں میں رہ کر جینے کا ہنر سیکھو۔ سماجی تقریبات میں شرکت کرنی ہی پڑتی ہے یار۔" انصار احمد کے سمجھانے پر وہ خاموش ہی رہا، لیکن چہرے پر اب بھی بے زار کن تاثرات تھے۔

"اور تم ناراض نہ ہو تو ایک مفت مشورہ بھی دے سکتا ہوں۔" مسکراہٹ دباتے ہوئے انہوں نے بیٹے کو مخاطب کیا۔ ایبک نے سوالیہ نگاہیں ان پر گاڑیں۔

"آج کی تقریب میں اتنی ڈھیر ساری لڑکیاں ہیں۔ ہو سکتا ہے غور کرنے پر تمہیں کوئی لڑکی پسند ہی آجائے۔ عنقریب تمہاری پڑھائی ختم ہونے والی ہے، پھر میں نے فوراً ہی تمہارے سر پر سہرا سجا دینا ہے۔" انہوں نے وارننگ دینے والے انداز میں باور کروایا۔

"انصار بابا! آپ دنیا کے انوکھے ترین باپ ہیں۔ شریف بیٹے کو خود نظرباز بننے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ یونی ورسٹی پڑھنے جاتا ہوں، وہاں کے لیے بھی آپ یہ ہی بات بار بار دہراتے ہیں کہ کوئی اچھی سی لڑکی منتخب کرلو۔ کسی تقریب میں آپ کے ساتھ شرکت کی غلطی کرلوں، تب بھی آپ یہ ہی بات کہتے ہیں کہ اتنی ڈھیر ساری لڑکیاں ہیں، کوئی بھی پسند کرلوں۔ لائف پارٹنر کا انتخاب ایسے تھوڑی ہوتا ہے انصار بابا۔" وہ جھنجلا ہی تو گیا۔

"تم جتنے کھڑوس شخص ہو بیٹا، اپنے لیے لڑکی تو تمہیں خود ہی ڈھونڈنی پڑے گی۔ میں کوئی لڑکی ڈھونڈ کر بعد میں ساری عمر تمہارے طعنے نہیں سن سکتا۔" اس بار انہوں نے بھی ذرا خفگی سے بیٹے کو جتایا تھا، پھر کوئی شناسا صورت نظر آنے پر سلام دعا کرنے کے لیے آگے بڑھ گئے۔

"بابا کا بھی جواب نہیں، کہتے ہیں ان لڑکیوں میں سے کوئی لڑکی ڈھونڈ لوں۔" ان کے جانے کے بعد وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا تھا۔ "کیک پیسٹری بنی ان لڑکیوں میں سے کسی ماڈل گرل کا انتخاب تو ہو سکتا ہے، مگر لائف پارٹنر کا نہیں۔" اس نے سرسری سی نگاہ لڑکیوں کے ایک گروپ پر ڈالتے ہوئے سوچا تھا۔

کمال انکل کی فیملی خاصی ماڈرن اور آزاد خیال تھی۔ برائے نام آستینوں والے ڈیزائنر ملبوسات پہنے وہ لڑکیاں ادھر سے اُدھر اپنے حسن کی بجلیاں گراتی پھر رہی تھیں، کچھ وہ تھیں جو اپنے حسن کو اپنے ہی سیل فون کے کیمرے میں قید کرنے کی کوشش میں مصروف تھیں۔ ایبک کوفت اور بے زاری سے ان لڑکیوں کی حرکتیں دیکھنے میں مشغول تھا کہ نگاہ بھٹک کر دوسری سمت چلی گئی۔ جو بے زاری ایبک کے چہرے پر موجود تھی عین وہ ہی تاثرات محترمہ کے چہرے پر بھی دیکھے جاسکتے تھے۔ ایبک کے لبوں پر جانے کیوں مسکراہٹ بکھر گئی۔

"لگتا ہے میرے بابا کی طرح اس کی دادی بھی اسے زبردستی ساتھ لائی ہیں۔" وہ اس مغرور حسینہ کے تاثرات سے محظوظ ہوا تھا۔ قریب ہی اس کی دادی دوسری خواتین سے باتوں میں مشغول تھیں۔

"لگتا ہے، بابا کی نگاہ ابھی تک اپنی سوتیلی والدہ پر نہیں پڑی ہے۔ ورنہ اب تک ان کی خدمت میں حاضری دے چکے ہوتے۔" اس نے سوچا تھا اور پھر وقفہ وقفہ سے اس کی نگاہ غیر ارادی طور پر گل خنداں کی طرف اٹھتی رہی تھی۔

اس کی دادی سحر انگیز خوب صورتی رکھنے والی خاصی پُروقار خاتون تھیں۔ گل خنداں دادی جتنی حسین و جمیل نہ سہی، لیکن اس کی شخصیت میں بھی کسی حد

تک جاذبیت تھی۔ ناپسندیدگی کے باوجود ایبک کو دل میں قائل ہونا پڑا تھا۔

اچانک اس کی نگاہ انصار بابا پر پڑی۔ وہ کچھ فاصلے پر کھڑے تھے اور جانے کب سے بیٹے کو "تاڑنے" میں مشغول تھے۔ اس کی توجہ کا مرکز ان کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ تھا۔ باپ' بیٹے کی نگاہیں ملیں تو انصار بابا کے چہرے پر ذومعنی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

"انصار بابا بھی نا بس...." ایبک ذرا خفیف ہوا' جانتا تھا کہ اب وہ اس حوالے سے کوئی اوٹ پٹانگ بات ضرور کریں گے۔

تقریب کے دوران تو انہوں نے کسی قسم کا کوئی ذکر نہ چھیڑا' لیکن اس کے خدشے کے عین مطابق اگلے دن رات کا کھانا کھاتے ہوئے انہوں نے بہت سرسری سے انداز میں بات کا آغاز کیا تھا۔

"بہت اچھی بچی ہے گل خنداں! تم نے بھی نوٹ کیا ہوگا کہ کل کی تقریب میں وہ دوسری سب لڑکیوں میں منفرد اور ممتاز لگ رہی تھی۔"

"مجھے ایسی باتیں نوٹ کرنے کی کیا ضرورت تھی' میں تو اس کے پاس کھڑے کمال انکل کے پوتوں کو دیکھ رہا تھا۔ بہت پیارے بچے تھے۔" اس نے بھی لاپروا سے انداز میں جواب دیا۔

"ویسے ایبک! اگر تم مانو تو میں بیگم فلک ناز سے گل خنداں کے لیے بات کروں۔ ہوسکتا ہے وہ مان ہی جائیں۔" ایبک نے ان کے کہنے پر نگاہیں اٹھا کر انہیں دیکھا۔ وہ واقعی سنجیدہ تھے۔

"فار گاڈ سیک انصار بابا! آپ ایسی بات کر کے مجھے طیش کیوں دلا رہے ہیں۔ ان کے ماننے' نہ ماننے کی بات تو بعد میں آتی ہے' جبکہ مجھے وہ لڑکی ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ آپ نے ایسی بات سوچی بھی کیسے؟"

"پتا نہیں وہ تمہیں کیوں پسند نہیں۔ کتنی پیاری بچی ہے۔ ذرا سوچو اگر یہ رشتہ جڑ جائے تو تمہارے دادا' دادی کی روحوں کو کتنا سکون ملے گا۔"

"دادی' دادا کی روحوں کو سکون پہنچانے کے لیے آپ اپنے بیٹے کو بے سکون کیوں کر رہے ہیں۔ آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ وہ لڑکی انتہا درجے کی بدتمیز اور بدتہذیب ہے۔ یونی ورسٹی میں اپنے ہر جاننے والے کو میرے متعلق یہ جتاتی ہے کہ میں اس کے دادا کا سوتیلا پوتا ہوں اور اس روز جب میں گھر گیا تو اتنے روڈ طریقے سے پیش آئی کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔ گھر آئے مہمان سے چائے' پانی پوچھنا تو درکنار وہ سلام دعا تک کرنے کی روادار نہ ہوئی اور ایسی بدتہذیب لڑکی کا آپ رشتہ مانگنا چاہتے ہیں۔" وہ بگڑ کر بولا۔

"برخوردار! اسے چائے' پانی تو واقعی پوچھنا چاہیے تھا' لیکن سلام تو مہمان بھی کر سکتا تھا' کبھی تو میری تربیت کی لاج رکھ لیا کرو۔" انصار بابا اپنی عادت کے مطابق بات کو گھما پھرا کر پھر اس کی تربیت تک لے آئے تھے۔ ایبک بس انہیں بے چارگی سے دیکھ کر رہ گیا۔

☆ ☆ ☆

"کیا ہوا بیگم جی! طبیعت تو ٹھیک ہے' اتنی مضمحل کیوں لگ رہی ہیں۔ آج تو آپ ڈاکٹر کے پاس چیک اپ کروانے گئی تھیں نا' کیا کہا ڈاکٹر نے۔" رحمت بوا' فلک ناز سے مخاطب تھیں۔ فلک ناز کے چہرے پر تھکی تھکی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

"ڈاکٹروں نے کیا بتانا ہے رحمت! اپنے دل کے فسانے کا تو مجھے خود علم ہے۔ ڈاکٹر تو بس وارننگ دیتے ہیں کہ خود کو دل کی چیرپھاڑ کے لیے راضی کرلوں' اب مزید وقت ضائع کرنے کی گنجائش نہیں۔" انہوں نے بوا کو آسان فہم زبان میں بتایا۔

"ہائے میرے اللہ۔" بوا کا ہاتھ بھی اپنے دل پر جا پڑا تھا۔

"پھر کاہے کو دیر کرتی ہیں بیگم جی! ڈاکٹروں کا مشورہ مان لیں۔" بوا مضطرب ہو گئی تھیں۔

"اب میں بنا تاخیر کے پارو کے فرض سے سبک دوش ہونا چاہتی ہوں رحمت۔ پارو کے مستقبل کی طرف سے اطمینان ہو جائے تو کروالوں گی علاج' لیکن

مجھے پتا ہے' اب اس کا کوئی فائدہ نہیں' مہلت بس ختم ہی ہونے والی ہے۔"

"اللہ آپ کو صحت و تندرستی کے ساتھ درازی عمر عطا کرے۔ منہ سے خیر کا کلمہ نکالیں اور جہاں تک پارو بٹیا کی شادی کا معاملہ ہے میں تو کب سے کہہ رہی ہوں کہ جتنی جلدی ہو سکے اس فرض سے سبکدوش ہوں۔" رحمت بوا کے کہنے پر انہوں نے ہنکارا بھرا تھا۔

"محسن صاحب کو تو جانتی ہیں نا آپ' کچھ دن پہلے انہوں نے اپنے بیٹے کے لیے بات کی تھی' سوچ رہی ہوں انہیں فیملی سمیت کھانے پر بلالوں۔ لڑکا جی کو لگا تو پھر معاملہ آگے بڑھائیں گے۔"

"ٹھیک ہے بیگم جی' جیسا آپ مناسب سمجھیں' بس بٹیا کو اچھی طرح سمجھا دیجیے گا۔ مہمانوں سے ذرا تمیز' تہذیب سے پیش آئیں' اگر انہیں پتا چل گیا مہمان کس مقصد سے آرہے ہیں تو بہت ہنگامہ مچائیں گی۔" بوا دلی خدشہ زبان پر لے آئیں۔

"سمجھا دوں گی رحمت۔ ظاہر ہے سمجھانا ہی پڑے گا۔ پارو کو بھی اب زندگی کی حقیقتوں کا سامنا کرنا آنا چاہیے۔ بوڑھی دادی کب تک اسے مرغی کے بچے کی طرح اپنے پروں میں چھپا کر بیٹھی رہے گی۔" وہ یاسیت بھرے لہجے میں بولیں۔ رحمت اس بار انہیں تسلی کے دو بول بھی نہ بول سکیں۔ بس انہیں دل گرفتی سے دیکھ کر رہ گئیں۔

☆ ☆ ☆

"لیکن دادو...." وہ ان کی بات سن کر متوحش نگاہوں سے انہیں تکنے لگی تھی۔

"میں چاہتی ہوں اپنی زندگی میں ہی تمہیں اپنے گھربار کا کردوں۔"

"پلیز دادو! یہ زندگی موت والی باتیں کر کے مجھے پریشان مت کیا کریں۔" وہ روہانسی ہو گئی تھی۔

"حقیقت کو فیس کرنا سیکھو پارو۔ میں بوڑھی ہو گئی ہوں۔ میری زندگی اپنے اختتام کی جانب گامزن ہے۔ میرے بغیر تم اکیلے کیسے رہوگی' سوچ سوچ کر میری راتوں کی نیندیں اڑ گئی ہیں اور ڈاکٹرز کہتے ہیں مسلسل اسٹریس لینا میرے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔" دوستانہ انداز ترک کر کے انہوں نے قطعی سنجیدہ لہجے میں پوتی کو سمجھایا تھا۔

"یعنی آپ کی پریشانی کی سب سے بڑی وجہ میں ہوں۔" اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے' لیکن فلک ناز آج پوتی کے رونے کو بھی خاطر میں نہ لائی تھیں۔

"تم میری زندگی کی سب سے قیمتی متاع ہو' تمہارے مستقبل کو محفوظ بنانے کے لیے میری تگ ودو اور پریشانی بالکل فطری ہے۔ اس کا یہ مطلب کہیں سے نہیں نکلتا کہ تم میری پریشانی کی سب سے بڑی وجہ ہو۔"

"لیکن اتنی جلد سب کچھ۔ مجھے ذہنی طور پر تیار ہونے کے لیے تھوڑا سا تو وقت دیں دادو۔" اس نے اس بار التجائیہ انداز اختیار کیا۔

"محسن صاحب کی فیملی کو شادی کی جلدی ہے۔ ارسلان ان کا سب سے بڑا بیٹا ہے اور بڑے بیٹے کے سر پر جلد سہرا سجانے کا ماں' باپ کو بہت ارمان ہوتا ہے۔ تمہارے فائنل پیپرز کے فوراً بعد کی تاریخ طے ہوئی ہے۔" انہوں نے اس بار بھی قطعی اور بے لچک انداز میں بتایا تھا۔

گل خنداں ڈبڈبائی ہوئی نگاہوں سے دادی کو تکتی رہی' پھر اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ دس دن پہلے دادو نے جس فیملی کو ڈنر پر مدعو کیا تھا' ان کی آمد کی غرض و غایت کیا تھی اور جب محسن صاحب کی فیملی کی طرف سے گل خنداں کو سند قبولیت بخش دی گئی اور انہوں نے بہت مان اور چاؤ سے اس کا رشتہ مانگ لیا' تب دادو نے اسے بتانے کا تکلف کیا تھا۔

انہیں بھی ارسلان پسند آیا تھا۔ وہ پڑھا لکھا مہذب اور ہینڈسم لڑکا تھا۔ دلی اطمینان کے بعد انہوں نے یہ رشتہ قبول کر لیا تھا۔

اب وہاں سے جلد شادی کا تقاضا تھا۔ اپنی بیماری کی وجہ سے فلک ناز بھی اس فریضے سے جلد سبک دوش ہونا چاہتی تھیں۔ گل خنداں کی ناراضی کو خاطر میں لائے بغیر انہوں نے شادی کی تیاریاں شروع کردیں۔ وہ کچھ دن تو دادی سے ناراض رہی، لیکن پھر رحمت بوا کے سمجھانے پر یہ خودساختہ ناراضی ختم کرنا پڑی۔ اپنی دادو کی صحت اور سلامتی سے بڑھ کر اس کے لیے کچھ نہ تھا، اس کی شادی سے دادو کی ذہنی ٹینشن ختم ہو رہی تھی، ورنہ یہ ٹینشن، اسٹریس ان کے لیے نقصان دہ بھی ثابت ہو سکتا تھا۔

✡ ✡ ✡

"سمجھ میں نہیں آرہا کہ بیگم صاحبہ کی پوتی کی شادی پر کیا تحفہ دیا جائے۔" سرخ اور سنہری حاشیے والا دیدہ زیب سا شادی کارڈ انصار صاحب کے ہاتھ میں تھا اور وہ پُرسوچ انداز میں بیٹے سے مخاطب تھے۔

"مجھ سے مشورہ تو ایسے مانگ رہے ہیں جیسے میں نے جو مشورہ دیا وہ آپ فوراً "مان لیں گے۔"

"نہیں، نہیں تم بتاؤ تو سہی، میری تو خود سمجھ میں نہیں آرہا۔" انہوں نے بیٹے کو مخاطب کیا۔

"ایک لفافے میں ڈال کر نقد پانچ ہزار دے دیں۔ اللہ اللہ خیر صلّا۔" اس نے لاپروا سے انداز میں مشورہ دیا۔

"مجھے تم سے ایسی تھڑدلی کی توقع نہ تھی ایبک۔ اپنا دل بڑا کرنا سیکھو، کبھی تو میری تربیت کی لاج رکھ لیا کرو۔" وہ خفا ہوگئے۔

"ایک مشورہ ہی تو دیا ہے، آپ ہر بات کے بیچ میں اپنی تربیت کو کہاں سے لے آتے ہیں۔" اس نے زچ ہو کر پوچھا۔ انصار بابا اسے تیکھی نگاہوں سے گھورنے لگے تھے۔ "اپنی سوتیلی والدہ کے ساتھ آپ کا حسن سلوک کم از کم میری سمجھ سے باہر ہے انصار بابا! دادی جان کی زرعی زمین کی آمدنی آپ ہر ماہ دکانوں کا کرایہ کہہ کر اپنی سوتیلی امی جان کی خدمت میں پیش کردیتے ہیں۔ اس رقم پر ان لوگوں کا حق کسی طور نہیں بنتا، کبھی سوچا کہ اگر وہ دکانوں کا کرایہ وصول کرنے کے بجائے دکانوں کی حق ملکیت کا دعوا کریں تو آپ کیا کریں گے اور اب جب "ان کی پوتی کی شادی کا معاملہ درپیش ہے، تب بھی آپ پریشان ہیں کہ وہ کون سا شایان شان تحفہ ہونا چاہیے جو آپ ان کی خدمت میں پیش کریں۔ جان کی اماں پاؤں اور آپ میری کی گئی تربیت کو دوش نہ دیں تو آپ کا طرز عمل میری سمجھ سے ہمیشہ بالاتر رہا ہے۔" ایبک چڑ کر بولا تھا۔

انصار احمد چند لمحوں کے لیے خاموش ہوگئے پھر بولے۔ "جب میرے والد کا انتقال ہوا تو جانتے ہو میری عمر محض تین سال تھی۔ میری بیوہ ماں اپنے تین سالہ یتیم بچے کے ساتھ واپس اپنے ماں باپ کی دہلیز پر پہنچ گئی تھی۔ ماں، باپ بوڑھے تھے اور بھائی لاپروا، سنگ دل بھاوجوں نے میری ماں کی زندگی اجیرن کردی تھی اور اماں اپنی ذات پر تو ہر ستم سہ لیتی تھیں، لیکن کوئی مجھے معمولی سا ڈانٹ بھی دیتا تو اماں سے یہ بات برداشت نہ ہوتی۔

اگر اماں کا عقد ثانی نہ ہوتا تو اس گھر میں مجھے نوکروں سے بڑھ کر درجہ نہ ملتا۔ شافع علی کہنے کو میرے سوتیلے والد تھے، لیکن میں آج جو کچھ ہوں ان کی محبت اور شفقت کی بدولت ہوں۔ انہوں نے کبھی مجھ سے سوتیلے پن والا برتاؤ نہیں کیا۔ مجھے اچھی تعلیم دلوائی، متوازن رویے کے ساتھ میری پرورش کی، مجھے معاشرے کا کامیاب انسان بنایا۔" انصار احمد بول رہے تھے۔ ایبک سننے پر مجبور تھا۔ یہ داستان اس کے لیے نئی نہ تھی۔

"اماں بہت اصول پسند عورت تھیں، انہیں ہمیشہ یہ قلق ستاتا رہا کہ ان کا اپنا بیٹا یتیمی کے باوجود باپ کی شفقت تلے پروان چڑھا اور ابا جان کا اپنا سگا بیٹا، باپ کی شفقت کو ترستا رہا۔"

"تو اس میں دادی جان کا تو کوئی قصور نہ تھا۔" ایبک نوکے بنا رہ نہ پایا۔

"ہاں.... لیکن اماں اسی پچھتاوے کے زیراثر رہیں کہ اگر ان کی ابا جان سے شادی نہ ہوتی تو شاید ان کا

اپنی پہلی بیوی سے سمجھوتا ممکن ہو جاتا، حالانکہ یہ اماں کی خام خیالی تھی۔ ابا جان اور بیگم فلک ناز دونوں اپنی انا کے اسیر تھے۔ شدید محبت کے باوجود دونوں ایک دوسرے کے ساتھ نباہ نہ کرپائے اور نہ ہی ایک دوسرے کو اپنے دل سے نکال پائے۔"

اس سارے قصے میں نقصان بیگم صاحبہ اور ابا جان کے بیٹے کا ہوا۔ بیگم صاحبہ بہت بڑی انٹلکچوئل اور دانش ور خاتون سہی، لیکن شوہر کے بغیر بیٹے کو متوازن انداز میں پروان نہ چڑھا سکیں۔ بیٹے نے اوائل جوانی میں ہی غلط لڑکی کا انتخاب کرکے اس سے شادی رچالی۔ ناتجربہ کاری کے باعث ماں کا سارا اثاثہ کاروبار میں لگا کر دیوالیہ نکال دیا اور پھر خود بھی جان کی بازی ہار بیٹھا۔ بیگم صاحبہ کے بیٹے کے اس انجام نے اماں کو بہت دکھی کردیا تھا۔

وہ ہمیشہ مجھ سے کہتی تھیں کہ شافع علی نے تمہیں باپ کی شفقت دے کر نارمل اور کامیاب انسان بنایا۔ یہ محبتیں اور شفقتیں تم پر ان کا قرض ہیں۔ اب یہ تمہارا فرض ہے کہ تم اپنے باپ کے وارثوں کی خبرگیری کرو۔ میری ماں نے مرتے دم تک مجھے یہ ہی سبق پڑھایا تھا۔

میں تو ہر پل یہ کوشش کرتا ہوں کہ اپنے مرحوم ماں، باپ کی تربیت کی لاج رکھ لوں، لیکن تم کبھی میری تربیت کی لاج نہیں رکھتے اور ہر بار مجھے نئے سرے سے دکھ میں مبتلا کردیتے ہو۔" بات گھوم پھر کر پھر اس کی تربیت پر آن ٹھہری تھی۔

"آپ بیگم فلک ناز کو ان کی پوتی کی شادی پر جتنا مرضی قیمتی تحفہ دے دیں۔ میری توبہ جو میں نے کچھ کہا ہو۔"

"ہر بار توبہ کرتے ہو، پھر ہر بار کچھ الٹا سیدھا بول دیتے ہو۔ بندہ تمہاری کس بات پر اعتماد کرے۔" انصار بابا خفگی سے بولے۔

"نہیں اس بار واقعی سچی اور پکی والی توبہ۔ کہیں تو کان بھی پکڑ لیتا ہوں۔" وہ بے چارگی بھرے لہجے میں بولا۔

مدھم سی مسکراہٹ انصار احمد کے لبوں پر ابھر کر معدوم ہوگئی تھی۔

✡ ✡ ✡

آج گل خنداں کی رسم حنا تھی۔ اس کی سہیلیوں نے خوب رونق لگائی تھی۔ پیلے گوٹے کے کام والے روایتی سے جوڑے میں ملبوس گل خنداں پر ٹوٹ کر روپ چڑھا تھا۔ نسبت ٹھہرائے جانے کے دن سے آج تک اس کے سسرال والے بہت محبت کرنے والے ثابت ہوئے تھے۔

بہت چاؤ اور ارمان سے انہوں نے گل خنداں کو ساتھ لے کر جا کر شادی کی شاپنگ کروائی تھی۔ بری کی ساری تیاری میں اسی کی پسند کو مدنظر رکھا تھا۔ ارسلان سے اس کا آمنا سامنا نہ ہونے کے برابر ہوا تھا۔ لیکن ساس، نندیں اس پر واری صدقے جاتی تھیں، لیکن آج جب سسرال والے مہندی لے کر پہنچے تو ان کے تیور اکھڑے اکھڑے سے تھے۔

پیلا پٹکا گلے میں ڈالے، ہلکی سی بڑھی شیو میں ارسلان بھی خوبرو لگ رہا تھا، لیکن اس کے چہرے کی سنجیدگی نظرانداز کیے جانے کے قابل نہ تھی۔

"رسم تو ہوتی رہے گی، پہلے ہمیں آپ سے کچھ ضروری بات کرنی ہے آنٹی جی۔" ارسلان کی بڑی بہن نے بیگم فلک ناز کو مخاطب کیا۔

"ٹھیک ہے۔ آیئے ڈرائنگ روم میں چل کر بیٹھتے ہیں۔" کسی انہونی کے خدشے سے ان کا دل کانپا تھا، لیکن خیرمقدمی مسکراہٹ چہرے پر سجا کر وہ مہمانوں کو ڈرائنگ روم میں لے گئیں۔

"دیکھیے بہن! ہم گھما پھرا کر تو بات کرتے نہیں۔ آپ لوگوں نے ہمیں دھوکے میں رکھا، ہم سخت صدمے میں مبتلا ہیں۔" ارسلان کی ماں تیوریاں چڑھا کر بولی تھیں۔

فلک ناز نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ "کیسا دھوکا؟"

"یہ کوٹھی جس میں آپ رہائش پذیر ہیں، یہ آپ

نے برسوں پہلے فروخت کردی ہے اور اب آپ اس میں کرائے دار کی حیثیت سے رہائش پذیر ہیں۔"

ارسلان کی بہن نے پوچھا۔

بیگم فلک ناز نے پیشانی مسلی۔ مسئلہ ان کی سمجھ میں آگیا تھا۔ ان کا دل بیٹھتا چلا گیا۔ اپنی لاڈلی پوتی کو بیاہنے کے لیے انہوں نے جس خاندان کا انتخاب کیا تھا کیا اس کی اصلیت کھلنے کا وقت آن پہنچا تھا۔

"چپ کیوں ہیں آنٹی۔ بتایئے نا آپ لوگوں نے اتنی بڑی بات ہم سے کیوں چھپائی۔ کیا یہ صریحاً "دھوکا دہی نہیں ہے۔"

"اگر آپ اس کوٹھی کے لالچ میں میری پوتی سے اپنے بیٹے کی شادی کررہے تھے تو آپ کو اپنا مطمع نظر واضح کرنا چاہیے تھا۔ دھوکا دہی کے مرتکب آپ ٹھہرے ہیں' میں نہیں۔" انہوں نے سرد نگاہ حاضرین پر ڈالی۔

"لیں' یہ تو وہ ہی بات ہوگئی' الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔" ارسلان کی ماں چمک کر بولی تھیں۔

"اگر آپ لوگوں کی کوئی ڈیمانڈ تھی تو آپ کو مجھے پہلے بتانا چاہیے تھا۔ پھر میری مرضی ہوتی کہ میں یہ رشتہ جوڑنے پر راضی ہوں بھی یا نہیں۔" وہ سنجیدگی سے بولیں۔

"بات ڈیمانڈ کی نہیں ہے آنٹی! بات اتنی سی ہے کہ آپ نے اس تمام عرصے میں ہم لوگوں سے یہ بات کیوں چھپائے رکھی کہ آپ اس کوٹھی کی مالکن نہیں۔ آپ کے دل میں چور تھا' اسی لیے تو آپ نے اتنی بڑی بات ہم سے چھپائی۔" کافی دیر سے خاموش بیٹھا ارسلان بھی بالآخر بول اٹھا تھا۔

فلک ناز کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے کر مسل دیا تھا۔ موہوم سی امید کہ وہ اپنے گھر والوں کی باتوں سے متفق نہیں' دم توڑ چکی تھی۔

"دل میں چور تم لوگوں کے تھا' بیٹا! تم اس کوٹھی کے لالچ میں یہ رشتہ جوڑنا چاہ رہے تھے۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ تم لوگوں کی اصلیت اتنی دیر میں مجھ پر کھلی۔" وہ تاسف بھرے لہجے میں بولیں۔ دل مسلسل ڈوب رہا تھا۔ وقت کڑا تھا' لیکن وہ فوری فیصلے پر پہنچ چکی تھیں۔

"مجھے بہت افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ آپ لوگوں کی اصلیت کھلنے کے بعد میں یہ شادی نہیں کرواسکتی۔ جو سامان اب تک آپ لوگوں نے گل خنداں کو دیا' وہ بہت جلد آپ کو لوٹا دیا جائے گا۔" انہوں نے سرد لہجے میں حاضرین کو مخاطب کیا۔

ان لوگوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے تھے۔

"اسے کہتے ہیں ڈھٹائی۔ ہم آپ کی دھوکا دہی کھلنے کے باوجود دل پر جبر کرکے آج مہندی کی رسم کرنے آگئے تھے۔ آپ بجائے شرمندہ ہوکر معافی تلافی کرنے کے' ہمیں ذلیل کررہی ہیں۔ ارے یہ ہمارا جگرا تھا جو ہم نے آپ جیسی خاتون کے ساتھ رشتہ جوڑا۔ شوہر کے ساتھ آپ کی نہیں نبھ سکی۔ بہو' بیٹے کو چھوڑ کر بھاگ گئی۔ اب پوتی اللہ جانے کیا گل۔"

"بس خاموش ہوجایئے' اس کے آگے ایک لفظ نہیں۔" ان کی برداشت جواب دے گئی تھی۔

"چلو بیٹا! اٹھو' اب مزید بے عزتی کروانے کا کوئی فائدہ ہے بھلا۔" ارسلان کی ماں تن فن کرتی اٹھی تھیں۔

مہمان جن بڑے تیوروں کے ساتھ رخصت ہوئے تھے لان میں بیٹھے دلہن والوں کے بلائے مہمان بھانپ گئے کہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہے۔ رحمت بوا کو اپنے پاس بلوا کر بیگم فلک ناز نے کہا تھا کہ وہ مہمانوں میں جاکر تقریب ملتوی ہونے کا اعلان کردیں۔ رحمت بوا کو آدھی' ادھوری بات کا ہی علم ہوسکا تھا۔ وہ سراسیمہ ہوگئیں۔ بیگم فلک ناز کی طبیعت بگڑنے لگی تھی۔ مہمان خواتین کی اکثریت واپس جانے کے بجائے معاملے کی سن گن لینے رہائشی حصے کی طرف آگئی تھی۔

ایبک ابھی ذرا دیر پہلے انصار بابا کے ساتھ یہاں پہنچا تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد انصار بابا نے شادی کے تحفے کے طور پر نقد رقم دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ انہیں آج کی تقریب میں شمولیت کی دعوت بھی ملی تھی۔

انہوں نے خطیر رقم لفافے میں ڈال کر آج ہی آنے کا قصد کرلیا۔ کل شادی والے روز کی گہما گہمی میں اللہ جانے بیگم صاحبہ سے ملنے کا موقع ملتا بھی یا نہیں۔ بہت ناک بھوں چڑھا کر وہ باپ کو یہاں لانے پر راضی ہوا تھا۔ اور یہاں آنے کے کچھ دیر بعد ہی مہمانوں میں عجیب سی چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں۔ پھر سننے میں آیا بیگم صاحبہ کی طبیعت بگڑ رہی ہے۔ کمال انکل اور ان کے بیٹے فوراً انہیں اسپتال لے گئے۔

"ہمیں بھی اسپتال چلنا چاہیے ایبک۔" انصار بابا نے پریشانی کے عالم میں بیٹے کو مخاطب کیا۔ ایبک نے اثبات میں سرہلادیا۔

اسپتال پہنچ کر کمال انکل کی فیملی سے صورت حال کا صحیح علم ہوا۔ ایبک کا دل تاسف سے بھر گیا۔ ان لوگوں کا خبث باطن ظاہر ہونے پر یہ ضعیفہ خاتون زندگی اور موت کی کش مکش میں مبتلا ہوگئی تھیں اور ان کی پوتی جس کو کل رخصت ہوکر پیا دیس سدھارنا تھا' اس وقت اسپتال کے کوریڈور میں کھڑی بلک بلک کر رونے میں مصروف تھی۔

رحمت بوا اسے سنبھالنے میں ہلکان ہوئے جارہی تھیں۔ مسز کمال بھی اسے مسلسل تسلی دلاسا دینے میں مشغول تھیں۔ لیکن اسے کسی طور قرار نہ آرہا تھا۔ اس کا پیلا جوڑا اور مہندی لگے ہاتھ اسے لوگوں کی توجہ کا مرکز بنا رہے تھے' وہ اس سب سے قطعی بے نیاز تھی۔ ایبک نے اس لڑکی کو ہمیشہ اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں کھلکھلاتے دیکھا تھا' جب بھی ایبک سے اس کا آمنا سامنا ہوا یا بات چیت کرنے کا اتفاق ہوا' وہ ایک اکھڑ اور مغرور لڑکی کے روپ میں سامنے آئی۔ اس کا یہ روتا بلکتا روپ ایبک کو دکھ میں مبتلا کررہا تھا۔

انصار احمد کی حالت بھی بیٹے سے مختلف نہ تھی' لیکن دونوں ہی اپنی اپنی جگہ کچھ کرنے سے قاصر تھے۔ رات بیتتی جارہی تھی۔ پہلے کمال صاحب کے بڑے بیٹے رخصت ہوئے' پھر کمال صاحب ان دونوں کے پاس آئے تھے۔

"آپ لوگوں کا ابھی اسپتال رکنے کا ارادہ ہے؟" ایبک نے باپ کی سمت دیکھا' انہوں نے اثبات میں سرہلادیا۔

"فہمیدہ از آ ئی پیشنٹ ہے' اب اس کی ہمت بھی جواب دے رہی ہے' میں اسے لے کر گھر جارہا ہوں۔ بلال البتہ یہیں رکے گا۔" انہوں نے اپنی بیوی کی طبیعت خرابی کے متعلق بتا کر جانے کا ارادہ بھی ظاہر کردیا۔ ان کا بیٹا جس کو وہ چھوڑے جارہے تھے' وہ پہلے ہی وزیٹرز لاؤنج میں ایک بینچ سنبھالے خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہا تھا۔

"آپ لوگ جائیں۔ میں اور ایبک یہیں پر ہیں۔ جب تک ڈاکٹرز کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیتے' ہم یہیں رکے ہیں۔" انصار احمد نے انہیں رسانیت سے مخاطب کیا۔

بیگم کمال گل خنداں سے ساتھ چلنے پر اصرار کررہی تھیں' لیکن وہ مستقل انکار میں سرہلا رہی تھی۔ مایوس ہوکر کمال صاحب کی بیوی شوہر کے ہمراہ چلی گئیں۔

ایبک نے اچٹتی نگاہ گل خنداں پر ڈالی۔ رو' رو کر اس کے پپوٹے سوج چکے تھے' اب وہ آنسو نہیں بہا رہی تھی۔ البتہ لٹی پٹی حالت میں کسی غیر مرئی نکتے کو دیکھتی' جانے بیٹھے بیٹھے کیا سوچے جارہی تھی۔

رحمت بوا مسلسل تسبیح پر کوئی ورد کرنے میں مصروف تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر وہ "بٹیا" کو بھی اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونے کا کہہ کر تسلی دے رہی تھیں۔

مشکل رات آخر کٹ ہی گئی' صبح ڈاکٹرز نے بیگم صاحبہ کی طبیعت میں بہتری کا مژدہ سنایا تھا۔ وہ ملک کی مشہور و معروف ادیبہ تھیں۔ ڈاکٹرز نے ان کے علاج اور نگہداشت میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ ان کی طبیعت کی طرف سے اطمینان ہونے کے بعد ایبک اور انصار صاحب واپس آگئے تھے۔ رحمت بوا اس مشکل وقت میں ساتھ دینے پر ان کی ممنون ہوئے جارہی تھیں۔

"بیگم صاحبہ سے ہمارا بہت قریبی رشتہ ہے خاتون۔ یہ ہمارا فرض تھا۔ ان شاء اللہ دن میں کسی وقت پھر چکر لگائیں گے۔ ضرورت پڑنے پر آپ ہم سے فوراً" رابطہ کرسکتی ہیں۔" انصار احمد نے انہیں کارڈ تھمایا تھا۔

شام کو انصار احمد دوبارہ اسپتال گئے تھے تو رحمت بوا' محسن صاحب (ارسلان کے والد) کی گوشمالی کرنے میں مصروف تھیں۔

"اب آپ کس منہ سے معذرت کرنے آئے ہیں' یہ ممکن ہی نہیں کہ آپ اپنے گھر والوں کے خیالات سے واقف نہ ہوں۔ بیگم جی سے آپ کا برسوں کا تعلق تھا۔ آپ کا منہ دیکھ کر ہم نے اپنی بٹیا کا رشتہ آپ کے بیٹے سے طے کیا' لیکن جو کمینگی آپ کے بیوی بچوں نے دکھائی اس کے بعد آپ کا معافی مانگنا بالکل بے کار ہے۔ نہ ہی بیگم جی پاگل ہوئی ہیں' جو اب بھی یہ رشتہ جوڑے رکھیں گی۔ آج شادی کا دن تھا۔ وہ گزر گیا' اب آپ اپنے گھر کی راہ لیں۔" رحمت بوا نے محسن صاحب کی طبیعت صاف کردی تھی۔

وہ خفت سے سرخ پڑتا چہرا لیے بیگم فلک ناز سے ملے بغیر ہی چلے گئے تھے۔ انصار احمد نے بیگم فلک ناز کی عیادت کی تھی۔ ایک رات کے اندر اندر وہ آن بان رکھنے والی پُروقار سی خاتون برسوں کی مریضہ دکھائی دے رہی تھیں۔ ان کی عیادت کو بہت سے لوگ آرہے تھے۔ انصار احمد ذرا دیر میں ہی واپس ہولیے تھے۔

☼ ☼ ☼

"کیا بات ہے انصار بابا' بہت چپ چپ لگ رہے ہیں۔ آخر کن سوچوں میں کھوئے ہیں۔" ایبک نے باپ کے سامنے چائے کا کپ رکھتے ہوئے استفسار کیا۔ وہ جیسے اپنے خیالات سے ایک دم چونکے۔

"کچھ نہیں یار! بس بیگم فلک ناز کے متعلق سوچ رہا تھا۔ آج وہ ڈسچارج ہوکر گھر آگئی ہوں گی۔"

"تو کل ان کے گھر حال پوچھنے چلے جایئے گا۔ آخر چار' پانچ دن تک آپ بلاناغہ اسپتال بھی تو جاتے رہے ہیں۔"

"وہ تو چلا جاؤں گا' لیکن بیگم صاحبہ کی حالت تسلی بخش نہیں۔ ڈاکٹرز انہیں ابھی مزید انڈر آبزرویشن رکھنا چاہ رہے تھے' لیکن وہ ضد کرکے گھر چلی گئیں۔" انہوں نے بیٹے کو بتایا تھا۔

"نہیں ڈاکٹرز کی رائے پر ہی چلنا چاہیے تھا۔" ایبک یہ ہی کہہ سکا' انصار احمد نے ہنکارا بھرا تھا' پھر وہ کچھ پل کے لیے خاموش سے ہوگئے۔

"ایبک یار! ایک بات کہوں۔" کچھ پل کے توقف کے بعد انہوں نے بیٹے کو مخاطب کیا۔

"کہیے انصار بابا! اتنا سوچ سوچ کر کیوں بول رہے ہیں۔" وہ باپ کے انداز پر حیران ہورہا تھا۔

"بیگم صاحبہ کی پریشانی کی اصل وجہ گل خنداں ہے۔ شادی سے ایک دن پہلے ان کی پوتی کا رشتہ ٹوٹنا' ان کے لیے کس قدر تکلیف دہ امر ہے تم ان کے ذہنی کرب کا اندازہ کرسکتے ہو نا؟" انصار احمد نے پوچھا۔ ایبک نے اثبات میں سرہلادیا۔

"اور گل خنداں کتنی پیاری بچی ہے۔ مجھے علم ہے کہ ماضی میں تم اس سے تھوڑا بہت چڑتے بھی تھے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ تمہیں اپنے دادا کا سوتیلا پوتا کہہ کر متعارف کرواتی تھی۔ یہ اس کا بچپنا تھا۔ اس سے چڑنے کے لیے یہ کوئی بہت ٹھوس وجہ تو نہیں۔" انصار بابا نے اس سے تائید چاہی۔

ایبک ذرا چونکنا ہو بیٹھا۔ اس کی چھٹی حس خطرے کی گھنٹی بجانے لگی تھی۔ آخر باپ کس بات کی تمہید باندھ رہا تھا۔ اس نے اندازہ لگانا چاہا۔

"اور جہاں تک تعلق ہے تم سے سیدھے منہ بات نہ کرنے کا تو اگر سوچو تو اس بات سے گل خنداں کا اعلا کردار ظاہر نہیں ہوتا' تم خود بتاتے ہو کہ یونی ورسٹی میں لڑکیاں تمہارے گرد شہد کی مکھیوں کی طرح منڈلاتی تھیں اور اس بچی نے رشتہ داری ہونے کے باوجود تمہیں کبھی منہ نہ لگایا۔ نہ صرف تمہیں' بلکہ کسی بھی یونی ورسٹی فیلو سے وہ سلام دعا اور کام کی بات سے آگے نہ بڑھتی تھی اور اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں ہی خوش باش رہتی تھی' یہ ہی بتاتے تھے نا تم مجھے اس کے متعلق۔"

"میں تو جو بتاتا تھا سو بتاتا تھا' آپ مجھے میری کہی باتیں ہی دوبارہ کیوں بتا رہے ہیں۔" اس نے الجھ کر پوچھا۔

"بیگم صاحبہ کی حالت ہرگز بھی تسلی بخش نہیں ہے ایبک۔ ڈاکٹرز ان کی زندگی کے متعلق زیادہ پُرامید نہیں اور رحمت خاتون بتا رہی تھیں کہ جو ملنے جلنے والے لوگ ان کی مزاج پُرسی کو آتے ہیں' وہ گل خنداں کے رشتہ ٹوٹنے سے متعلق عجیب و غریب قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔ بیگم صاحبہ اس وقت شدید ذہنی کرب میں مبتلا ہیں۔"

"تو۔۔۔؟" ایبک نے سنجیدگی سے باپ کی سمت دیکھا۔

"گل خنداں خوب صورت ہے' پڑھی لکھی ہے' سمجھ دار۔۔۔"

"پھر۔۔۔" اس نے باپ کی بات کاٹی تھی۔

"کمال صاحب بیگم صاحبہ کی پریشانی دور کرنے کے خیال سے اپنے چھوٹے بیٹے کا رشتہ گل خنداں کے لیے پیش کرنے والے ہیں۔ وہ چھوٹا بیٹا جس کی نالائقیوں کے قصے درجن بھر بار وہ مجھے سنا کر اس کے سدھرنے کے لیے دعا کرنے کا کہہ چکے ہیں۔"

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں انصار بابا' کھل کر کہیں۔" ایبک نے گہری سانس اندر کھینچتے ہوئے باپ کو مخاطب کیا۔

"تم اب برسرِروزگار ہو ایبک۔ آج نہیں تو کل میں نے تمہارے لیے کوئی لڑکی ڈھونڈنی ہی ہے' پھر وہ لڑکی گل خنداں کیوں نہیں۔ اگر تم راضی ہوجاؤ تو اس فیصلے سے نہ صرف بیگم صاحبہ کی پریشانی دور ہوجائے گی' مجھے گھر بیٹھے بٹھائے بہو مل جائے گی' بلکہ اماں جان اور ابا جان کی روحیں بہت مطمئن ہوجائیں گی۔"

"ہونہہ۔۔۔ تو گویا ایک پنتھ تین کاج والا معاملہ ہے۔" ایبک نے بڑی سنجیدگی سے سرہلاتے ہوئے خود کلامی کی۔ "تو بات دراصل یہ ہے کہ آپ کو بیگم صاحبہ کی پوتی کی شادی میں دینے کے لیے کوئی تحفہ سمجھ میں نہ آرہا تھا۔ اس لیے آپ نے اپنے بیٹے کی صورت سب سے قیمتی تحفہ ان کی خدمت میں پیش کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ ایسا ہی ہے نا انصار بابا؟"

"انکار کرنا ہے تو صاف صاف کرو' اتنا گھما پھرا کر طنز کرنے کی کیا ضرورت ہے' مجھے پہلے ہی پتا تھا کہ تم کبھی بھی میری تربیت کی لاج۔۔۔"

"آپ بیگم صاحبہ کی خدمت میں رشتہ پیش کرکے دیکھ لیں۔ اگر انہیں کوئی اعتراض نہیں تو میں بھی آپ کی خاطر یہ کڑوا گھونٹ بھرنے پر تیار ہوجاؤں گا۔" اس نے باپ کی بات کاٹتے ہوئے بہت لاپروا سے انداز میں انہیں مخاطب کیا تھا۔

انصار احمد یک لخت خاموش ہوگئے۔ انہیں اپنی سماعت پر یقین ہی نہ آیا تھا۔ کچھ پل گزرنے کے بعد انہیں یقین آیا تو انہوں نے بیٹے کو بے ساختہ گلے سے لگالیا تھا۔

"مجھے پہلے ہی پتا تھا کہ تم کبھی بھی میری تربیت پر حرف نہ آنے دو گے۔" کیا کمال کا بیان بدلا تھا انہوں نے۔ ایبک کی ان چالاکی پر دل میں اش اش کر اٹھا تھا۔

☼ ☼ ☼

بیگم فلک ناز ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے انصار احمد کو تک رہی تھیں جو بہت انکساری سے ایبک کا رشتہ پیش کرنے کے بعد جواب کے منتظر تھے۔

"تم نے مجھے کچھ کہنے کے قابل ہی کہاں چھوڑا ہے انصار بیٹے' تمہاری ماں عظیم عورت تھی' کاش میں اس عورت کے ساتھ' شوہر کی شراکت برداشت کرلیتی اور اپنے اندر شوہر کو معاف کرنے کا ظرف پیدا کرلیتی تو زندگی اتنی کٹھنائیوں سے عبارت نہ ہوتی۔" زندگی کے آخر حصے میں بیگم صاحبہ کو کیا قلق ستایا تھا۔ انصار احمد خاموش رہے تھے۔

"میں نے زندگی میں بہت سے غلط فیصلے کیے' پھر ان فیصلوں پر پچھتاوے بھی سمیٹے' لیکن میرے دل

سے اپنے آخری غلط فیصلے کا ملال جاتا ہی نہیں' میں نے اپنی پوتی کے لیے کتنے لالچی لوگوں کا انتخاب کیا تھا۔ میں بہت بڑی انٹلکچوئل بنی پھرتی ہوں۔ مجھے تو ساری زندگی لوگوں کی پرکھ کا سلیقہ ہی نہ آیا۔" وہ دل گرفتی سے بولیں۔ انصار احمد کے لیے ان کا ٹوٹا' بکھرا روپ بالکل نیا تھا۔ مودب ہو کر انہیں سنے جا رہے تھے۔

"میں تمہارے بیٹے کو ٹھیک سے نہیں جانتی انصار احمد! لیکن مجھے تم پر اتنا ہی بھروسا ہے جیسے کسی ماں کو اپنے بیٹے پر' میں اپنی پارو کے لیے بہت مضطرب تھی۔ بیٹا! تم نے زندگی کی آخری ساعتوں میں میرا اضطراب ختم کر کے مجھے سکون سے ہمکنار کردیا ہے۔ تمہارا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں۔"

"مائیں' بیٹوں کا شکریہ ادا نہیں کرتیں' بیگم صاحبہ! مجھے گناہ گار مت کیجیے۔" سدا کے جذباتی انصار احمد کی آنکھیں بھی ڈبڈبا گئی تھیں۔

"نکاح سادگی سے ہو گا' ابھی پارو ذہنی طور پر بہت ڈسٹرب ہے۔" کچھ توقف کے بعد وہ دھیرے سے بولی تھیں۔ انصار احمد نے اثبات میں سرہلا دیا۔



وہ دادو کی بک ریک میں کتابیں ترتیب سے رکھ رہی تھی۔ وہ ایک اور اس کے نکاح کے بعد محض تین دن مزید زندہ رہی تھیں اور اب تو انہیں دنیا سے گئے ایک ماہ سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا' لیکن اب بھی گل خنداں دن کا بیشتر وقت ان ہی کے کمرے میں گزارتی تھی۔ انصار احمد اب باقاعدگی سے آتے تھے' لیکن گل خنداں ان کے سامنے بھی نہ آتی۔ دادو کا کمرا ہی اس کے لیے عافیت کدہ تھا۔ وہ آئندہ آنے والی زندگی کے متعلق سوچنا بھی نہ چاہتی تھی۔ رحمت بوا اس کی حالت دیکھ دیکھ کر کڑھتی تھیں۔ انہوں نے اسے بہت بار سمجھانے کی کوشش کی' جو ہو گیا اس پر صبر کر کے وہ اپنی آئندہ زندگی کے متعلق سوچے۔ لیکن وہ اپنے غم کو ہی سینے سے چمٹائے بیٹھی تھی۔ بالآخر

رحمت بوا کو اس سے دوٹوک انداز میں بات کرنا ہی پڑی۔

"کمال میاں تین' چار بار آچکے ہیں۔ وہ تقاضا کررہے ہیں کہ ہم فوری طور پر یہ گھر خالی کردیں' وہ اس کی تعمیر و مرمت کے بعد یہاں شفٹ ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں۔" رحمت بوا نے سنجیدہ انداز میں گل خنداں کو مخاطب کیا۔

وہ انہیں بے یقینی سے تکنے لگی۔ "ابھی دادو کو گئے عرصہ ہی کتنا ہوا ہے۔ کمال انکل اتنی سنگ دلی کا مظاہرہ کیسے کرسکتے ہیں۔ یوں اچانک ہمیں یہاں سے شفٹ ہونے کا کیسے کہہ سکتے ہیں۔ ہم نے تو ابھی کوئی دوسرا گھر ڈھونڈا تک نہیں۔" وہ بوا کی بات سن کر سراسیمہ ہوگئی تھی۔

"تو ہم نے کوئی دوسرا گھر ڈھونڈنا بھی کیوں ہے بٹیا۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے بیگم جی کی دعاؤں کی لاج رکھ لی۔ مرتے مرتے بھی وہ آپ کو محفوظ ہاتھوں میں سونپ گئیں۔ آپ خیر سے اپنے گھر جاؤ گی۔"

"میں نے صرف دادو کی خوشی کی خاطر نکاح پر رضامندی دی تھی بوا جی' ورنہ میں کوئی شادی وادی نہیں کرنا چاہتی۔ آپ اور میں کوئی چھوٹا موٹا کرائے کا مکان لے کر بھی تو رہ سکتے ہیں۔" اس نے ان کا ہاتھ تھام کر لجاجت بھرے انداز میں مخاطب کیا۔

"میری چندا۔ آپ کے چاہنے' نہ چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ خیر سے آپ کا نکاح ہو چکا ہے۔ وہ لوگ کوئی غیر نہیں۔ آپ کے اپنے ہیں۔ اللہ نے ہم پر کتنا کرم کیا کہ ان لالچی لوگوں سے جان چھڑا دی۔ انصار احمد بہت بھلے مانس شخص ہیں اور ان کا بیٹا بھی بہت فرماں دار اور بااخلاق ہے۔ اسے دیکھ کر دل میں ٹھنڈک سی اتر جاتی ہے۔ شہزادوں جیسا خوب رو۔"

وہ خاموشی سے سنتی رہی۔

"بیگم جی کی طرح اب میرا بھی چل چلاؤ ہے' ویسے بھی میرا بھتیجا ایک دو دن میں مجھے لینے پہنچ رہا ہے۔ آپ کو رخصت کر کے میں اس کے ساتھ حیدر آباد چلی جاؤں گی۔ آخری عمر ہیں اپنے بھائی' بھتیجوں کے پاس

گزاروں گی۔" بوا رسانیت بھرے لہجے میں مخاطب ہوئی تھیں۔

گل خنداں دکھ اور بے یقینی سے انہیں تکنے لگی۔ "تو دادو کے بعد آپ نے بھی مجھے چھوڑ کر جانے کا فیصلہ کرلیا؟"

"اللہ آپ کا دامن خوشیوں سے بھر دے۔ آپ کی بوا اپنی ہر سانس کے ساتھ آپ کے لیے دعاگو رہے گی۔" رحمت بوا نے اسے اپنے ساتھ چمٹا لیا تھا۔ دونوں کی سسکیاں کمرے میں گونجنے لگی تھیں۔



یہ اپنی نوعیت کی انوکھی رخصتی تھی۔ انصار احمد بہو کو اپنے ہمراہ گھر لے آئے تھے۔ ایبک نے آفس سے ڈرائیور بھیج دیا تھا۔ انصار احمد کے بہت ناراض ہونے کے باوجود وہ ان کے ہمراہ نہیں گیا تھا۔

"میں بہو کے سامنے تمہاری بار بار کلاس نہیں لے سکوں گا۔ لیکن اب تمہیں اپنی غیر سنجیدگی ترک کر کے ایک ذمہ دار اور محبت کرنے والے شوہر بننے کا ثبوت دینا پڑے گا۔" انصار احمد نے خفگی سے کہا تھا۔

ایبک خود کوئی غیر سنجیدہ رویہ اپنانا نہیں چاہتا تھا' لیکن اپنے بیڈ روم میں دھلے' دھلائے' سپاٹ سے چہرے والی اس مغرور حسینہ کو میگزین کی ورق گردانی میں مصروف دیکھا تو سخت بدمزا ہوا۔ وہ آج بھی نگاہیں اٹھا کر سلام تک کرنے کی روادار نہ ہوئی تھی۔

"آپ کے سگے دادا کا سوتیلا پوتا آپ کے شوہر کے رتبے پر فائز ہو چکا ہے۔ کیا کہیں گی آپ اس بارے میں۔" غیر ارادی طور پر ہی یہ فقرہ اس کے لبوں سے برآمد ہوا تھا۔

"قسمت کی ستم ظریفی کے سوا اسے کیا نام دیا جاسکتا ہے۔" اس نے سپاٹ سے انداز میں ایبک کی بات کا جواب دیا تھا۔

اس فوری اور فی البدیہہ جواب پر ایبک کا دماغ جھنجھنا ہی تو اٹھا۔ سارے نرم گرم جذبات پل بھر میں رخصت ہوئے۔ تسلی دلاسے اور پیار محبت کے سب ڈائیلاگ بھی ذہن سے ہوا ہو گئے۔

"آپ کے ساتھ قسمت نے جو بھی کھیل کھیلا۔ مجھے اس پر افسوس ہے۔ بہرحال آپ اس گھر میں پورے مالکانہ حقوق کے ساتھ زندگی گزار سکتی ہیں۔ ساس' نندوں کا کوئی جھنجٹ نہیں' جہاں تک انصار بابا کا تعلق ہے وہ بھلے سے آپ کے دور پار کے سوتیلے رشتہ دار سہی' لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ آپ کا بہت خیال رکھیں گے۔ اس گھر میں وہ اگر کسی کو سوتیلا سمجھتے ہیں تو وہ میں ہوں۔ اینی ہاؤ' اس گھر میں آپ جیسے چاہیں رہیں' جو مرضی کریں' آپ کو پوری آزادی ہے۔" اپنی دانست میں اس نے حسن سلوک کے سب تقاضے پورے کردیے تھے۔ لیپ ٹاپ اور موبائل کا چارجر لے کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

لاؤنج میں انصار بابا بیٹھے کوئی نیوز چینل دیکھ رہے تھے۔ ایبک کو آتا دیکھ کر ان کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"اس سے پہلے کہ آپ مجھے سخت سست سنانا شروع کریں' میں آپ کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ محترمہ کے لیے میرا ساتھ محض قسمت کی ستم ظریفی ہے۔ یہ صلہ پایا ہے میں نے آپ کی فرماں برداری کا۔" اس نے باپ کو مورد الزام ٹھہرانے میں ایک منٹ نہ لگایا تھا۔

انصار احمد نے گہرا سانس اندر کھینچا۔ "دیکھو ایبک! تم اس بچی کی ذہنی کیفیت سمجھنے کی کوشش کرو۔ کچھ عرصہ پہلے اس نے اپنی زندگی کا واحد خونی رشتہ بھی کھو دیا ہے۔ وہ اس بھری پری دنیا میں خود کو بہت اکیلا محسوس کررہی ہے۔ اسے ہماری محبت اور اعتماد کی ضرورت ہے۔ ایک وقت آئے گا کہ وہ دل سے اس گھر کو اپنا گھر سمجھ لے گی اور جب۔"

"ہاں تو ٹھیک ہے نا' میں بھی اسے وقت ہی دے رہا ہوں۔ اسی لیے اس کے سر پر سوار نہیں ہو رہا۔ وہ اس گھر کو اپنا گھر سمجھ لے' پھر مجھے بھی اس کا "گھر والا" بننے پر کوئی اعتراض نہ ہو گا۔" انصار احمد کی بات کاٹتے ہوئے اس نے انہیں اپنے موقف سے بھی آگاہ کردیا۔

بیٹے کا بگڑا موڈ دیکھتے ہوئے اس وقت خاموش رہنے

میں ہی عافیت تھی۔

✡ ✡ ✡

دن گزرتے جارہے تھے' لیکن انصار احمد کی کوششوں کے باوجود گل خنداں اجنبیت کا لبادہ اوڑھے ہوئے تھی۔ وہ زیادہ وقت بیڈ روم میں بند ہو کر ہی گزارتی۔

"ایسا کب تک چلے گا ایبک۔ اگر وہ ابنارمل رویہ اپنائے ہوئے ہے' تو ہمیں اسے اس کے حال پر نہیں چھوڑے رکھنا چاہیے۔ کوشش کرنی چاہیے کہ اس کی اجنبیت کا خاتمہ ہو۔ وہ ہمارے ساتھ گھل مل کر رہے۔"

"پتا نہیں انصار بابا! آپ مجھ سے کیا کچھ کروانا چاہتے ہیں۔ میں تو ایک بار آپ کی مرضی کے آگے سر جھکا کر پھنس گیا نا۔" اس نے وہ ہی شکوہ دہرایا جو آج کل صبح و شام دہرانا اس کا معمول بن گیا تھا۔

"تمہارے شکوے سن سن کر میرے کان پک چکے ہیں۔ میرے اتنے فرماں بردار تم کبھی نہیں رہے کہ ایک بار میں نے تمہیں حکم دیا اور تم فوراً "میرا حکم بجا لائے۔ یہ تمہارے اپنے دل کی بھی خواہش تھی۔"

انصار احمد کے کہنے پر ایبک کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ "آپ جانتے ہیں ہمیں محترمہ سے کتنا چڑتا تھا' صرف آپ کی خاطر میں نے یہ کڑوا گھونٹ بھرا' بجائے اس کے کہ آپ میری سعادت مندی اور فرماں برداری کے گن گائیں' آپ الٹا مجھ پر ہی احسان دھر رہے ہیں۔" وہ بلبلا ہی تو گیا تھا۔

"ارے جاؤ میاں' جاؤ' جیسے ہم جانتے نہیں کہ نام نہاد' نفرت اور بے زاری کے پیچھے پسندیدگی کا جذبہ ہی کارفرما تھا' ورنہ تم جیسا اڑیل کبھی اس نکاح پر راضی نہ ہوتا۔" انصار بابا لاپروا سے انداز میں بولے تھے۔

✡ ✡ ✡

"انصار بابا کہہ رہے ہیں کہ اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو ہمارے ساتھ دوپہر کا ماحضر تناول فرمائیں۔" ایبک نے کمرے میں جھانک کر اسے مخاطب کیا۔

وہ بیڈ پر لیٹی خلاؤں میں گھورتی جانے کیا سوچ رہی تھی۔ ایبک کی اچانک آمد پر ہڑبڑا کر اٹھی۔ وہ انصار بابا کا پیغام پہنچا کر واپس پلٹ گیا تھا۔

"پیغام پہنچا دیا ہے' لیکن انتظار فضول ہے۔ محترمہ نہیں آئیں گی' آپ کھانا شروع کریں۔" اس نے انہیں مخاطب کیا' لیکن اگلے ہی پل حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ انصار بابا کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا تھا۔

"آؤ بیٹا! آؤ۔" انہوں نے خوش دلی سے پکارا۔

ایبک نے گردن موڑ کر دیکھا' وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی آرہی تھی۔ پھر آہستگی سے سلام کر کے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔

"بھئی! اتنے دن ہو گئے ہیں تمہیں اس گھر میں آئے اور ابھی تک ہم تمہاری پسند' ناپسند سے بھی آگاہ نہیں۔ مجھے جو سمجھ میں آتا ہے' میں آرڈر پر منگوالیتا ہوں۔ بیٹا تم بھی تو اپنی پسند' ناپسند کے بارے میں بتایا کرو نا۔" انہوں نے پرشفقت انداز میں گل خنداں کو مخاطب کیا۔

"میں سب کچھ کھالیتی ہوں انکل۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"آپ تو سب کچھ کھالیتی ہیں' لیکن مستقل بازاری کھانے کھا کر ہماری جیب اور معدے دونوں کا کباڑا ہو رہا ہے۔" ایبک بولے بنا نہ رہ پایا تھا۔ انصار احمد نے اسے خشمگیں نگاہوں سے گھورا' لیکن اس نے باپ کی جانب دیکھنے کی غلطی نہ کی تھی۔

"گل خنداں بیٹا' یہ چکن کے ریشمی کباب ٹرائی کرو۔"

"گل خنداں۔" ایبک نے جانے کیوں اس کے نام کو خود کلامی کے سے انداز میں دہرایا تھا۔

"ویسے انصار بابا! یہ نام کچھ عجیب سا نہیں۔ نام پکارنے پر گلے میں خراش سی پڑجاتی ہے۔"

انصار بابا کا بس نہ چل رہا تھا کہ ٹھنڈے پانی کا جگ اس کے سر پر انڈیل دیں۔

"اتنا خوب صورت اور منفرد نام ہے گل خنداں۔ تم نبے پر کی مت اڑاؤ۔" بمشکل غصہ ضبط کرتے

ہوئے انہوں نے ایبک کو ٹوکا تھا۔

"ہاں خوب صورت تو ہے' لیکن گلے میں خراش پڑنے والی بات بھی جینوئن ہے۔" وہ اپنی بات پر مصر تھا۔

"ویسے گھر میں تو بیٹی کو پارو نام سے پکارا جاتا تھا۔ ہے نا بیٹی۔" اس نے پھر دھیرے سے اثبات میں گردن ہلادی۔

"بھئی ان کے گھر والوں کو یہ پیاری لگتی ہوں گی تو پارو کہہ دیتے ہوں گے۔ سوال یہ ہے کہ ہم انہیں کیا کہہ کر بلائیں۔" وہ اس سنجیدگی بھرے انداز میں مخاطب تھا' جیسے اس سے زیادہ غور طلب دوسرا مسئلہ ہی نہ ہو۔

"تم گل خنداں بیٹی کو صرف گل کہہ کر بھی پکار سکتے ہو۔" انصار احمد نے اسے قہربار نگاہوں سے گھورتے ہوئے بظاہر مسکرا کر کہا۔

"چلیں' آپ کی بات مان لیتا ہوں تو صرف گل صاحبہ! آپ پلیز اچھی طرح پیٹ بھر کر کھانا کھائیں' اگر آپ برائے نام کھانا کھا کر چلی گئیں تو انصار بابا اس کا ذمہ دار مجھے ٹھہرائیں گے اور بات گھوم پھر کر میری تربیت کی طرف جانکلے گی۔"

"بیٹی! تم اس گدھے کی باتوں سے پریشان مت ہو' آرام سے کھانا کھاؤ اور ایبک! اگر تم کھانا کھاچکے ہو تو جاؤ چائے کے لیے قہوہ چولہے پر چڑھادو۔" انصار بابا نے اسے مخاطب کیا۔

"میں نے ابھی کھانے کا باقاعدہ آغاز بھی نہیں کیا اور آپ مجھے ٹیبل بدر کرنا چاہ رہے ہیں۔ سکون سے کھانا تو لینے دیں' پھر آپ کو چائے بھی بنا دوں گا۔" وہ مزے سے بولا۔ انصار احمد دانت کچکچا کر رہ گئے تھے۔ جبکہ گل خنداں سر جھکائے چپ چاپ کھانا کھاتی رہی تھی۔

✡ ✡ ✡

"دیکھیے محترمہ! مانا کہ میں نے اول روز آپ کو کہہ دیا تھا کہ اس گھر میں آپ کو ہر طرح کی آزادی ہے' لیکن خاتون آپ نے تو اس آزادی کا کچھ زیادہ ہی ناجائز فائدہ اٹھانا شروع کردیا۔" تیکھے لہجے میں اس سے مخاطب ہوا۔

"کیوں۔۔۔ میں نے ایسا کیا کردیا۔" وہ اس کے انداز پر خائف ہو گئی تھی۔

"بات دراصل یہ ہے میڈم کہ یہ گھر برسوں سے ماسیوں کے سہارے چل رہا ہے۔ کھانا پکانے کے علاوہ گھر کا ہر کام ماسیاں ہی سرانجام دیتی ہیں ماسی برائے نام صفائی کرتی ہے' الٹے سیدھے ہاتھ مار کر برتن دھوتی ہے۔ فریج کی صفائی کے بجائے فریج میں پڑی چیزوں کا صفایا کرلی ہے اور آپ اس کی ان تمام حرکتوں سے بے نیاز اس کمرے میں بند کر بیٹھی رہتی ہیں۔" ایبک نے تو پوری تقریر ہی جھاڑ دی تھی۔

"تو آپ چاہتے ہیں کہ ماسی شریفاں کے بجائے گھر کے کام کاج میں سنبھال لوں۔" اس نے تیکھے تیوروں سے پوچھا۔

"میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ گھر میں اپنی موجودگی کا احساس دلائیں۔ کمرے سے نکلیں گی تو ملازموں کو من مانی کرنے کا موقع نہیں مل سکے گا۔" ایبک نے مسکراہٹ دبا کر سنجیدہ سا انداز اپنایا تھا۔ محترمہ کے تیکھے تیور اسے مزا تو بہت دے گئے تھے۔

"ٹھیک ہے' میں آپ کی ماسی شریفاں کی نگرانی کرلوں گی اور کچھ؟"

"ماسی شریفاں میری کہاں سے ہو گئی۔" وہ بڑبڑایا۔

"اور دوسری بات یہ ہے کہ بازاری کھانے کھا کر میرا پیٹ اور انصار بابا کا معدہ اپ سیٹ ہو گیا ہے۔ آپ کے اس گھر میں آنے سے پہلے ہم نے کھانا پکانے کی باریاں مقرر کر رکھی تھیں۔ ہفتے میں تین دن میں اور تین دن انصار بابا کوکنگ کرتے تھے' صرف ایک دن ہم باہر کے کھانے کی عیاشی کرتے تھے' اب آپ کے اعزاز میں روزانہ ہوٹلوں سے کھانا آرہا ہے۔"

"تو میں نے کب کہا کہ کھانا ہوٹلوں سے منگوائیں؟" وہ ایبک کی باتوں سے زچ ہو رہی تھی۔ اس لیے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا تھا۔

"اگر آپ نے یہ نہیں کہا کہ کھانا باہر سے منگوائیں تو یہ بھی تو نہیں کہا کہ کھانا باہر سے مت منگوائیں' میں خود گھر میں پکالوں گی۔ اب آپ کی موجودگی میں انصار بابا کچن کا کام کرتے اچھے لگیں گے کیا۔" اس نے شرم دلائی۔

"آپ اپنے والد کو نام لے کر کیوں پکارتے ہیں' کتنی بدتہذیبی کی بات ہے یہ۔" گل خنداں نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا تھا۔

"سوال گول کرنے میں آپ نے سیاست دانوں کو بھی مات دے دی ہے۔ بہرحال آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ میں بچپن میں اس سے بھی زیادہ بدتہذیب ہوتا تھا اور انصار بابا کو دادی کی دیکھا دیکھی صرف انصار کہہ کر بلاتا تھا۔ دادی نے بہت بار میرا کان موڑا' تب میں انصار نام کے آگے بابا کہہ کر پکارنے لگا تھا۔" اس نے تشفی آمیز جواب دیا تھا۔ گل خنداں سے آگے کوئی اور بات نہ بن پڑی تھی۔

"پھر آپ کچن میں انصار بابا کی ہیلپ کرنے آرہی ہیں نا' وہ آج بھنڈی گوشت پکانے کی تیاری کررہے ہیں۔" ایبک نے سنجیدہ انداز میں اسے مخاطب کیا۔ گل خنداں کے پاس اثبات میں سرہلانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔



ایبک بہت دنوں سے نوٹ کررہا تھا کہ وہ ایبک کو بھلے سے اب بھی گھاس نہ ڈالتی تھی' لیکن انصار بابا سے اس کی ٹھیک ٹھاک بے تکلفی ہوچکی تھی۔ ان کی محبت اور شفقت کو نظر انداز کرنا گل خنداں کے لیے مزید ممکن نہ رہا تھا۔

لیکن ایبک اس ساری صورت حال سے خاصا غیر مطمئن تھا۔ اس کی زندگی میں اب بھی ویرانی ہی ویرانی تھی' تو یہ سسر' بہو اتنے آرام' سکون سے کیسے زندگی گزار رہے تھے۔ وہ گل خنداں کی ذات پر تنقید کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا تھا' جبکہ انصار احمد خم ٹھونک کر بہو کی حمایت کرتے تھے۔

"یہ تم نے کوفتے پکائے ہیں۔ کسی کے سر پھوڑنے کے کام تو آسکتے ہیں' لیکن چبائے ہرگز نہیں جاسکتے۔" کھانے کی میز پر وہ بگڑے ہوئے لہجے میں گل خنداں سے مخاطب تھا۔

"گل بیٹی نے مجھ سے طریقہ پوچھ کر سالن بنایا ہے۔ اتنے بھی سخت نہیں ہیں' صبر شکر کرکے کھاؤ۔" انصار بابا نے اسے ڈپٹا تھا۔

"آپ تو جیسے پاکستان کے صف اول کے شیف ہیں نا' جو محترمہ آپ کی ریسیپیز ٹرائی کرتی ہیں۔ نیٹ پر سرچ کرلیں' تو ہر طرح کی ترکیب مل جائے گی۔" وہ چڑ کر بولا۔

"انکل نے طریقہ صحیح بتایا تھا' لیکن میں ابھی اتنی ایکسپرٹ نہیں ہوں۔ کمی بیشی مجھ سے ہی ہوتی ہے۔" گل خنداں بھی بول پڑی تھی۔

"اور ابھی تو کوفتے سخت بنے ہیں تو آپ چار کھا چکے ہیں۔ پرفیکٹ بنتے تو پتا نہیں اسکور کہاں تک پہنچتا۔" گل خنداں کے کہنے پر انصار بابا قہقہہ لگا کر ہنس پڑے تھے۔

"بجائے اس کے کہ بہو کو بدتمیزی پر ٹوکیں' الٹا اسے شہہ دے رہے ہیں۔" ایبک نے تلملاتے ہوئے سوچا تھا۔

"شام کو تمہاری کوئی مصروفیت تو نہیں۔" انصار بابا نے اسے مخاطب کیا۔

"دراصل گل بیٹی نے جانا ہے۔ رحمت خاتون اپنے بھتیجے کی فیملی کے ساتھ یہاں کوئی شادی اٹینڈ کرنے آئی ہیں۔ وہاں کسی کے پاس اتنی فرصت نہیں کہ انہیں یہاں ملوانے لے آئے۔ گل بیٹی اداس ہورہی تھی' میں نے کہا اس میں کیا مسئلہ ہے۔ ایبک تمہیں خود ملوانے لے جائے گا۔"

"اگر ڈائریکٹ مجھ سے کہہ دیتی تو جیسے میں تو لے کر ہی نہ جاتا۔" وہ جی ہی جی میں خفا ہوا تھا' مگر کچھ کہنے کے بجائے اثبات میں سرہلانے پر اکتفا کیا تھا۔



"آپ کتنی کمزور ہوگئی ہیں رحمت بوا!" وہ انہیں دیکھ کر ششدر رہ گئی تھی۔

"میری چھوٹو بیٹا' اپنی سناؤ' ٹھیک تو ہو۔" رحمت بوا نے بے قراری سے اس کی خیریت جاننا چاہی۔

"میں ٹھیک ہوں' لیکن یہ بتائیں' اتنی کمزور کیوں ہوگئیں۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔" اس نے ان کے ہاتھ تھامے۔

"اوہ بھئی' مجھ بڑھیا کو کیا ہوتا ہے۔ اپنی سناؤ۔ وہاں حیدر آباد سے جب بھی تم سے فون پر بات ہوتی ہے مجھے آواز ہی ٹھیک سے ___ نہیں آتی۔ اب تسلی سے بتاؤ' گھر میں دل لگ گیا۔ سب کیسے ہیں تمہارے ساتھ۔" بوا ایک ہی سانس میں اس کی خیریت جاننا چاہ رہی تھیں۔

گل خنداں ابھی ذرا دیر پہلے ایبک کے ساتھ یہاں پہنچی تھی۔ یہ چھوٹا سا گھر تھا اور شادی کے موقع پر مہمانوں سے بھرا ہوا۔ ایبک کو بیٹھک میں بٹھایا گیا تھا اور نیچے کمروں میں کوئی پرسکون گوشہ نہ پاکر بوا اس کا ہاتھ پکڑ کر چھت پر لے آئی تھیں۔

"میں ٹھیک ہوں بوا جی! شروع شروع میں بالکل دل نہ لگا تھا۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ مجھے اندازہ ہوگیا بوا جی کہ دادو نے اپنی زندگی کی آخری سانسوں میں میرے لیے بہترین فیصلہ کیا۔ انصار انکل بہت اچھے ہیں۔ بہت شفیق' مہربان اور بہت محبت کرنے والے۔ وہ میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ میں بہت قنوطی ہوگئی تھی' لیکن انصار انکل کی کوششوں سے میں زندگی کے روشن پہلوؤں کو بھی دیکھنے لگی ہوں۔"

"انصار بیٹے کے متعلق تو ہم بھی سب جانتے ہیں بیٹا۔ وہ تو فرشتہ صفت انسان ہیں' تم ہمیں ایبک کے بارے میں بتاؤ۔ وہ کیسا ہے تمہارے ساتھ' خیال رکھتا ہے نا تمہارا؟" بوا ہر طرح سے اپنے دل کی تسلی چاہ رہی تھیں۔

"فی الحال تو وہ میرے لیے انصار انکل کا بیٹا ہے اور بس۔ اتنا برا نہیں' بس تھوڑا سا نک چڑھا ہے۔" اس کے بتانے پر بوا کا جی چاہا اپنا سر پیٹ لیں۔

"وہ تمہارا شوہر ہے بیٹا۔ تمہاری زندگی میں اس کے مقام اور مرتبے کا تمہیں اندازہ ہونا چاہیے۔ انصار احمد بھلے سے جتنے اچھے ہوں' وہ تمہارے سسر ہیں۔ زندگی تمہیں ایبک میاں کے سنگ گزارنی ہے۔ اگر اس نے ابھی تک تمہیں بیوی کا رتبہ نہیں دیا تو میں انصار احمد سے بات کروں گی۔" بوا اس کی بات سن کر مضطرب ہوگئی تھیں اور بوا جی کی بات سن کر وہ پریشان۔

"ارے نہیں بوا جی! آپ انصار انکل سے کچھ نہیں کہیں گی۔ ایبک اگر مجھے بیوی نہیں سمجھتا تو میں کون سا اسے شوہر سمجھتی ہوں۔ میں بھی تو اسے بالکل لفٹ نہیں کراتی۔" اس نے گھبرا کر بوا جی کو ٹوکا تھا۔

وہ اپنا سر ہاتھوں میں پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ "ہمیں آپ سے اس بے وقوفی کی امید نہیں تھی بیٹا' جن حالات میں آپ کا رشتہ جڑا ہے' ایسے میں تو آپ کو مزید سمجھ داری سے کام لینا چاہیے تھا۔ ان لوگوں نے کتنے بڑے ظرف کا مظاہرہ کیا۔ عین وقت پر آپ کی شادی ہوتے ہوتے رہ گئی۔ یہ انصار احمد کی ہمدرد فطرت تھی کہ انہوں نے اپنے بیٹے کو آپ سے فوری نکاح پر راضی کیا' ورنہ آج کل کے لڑکے کب والدین کی مانتے ہیں۔ آپ ان کی ہمدردی کا ناجائز فائدہ مت اٹھائیں بیٹا کہ ایبک بیٹے کو اس فیصلے پر پچھتاوا ہونے لگے۔" بوا کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اتنے قلیل وقت میں اسے ساری عقل کی باتیں کیسے سکھادیں۔

گل خنداں ان کی بات سن کر خاموش ہوگئی تھی۔

"تو آپ کہنا چاہ رہی ہیں انصار انکل اور ایبک نے مجھ پر ترس کھا کر محض ہمدردی میں یہ رشتہ جوڑا ہے۔"

"اب آپ نے میری بات ہی پکڑلی۔ میں صرف یہ سمجھانا چاہ رہی ہوں چندا کہ سمجھ داری سے کام لیں۔ میاں' بیوی کے رشتے میں انا نام کی کوئی چیز نہیں ہونی چاہیے۔ ایبک کو شوہر کا رتبہ دیں۔ اس کی عزت کریں۔ خدمت سے اس کے دل میں جگہ بنائیں۔" بوا اسے رسانیت سے سمجھا رہی تھیں' پھر انہیں کچھ خیال آیا۔ "آپ سے باتوں میں کسی اور چیز کا خیال ہی نہیں رہا۔ بیٹا! بس ذرا ایک چکر نیچے کا لگالوں۔ آپ

اکیلی آئیں تو میں کاہے کو تکلف میں پڑتی۔ ہم بھی بیٹی اپنی باتیں کرتے رہتے، لیکن ایک میاں والدہیں یوں سوکھے منہ واپس جائیں، اچھا نہیں لگتا، میں ذرا نسرین کی خبر لوں۔" انہوں نے نیچے جانے کا قصد کیا۔ انداز میں عجلت تھی۔

"کن سوچوں میں گم ہو۔ خوش تو ہو اپنے گھر میں۔" نسرین صاحبہ اوپر آئی تھیں۔ نے چھوٹتے ہی بے تکلفی سے استفسار کیا۔ گل خنداں نے رسمی مسکراہٹ چہرے پر سجا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

"بواجی بہت کمزور ہو گئی ہیں نسرین بھابھی۔ یہ اپنا بالکل خیال نہیں رکھتیں، آپ پلیز ان کا خیال رکھا کریں۔" گل خنداں نے انہیں بہت اپنائیت بھرے لہجے میں مخاطب کیا تھا۔

"دیکھو بی بی! برا مت ماننا بات ہے سیدھی سی۔ ہم غریب لوگ ہیں۔ ایک ہی کمانے والا اور چھ کھانے والے۔ ہمارا تو اپنا پورا نہیں پڑتا، تمہاری بواجی کا کیا خیال رکھیں۔ ہم نے تو سوچا تھا، ساری عمر اتنی بڑی بیگم صاحبہ کے پاس نوکری کی ہے۔ رہائش اور کھانا تو مفت کا ہوتا ہے۔ پھوپھی نے اپنی تنخواہ ہی جوڑ جاڑ (جمع) رکھی ہوگی۔ ہمیں کیا پتا تھا کہ پھوپھی بالکل خالی ہاتھ ہلاتے ہوئے تشریف لے آئیں گی۔" نسرین چمک کر بولی تھی۔

گل خنداں ان کی بات سن کر سُن ہو گئی تھی۔ "بواجی ہمارے گھر ملازمہ کی حیثیت سے نہیں رہتی تھیں، وہ ہمارے گھر کا فرد تھیں۔" بہت مشکل سے خود کو کمپوز کرتے ہوئے اس نے انہیں جواب دیا تھا۔

"ہاں بھئی، یہ بھی خوب رہی۔ تم لوگوں نے اپنا الّو خوب سیدھا کیا۔ تھوڑی سی عزت دے کر پھوپھی سے بیگار لیتے رہے۔ بے دام غلام بن کر رہیں وہ تمہارے گھر۔" نسرین نے اپنے دل میں جمع بہت دنوں کی کھولن اس کے سامنے نکالی تھی۔

"آپ زیادتی کر رہی ہیں نسرین بھابھی اس طرح کہہ کر۔ میری بواجی کو ڈی گریڈ مت کریں۔ ہمارے گھر میں ملازموں کی کمی نہ تھی۔ ہاں کچن کی ذمہ داری بواجی نے سنبھال رکھی تھی، لیکن آپ بھی تو اپنے گھر میں اپنے بچوں کے لیے کھانا پکاتی ہوں گی تو کیا آپ اپنے گھر کی ملازمہ ہیں۔" اس کی برداشت جواب دے گئی تھی۔

نسرین بھابھی کے چہرے کے زاویے مزید بگڑ گئے۔

گل خنداں نے کچھ لمحے سوچا، پھر اپنے ہینڈ بیگ میں ہاتھ مار کر چھوٹا سا بٹوہ برآمد کیا۔ مڑے تڑے ہزار ہزار کے کئی نوٹ نکال کر ان کی طرف بڑھائے۔

"یہ کچھ پیسے ہیں، آپ رکھ لیجیے۔ میں کوشش کروں گی کہ ہر ماہ بواجی کا خرچا بھجوا دوں، لیکن انہیں آپ کے گھر میں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہونا چاہیے۔"

"ارے اب میرا یہ مطلب بھی نہ تھا۔" نسرین بیگم نے ادھر ادھر نگاہیں دوڑا کر پیسے تھامے اور اپنے گریبان میں اڑس لیے۔

"میں چلتی ہوں، اس سے پہلے بواجی سیڑھیاں چڑھ کر دوبارہ اوپر آئیں، میں ان سے نیچے ہی مل کر واپسی کے لیے نکلوں گی۔" سپاٹ سے انداز میں انہیں مخاطب کرکے، بنا الوداعی سلام دعا کیے وہ زینہ اتر گئی تھی۔

واپسی کے سفر میں ایبک سے اس کی اداسی پوشیدہ نہ رہ پائی تھی۔ "آپ دو، تین دن کے لیے اپنی بوا کو اپنے ہاں لے چلتیں، ابھی تو ان کی فیملی کا یہاں مزید کچھ دن قیام کا ارادہ ہے۔" اس نے گل خنداں کو مخاطب کیا۔ اس نے جیسے ایبک کی بات غور سے سنی ہی نہ تھی۔ وہ اپنی ہی کسی سوچ میں گم تھی۔

"اتنا ایٹی ٹیوڈ! پر کیا کریں محترمہ پر جچتا بھی ہے۔" سوال کا جواب نہ پا کر وہ بدمزا تو ہوا، مگر سوچے بنا نہ رہ پایا۔

"وہ دادا جان والی دکانوں کا کرایہ آتا تھا پہلے۔ اب شاید دو ماہ سے وہ کرایہ نہیں آ رہا؟" گاڑی میں کچھ دیر خاموشی چھائی رہی تھی۔ پھر گل خنداں نے سرسری انداز میں ایبک کو مخاطب کرکے استفسار کیا تھا۔ انداز سرسری تھا۔ پھر بھی ایبک کو سوال سن کر جھٹکا لگا تھا۔

تھے، حال ہی میں ان کے بیٹے کی شادی ہوئی ہے۔ گھر کے خرچے کچھ بڑھ گئے۔ بہو کے لیے نیا اے سی لگوایا۔ کچھ کچن کا خرچا بڑھا۔ بیٹے نے گاڑی کے ٹائر وغیرہ تبدیل کروائے۔ بس اسی لیے ان کا بیلنس کچھ آؤٹ ہو گیا ہے۔ بہرحال آپ فکر نہ کریں، کرایہ دوبارہ ملنا شروع ہو جائے گا۔" اس کے سرسری سے سوال کا ایبک نے تفصیلی جواب دیا۔

گل خنداں کو اس ساری تفصیل سے کیا سروکار تھا۔ اس نے عدم دلچسپی سے اس کے جواب کو سنا۔

"دیکھیے ہمیں ان کے گھریلو حالات سے کیا لینا دینا۔ بھلے سے بیٹے کی شادی کریں یا بیٹی کی، ہمیں تو کرایہ وقت پر ملنا چاہیے۔ آپ انہیں تاکید کر دیجیے گا کہ آئندہ دیر سویر نہ ہو۔"

"بہتر کہہ دوں گا۔" ایبک لب بھینچ کر بولا۔

اس مغرور حسینہ کے ہمراہ یہ اس کی پہلی ڈرائیو تھی۔ ایبک گھر سے سوچ کر نکلا تھا کہ اس مختصر سے سفر میں وہ اپنے تعلقات میں خوش گواری پیدا کرنے کی کوشش کرے گا۔ اجنبیت کی دیوار گرانے کے لیے آخر کسی کو تو پہل کرنی تھی۔ ایبک یہ پہل کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو چکا تھا۔ آخر اتنی پیاری اور خدمت گزار بیوی کے ہوتے ہوئے وہ کیوں لنڈوروں کی طرح کی زندگی بسر کرتا رہے۔ مانا کہ ابھی وہ صرف انصار بابا کی خدمت کرتی تھی اور ایبک کے لیے ایک نخریلی مغرور حسینہ ہی ثابت ہو رہی تھی، لیکن وہ خود بھی تو اس سے سیدھے منہ بات نہ کرتا تھا۔ وہ اپنا طرز عمل درست کرے گا تو بیگم صاحبہ بھی خود بخود لائن پر آ جائیں گی۔ اس کی خوش فہمی عروج پر تھی۔

اس سفر کے دوران وہ ایک آدھ ڈائیلاگ جھاڑ کر طرز عمل میں درستی کا آغاز کرنا چاہ ہی رہا تھا کہ محترمہ نے کرایہ مانگ کر اس کے ارمانوں پر اوس ہی گرا دی۔ واپسی کے سفر میں وہ لب بھینچے ڈرائیونگ کرتا رہا اور وہ بھی اپنی ہی سوچوں میں گم رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

نے کبھی میرے خدشات کو سیریس لیا ہی نہیں۔ کرایہ مانگ رہی ہیں محترمہ۔ اب بتائیں، پچھلے دو، تین مہینے کا کرایہ یکمشت کیسے ادا کریں گے۔ فصل خراب ہو گئی تھی، دادی جان کی زمین سے کوئی آمدنی نہیں ہوئی۔ آپ کی پنشن اور سیونگ سے گھر کے خرچے نپٹ رہے ہیں اور اس ماہ میرا گاڑی پر بہت خرچا اٹھ گیا۔ لہٰذا مجھ سے تو کوئی امید رکھیے گا مت۔" ایبک نے دو ٹوک انداز میں انصار بابا کو مخاطب کیا تھا۔ انصار بابا جواب میں کچھ نہ بولے تھے۔

"یہ ہوتا ہے ہمدردی کا انجام۔ اتنے سالوں تک بغیر سوچے سمجھے ہر ماہ ایک خطیر رقم محترمہ کی دادی کی خدمت میں پیش کرتے رہے۔ اتنی ہمدردی سے بھی جی نہیں بھرا تو مجھے قربانی کا بکرا بنا کر پیش کر دیا۔ انصار بابا! آپ نے یہ سوچا تک نہیں۔"

ایبک کا فقرہ اس کے لبوں پر ہی دم توڑ گیا تھا۔ دروازے کے باہر چائے کا کپ ٹرے میں سجائے گل خنداں کھڑی تھی۔ آنکھوں میں عجیب سا تاثر تھا۔ انصار بابا نے بھی ایبک کی نگاہوں کا تعاقب کیا۔

"آؤ گل بیٹا! رک کیوں گئیں۔" ایبک کو قہربار نگاہوں سے گھورنے کے بعد انہوں نے اسے پُرشفقت انداز میں مخاطب کیا۔

وہ چپ چاپ اندر آئی تھی اور ٹرے میز پر رکھ کر بنا کچھ کہے واپس پلٹ گئی۔ ایبک نے دل ہی دل میں خود کو کوسا، وہ کیوں بھول گیا تھا کہ انصار بابا نے ہی اسے چائے لانے کا کہا تھا۔

"لگتا ہے، گل خنداں نے سب سن لیا ہے۔" اس بار شرمندہ سے لہجے میں انصار بابا کو مخاطب کیا۔ انصار بابا کچھ نہ بولے، بس اسے خشمگیں نگاہوں سے گھورتے رہے تھے۔

"اچھا اب ایسے نظروں کے تیر تو مت چلائیں۔ ڈانٹنا چاہتے ہیں تو ڈانٹ لیں۔" وہ جز بز ہوتے بولا۔

"میرا تم سے مخاطب ہونے کو بھی دل نہیں کر رہا۔ تم کبھی تو میری تربیت کی لاج رکھ لیا کرو۔" وہ شدید

غصے کے عالم میں تو تھے، لیکن اس سے بھی زیادہ دکھی لگ رہے تھے۔ ایک چپ کھڑا رہا۔

"کم ظرف لوگوں کی یہ ہی نشانی ہے کہ وہ احسان کرتے ہیں، پر اس کا ڈھول پیٹ پیٹ کر اعلان کرتے ہیں اور پھر میں نے یا تم نے تو کوئی احسان کیا بھی نہیں، بلکہ ہم اباجی کے احسانات کے جس بوجھ تلے دبے تھے وہ تھوڑا سا اتارنے کی کوشش کی تھی اور آج جو تم گل بٹی کے کرایہ مانگنے پر یوں چراغ پا ہو گئے۔ تم نے سوچنے کی زحمت بھی کی کہ وہ تم سے یہ بات کرنے پر کیوں مجبور ہوئی۔ نکاح کے بعد تم اس کے نان نفقہ کے ذمہ دار ہو۔ اس کی سو ضرورتیں ہو سکتی ہیں، کبھی تم نے اس سے پوچھنے کی زحمت گوارا کی کہ اسے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں، اب وہ خوددار بچی تمہارے آگے ہاتھ پھیلانے تو رہی۔ مجبوری کے عالم میں اس نے اپنی رقم کا ہی تقاضا کرتا تھا۔" انصار بابا بولنے پر آئے تو بنا رکے بولتے ہی رہے۔ ایک کان لپیٹے انہیں سننے پر مجبور تھا۔

"اچھا، آپ ٹینشن نہ لیں۔ میں اس سے معذرت کرلوں گا۔" وہ دھیرے سے بولا۔

وہ غصے سے سر جھٹک کر بڑبڑاتے ہی رہے تھے۔ ایک بے بسی کے عالم میں انہیں دیکھ کر رہ گیا تھا۔



"آپ کو ہم پر ترس کھانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی انکل! میری دادو بہت خوددار عورت تھیں۔ اگر انہیں گمان گزرتا کہ آپ دادا جان کا نام لے کر اپنے طور ہماری مالی مدد کر رہے ہیں تو وہ کبھی آپ سے وہ رقم نہ لیتیں اور نہ ہم ان پیسوں کے محتاج تھے۔"

تین دن گزرنے کے بعد آج انصار احمد نے اس سے یہ ذکر چھیڑا تھا۔ پچھلے تین دن سے وہ دوبارہ اپنے خول میں سمٹ چکی تھی۔ آج بہت جتن کر کے انہوں نے اسے بولنے پر اکسایا تھا اور پھر اس کے شکوے کے جواب میں انہیں اسے بہت مشکلوں سے سمجھانا پڑا تھا کہ وہ خدانخواستہ ترس کھا کر ان کی مالی مدد نہ کرتے تھے، بلکہ اپنی مرحومہ ماں کی وصیت پر عمل کرتے ہوئے انہیں ان کا ہی حق لوٹانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اپنی سگی اولاد کے ہوتے ہوئے بھی شافع علی نے ایک پرائے بچے پر اپنی شفقتیں لٹائیں۔ مالی، جذباتی اور اخلاقی ہر لحاظ سے زندگی بھر اس کی سپورٹ کرتے رہے تو یہ اس بچے کا بھی فرض تھا کہ وہ شافع علی کے جائز وارثوں کو بھی اس وصول کردہ حق میں حصہ دار بنائے۔

"ٹھیک ہے انکل! میں آپ کا موقف مان لیتی ہوں، لیکن آپ کو یہ حق تو نہیں پہنچتا تھا کہ آپ اپنے بیٹے کو مجھ سے شادی کے لیے پریشرائز کرتے۔ ایک نے محض ترس اور ہمدردی میں یہ رشتہ جوڑ لیا۔"

"ارے کس نے کہا اس نالائق نے تم پر ترس کھایا ہے۔ وہ تو میں نے اس کے دل کی مراد بنا کے پوری کردی تھی۔" انصار احمد نے سرعت سے اس کی بات کاٹی۔ وہ بے یقینی سے انہیں دیکھنے لگی۔

"میں اس گدھے کی رگ رگ سے واقف ہوں، اتنا فرماں بردار وہ کبھی نہیں رہا کہ محض ایک بار کہنے پر نکاح کے لیے راضی ہو گیا۔ اگر اس کی دلی رضامندی نہ ہوتی تو وہ ہنگامہ مچا دیتا، مگر میرے فیصلے پر سر نہ جھکاتا۔ میں تمہارے لیے اس کی بے قراریوں کا عینی شاہد ہوں۔

تمہاری دادو کے جنازے پر بلک تم رہی تھیں اور باہر مردانے میں تڑپ وہ رہا تھا۔ بھاگا بھاگا جا کر ڈاکٹر کو بلا کر لایا اور پھر دو مہینوں تک بلا ناغہ مجھے تمہاری طرف چھوڑ کر آتا رہا، کرید کرید کر تمہاری طبیعت کے بارے میں استفسار کرتا اور تم جانتی ہو کہ تمہارے "کرائے" میں دو مہینے کا رخنہ بھی کیوں پڑا۔" وہ ذرا سا مسکرائے۔

"صاحب زادے کو یہ گھر تمہارے رہنے کے قابل نہ لگتا تھا۔ برسوں سے ہم باپ، بیٹا اسی گھر میں رہتے چلے آرہے تھے۔ گھر کو پینٹ کروائے بھی ایک مدت ہوگئی تھی۔ تمہارے آنے سے پہلے گھر کی حالت سنواری گئی۔ تمہیں گرمی نہ لگے، نیا ایرکنڈیشنر لگوایا گیا۔ تمہارے لیے کھانے کا آرڈر بھی صاحب زادے خود کرتے تھے۔ ہاں تمہارے سامنے ناک منہ چڑھا کر یہ سارے کام میرے کھاتے میں ڈال دیتا تھا۔

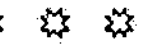
سچ کہوں کہ اگر میں کوئی کٹ کھنی سی ساس ہوتی تو تمہارے لیے اس کا کنسرن دیکھ کر خوب جیلس ہوتی۔" وہ مزے سے بولے تھے۔ گل خنداں خفیف سا ہو کر مسکرا دی۔

"بات صرف اتنی سی ہے کہ وہ بہت اونچی ناک رکھتا ہے۔ تم نے پہلے دن ہی اس سے کہہ دیا کہ اس کا ساتھ تمہارے لیے قسمت کی ستم ظریفی ہے۔ بس اس بات نے اسے بہت ہرٹ کیا اور وہ اپنے جذبے تم پر آشکار نہ کر پایا، بلکہ انہیں پھر سے اپنے دل میں سینت کر رکھ لیا۔"

"لیکن انکل! پہلے ایک نے مجھ سے پوچھا تھا کہ سگے دادا کے سوتیلے پوتے کو شوہر کے روپ میں دیکھنا کیسا لگ رہا ہے۔ اس لیے اس سوال کا ایسا ہی جواب ہونا تھا اور پھر ان دنوں میں ذہنی طور پر بھی تو بہت ڈسٹرب تھی۔" اس نے سارا قصور ایک کے ہی کھاتے میں ڈالا تھا۔

انصار احمد محظوظ انداز میں مسکرا دیے۔ "ان دنوں تم ڈسٹرب تھیں تو ان دنوں میرا بیٹا ڈسٹرب ہے۔ وہ تم سے معافی مانگے تو تھوڑا بہت تنگ کرنے کے بعد اسے معاف کر دینا۔ اس خوب صورت بندھن میں انا کی کوئی گنجائش نہیں بیٹا! زندگی کے یہ خوب صورت دن پھر لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ ایک دوسرے کی ہمراہی پر خدا کا شکر ادا کرو اور زندگی کی خوب صورتی کو محسوس کرو۔" انصار احمد نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر پیار بھرے لہجے میں مخاطب کیا۔

گل خنداں نے دھیرے سے اثبات میں گردن ہلا دی۔



"انڈا ابالنا اور قمیص کا بٹن ٹانکنا تو ہر پھوہڑ سے پھوہڑ لڑکی کو بھی آتا ہے۔ میری ساری شرٹس ابتر حالت میں ہیں۔ کسی کی سلائی ادھڑ گئی، تو کسی کا بٹن۔ پتا نہیں یہ ماسی شریفاں کپڑے دھوتے ہوئے کیسے رگڑے لگاتی ہے۔ نئی شرٹس کا بھی ستیاناس ہوا پڑا ہے۔" وہ با آواز بلند بڑبڑا رہا تھا۔ سنانا جس "پھوہڑ" لڑکی کو مقصود تھا، وہ اس وقت اپنے سیل فون پر اپنی سہیلیوں کے میسج چیک کرنے میں مصروف تھی۔

"اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو اس شرٹ کا ٹوٹا بٹن ٹانک دیں گی۔" ایک نے اسے سنجیدگی سے مخاطب کیا۔

"مجھے انڈا ابالنا تو آتا ہے، لیکن بٹن ٹانکنا نہیں۔" اس نے کمال بے نیازی سے جواب دیا۔ اس دوٹوک انکار پر وہ گھورنے کے سوا کیا کر سکتا تھا۔

"ویسے کل ماسی شریفاں کو جلدی جانا تھا۔ وہ کپڑے پریس کیے بغیر چلی گئی تھی۔ آپ کے اور انکل کے کپڑے میں نے پریس کیے تھے اور کل تک اس شرٹ کے سب بٹن درست حالت میں تھے۔ مجھے مخاطب کرنے کے لیے آپ کو یہ بٹن توڑنے کی کیا ضرورت تھی۔ ویسے بھی مخاطب کر سکتے تھے۔" وہ سیل فون کی اسکرین کو دیکھتے ہوئے لاپروا سے لہجے میں مخاطب ہوئی۔

"اگر تمہیں پتا چل ہی گیا ہے کہ میں تمہیں مخاطب کرنے کے لیے یہ پاپڑ بیل رہا ہوں تو اتنی بے نیاز کیوں بن رہی ہو۔" ایک کی برداشت جواب دے گئی تھی۔ اس نے گل خنداں کے ہاتھ سے سیل فون جھپٹ کر سائڈ پر رکھا تھا۔

"کہیے کیا کہنا چاہتے ہیں۔" وہ سنجیدگی سے اس کی جانب متوجہ ہوئی۔

"کہنا نہیں چاہتا، صرف پوچھنا چاہتا ہوں، کیا میرا ساتھ تمہارے لیے واقعی قسمت کی ستم ظریفی کے سوا کچھ نہیں۔" وہ پوری سنجیدگی سے استفسار کر رہا تھا۔

"آپ نے میری ایک بار کی کہی بات پکڑلی۔ بعض اوقات کسی خاص موڈ کے تابع ہو کر انسان کے منہ سے کچھ بھی نکل جاتا ہے۔" اس نے گول مول سا جواب دیا۔

"بہت خوب، میرے متعلق کہہ رہی ہو کہ میں

نے بات پکڑلی۔ وہ بات جو تم نے مجھ سے خود مخاطب ہو کر کہی اور اس روز تم نے میری اور انصار بابا کی باتیں بھی تو اپنے دل سے لگالی تھیں کہ میں نے تم پر ترس کھاکر یہ رشتہ جوڑا ہے۔ حالانکہ میں تو تم سے مخاطب بھی نہ تھا۔ تم اب تک انصار بابا اور میرے تعلق سے واقف ہو چکی ہوگی۔ ایک دوسرے سے شدید محبت کرنے کے باوجود ہم ایک دوسرے کے ساتھ بلیم گیم میں مصروف رہتے ہیں۔

جب انصار بابا ہر وقت میری تربیت کو دوش دیتے ہیں تو بدلے میں مجھے بھی تو انہیں کچھ نہ کچھ سنانا ہوتا ہے نا اور تم نے اس روز وہ باتیں سن کر اپنے دل سے لگالیں۔ میں نے تمہیں پوری دلی آمادگی کے ساتھ اپنایا تھا گل خنداں۔ یہ محض ترس اور ہمدردی میں کیا جانے والا فیصلہ نہ تھا۔" اگرچہ انصار بابا اسے بتا چکے تھے کہ وہ گل خنداں کے دل میں پڑی یہ گرہ کھول چکے ہیں۔ پھر بھی ایبک نے اپنے طور پر صفائی پیش کرنا ضروری سمجھا تھا۔

"میں "گاڈ فادر" کی اس بات سے ہرگز متفق نہیں کہ ہر بڑی دولت کے پیچھے ایک جرم چھپا ہوتا ہے' لیکن میں اپنے فادر کی اس بات سے ضرور متفق ہو گیا ہوں کہ ہر بڑی چڑ اور بے زاری کے پیچھے محبت کا جذبہ ہی کارفرما ہوتا ہے۔" ایبک نے فلسفہ بگھارا تھا۔

گل خنداں کو اس فلسفیانہ اظہار محبت پر ہنسی آگئی تھی۔

"معصومہ۔ میری بات کا یقین کرو۔ یونی ورسٹی کے زمانے میں' میں تم سے واقعی چڑتا تھا۔ پڑھائی لکھائی سے تمہیں خاص سروکار نہ تھا' بس ہر وقت اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں بیٹھی ہنسی مذاق میں ہی مشغول رہتی تھیں۔ اس کے باوجود تمہیں سب اساتذہ کی وہ محبت اور شفقت میسر تھی جو ہم جیسے طالب علموں کو بہت جان مارنے پر حاصل ہوتی تھی' بس اسی لیے میں تم سے خار کھاتا تھا۔" ایبک نے اعتراف کیا تھا۔

"اور پھر میں نے تمہیں کمال صاحب کی بیٹی کی شادی میں دیکھا' میں تمہیں پہلی بار نہ دیکھ رہا تھا۔ میں تمہیں سینکڑوں بار دیکھ چکا تھا' لیکن اس روز مجھے لگا جیسے میں تمہیں پہلی بار ہی دیکھ رہا ہوں۔ میرے دلی جذبے مجھ پر آہستہ آہستہ واضح ہو رہے تھے کہ ہمیں تمہاری شادی کا کارڈ موصول ہو گیا۔

پتا نہیں میں ان دنوں اتنا چڑچڑا کیوں ہو گیا تھا۔ بات' بے بات انصار بابا سے الجھنے لگا تھا اور پھر جب تمہاری مہندی والے روز تمہاری دادو آئی سی یو میں زندگی کی جنگ لڑ رہی تھیں تو تمہارا روتا بلکتا روپ مجھ سے دیکھا نہ جا رہا تھا۔ تمہاری حالت دیکھ کر میرے دل کی بے قراری بڑھتی جا رہی تھی۔ لیکن اس بے قراری سے چھٹکارا پانا میرے بس سے باہر بھی تھا اور جب پانچ' چھ دن بعد انصار بابا نے سرسری سے انداز میں تمہارے لیے میری رائے لینا چاہی تو میں نے رضامندی دینے میں دو سیکنڈ بھی نہ لگائے تھے۔ حالانکہ میں نے پہلے اس بارے میں سوچا تک نہ تھا' لیکن انصار بابا کی وہ بات جس کو سن کر میں کچھ عرصہ پہلے خوب خفا ہوا تھا' اب وہ ہی بات سن کر میرا دل الگ ہی لے پر دھڑکنے لگا تھا۔ ورنہ تم جانتی ہو کہ میں انصار بابا کا ہرگز فرماں بردار نہیں' وہ چاہتے تو گن پوائنٹ پر بھی مجھے اس نکاح کے لیے راضی نہ کر سکتے تھے۔ یہ نکاح کے وقت تک کی کہانی ہے۔ بعد کے حالات و واقعات کی ذمہ دار صرف تم ہو۔

کیسا سوتیلوں والا انداز اپنایا تھا تم نے میرے ساتھ۔" ایبک نے اپنی تمام تر صفائی پیش کرنے کے بعد الزام کی گٹھڑی اس کے کندھوں پر رکھ دی۔ گل خنداں جو دھڑکتے دل کے ساتھ یہ انوکھی سی داستان محبت سن رہی تھی' اس کے یوں یک دم پینترا بدلنے پر ہکابکا رہ گئی۔

"سارا الزام میرے سر نہ ڈالیں۔ اپنے گریبان میں جھانکیں' آپ نے کیا کیا میرے ساتھ۔ ہر وقت مجھے طنز کا نشانہ بناتے رہتے تھے۔ میرا تو نام لینے سے بھی آپ کے گلے میں خراش پڑ جاتی تھی۔" وہ رونکھی ہو کر بولی۔

"ہاں وہ تو پڑتی تھی اور میں اب بھی تمہیں اتنے مشکل نام سے تھوڑی پکاروں گا۔ تنہائی میں تمہیں گل جان کہہ کر بلایا کروں گا اور انصار بابا کے سامنے

صرف جان کہہ کر۔" ایبک نے اس کا گلابی پڑتا چہرا دیکھ کر لطف لیتے ہوئے شوشا چھوڑا۔

وہ بوکھلا گئی۔ "ہرگز نہیں' آپ انصار بابا کے سامنے کوئی چھچھورپن نہیں کریں گے۔" اس نے اسے پیشگی متنبہ کیا' ورنہ کیا بعید تھا کہ وہ اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنا دیتا۔

"چلو ٹینشن نہ لو۔ انصار بابا کے سامنے صرف گل کہہ کر کام چلا لیا کروں گا۔" اس نے مسکراہٹ دباتے ہوئے بہت فراخدلی دکھائی۔ گل خنداں کی جان میں جان آئی تھی۔

"ہاں ایک بات اور' آج کے بعد اپنی پریشانیوں کو دل میں رکھنے کے بجائے مجھ سے شیئر کیا کرو۔ اس روز اپنی بوا جی سے ملنے کے بعد تم نے مجھ سے کرائے کے پیسوں کا تذکرہ کیا تھا۔ مجھے بعد میں احساس ہوا کہ تم پیسے کیوں مانگ رہی تھیں۔ میں تمہاری بوا جی کے لیے تمہارے دلی جذبات سے بخوبی واقف ہوں۔ وہ تمہاری بزرگ ہیں' تمہیں عزیز تر ہیں تو میرے لیے بھی اتنی ہی قابل احترام ہیں۔ اگر تم انہیں اپنے پاس بھی بلانا چاہتی ہو تو مجھے یا انصار بابا کو قطعی کوئی اعتراض نہیں۔" وہ اب دوستانہ انداز میں مخاطب تھا۔

"آپ کا کہا ہی میرے لیے کافی ہے ایبک! لیکن بوا جی اس بات پر کبھی راضی نہ ہوں گی۔" وہ رسانیت سے بولی تھی اور ایبک تو اس کے لبوں سے اپنا نام سن کر ہی خوشی سے جھوم اٹھا تھا۔ کتنے ادب اور تمیز سے اس نے اسے پکارا تھا۔

"بہرحال تم جیسے چاہو' ان کی مدد کر سکتی ہو۔ صرف تمہاری تسلی کے لیے بتا رہا ہوں کہ اس روز تمہاری بوا جی کا پوتا میرے پاس بیٹھا تھا۔ ہونہار لڑکا تھا۔ بی کام کے بعد ملازمت کی تلاش میں تھا' میں نے وہیں حیدر آباد میں اپنے ایک دوست کی فیکٹری میں اس کے لیے جاب کی بات کی تھی۔ اب وہ وہاں پڑھائی کے ساتھ پارٹ ٹائم جاب بھی کر رہا ہے۔" ایبک نے بتایا۔

"جانتی ہوں۔ بوا جی کا فون آیا تھا' کہہ رہی تھیں نسرین بھابھی بھی بیٹے کو اتنی اچھی جاب ملنے کے بعد بہت خوش ہیں' اب بوا جی کے ساتھ ان کا رویہ بہت بہتر ہو گیا ہے۔"

"طاہر کے فون سے تمہاری بوا جی نے مجھ سے بھی بات کی تھی کہہ رہی تھیں ایک بیٹا' ہماری بٹیا کچھ بے وقوف اور کم عقل ہے۔ اس کی بے وقوفیوں کو درگزر کرکے پیار' محبت سے پیش آؤ گے تو خود ہی سدھر جائیں گی۔ اب بوا جی کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے میں نے تو تم سے پیار' محبت سے ہی پیش آنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اب بتاؤ پہلے پیار کروں یا محبت کا اظہار۔" وہ پوری سنجیدگی سے استفسار کر رہا تھا' جبکہ بھوری آنکھوں میں شرارتی مسکراہٹ رقصاں تھی۔

"پلیز ایبک۔" وہ محجوب ہو کر اسے ٹوکے بنا نہ رہ پائی۔

وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔

"ویسے شرماتے ہوئے بہت اچھی لگتی ہیں آپ۔ اب مہربانی فرما کر میرے ایک آخری سوال کا بھی جواب دے دیں۔ وہ ہی سوال جو میں پہلے بھی کر چکا ہوں۔" اس کے کہنے پر گل خنداں نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔

"بس آخری بار بتا دو کہ میرا ساتھ تمہارے لیے قسمت کی ستم ظریفی ہے یا قدرت کا حسین اتفاق۔" وہ اب صاف صاف چھیڑ رہا تھا۔

"آپ کا ساتھ میرے لیے قسمت کی۔۔۔" اس نے شرارتی انداز میں بات ادھوری چھوڑی۔

"کیا قسمت کی۔" ایبک نے اسے گھورا تھا۔

"قسمت کی حسین ترین ستم ظریفی ہے بھئی اور کیا؟" گل خنداں نے مسکراتے ہوئے فقرہ مکمل کیا تھا۔

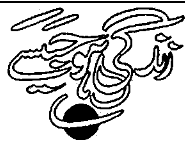
"تم میں سیاست دان بننے کے پورے گُنس ہیں۔"

وہ اس بار بے چارگی سے گویا ہوا۔ گل خنداں کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

بالآخر محبت نے اپنا وجود تسلیم کروا لیا تھا اور اب اس گھر میں محبت نے ہی راج کرنا تھا۔

☼

ہاجرہ ریحان



اب یہ ایک نئی مصیبت آن پڑی ہے کہ میری آنکھوں میں ہر وقت نمی سی رہنے لگی ہے...... خاص طور سے پڑھنے لکھنے یا ٹیلی ویژن پر آتے کسی پروگرام کو غور اور توجہ سے دیکھنے کے دوران یہ نمی باقاعدہ آنسو کی صورت دو چار قطرے بن کر ٹپک پڑتی ہے۔ قطرہ بننے سے پہلے یہ میری بینائی کو چند لمحوں کے لیے دھندلانا نہیں بھولتی، شروع میں جب یہ نمی میری آنکھوں میں نمودار ہوئی تھی تو بڑی الجھن



ہوئی، میں نے اس کو صاف کرنے، آنکھوں کو خشک رکھنے کے کئی جتن کیے۔ کبھی ٹشو ہاتھ میں لیے پھرتی اور وقفے وقفے سے آنکھوں کو رگڑتی جاتی، کبھی پانی سے آنکھوں کو دھوتی اور نرم تولیے سے اچھی طرح خشک کرتی مگر میری ہر کوشش اور تردد کے باوجود اس نمی نے میرا پیچھا نہ چھوڑا۔

پہلا خیال یہی آیا کہ شاید عینک کا نمبر بڑھ گیا ہے فرصت ملتے ہی میں آنکھوں کے ڈاکٹر کے پاس جا پہنچی۔ احتیاطاً یہ سوچ کر کہ عینک کا نمبر تو دکان سے بھی مل جائے گا مگر ڈاکٹر سے چیک اپ ہو جائے تو زیادہ اچھا ہے، کہیں آنکھوں میں کوئی خرابی ہی نہ ہو۔ خوش مزاج ڈاکٹر نے ذرا سی دیر میں بیماری کے بارے میں اطمینان دلا کر عینک کا نیا نمبر دے کر فارغ کر دیا، نمبر واقعی بڑھ گیا تھا میں دل میں تھوڑا مطمئن ہوئی کہ چور پکڑا گیا ہے۔

دو چار دن جب تک عینک بن کر نہ آئی آنکھوں سے گرتی چھلکتی نمی کو ہنسی خوشی برداشت کر لیا۔ سچ ہے جیسے جیسے رہائی کا دن قریب آنے لگتا ہے، سزا اتنی ہی پیاری ہوتی جاتی ہے یا جیسے عیدالفطر کے قریب آنے پر روزے آسان لگنے لگتے ہیں۔ عینک آ گئی تو بڑے اہتمام سے آنکھوں کو دیر تک ٹھنڈے پانی سے دھویا اور پھر بہت ہی مان اور چاؤ سے نئی نکور عینک کا استعمال شروع کیا۔ ڈھاک کے وہی تین پات کچھ بھی اثر نہ پڑا۔

آنکھوں کی نمی بدستور مجھے تنگ کرتی رہی، کبھی آنکھوں میں بھری بھری جیسے چھلکنے کو بے قرار رہتی اور کبھی نظر کو دھندلا کر دو چار قطروں میں موقع محل وقت دیکھے بنا آنکھوں سے ٹپک جاتی۔ میں جھنجھلا گئی۔ اب تو کسی سے کچھ کہتے بھی ڈر لگتا ہے، ویسے بھی آج کل لوگ اپنی دی گئی نصیحتوں، ہدایتوں اور مشوروں کو باور ہوتا نہ دیکھ کر سامنے والے پر نفسیاتی کا لیبل لگا دیتے ہیں۔ جس کسی کو سمجھ نہیں پاتے اسے بھی نفسیاتی کہہ دیتے ہیں، جس کو سمجھ لیتے ہیں مگر ظاہر کرنا نہیں چاہتے اسے بھی نفسیاتی بنا دیتے ہیں۔ لہذا میں چپ ہو گئی۔ دل میں بہرحال سوچا ضرور، کوئی نہ کوئی تو وجہ ہوتی ہی ہے۔

اب اگر عینک کا نمبر بھی ٹھیک ہے اور آنکھوں کو کوئی بیماری بھی نہیں لگی تو پھر کیا وجہ ہے مگر وجہ کھوجنے سے پہلے مجھے اس وقت اور اس لمحے کو سوچنا چاہیے جب پہلی بار میری آنکھوں میں یہ نمی اتری تھی یا اس وقت سے کوئی دو چار مہینے پہلے کا وقت جو آگے چل کر آنکھوں میں نمی کا باعث بنا۔

وہ کیا دن تھا، کون سی تاریخ تھی؟ وہ وقت ہاں یاد آیا وہ وقت شاید عصر اور مغرب کے درمیان کا تھا۔ ایک خوش گوار سی شام میں ہمیشہ کی طرح گھر کے کام نمٹا کر اپنی خواب گاہ کی واحد کھڑکی کے نیچے بچھے فلور کشن پر بیٹھی کسی کتاب میں منہمک تھی۔ کتاب کا نام یاد کرنے پر بھی یاد نہیں آ رہا...... کیونکہ اصل واردات اس کتاب سے منسلک نہیں...... اصل واردات تو وہ فون کال ہے جو اس وقت میرے موبائل پر آئی تھی۔

''میں پاکستان آ چکی ہوں۔ آپ سے ملنے کی قوی امید کرتی ہوں اور آپ سے پوچھے بنا ہی ملاقات کا دن اور وقت طے کر چکی ہوں...... سمجھیں؟''

اس کی چہکتی ہوئی آواز سنائی دی...... آواز میرے لیے اجنبی تھی مگر میں بولنے والی کو خوب جانتی تھی...... ہم کئی مہینوں سے بلاناغہ رات دیر تک فیس بک پر ایک دوسرے سے کبھی اسٹیٹس کے ذریعے تو کبھی میسنجر پر چھیڑ خانی کرتے رہے تھے۔ یہاں تک کے اس کے ہاں رات ڈھل جاتی اور وہ گڈ نائٹ کہہ کر مجھے بھی چلتا کر دیتی۔

''میں تو رات کو دیر تک جاگنے کی عادی ہوں۔'' میں نے ایک دن اس سے میسنجر میں کہا تھا۔

''لہذا اگر تمہیں اپنی شام گزارنے کے لیے کوئی نہ ملے تو تم مجھ سے گپ لگا لیا کرو......''

میری اس پیشکش کو اس نے بہت ہی جاں فشانی

اور وفاداری سے نبھایا...... یہ اس کی مجبوری بھی تھی۔ مصر اور پاکستانی وقت کے تین ساڑھے تین گھنٹے کے فرق نے ہمیں کتنے ہی مہینوں ایک دوسرے سے جوڑے رکھا...... وہ زیادہ تر شام کو ہوسٹل میں فارغ رہتی۔ میں رات کے کھانے سے فارغ ہو کر سکون سے اس کے ساتھ مگن ہو جاتی۔ میرا اس سے تعارف ہماری ایک مشترکہ دوست نے کرایا تھا۔ میں، وہ اور ہماری مشترکہ دوست فیس بک کے ایک ادبی گروپ میں باقاعدگی سے اپنا حصہ ڈالتے رہتے تھے۔ بس وہیں اس کی شوخ و چنچل اور تیکھی مگر دل میں اترتی ہوئی ذہانت بھری باتوں نے مجھے اس کی طرف متوجہ کر دیا۔

☆☆☆

پہلے ہفتے میں اس کی ہر پوسٹ اور کسی بھی پوسٹ پر ہوئے کمنٹس پڑھ کر ان پر سنجیدگی سے جواب دیتی رہی۔ پھر ایک دن ہمت کر کے اسے فرینڈ ریکویسٹ بھیجی ...... جس کے لیے اس نے ہماری مشترکہ دوست کو بہت تنگ کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ عورت کے نام پر بنائی گئی پروفائل میں چھپے کسی مرد کی دوست بننے سے بہتر ساری عمر دوست کے بنا رہنے کو ترجیح دیتی ہے، لہٰذا میرے بارے میں سب کچھ جان لینے کے بعد ہی اس نے مجھے اپنے دوستوں میں شامل کیا۔ مجھے اس کی اس احتیاط میں احتیاط سے زیادہ بے وقوفی کا احساس ہوا...... مگر یہ بات کچھ اس قدر اہم بھی نہیں تھی کہ میں سوچ بچار کرتی...... تو ہم دوست بن گئے۔

اس نے اپنے بارے میں آہستہ آہستہ بتانا شروع کیا۔ وہ ایک گورنمنٹ آفس میں اچھی پوسٹ پر فائز، آفس ہی کی طرف سے دیے گئے وظیفے پر تین سال کے لیے پی ایچ ڈی کرنے مصر گئی ہوئی ہے۔ اسے ڈھائی سال ہو چکے ہیں اور اب جلد ہی وہ ہمیشہ کے لیے واپس پاکستان آنے والی ہے۔ اس کے پیچھے اس کے والدین نے اپنے پرانے گھر کو تڑوا کر ایک شان دار سا گھر تعمیر کروا لیا ہے جس کا ابھی تک وہ صرف تصاویر میں ہی نظارہ کرتی رہی ہے۔ تصاویر میں اس کی ننھی بھتیجی بھی ہوتی جو اس سے بہت مانوس تھی اور ہر فون کال پر اس کا آنے سے تقاضا کرتی۔ ایسی ہی کتنی باتیں وہ کرتی جاتی۔ میری بھی سنتی جاتی۔

ہم دونوں میں سوالات بہت کم ہوتے۔ جو جیسے، جس طرح کا خیال دماغ میں آتا، ہم بتاتے جاتے...... ویسے بھی مجھے دوستی میں سوالات بہت عجیب لگتے ہیں۔ نام کیا ہے؟ شادی ہو گئی؟ شوہر کا نام؟ بچے کتنے؟ گھر اپنا ہے کہ کرائے کا؟ سسرالی ساتھ رہتے ہیں کہ الگ؟ کتنا پڑھا ہے۔ گھر میں کیا کرتی ہو؟ کھانا کیا پکاتی ہو۔ رنگ کون سا پسند ہے؟ گھر کا خرچا کون چلاتا ہے؟ تمہارے میکے والے کون کون ہیں؟ کہاں ہیں؟ کیا کرتے ہیں؟ اُف...... فیس بک پر اسی خصلت کی میری ایک دوست بنی جو مجھ سے ہر دو دن بعد پوچھتی۔

”تم نے جاب کیوں چھوڑ دی؟“

میں ہنس کر اسے بتاتی ”جاب چھوڑی نہیں جاتی ’جاب چھوٹ جاتی ہے۔“ مگر وہ ہر دو دن بعد جیسے رٹے رٹائے انداز میں پھر پوچھ بیٹھتی میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جب اسے میرا دیا گیا جواب یاد نہیں رہتا تو بھلا یہ سوال کیسے بار بار سر اٹھاتا ہے؟ میں نے اس کی چھٹی کر دی۔ یہی تو مزے کی بات ہے اس فیس بک کی دنیا میں...... جس کو چاہو لمحے بھر میں اپنی نظروں سے ہمیشہ کے لیے غائب کر دو...... انسان کو بھلانا بہت ہی آسان، بس ایک بٹن کے فاصلے پر......

خیر...... تو میں یہ بتا رہی تھی کہ میں اور وہ کبھی ایک دوسرے سے اس طرح کے سوالات نہیں کرتے تھے بلکہ کسی قسط وار ڈرامے کی طرح کہانی روز بروز آگے بڑھتی رہی اور ہم ایک دوسرے کو جانتے گئے......

گھروں اور دلوں میں مقیم کردار خود بخود وقت کے ساتھ سامنے آتے گئے اور ہم ایک دوسرے کی بہت سی عادتوں اور نادانیوں سے واقف ہوتے گئے۔

”تو شروعات یہ ہے؟“ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

”جڑ تو پکڑ میں آ چکی ہے۔ اب ذرا آگے بڑھا جائے تو جب وہ ہمیشہ کے لیے واپس پاکستان لوٹی تو جذبات میں آ کر دوسرے ہی دن میرے ہاں مجھ سے ملنے چلی آئی۔ نکلتا ہوا قد، دبلا پتلا سراپا اور چہرے پر بلا کی سنجیدگی۔ پہلی نظر میں وہ بہت ہی بارعب، لیے دیے رہنے والی شخصیت نظر آئی مگر دو چار بار جائزہ لینے پر چہرے کے سنجیدہ خدوخال جیسے اچانک شوخ و چنچل سے لگنے لگتے۔ ویسے مجھے اس سے اس قدر جلد بازی کی یا یوں کہیں کہ مجھ سے ملنے کی بے چینی کی امید نہیں تھی، مگر وہ ایسی ہی تھی اپنے اصولوں، اپنی مرضی اور منشا پر اپنے دوستوں کو انگلیوں پر نچانے والی۔ اکثر کسی بات یا بحث کے دوران وہ تیکھا سا کوئی طنز مار دیتی۔

ایسا ہی ہوتا ہے، انسان کے جسم کا یہ عضو ایسا ہے جس پر قابو رکھنا مشکل ہے اور عام بشر کے لیے تو ناممکن ہے مگر اس کے لیے ایسا سوچنے میں یہ قباحت ہے کہ وہ اپنی زندگی کو بڑے نپے تلے انداز میں گزارتی چلی آئی تھی۔ اس نے اب تک کی گزری ہوئی اپنی زندگی میں کبھی کہیں لرزش نہیں دکھائی تھی۔ وہ کمزور نہیں پڑی تھی اس نے کبھی کسی کو دھوکا دینے کا موقع نہیں دیا تھا۔ اس کے ہاں اصول تھے تو ان پر عمل پیرا بھی سختی سے تھی۔

ایسے میں اس کی گز بھر کی ادھر ادھر ڈولتی زبان اس کی شخصیت سے بالکل بھی میل نہ کھاتی تھی۔ اپنے رویے میں تو وہ بہت سکڑی سمٹی رہتی، کافی حد تک بارعب بھی جمائی سی مگر زبان بے قابو، بلا روک ٹوک طنز کے نشتر چلاتی چلی جاتی...... اس طرف میں بھی ایک نمبر کی گھنی تھی، میں تو آج تک خود کو معاف نہ کر سکی۔ اس کی زبان کی تیزی کو کیسے برداشت کرتی...... لہٰذا میری طرف سے ناراضی کا باقاعدہ زور و شور سے اعلان جیسا کچھ ہوتا یعنی میں اپنی ناراضی کا برملا تمام مشترکہ دوستوں میں اظہار کرتی۔ اب وہ خاموشی سے سب طرف سے پڑنے والی پھٹکار برداشت کرتی۔ زبان سے تو کچھ نہ کہتی مگر اپنے رویے کی سختی اور بلاوجہ کے طنز کی تلافی کچھ دنوں کے لیے خاموش ہو کر دینے لگتی۔

مجھے ایک دو دن میں ہی اس کی خاموشی کھل جاتی...... میں اب کی بار اس پر ہی چڑھ دوڑتی ...... اور وہ ہنس ہنسا کر بات نمٹاتی...... تو کچھ یوں ہم نے چھ مہینے گزارے تھے اور ایک دوسرے کو بہت ہی قریب کر لیا تھا۔ شاید میں نے خود کو پہلی بار اس قدر ڈھیل دی تھی ورنہ اس سے پہلے میں دوستی وغیرہ کے معاملات میں بالکل ہی ٹھس رہا کرتی تھی۔

اصل معاملہ بھی تو یہی ہے کہ میں ہی اس کو کھونا نہیں چاہتی تھی، تب ہی تو اپنے چڑچڑے پن کو سمجھتے ہوئے بھی اس سے جڑ کر رہنے پر بضد تھی۔ ویسے مجھے بچپن سے ایک بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ میں ایک نہایت ہی گھنی، چپی اور تنک مزاج انسان ہوں ...... اور ایسے لوگوں کے دوست نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں...... لہٰذا دوسروں سے میں خود بھی فاصلہ رکھ کے ہی ملتی تھی مگر اس بار کچھ یوں ہوا تھا کہ امی جان (جن کے دم سے مجھے ہزاروں کام رہتے تھے) کا حال میں ہی انتقال ہوا تھا۔ بھائی بہن تو سارے ہی بیرون ملک مقیم تھے جو امی جان کے انتقال پر آ کر ایسے گئے کہ فون رابطوں سے بھی گئے۔

میں ان دنوں سسرال میں رہتی تھی۔ چند ہی دنوں بعد میکے کی طرف سے دیے گئے میرے زیورات جو میں کسی شادی میں پہننے کے لیے لاکر سے نکال لائی تھی، پراسرار طور پر میرے کمرے سے غائب ہو گئے۔ بھئی میں سسرال میں کسی پر الزام نہیں لگا سکتی مگر ہاں ان سے الگ ضرور ہو گئی تھی خیر تو گھر بدلا تھا۔ ایک طرف امی جان کی کمی تو دوسری طرف لٹ جانے، بچھڑ جانے اور تنہا رہ جانے والے جیسے دکھ۔ سب نے مل کر میری آنکھیں کھول دی تھیں۔

’’تو آہستہ آہستہ میرے سجائے گئے تمام ہی بت جیسے ڈھائے جانے لگے۔‘‘ میں نے دل میں سوچا۔

واقعی میں نے بھی صنم کدے میں کیسے کیسے بت سجا رکھے تھے جو نہ میری سن سکتے تھے اور نہ ہی میرے کسی طرح کے مددگار تھے بلکہ وہ تو خود اپنی مدد بھی نہیں کر سکتے تھے۔ یوں صنم کدے کا آخری بت یعنی میری بارہ سالہ ایک برطانوی تعلیمی ادارے کی لگی لگائی، پکی نوکری بھی ختم ہوگئی۔ اب میں تھی اور میری تنہائی۔

ایک ریلا مجھے بہا کر اٹھا پٹخ کر انجان بے بیان ساحل پر ٹڈھال پھینک کر آگے بڑھ چکا تھا...... میں سانس لیتی تھی، ہنستی تھی مگر کچھ بھی سمجھ نہیں پاتی تھی۔ بھوک لگتی تو کھا لیتی، سانس رکنے لگتی تو منہ اٹھائے کہیں بھی نکل جاتی۔

ایسے میں اس کا ساتھ غنیمت ہوا۔ جیسے کسی نے اچانک میرا رشتہ واپس دنیا سے...... دنیا میں بسنے والے انسانوں سے جوڑ دیا تھا۔ لہٰذا سچ بات تو یہی ہے کہ اس سے زیادہ میں اس کے ساتھ کی ضرورت مند تھی، وہ تو مطلوب تھی، طلب گار میں تھی مگر مانتی کم کم تھی اور مانتی بھی کیسے، اس سے پہلے تو میں نے اس طرح دوستی کے رشتوں کو پرکھا ہی نہیں تھا، میرے لیے تو ماں باپ، بھائی بہن، شوہر، سسرال سے بڑا کوئی بت تھا ہی نہیں...... مگر پھر احساس ہوا کہ آخر دوست بھی تو انسان ہیں...... یہ نہ صرف آپ کو سمجھتے ہیں بلکہ آپ کا احساس بھی کرتے ہیں...... اور سب سے بڑی بات یہ کہ آپ کو ان پر اعتبار کرتے ہوئے ڈر نہیں لگتا بس شروع میں تھوڑی سی احتیاط کی جائے تو اچھے سے اچھا مخلص دوست مل جاتا ہے۔

میں تنہا ہو کر بھی جیسے مگن ہوگئی تھی۔ مجھے بہت سے مخلص لوگ اپنے اردگرد نظر آنے لگے تھے مگر میں اپنی خوشی میں بھولتی جا رہی تھی کہ ہمارے معاشرے میں عورت جتنی بھی پڑھی لکھی، خوداعتماد اور مستحکم کیوں نہ ہو، شادی کے بعد وہ اپنے شوہر اور اس کے گھر والوں کی مرضی سے ہی چلتی ہے اور پھر دوستیاں یاریاں تو بس مردوں کا شیوا ہے۔ ہم عورتوں کو خاص طور سے شادی شدہ عورت کو سسرالیوں میں یہ سب بدنام کر سکتا ہے۔

☆☆☆

پہلی بار جب اس سے میرے شوہر صاحب ملے تو بڑے متاثر ہوئے...... اتفاق سے شوہر صاحب سے اس کی پہلی ملاقات اس کے آفس میں ہی ہوئی تھی۔ وہ نئی نویلی سترہ گریڈ کی آفیسر بنی تھی اور ہمارے سامنے آفس میں اپنے سے نچلے درجے کے کولیگز سے بات کرتے ہوئے وہ جیسے جھجک جاتی۔ مجھے اس کا اس طرح جھجکنا اور جھینپنا مزہ دے رہا تھا۔ شوہر صاحب نے ملاقات کے ختم ہوتے ہی مجھ سے اس کی بڑی تعریف کی...... میں بھی خوشی سے پھولی نہ سمائی مگر پھر خوشی دو دن کی ہی ثابت ہوئی کہ تیسرے دن ساس صاحبہ مع چھوٹی نند اور اس کے تین بچوں سمیت وارد ہوگئیں۔

میں اب سسرال بہت کم جاتی تھی اور جاتی بھی کیسے کہ اس گھر میں قدم دھرتے ہی جیسے مجھے اپنا گلوبند...... نولکھا ہار اور بڑے بڑے جھمکوں کی یاد آنے لگتی۔ چوڑیاں بھی کچھ کم بھاری نہیں تھیں تو میرے کم کم جانے سے سسرال والوں پر یہ اثر ہوا کہ انہوں نے میرے گھر آنا جانا شروع کر دیا۔ ساس صاحبہ نے آتے کے ساتھ ہی چند ایک ادھر ادھر کی بات کرنے کے بعد اس کے بارے میں استفسار شروع کر دیا۔ ساتھ میں چھوٹی نند بھی شروع ہوگئی۔

’’وہ ایسا ہے کہ آپ کو تو معلوم ہی ہے ہمارے فلاں کزن، ڈھما کے بھائی، ان کے اکلوتے بھانجے آپ تو جانتی ہی ہیں۔ کتنے دلارے ہیں وہ ہم سب کے...... بس یہ ہے کہ کام دھندے میں ذرا ڈھیلے ہیں۔ مگر آپ تو جانتی ہیں ان کو کاروبار کا شوق ہے پھر اگر کوئی ایسی لڑکی مل جائے جو ان کے کاروبار کے لیے سرمایہ کاری کر دے...... اس کے بدلے وہ گھر داماد بھی بننے کے لیے تیار ہیں۔ لڑکی کی نوکری سے بھی انہیں کوئی مسئلہ نہیں...... پھر یوں بھی تو ہے کہ...... آپ تو سب جانتی ہی ہیں، بس سب کچھ آپ کے سامنے ہی ہے۔‘‘

شوہر صاحب سے میری نظریں ملیں اور شرم سے جھک گئیں...... اصل میں ہوا کچھ یوں تھا کہ ایک دن میں نے یوں ہی اس سے اب تک شادی نہ کرنے کے بارے میں پوچھ لیا تھا۔

’’ایک تو غریب اوپر سے سب سے بڑی لڑکی...... کون کرتا مجھ سے شادی؟‘‘

مجھے اس کی یہ بات اس قدر اداس کر گئی کہ میں نے دل ہلکا کرنے کے لیے یہ بات شوہر صاحب کے گوش گزار کر دی۔ اس وقت تو انہوں نے کوئی ردعمل نہیں دکھایا مگر اب اس کے آفس جا کر اس کے سترہ گریڈ کے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر جیسے ان کی آنکھیں بھی کھل گئیں تو غلطی میری ہی تھی، میں نے بات سنبھالنی چاہی۔

’’مگر جس کی تم لوگ بات کر رہے ہو وہ بہت...... میرا مطلب کہ بہت محنت کر کے یہاں تک پہنچی ہے پھر آپ کے بھائی انہوں نے پچھلی دو شادیاں بھی اسی شرائط پر کی تھیں مگر پھر ان کی نبھ نہ سکی...... مطلب تم یہ دیکھو کہ شرائط رکھی جائیں تو ان کو پورا کرنا دونوں طرف سے فرض ہو جاتا ہے ناں...... سب سے بڑی بات یہ بھی کہ کیا معلوم آپ کے بھائی کی اصلیت میرا مطلب ہے ان کے بارے میں سب کچھ جان کر وہ نہ مانے بلکہ مجھ سے ناراض ہی ہو جائے...... ملنا ہی ترک کر دے؟‘‘

میں نے خود کو پرسکون رکھتے ہوئے دبے دبے لہجے میں تقریر جھاڑی۔

’’ارے تو کیا ہوگیا؟‘‘ ساس صاحبہ جلبلا کر بولیں۔ ’’کون سی وہ تمہاری سگی بہن ہے کہ ملنا چھوڑ دے گی تو تمہاری صحت پر اثر پڑ جائے گا۔ ہونہہ، نہ مانے تو بیٹھی رہے اپنی ماں کے گھر، بھلائی کا زمانہ ہی نہیں رہا۔‘‘

ساس صاحبہ اپنے نکمے نکھٹو بھانجے کے لیے ایسی ہی حساس تھیں کہ ان کی نظر میں اس کی شادی اگر شہزادی ڈیانا سے بھی ہوتی تو یہ شہزادی ڈیانا پر ہی احسان ہوتا...... میں سر ہلاتی رہ گئی...... عجیب مشکل میں پھنس گئی تھی اس بات کا احساس بھی تھا کہ شوہر صاحب اپنی والدہ کے ساتھ ٹیم بنا کر بیٹھ گئے ہیں۔ میری تو اب کہیں بھی سنی ہی نہیں جائے گی۔

ساس صاحبہ کے جاتے ہی میں نے غصہ کیا اور خوب گرما گرمی کے ساتھ دونوں کا موازنہ بھی کھلے لفظوں اور بہ آواز بلند کیا مگر سوئی وہیں اٹکی رہی...... گھر کی فضا بوجھل سی رہنے لگی میں نے تھک ہار کر ایک دن موقع غنیمت جان کر اس سے بات کی مگر جیسے اپنا فرض نبھایا...... ایسی گول مول بات اس کے سامنے ڈالی کہ اس نے میرے پہلے جملے کے اختتام پر ہی صاف لفظوں میں انکار کر دیا۔

میں تو دل سے یہ ہی چاہتی تھی، میں نے جیسے سکھ کا سانس لیا اور دوبارہ بھول کر بھی اس کے سامنے یہ موضوع نہ چھیڑا...... مگر سسرال میں ایک ہی موضوع زیر بحث رہنے لگا...... کبھی دھمکیاں تو کبھی منت سماجت۔ شوہر صاحب تو جیسے مجھ بکری کو شیر کے آگے ڈال کر بھول ہی گئے تھے۔ میں جب بھی اس سے ملنے کہیں جاتی یا وہ مجھ سے ملنے میرے گھر آتی تو شوہر صاحب چاق و چوبند ہمارے اردگرد منڈلانے لگتے...... اور پھر پوری رپورٹ ساس صاحبہ تک پہنچ جاتی...... عجیب گھنے انسان بن گئے تھے شوہر صاحب اس کے سامنے مسکین بنے رہتے، میری ہاں میں ہاں ملاتے میرے آگے چوں نہ کرتے۔

اس کے اوجھل ہوتے ہی اپنی والدہ کو فون لگا کر بیٹھ جاتے یا پھر وہ چلی آتیں۔

سب مل کر نئے سرے سے مجھے باور کراتے کہ میں ان کے ساتھ مخلص نہیں ہوں...... ذرا سا کام ہے اور میں جان بوجھ کر ٹالتی چلی جا رہی ہوں...... ایسے میں اس سے اکیلے ملنے کا تو سوال ہی نہیں تھا... کہ میں اس کو سمجھا پاتی کیونکہ وہ بھی ہر وقت

ہمارے اردگرد منڈلاتے' توجہ نچھاور کرتے میرے شوہر صاحب سے تنگ ہونے لگی تھی......

اس کا انداز بھی شاہانہ تھا۔ اچانک فون کھڑکاتی کہ آ رہی ہوں۔

میں گھبرا کر۔ ابھی انتظام کر بھی نہ پاتی کہ وہ موجود ہوتی...... باتیں تو مجھے ڈھیروں کرنا ہوتی تھیں بلکہ مجھے تو اس سے مل کر جیسے طمانیت سی محسوس ہوتی۔ اس کے دن بدن بڑھتے درجے، ترقی، اس کی ذہانت اور شوخی جیسے میرے اندر تحلیل ہر سو پھیلی ہوئی اور ہر طرف سرایت کی ہوئی کم مائیگی...... احساس کمتری اور ناکامی کو رگڑ رگڑ کر نکال پھینکتی...... مجھے اپنا آپ نیا، نیا سا لگنے لگتا...... ایک جوش وولولہ سا دل میں بھر جاتا مگر اب میں الگ قسم کے بوجھ میں دبتی اس سے دل کی بات ہی نہ کر پاتی...... اور ہر ممکن اسے نظر انداز کرنے لگی...... ملنے سے کترانے لگی۔ کبھی کبھی میں سوچتی کہ کرنے دوں ساس صاحبہ کو اپنی۔

وہ چاہتی تھیں کہ میں ان کا اس سے آمنا سامنا کروادوں...... وہ خود ہی نمٹ لیں گی مگر میں......

میں جانتی تھی کہ آگے کیا ہوگا...... وہ مجھے ہی موردالزام ٹھہرائے گی...... پھر جو بے عزتی اور ذلت ہوگی، وہ تو مجھے ہی سہنی پڑے گی ناں پھر، پھر میں خود کو اس قدر کمزور، ناتواں اور لاچار کیسے ظاہر کروں......

نہیں بھئی مجھے شوہر صاحب اور اپنے سسرال پر پورا پورا مان اور اختیار ہے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ کوئی پتا بھی میری مرضی کے خلاف کھڑک جائے...... مگر مسئلے کا کوئی حل نکل پا رہا تھا نہ ہی میری یا شوہر صاحب کی پارٹی میں سے کوئی ڈھیلا پڑ رہا تھا...... اور وہ ہمارے درمیان ہوتی تمام دھما چوکڑی ...... کشتی اور کسی حد تک کبڈی سے بے خبر...... کبھی مجھ پر نہ ملنے پر حد سے زیادہ ناراض ہوتی کبھی مجھے طنز پر رکھ لیتی...... میں سچ بتا کر اسے ہمیشہ کے لیے کھودوں گی...... میں دل میں خود کو سمجھاتی...... چلنے دو جیسا چل رہا ہے...... مگر آخر کب تک...... سچ ایک دن رسی تڑوا کر بھاگ نکلے گا...... آئے دن کی کشتی، دھما چوکڑی اور کبڈی نے مجھے مکمل طور پر نڈھال کر دیا تھا...... آخر کار میں گھٹنوں کے بل گر پڑی...... اور سیدھی سجدے میں چلی گئی۔

''اے میرے مالک...... حب تو تیرا ہی کرشمہ ہے۔ دل میں پیدا ہونے والے اس حب کو دل میں ہی سینت سینت کر رکھنے کی برداشت بھی دے دے ...... ہمت دے دے میرے مالک......!''

میں نے سجدے میں کافی دیر رونے دھونے کے بعد سر اٹھایا۔

''اب وہ نہ مجھ سے ملے گی نہ میں اس سے...... ہمارے درمیان زبردست جھگڑا ہو گیا ہے...... وہ بدتمیز' بددماغ' پھوہڑ ہے...... میں اس سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں رکھوں گی...... کہیں نظر پڑ بھی گئی تو ایسے نظر انداز کر دوں گی جیسے جانتی ہی نہیں...... آپ بھی ہوش کے ناخن لیں...... جب میں اس سے ملنا یا تعلق رکھنا ہی نہیں چاہتی تو بھلا آپ کے بھائی کے بارے میں کیا بات کر سکتی ہوں...... بس اب اس بات کو دفن کریں۔''

میں نے شوہر صاحب کو اسی دن دوٹوک انداز میں خبردار کیا اور خود پر ہمیشہ کا آزمودہ بے حسی، لاتعلقی اور بے غیرتی کا پردہ ڈال لیا...... کئی دنوں نہیں ہفتوں بلکہ یوں کہیں کہ مہینوں...... اس کے معاملے کی کبڈی ہوتی رہی مگر اب میں ہاری ہوئی کچھ اس انداز میں شمولیت اختیار کرتی کہ حریف اپنا سا منہ لیے' تاسف سے سر ہلاتے واپس لوٹ جاتے...... اب میں نے ایک بار پھر سے دوست بنانے چھوڑ دیے۔

یہ دوستی یاری سب بیکار کی باتیں ہیں...... عورت کا اصل صرف شوہر اور شوہر کی مرضی ہی ہوتی ہے۔ چند ہی مہینوں میں راوی چین ہی چین لکھنے لگا۔ اب تو سب کچھ ٹھیک جا رہا ہے...... ہر طرف سکون و امن بکھرا پڑا ہے۔ بس...... بس یہ میری آنکھوں کی نمی کا عجیب مسئلہ آن پڑا ہے۔

☆

سلویٰ سیف اللہ بٹ



دعا کی والدہ کا اچانک انتقال ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی ماں اور سوتیلے بھائی حماد کے ساتھ رہتی ہے۔ دعا کے دو ماموں، ریاض احمد جن کی بیوی رابعہ احمد ہیں اور الیاس احمد جن کی بیوی مریم ہے۔ رابعہ احمد کے کہنے پر ریاض احمد دعا کو اپنے ساتھ لے جاتے ہیں کہ سوتیلے بھائی کے ساتھ رہنے کا اب جواز نہیں ہے۔

ریاض احمد کے دو بیٹے عمیر اور عمر ہیں اور ایک بیٹی نوال ہے۔ عمیر بہت سلجھا ہوا نوجوان ہے۔ جس نے باپ کے ساتھ مل کر ان کا کاروبار بھی سنبھال رکھا ہے۔ جبکہ عمر ایک بگڑا ہوا ضدی اور خود سر نوجوان ہے۔

الیاس احمد اپنے بڑے بھائی ریاض احمد کے برابر میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ہی رہتے ہیں۔ آنے جانے کے لیے درمیان میں دروازہ ہے۔ ان کی بیوی مریم ایک امیر خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ بیوی کی جائیداد ہتھیانے کی کوشش میں ہیں۔ مریم کا ایک بھائی ایکسڈنٹ میں معذور ہو جاتا ہے اور اس کی بیوی مرجاتی ہے وہ ذہنی طور پر بھی ڈسٹرب ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر اس کا علاج شادی تجویز کرتے ہیں۔

مکمل ناول



انعم اور احسن ایک خوشگوار زندگی گزار رہے ہیں۔ لیکن اولاد کی کمی ان کی زندگی میں ہے۔ انعم کے شک کرنے پر احسن اپنا ٹیسٹ کرواتا ہے۔ انعم بہت پریشان ہے' احسن اسے تسلی دیتا ہے۔ لیکن اس کے بار بار پریشان ہونے پر ناراض ہو کر اسلام آباد چلا جاتا ہے۔ اس کی رپورٹ پازیٹو آتی ہیں' وہ بالکل نارمل ہوتا ہے۔ انعم کا نروس بریک ڈاؤن ہو جاتا ہے۔ کمی اس میں ہوتی ہے۔

الیاس احمد بنیادی طور پر لالچی آدمی ہے۔ اسے رشتوں کا بھی پاس نہیں۔ وہ اپنی بیوی سے بھی اکھڑا اکھڑا رہتا ہے اور اپنے بھتیجے عمیر کو بھی باپ بھائی کے خلاف بھڑکاتا ہے۔

عمیر اور دعا ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ رابعہ احمد یہ پسند نہیں کرتیں۔ عمیر اور نوال دونوں بہن بھائی دعا کو اس کی ماں کے غم سے باہر نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ریاض احمد کو بہن اور بھانجی سے بہت محبت ہے۔ وہ اس کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ عمر کو دعا ایک آنکھ نہیں بھاتی' وہ اسے ہر وقت ذلیل کرتا رہتا ہے۔

دعا کو دیکھ کر الیاس احمد کا لالچی ذہن مختلف منصوبے بنانے لگتا ہے۔

الیاس احمد' عمر کے کہنے پر اس کے والد سے اس کے علیحدہ بزنس کی سفارش کرتے ہیں' جسے ریاض احمد سختی سے رد کر دیتے ہیں۔ عمر ان سے مزید برگشتہ ہو جاتا ہے۔

تبریز ملک اپنے معذور بھائی کی شادی اور مریم کو ان کا حصہ دے کر ہمیشہ کے لیے امریکہ میں رہائش پذیر ہونا چاہتے ہیں۔ یہ سن کر الیاس احمد ایک شاطرانہ منصوبہ بناتا ہے۔ اور عمر کو اپنے ساتھ ملا لیتے ہیں۔ عمر کا رویہ دعا کے ساتھ انتہائی دوستانہ ہو جاتا ہے۔ رابعہ احمد بھی اس کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں' کیونکہ انہیں مریم نے مشورہ دیا ہوتا ہے کہ عمر اور دعا کی شادی ہو گئی تو باپ' بیٹے کے درمیان فاصلے کم ہو جائیں گے۔

ریاض احمد' عمر اور دعا کی باہم پسندیدگی کو جانتے ہیں۔ اور ان کی شادی کا عندیہ دیتے ہیں' مگر رابعہ' دعا کا عمر سے شادی سے گریز اور بار بار عمر اور دعا کے اچھے تعلقات کو جتاتی رہتی ہیں۔ دعا کے رویے سے عمر کھٹک جاتا ہے۔

رابعہ احمد کی کوششوں سے عمر اور دعا کا تعلق سب کی نظر میں آ جاتا ہے۔ ریاض احمد کو کھیل سمجھ میں آنے لگتا ہے۔ وہ عمر کو اسلام آباد برانچ کا چارج دے دیتے ہیں۔

عمیر کو دعا کا شادی سے انکار اور عمر سے تعلق کا رویہ الجھن میں ڈال دیتا ہے۔ دعا بھی ممانی کی نیت کا فتور سمجھ جاتی ہے' مگر کم ہمتی اور کوئی اور ٹھکانا نہ ہونے کے سبب خاموش رہتی ہے۔

منصوبے کے مطابق الیاس احمد بیمار ہو کر ریاض احمد کے گھر جاتے ہیں جہاں دعا' عمر کے کمرے سے برآمد ہوتی ہے۔ عمر گناہ کا اعتراف کرتا ہے۔ رابعہ کو اس سارے ڈرامے کے باوجود دعا کی پاک دامنی پر یقین ہوتا ہے' وہ عمر کو ڈانٹتی ہیں۔ ریاض احمد صدمے سے بیمار ہو کر اسپتال پہنچ جاتے ہیں۔ اور دعا کو الیاس احمد اپنے گھر لے آتے ہیں' جہاں مریم اسے خوب لعن طعن کرتی ہے۔ دعا اپنی پاک دامنی ثابت نہیں کر پاتی' اس کے باوجود عمیر کا دل اسے قصوروار نہیں مانتا۔

الیاس احمد' مریم کے معذور بھائی کے لیے دعا کا نام پیش کرتے ہیں۔

الیاس احمد اپنی چکنی چپڑی باتوں سے مریم اور رابعہ احمد کو دعا کی آصف سے شادی پر راضی کر لیتے ہیں۔ ریاض احمد اور نوال کے کہنے پر عمیر' دعا کو اس کی شادی سے ایک روز قبل الیاس کے چنگل سے چھڑا لیتا ہے اور اسے اپنی محبت کا یقین دلا کر اس کے سوتیلے بھائی کے دروازے پر چھوڑ آتا ہے۔

اس کا سوتیلا بھائی ملک چھوڑ کر جا چکا ہے۔ دعا گھر فون کرتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ عمر نے عمیر کو گولی مار دی ہے۔ نوکرانی اسے کہیں اور جانے کا مشورہ دیتی ہے۔ بہت بری حالت میں دعا اپنی دوست انعم کے گھر پہنچ جاتی ہے اور اسے اپنے حالات بتاتی ہے۔

دعا کے متعلق رابعہ کے اصل خیالات اور عمر کے کرتوت جان کر ریاض احمد ان سے ناراض ہو جاتے ہیں۔ آصف' خودکشی کر لیتا ہے۔

انعم' دعا کو اپنے گھر میں پناہ دے دیتی ہے۔ انعم کی ساس کینیڈا سے ملنے آتی ہیں۔ انہیں یہ بات پسند نہیں آتی۔ وہ انعم اور دعا کا موازنہ کرتی ہیں۔ یہ بات دعا کو الجھن میں ڈال دیتی ہے۔ وہ انعم کو اس کی بے اولادی کا احساس دلاتی ہیں۔ عمیر قاتلانہ حملے میں بچ جاتا ہے۔ ریاض احمد' عمیر اور نوال کی بے رخی' رابعہ احمد کو اپنی غلطیاں سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ عمر نشے کی حالت میں ماں سے بھی بدتمیزی کرتا ہے اور الیاس احمد سے بھی پیسوں کا تقاضا کرتا ہے اور سارا سچ مریم کے سامنے اگل دیتا ہے۔ دونوں کا جھگڑا ہو جاتا ہے اور عمر' الیاس احمد پر فائر کھول دیتا ہے۔ عمیر' الیاس احمد کو اسپتال لے جاتا ہے۔ مریم' عمیر کو عمر اور الیاس احمد کے گٹھ جوڑ اور سازش کا بتاتی ہے۔ عمر کو پولیس پکڑ کر لے جاتی ہے۔ تھانے میں اس پر تشدد ہوتا ہے۔ عمیر اور ریاض احمد تھانے جاتے ہیں جہاں سے رہائی پانے کی خاطر عمر انہیں سچ سچ بتا دیتا ہے۔

آٹھویں قسط

رات کے آخری پہر وہ ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھیں۔ انہوں نے عمر کو خواب میں بہت بری حالت میں دیکھا تھا۔ چہرہ پسینے سے شرابور تھا۔ دل کی دھڑکن اور سانس کی رفتار معمول سے ہٹ کر تیز تھی۔

انہوں نے روم ریفریجریٹر میں سے بوتل نکال کر پانی کا گلاس بھرا اور ایک ہی سانس میں آدھا گلاس پی گئیں۔ پانی پینے سے سانس کچھ بحال ہوا تو گلاس واپس رکھ کے، مڑ کے سوئے ہوئے ریاض احمد کو دیکھا اور احتیاط سے چپل پیروں میں اڑس کے باہر آ گئیں۔ سنسان لاؤنج میں ہلکی روشنی تھی۔ وہ سیڑھیاں چڑھ گئیں۔ عمر کے کمرے کا دروازہ کھولا، اندر گھپ اندھیرا تھا۔ انہوں نے سوئچ بورڈ پہ بٹن ٹٹول کے بتی جلائی تو سارا کمرہ روشنی میں نہا گیا۔ ہر چیز ویسے ہی پڑی تھی جیسے وہ رکھ گیا تھا۔ وہ اس کی دیوار گیر تصویر کے پاس جا رکیں۔

کروٹ بدلتے ریاض احمد کی بیوی کو ساتھ نہ پا کر پوری آنکھیں کھل گئیں۔ انہوں نے واش روم کی طرف دیکھا جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھے۔

''رابعہ اس وقت کہاں جا سکتی ہے۔'' وہ بستر چھوڑ کر باہر آئے۔ لاؤنج میں رک کے ادھر ادھر دیکھا، سارے کمروں کے دروازے بند تھے۔ کچھ سوچتے ہوئے وہ سیڑھیاں چڑھ گئے۔ عمر کے کمرے کا دروازہ ادھ کھلا تھا۔ انہوں نے اندر جھانکا۔ وہ عمر کی تصویر کے سامنے کھڑی تھیں۔

''عمر! تم نے جو کچھ کیا، اس کے لیے میں بھی قصوروار ہوں۔ تمہیں بگاڑنے میں میرا بھی ہاتھ ہے۔ تمہاری تربیت میری ذمہ داری تھی۔ تم جیل میں ہو، مجھ سے دور ہو، میرا دل تمہارے لیے بہت تڑپتا ہے لیکن میں کچھ کر نہیں سکتی۔ میں نے تمہاری خاطر بڑے بیٹے کے ساتھ ناانصافی کی' شوہر کی حکم عدولی کر کے، میں نے تمہاری ضدیں اور خواہشیں پوری کیں، لیکن تم نے اس سب کا مجھے کتنا برا صلہ دیا۔ اتنی بری نقب لگائی، وہ بھی اپنے ہی گھر میں، اپنے باپ کو تکلیف پہنچائی اپنے بڑے بھائی پر گولی چلائی۔ دعا جو تمہاری بہن جیسی تھی، تم نے اس کا سودا کرنا چاہا۔ تم نے اس یتیم لڑکی کے خلاف کتنی بڑی سازش کی۔ اس کی زندگی تباہ کرنے کی کوشش کی۔ میں نے ہر دفعہ تمہیں بچانے کی کوشش کی۔ شاید تم اسی طرح سدھر جاؤ، لیکن اب نہیں —— میں تمہارے لیے دعا ضرور کرتی ہوں۔ اللہ تمہیں راہ راست پر لائے۔''

اس کی تصویر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے رابعہ احمد رو رہی تھیں۔ ریاض احمد خاموشی سے واپس پلٹ گئے۔

☆☆☆

بیڈ پر بری کے کپڑوں کا ڈھیر تھا۔ ہر رنگ اور کام کے کپڑے، ایک سے بڑھ کے ایک ڈیزائن۔ انعم اور دل آرا دیکھ رہی تھیں۔

ملازمہ نے فرنیچر کی جھاڑ پونچھ کر لی تھی۔ وہ میز پر دھرے برتنوں کی ٹرے اٹھا کے جانے لگی۔ تو انعم نے پکارا۔

"سنو، ذرا دعا کو بھیجو۔" وہ سر ہلا کے فوراً باہر نکل گئی۔

"ماما جی! میں آج دعا کو پارلر لے جاؤں، ٹائم بہت کم ہے۔ اس مشقت کے لیے بھی سارا دن چاہیے۔" وہ کپڑوں کو ہینگر پر پھر سے درست کرنے لگی۔

"سیلون کیوں جانا ہے اس کو۔" ان کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

"فیشل، تھریڈنگ، مینی اور پیڈی کیور وغیرہ کے لیے۔" اس نے حیرت سے سب گنوایا۔

"ناٹ ایٹ آل، کوئی ضرورت نہیں اسے کسی قسم کی اسکن پالش کی، اس کی اسکن ٹائٹ ہی ہے۔ ڈیٹس اٹ۔" دل آرا نے صاف منع کر دیا۔ انہیں انعم کی بے وقوفی کھولا رہی تھی۔ جس زاویے پہ ان کی سوچ دوڑ رہی تھی۔ انعم کی وہاں تک رسائی نہیں تھی۔

"لیکن ماما جی......!" اس نے منہ بسورا۔

"بس میں نے جو کہہ دیا اور کبھی کبھار اپنی عقل استعمال کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔" انہوں نے اسے ڈانٹ دیا۔

"آنٹی! آپ نے بلایا ہے۔" دعا دروازے کی دہلیز پر کھڑی پوچھ رہی تھی۔

"یوں غیروں کی طرح کھڑی ہو کر اجازت کیوں مانگنے لگیں۔ آجاؤ، ادھر ہمارے پاس آؤ۔" انہوں نے اس کی طرف بازو وا کیے۔ تھوڑی دیر قبل والے تاثرات نرمی میں بدل چکے تھے۔ وہ جھجکتے ہوئے ان کے قریب ہوئی۔ انہوں نے ہاتھ تھام کے اسے قریب بٹھا لیا۔

"یہ دیکھو ہم نے تمہارے لیے کتنے خوب صورت ڈریس خریدے ہیں۔ یہ میری اور انعم کی مشترکہ پسند ہے ـــــ دیکھو تو سہی۔" انہوں نے گپ چپ دعا کی گود میں دو تین سوٹ اٹھا کے ڈالے۔

"سب بہت اچھے ہیں آنٹی! پسند آپ کی ہے تو یقیناً اچھے ہوں گے۔ مجھے آپ پر بھروسا ہے۔" اس نے طائرانہ سی نگاہ ڈال کے بددلی سے کہا۔ زخمی دل کا بھلا رنگوں، خوب صورتی اور خوشیوں سے کیا لینا دینا۔

دل آرا نے توقف کر کے بغور اس کے چہرے کو دیکھا پھر بولیں۔ "او کے، تم کل بازار چلنا میں تمہیں شوز دلوا دوں گی اور گولڈ کی جیولری بھی اپنی پسند کی لے لینا۔"

وہ اس کے چہرے اور اعصاب پر چھائی پژمردگی کی وجہ جاننے میں قطعاً دلچسپی نہیں رکھتی تھیں۔

"سوری آنٹی! میں بھی بازار شاپنگ کی غرض سے نہیں گئی، میرے جوتے بھی امی جان لا دیتی تھیں۔ آپ تو مجھے ساتھ لے جا کے مایوسی ہی ہوگی کیونکہ میں تو مشورہ بھی نہیں دے سکتی، میں سائز بتا دوں گی، آپ خود ہی لا دیجیے گا۔" اس نے صاف کنی کترائی۔

"ماما! دعا سچ کہہ رہی ہے۔ اسے واقعی شاپنگ کا قطعاً آئیڈیا نہیں۔" انعم نے اس کی گواہی دی۔

"یہ تو ہے دعا مگر تم بالکل ریزرو سی ہو کے رہ گئی ہو، حالانکہ تم میرے ساتھ اچھی خاصی بات چیت کر لیتی تھیں۔" دل آرا کی زبان پر گلہ آ ہی گیا۔

"ایسا ہو جاتا ہے ماما جی! یاد ہے میں نے اپنی شادی سے دو تین روز قبل کھانا پینا چھوڑ دیا تھا۔ آپ نے جب سختی کی تو میں کتنا روئی تھی حالانکہ مجھے کہیں دور تو جانا نہیں تھا۔"

انعم کو اپنا وقت یاد آ گیا۔ دل آرا کے ہونٹوں پر

بھی مسکراہٹ رینگ گئی۔

"میں نے پورے دس دن تمہیں احسن سے پردہ کروایا تھا۔ اوہ مائی گاڈ وہ کتنا تڑپتا تھا، تمہارے کمرے تک پہنچنے کے لیے۔ تمہاری ایک جھلک دیکھنے کو تاولا ہو رہا تھا۔"

انعم کے ہونٹوں پر شرمیلی سی مسکان تھی۔ انہوں نے اس کی چوری پکڑتے ہوئے زور کا قہقہہ لگایا۔

"اور اس گھر کو پندرہ روز قبل ہی روشن قمقموں، رنگوں اور لائٹوں سے سجا دیا گیا تھا۔" ایک اور یاد ابھری۔

دعا خود کو اس ساری گفتگو میں ان فٹ محسوس کرتی اٹھ گئی۔ دل آرا نے اس کا اٹھنا خاص طور پر محسوس کیا تھا۔

"اور میری ساری بری احسن نے خریدی۔ ہر جوڑا، کلر کمبی نیشن اور اس پہ کام، ایوری تھنگ احسن کی پسند تھی۔ مجھے تو اپنی شاپنگ کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔"

انعم کا جوش دیدنی تھا۔ دعا یہ سب کچھ جانتی تھی۔ تب وہ دونوں بی ایس سی کا امتحان دے کر فارغ ہوئی تھیں۔ انعم اتنی پُرجوش تھی کہ دن بھر میں دس دفعہ کال کر کے دعا کو اپنی شاپنگ، حسن کی بے قراریاں، اپنی خوشی سے تیز ہوتی دل کی رفتار کی تفصیل بتاتی، لیکن اس کے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہو رہا تھا نہ ہی ہونے والا تھا۔ احسن کو تو شاید ٹھیک سے یہ بھی یاد نہیں تھا کہ ان دونوں نے نکاح کا کون سا دن مقرر کیا ہے اور نہ ہی ان دونوں کے من میں ملن کی خواہش جاگی تھی۔

☆☆☆

عمیر صوفے پر بیٹھا لیپ ٹاپ گود میں رکھے تیزی سے انگلیاں چلانے میں مصروف تھا، لیکن اس کا دھیان بار بار کرسی پر بیٹھے باپ کی طرف بھٹک جاتا، جو صبح سے کسی اندرونی خلفشار کا شکار تھے۔ ایک فائل پکڑتے، چند صفحے الٹ کے دوسری فائل اٹھا کے ورق گردانی کرنے لگتے ـــــ اب شاید تھک کے انہوں نے ریوالونگ چیئر کی پشت سے ٹیک لگا کے آنکھیں موند لی تھیں۔ عمیر سے مزید صبر نہ ہوا۔

"پاپا جان، اینی پرابلم......؟" اس نے لیپ ٹاپ بند کر دیا۔

"ہوں...... نہیں...... بس یوں ہی......" انہوں نے کسی گہری سوچ سے چونک کے آنکھیں کھول دیں اور سیدھے ہو گئے۔

"ایسا کیا ہے جو مجھ سے چھپا رہے ہیں۔" وہ آسانی سے مطمئن ہونے والا نہیں تھا۔

"میں عمر کے متعلق سوچ رہا تھا۔" بڑے عام سے لہجے میں بتایا گیا۔ انہیں رات سے رابعہ احمد کی حالت نے تشویش میں مبتلا کر رکھا تھا۔ وہ اس سے ماں کا راز شیئر نہیں کر سکتے تھے۔

"کیا سوچ رہے تھے؟" وہ اپنی حیرت چھپا گیا۔ باپ کے منہ سے نکلے الفاظ اسے کسی معجزے سے کم نہیں لگے تھے۔

"تم دکھاؤ، کہاں تک تمہارا کام پہنچا۔ ہمیں کل اس ایگری منٹ کو فائنل کرنا ہے۔" انہوں نے موضوع بدل دیا۔

"جی...... دکھاتا ہوں۔"

وہ باپ کے مزاج سے آشنا تھا اس لیے زیادہ اصرار نہ کیا۔

☆☆☆

دل آرا نماز ادا کر کے، وسیع لان میں ہی چہل قدمی کر لیتی تھیں۔ احسن بھی واک اور ایکسرسائز کرنے کا عادی تھا۔ وہ صبح نزدیکی پارک میں چلا جاتا۔ وہ لان میں آئیں تو ٹھٹک گئیں۔ وہ پول کے قریب رکھے بینچ پر بیٹھا تھا۔ وہ تیز قدم اٹھاتی اس تک پہنچیں۔

"احسن...... اکیلے کیوں بیٹھے ہو، واک پہ نہیں گئے۔" ان کی آواز میں ممتا کی تڑپ واضح تھی۔

وہ بھی دعا کی مانند بجھ کے رہ گیا تھا۔ دعا کے

معاملے میں تو انہوں نے آنکھیں اور کان بند کرلیے تھے، لیکن یہاں معاملہ اکلوتے بیٹے کا تھا۔

''میں تنہا ہی بیٹر فیل کرتا ہوں۔'' اکھڑ سا جواب۔

''اکیلے ہوں تمہارے دشمن، آئندہ یہ اول فول منہ سے مت نکالنا، میں تمہارا برا چاہ سکتی ہوں۔'' وہ بہت بے بسی سے جوان بیٹے کو تک رہی تھیں۔

''اپنی اولاد کی اولاد کو اپنی گود میں کھلانا میری فطری آرزو ہے۔ میں اس خواہش پر بند باندھتے باندھتے تھک چکی ہوں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ ہمارے اس بڑے سارے گھر میں تمہاری بچوں کی آوازیں، قلقاریاں، شور اور لڑائی جھگڑے گونجیں۔ انعم مجھ سے ان کی باتیں کرے، شرارتیں سنائے اور شکایتیں لگائے، میں ان کے لیے کھلونے اور چاکلیٹ خریدوں۔'' فرط جذبات سے ان کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

''اور اس سب میں تمہارا بھی فائدہ ہے احسن، تمہارا بیٹا، تمہارا بازو ہوگا، مضبوط بازو، وہ تمہیں سپورٹ کرے گا۔ انعم راضی ہے تو تمہیں کیا اعتراض ہے۔'' دل آرا نے اسے منانے کے ساتھ ڈپٹا بھی۔

''میں یہ سب انعم کی خاطر ہی کہہ رہا ہوں۔ شاید آپ کو اندازہ نہیں کہ آپ میرے لیے کتنے پرابلمز کری ایٹ کرنے والی ہیں، میں انعم کی نیچر کو جانتا ہوں۔ وہ بہت چھوٹے دل کی ہے، وہ تو میرے سائے تک کی تقسیم برداشت نہیں کرسکتی۔'' اس نے ان کی توجہ اصل مسئلے کی طرف مبذول کروائی۔

''اسے سب برداشت کرنا ہوگا۔ تم میں حوصلہ ہے اس کے بانجھ پن کو عمر بھر جھیلنے کا، تو اسے بھی ہم سب کی خوشی اور اس خاندان کے فائدے کے لیے تمہاری شراکت برداشت کرنا ہوگی۔ اسلام میں مرد کو چار شادیوں کی اجازت ہے۔ تم دونوں کو برابر کے حقوق دینا، کسی کا حق غصب نہ کرنا، میانہ روی سے چلنا، سب آسان ہوتا جائے گا۔'' انہوں نے نرمی سے اس کا ذہن الجھنوں سے نکالنا چاہا۔

''آئی کانٹ انڈر اسٹینڈ، ایسی کون سی عورت ہوگی، جس کے ساتھ انو کمفرٹ ٹیبل کرے گی۔ وہ تو آل ریڈی مجھ سے نالاں رہتی ہے، دو گھنٹے میں اسے اگر کال نہ کروں تو وہ کیا کیا فرض کرلیتی ہے۔ آپ کہاں سے ڈھونڈیں گی، اتنی صابر اور معصوم لڑکی جو صرف میری اولاد کو جنم دے، انعم اور میرے بیچ میں نہ آئے۔'' وہ انہیں کسی نہ کسی طرح روکنا چاہتا تھا۔ وجہ انعم اور اس کی شکی طبیعت ہی تھی۔ وہ جیسی بھی تھی' وہ اس کے ساتھ خوش تھا۔ اسے ہینڈل کرلیتا تھا۔

''میں نے ایسی لڑکی ڈھونڈی ہے جو خاص انعم کی پسند ہے۔ پھر وہ انعم کی ہر اچھی اور بری عادت سے واقف ہے۔ وہ اس کے ساتھ گزارہ کرسکتی ہے کیونکہ وہ بے چاری اتنی بے ضرر سی ہے کہ اسے تو اونچی آواز میں بات تک نہیں کرنا آتی۔'' وہ بڑی خوشی خوشی اسے تفصیل سنانے لگیں۔

''آپ لوگوں نے لڑکی ڈھونڈ لی ہے؟''

''دعا..... دعا ہے وہ لڑکی جو تمہاری اور انعم کی بے رونق زندگی میں خوشیاں بھر دے گی، انعم کی خالی گود بھر جائے گی اور میں دادی بن جاؤں گی۔'' دل آرا بڑے سکون و اطمینان سے سرشار اسے بتا رہی تھیں۔

''دعا.....!!'' احسن کے ماتھے پر بل پڑ گئے جبکہ دل آرا اسے نجانے آگے کیا کچھ بتا رہی تھیں جبکہ اس کا ذہن کافی دنوں سے اداس' بیمار او مغموم سی صورت والی دعا میں اٹک گیا تھا۔

☆☆☆

اس نے بریف کیس اور لیپ ٹاپ میز پر رکھ کے ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرکے اسے صوفے پر پھینکا اور واپس مڑ گیا۔ رابعہ احمد جو اس کے لیے پانی کا گلاس لارہی تھیں۔ اسے واپس جاتا دیکھ کے پکار اٹھیں۔

''عمیر! کہاں جارہے ہو.....؟'' وہ آواز دیتی کچن سے باہر آئیں۔

''چاچو جان کی طرف جارہا ہوں، تھوڑی دیر میں آجاتا ہوں۔'' وہ مڑے بغیر بتاتا ہوا باہر نکل گیا۔

لان میں لگا چھوٹا سا گیٹ جو دونوں گھروں کو ملائے ہوئے تھا۔ اسے کھول کے وہ الیاس احمد کے لان میں نکل گیا۔ لان میں وہ اور مریم کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔

''السلام علیکم! چاچو جان!'' اس نے ادب سے سلام کیا۔

''وعلیکم السلام!'' وہ دونوں اسے اپنے گھر میں دیکھ کے حیران رہ گئے۔

''چاچو جان، میں عمر کا پوچھنے آیا تھا۔ وہ کیسا ہے؟'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''وہ بہت تکلیف میں ہے وہاں عمیر۔ بہت بری جگہ ہے جیل، اس قدر محنت و مشقت اور پھر پیٹ بھر کر کھانے کو بھی نہیں ملتا، اتنی گندی زبان میں گالم گلوچ، بہت خراب حالت ہے اس کی وہاں' اسے معاف کردو اور رہا کروالو۔ ایسے ہی جیل میں کسی برے شخص کے ہتھے چڑھ گیا تو بڑی مصیبت بن جائے گی۔ تم بھائی جان کو منالو، مجھ میں اس کی سفارش کرنے کی ہمت نہیں ہے۔''

الیاس احمد کا دل اس کے لیے دکھتا تھا۔ وہ اسے رہا کروا کے، ریاض احمد کو خود سے بدظن نہیں کرسکتے تھے۔ عمیر نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

''عمیر..... مجھے تم سے حماد کا ایڈریس پوچھنا تھا۔ میں دعا سے ملنا اور معافی مانگنا چاہتا ہوں۔'' الیاس احمد کا ضمیر جاگ گیا تھا اور اپنے گناہ کا احساس چین نہیں لینے دیتا تھا۔

''دعا..... اپنے بھائی حماد کے پاس نہیں ہے۔'' عمیر نے بڑے کرب سے کہا۔ وہ انہیں ساری بات بتا رہا تھا۔ الیاس احمد کی زبان گنگ اور حواس معطل ہورہے تھے۔

☆☆☆

''تم اور ماما ل کے اس بے یارو مددگار لڑکی کو ایکسپلائٹ کررہی ہو۔'' بیڈروم میں داخل ہوتے ہی وہ شروع ہوگیا۔

''کون سی لڑکی.....؟ کس کا ذکر کررہے ہو۔'' وہ سنگھار میز کے اسٹول پر بیٹھی ہاتھوں پر نائٹ کریم کا مساج کررہی تھی۔ کھڑی ہوگئی۔

''شرم آرہی ہے مجھے یہ سوچتے ہوئے بھی کہ تم لوگوں نے میرے لیے دعا کو چنا ہے۔'' اس کا دل کررہا تھا کہ وہ سر دیوار پر دے مارے۔

''اس میں شرم کی کون سی بات ہے۔'' وہ اس کے مقابل کھڑی، اس کے تپتے چہرے کو دیکھتی ہوئی بڑی معصومیت سے سوال کررہی تھی۔

''کچھ عرصہ قبل تک اس پوری دنیا میں، تم اس کی واحد ہمدرد اور غمگسار تھیں۔ اس کی بے بسی اور بے گناہی کی داستان مجھے رو رو کے سنا رہی تھیں۔ اب تم خود اس کی مجبوری کا سودا کررہی ہو۔ اسے اپنی محفوظ چھت اور آسرا دینے کی اتنی بڑی قیمت وصول کررہی ہو۔ تم اپنی بہترین دوست کو خلوص کا یہ بدلہ دوگی۔''

''تم یہ باز پرس ماما سے کیوں نہیں کرتے۔'' اس نے جان چھڑانی چاہی۔ احسن کے سوال کا یہ مناسب جواب نہیں تھا۔

''یعنی تمہارا اس معاملے میں کہیں کوئی قصور ہی نہیں۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے' صرف اور صرف تم سے محبت کی ہے۔ میرے دل میں کسی دوسری عورت کی گنجائش نہیں۔ تم کیوں ہماری محبت کا بٹوارہ کرنا چاہتی ہو۔'' اس نے دوسرا حربہ استعمال کیا۔ شاید اس پہ کچھ اثر ہوجائے۔

''بٹوارہ محبت کا نہیں رشتے کا ہوگا، گنجائش دل میں نہیں گھر میں نکالنی ہے۔'' بڑا قطعی، مضبوط اور پُر غرور لہجہ تھا۔

''جب رشتہ بنے گا تو محبت بھی ہو ہی جائے گی کیونکہ میں تمہاری طرح ظالم اور سنگدل نہیں ہوں، تمہیں یہ ہٹ دھرمی بہت مہنگی پڑ جائے گی انعم.....''

وہ اسے انگلی اٹھا کے تنبیہ کرتا ہوا شعلہ بار نگاہوں سے گھورتا باہر نکل گیا۔ لمحہ بھر کو انعم کا دل مٹھی میں آ گیا۔ اگلے لمحے وہ یہ سوچ جھٹک کے مسکرا رہی تھی۔ اسے اپنی محبت پر پورا یقین تھا۔

☆☆☆

اگلی صبح بہت خاموش طلوع ہوئی تھی۔ دعا نے ناشتہ بنانا، کچن میں آنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ ان اوقات میں بہت کم کمرے سے باہر نکلتی جب احسن گھر میں موجود ہوتا۔ انعم احسن کی آفس ضرورت کی ہر چیز میز پہ دھر کے خود کچن میں اس کے لیے ناشتہ بنا رہی تھی۔ احسن کی آنکھوں میں کبھی شکوہ اور کبھی غصہ ہلکورے لینے لگتا، وہ اس کی طرف دیکھنے سے بھی گھبرانے لگی تھی۔

وہ اپنے کمرے سے بریف کیس لے کر نکلا۔ لاؤنج میں سے گزرتے ہوئے اس کی نظر ڈائننگ ہال کے کھلے دروازے سے اندر گئی' دل آرا اور انعم مڑ کر اسے دیکھ رہی تھیں۔ وہ دونوں ناشتے کے لیے اس کی منتظر تھیں۔

''میں بریک فاسٹ نہیں لوں گا۔''

وہ ان کی خود پر ٹکی نگاہوں کا مطلب سمجھ گیا۔

''کوئی نیو ریزن دو، پرانا تو میں جانتی ہوں۔'' دل آرا نے دونوں بازو کی کہنیاں میز کی شفاف سطح پر ٹکا ئیں۔

''خاموشی سے بیٹھ کے ناشتہ کرو۔ میں نے شادی کی ڈیٹ فکس کر لی ہے، اگر تم اپنے کسی فرینڈ وغیرہ کو انوائٹ......''

''میں اور انعم ایک دوسرے کے ساتھ بہت خوش ہیں ماما جان!''

''دوسری شادی سے بچنے کے لیے اتنا ڈراما......'' دل آرا طنزیہ ہنسی۔

لفظ ''ڈراما'' نے احسن کے جذبات کو کچل دیا۔

''میں پاپا جان کو کال کروں گا۔ اب وہی آپ کو سمجھائیں گے۔'' اس نے آخری حربے کے طور پر دھمکی دی۔

''جب تک تمہارے دادا زندہ رہے، انہیں مجھ سے یہی شکایت رہی کہ میں نے صرف ایک بیٹے کو جنم دیا۔ وہ اپنے آخری دم تک جنید آفندی کو دوسری شادی کی ترغیب دیتے رہے۔ تمہاری دادی نے ایک عورت ہونے کے ناتے میرا ساتھ دیا، ان کی التجائیں اور وعظ تمہارے باپ کے پیروں کی بیڑیاں بنی رہیں۔ جنید آفندی نے مجھے مجبوراً برداشت کیا، میں ان کی اتنی وسیع اسٹیٹ کو صرف اکلوتا وارث دینے کی مجرم تھی۔ جس کے باپ دادا کا کردار، مجھ پر واضح ہو، میں کیسے پھر سے دھوکا کھالوں۔ تم وارث کے لیے دوسری شادی ضرور کرو گے۔ تمہاری نسل کی سرشت کو میں اچھی طرح سے پہچانتی ہوں، لیکن ایسی اچھی اور خاندانی لڑکی ہمیں نہیں ملے گی۔ مائنڈ اٹ۔''

دل آرا ڈائننگ ہال سے نکلتی چلی گئیں۔ انعم اور احسن ہکا بکا کھڑے تھے۔ وہ دونوں اس ماں کی زندگی کی اتنی تلخ حقیقت سے ناواقف تھے۔

☆☆☆

دعا کے ذہن و دل میں دور تک سناٹا سا پھیل چکا تھا۔ اسے لگتا جیسے وہ کسی اندھیری سرنگ میں موہوم سی روشنی کی امید پر چل رہی ہو۔ اس کے جذبات واحساسات منجمد ہو چکے تھے۔ وہ یوں دوسروں کے اپنے متعلق فیصلے سنتی تھی کہ جیسے یہ سب کسی اور کے متعلق کہا جا رہا ہو۔

''دعا...... دعا......'' انعم اسے ڈھونڈتی ہوئی اندر آئی۔

وہ جو صوفے پر ٹیک ٹکا بیٹھی تھی۔ سیدھی ہوئی۔

''مبارک ہو دعا...... احسن مان گیا ہے۔ تین دن بعد تم دونوں کا نکاح ہے۔''

''مبارک باد تو تمہیں دینی چاہیے الو، تمہاری اور آنٹی کی پلاننگ کامیاب رہی۔'' اس کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔

''میں جانتی ہوں کہ تم دل سے خوش نہیں۔ بٹ بلیوی دعا! تمہارے ساتھ بالکل زیادتی نہیں ہونے جا رہی بلکہ تمہیں ایک مضبوط چھت اور سائبان مل جائے گا، اس گھر میں تم بڑے استحقاق سے رہو گی۔ کوئی اجنبیت فیل نہیں ہوگی پھر تمہیں کسی نہ کسی سے تو شادی کرنا تھی ناں۔ ہم دنیا کے سامنے تمہیں کیسے انٹروڈیوس کرواتے۔ تمہیں بہت سی باتوں اور غلط رویوں کا سامنا کرنا پڑتا اور یہ سب جھیلنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔'' اس کی بات بہت حد تک درست تھی۔

دعا نے سر جھکا لیا۔

''میں تو قسمت کے ہاتھوں کھلونا ہوں۔ میری خوشی اور ناخوشی کی پروا نہ کرو۔''

''جب شادی ہو جائے گی تب تم سے پوچھوں گی کہ اب بتاؤ میں نے تمہارا فائدہ سوچا تھا یا نقصان......'' وہ بولتی ہوئی باہر نکل گئی۔

''فائدہ، وہ بھی میرا...... اچھائی میرے ساتھ، لکی اور میں...... سب بہت متضاد ہے۔'' اس نے خود کلامی کی۔

☆☆☆

رابعہ احمد بہت برا خواب دیکھ رہی تھیں۔ عمر بہت دگرگوں حالت میں ان سے التجا کر رہا تھا۔ اس کے کپڑے پھٹے پرانے تھے وہ انتہائی لاغر اور کمزور لگ رہا تھا۔ رابعہ احمد کا سارا جسم پسینے میں شرابور تھا۔ وہ بہت اذیت میں مبتلا سر کو دائیں سے بائیں مار رہی تھیں کہ یک دم اٹھ بیٹھیں۔ آنکھیں پھٹی اور ہونٹ وا تھے۔ تکیے کے پاس پڑا دوپٹا اٹھا کے چہرے، گلے اور گردن سے پسینہ صاف کیا۔ چپل پیروں میں اڑس کے، محتاط نگاہ سوئے شوہر پر ڈال کے، آہستگی سے دروازہ کھول کے باہر نکل گئیں۔ وہ عمیر کے کمرے کی طرف گئی تھیں۔

''ماما جان، آپ اس وقت خیریت، پاپا جان ٹھیک ہیں۔'' اس کے ذہن میں پہلا خیال ان ہی کا آیا۔

''سب ٹھیک ہے۔'' وہ کہتی ہوئی اندر آ گئیں۔

عمیر ان کے پیچھے تھا۔

''عمیر...... عمیر...... میں نے...... بہت برا خواب دیکھا ہے۔'' وہ بتاتے ہوئے رو دیں۔

''میں نے عمر کو بہت اذیت اور بری حالت میں دیکھا۔ وہ رو رو کے مجھے مدد کے لیے پکار رہا تھا۔''

''آپ وہم مت کریں ماما جان! وہ ٹھیک ہوگا۔'' اسے کچھ نہ کچھ تو کہنا تھا۔

''نہیں ہے وہ ٹھیک عمیر! میرے دل پر جو بیت رہی ہے وہ تم نہیں جانتے۔''

''اگر میں مر جاتا ماما جان......'' عمیر کے لبوں پہ بے ساختہ یہ سوال آیا۔

''اللہ نہ کرے عمیر۔'' انہوں نے تڑپ کے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

''آپ میرے اس سوال کا جواب دیں ماما جان کہ اگر عمر کی گولی سے میں مر جاتا تو کیا...... تب بھی آپ اسے معاف کر دیتیں...... روز اس کی راہ دیکھتیں۔'' وہ آنکھوں میں جلن اور تپش لیے اپنے سوال پر ہٹ دھرمی سے قائم تھا۔

انہوں نے ایک لمحے کو اپنا دل ٹٹولا تھا۔

''نہیں عمیر......! میں اسے کبھی معاف نہ کرتی...... کبھی نہیں۔''

''دعا بھی مر چکی ہے ماما، اس کی ذمہ دار آپ ہیں یا عمر۔''

عمیر کا دل اور اس کے دماغ کی رگیں پھٹنے کے قریب تھیں۔ مگر رابعہ احمد کا ذہنی مدار عمر کے گرد ہی گھومتا رہتا تھا۔ وہ ابھی تک جانب دار تھیں۔

رابعہ احمد اسے ساکت و منجمد کئی لمحے گھورتی رہیں۔ عمیر کے الفاظ دماغ پر کسی برچھی کی مانند لگ رہے تھے۔ ان کے ذہن سے عمر اور برا خواب نکل چکا تھا۔ وہ الٹے قدموں باہر کی طرف دوڑیں۔ عمیر نے بیڈ پر گر کے اپنے سر کے بال نوچ لیے۔

☆☆☆

دل آرا اور انعم مطمئن تھیں۔ کسی لمحے انعم کا دل

ڈوب سا جاتا، لیکن وہ بہت کمزور سا لمحہ ہوتا۔ اس کی ہمت اور طاقت دل آرا تھیں۔ وہ ان کی موجودگی اور احسن کی خود سے بے تحاشا محبت کو محسوس کرتی خود کو حوصلہ دیے ہوئے تھی۔

کل نکاح تھا' پرسوں دل آرا کی واپسی کی فلائٹ تھی۔ وہ دونوں لاؤنج میں بکھیڑا پھیلائے بیٹھی تھیں۔ احسن جان بوجھ کر معمول سے ہٹ کر سات بجے داخل ہوا۔

"میں نے تمہیں کہا تھا احسن کہ آج کے دن چھٹی کر لو یا پھر جلدی آ جانا، مجھے تمہیں بازار لے کے جانا ہے۔" دل آرا نے اسے دیکھتے ہی لتاڑنا شروع کر دیا۔ تب ہی ستا ہوا چہرہ لیے دعا آ گئی۔

"جی آنٹی! آپ نے بلوایا تھا۔"

احسن نے ایک نگاہ غلط آنے والی پر ڈالی۔ جس کا سر جھکا ہونے کی وجہ سے وہ چہرہ دیکھ نہ پایا۔ آواز کا بھاری پن محسوس کر لیا گیا۔

"ہاں آؤ دعا! ذرا یہ شوز تو پہنو دیکھو فٹ ہیں تمہیں۔" انہوں نے خالی صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ بے دلی سے بیٹھ گئی۔ انعم نے ڈبے میں سے ایک جوتا نکال کے اس کے پیر کے آگے رکھا۔

"میں چینج کرنے جا رہا ہوں۔" تب سے انعم نے ایک بار بھی اسے نہیں دیکھا تھا۔ اس کا اس اعتنائی پر خون کھول رہا تھا۔ اس نے بہ آواز بلند خاص طور پر اسے ہی مطلع کیا۔

"جلدی سے فریش ہو کے آ جاؤ، پھر چلتے ہیں۔" دل آرا نے اس کے پاؤں میں جوتے کا سائز بغور دیکھا۔

"فار گاڈ سیک! مجھے کہیں نہیں جانا، نہ ہی کسی قسم کی خریداری کی، مجھے ضرورت ہے۔" وہ خاصا چڑ گیا۔

دعا کے دل کو کچھ ہوا۔ وہ بھی تو یہ چاہتے ہوئے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ چکی تھی۔

"تو کل کیا پہنو گے؟" دل آرا کی وہی رٹ۔ وہ اتنے اطمینان سے کہہ رہی تھیں جیسے اس کی پہلی شادی ہو۔ انعم مسلسل ہاتھ کے ناخنوں کو گھور رہی تھی۔ دعا نے جھٹکے سے برانڈڈ جوتے سے پیر کو آزاد کیا۔

"وارڈ روب بھری پڑی ہے کپڑوں سے، انعم کوئی سا بھی نکال دے گی۔ فی الحال میں بہت تھک چکا ہوں۔" دھیما پڑتے ہوئے اس نے انعم کو گھورا۔ جو اس کے غصے سے خائف نظریں چرائے ہوئے تھی۔

"ماما جی' شوز بالکل فٹ ہیں۔" انعم نے شوہر کی نگاہوں کی تپش چہرے پر محسوس کر کے موضوع بدل دیا۔

"زیورات بھی دکھاؤ نا......" دل آرا نے کہنے کے ساتھ ہی ایک بڑا ڈبا اٹھا لیا۔ وہ جو کف اڑاتا اپنے روم کی طرف جانے لگا تھا۔ پھر سے رک گیا۔

"یہ دیکھو احسن! پورے تیس تولے زیور بنوایا ہے میں نے۔" انہوں نے دعا کو سنایا۔

"کیوں، صرف تیس تولے کیوں......؟ اس نے "صرف" پر زور دیا۔ دعا تب سے پیروں کو گھورنے پر اکتفا کیے ہوئے تھی جیسے یہ ساری گفتگو کسی اور کے متعلق ہو۔ خاموش۔

"انعم کو تو آپ نے اسی تولہ ڈالا تھا۔ خاندانی بھاری بھر کم زیورات الگ سے اسے تحفتاً دیے تھے پھر اس کے ساتھ زیادتی کیوں کی جا رہی ہے۔" احسن کا لہجہ طنزیہ تھا۔ وہ ماں کے پُرجوش ہونے سے چڑ رہا تھا۔

انعم کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"احسن! تم دعا کو، مجھ سے کمپیئر کر رہے ہو۔" انعم مسلسل نفی میں سر ہلاتی بے یقینی و دکھ سے شوہر کو دیکھے جا رہی تھی۔ اب نظریں چرانے کی باری احسن کی تھی۔

"تم اور دعا' اس حقیقت کو کبھی مت بھولنا کہ انعم نہ صرف خاندانی بیوی بلکہ اس گھر کی اکلوتی بیٹی بھی ہے۔ دعا ہمیں دس وارث دے کے بھی، بانجھ انعم کے مقابلے پر نہیں آ سکتی۔ جو محبت اور حیثیت ہمارے دل اور گھر میں انعم کی ہے۔ اس کی جگہ کبھی دعا کو نہیں ملے گی۔" دل آرا نے اتنی سختی اور قطعی لہجے میں علی الاعلان یہ سب کہا کہ احسن خاموش رہ گیا۔ انعم

کے جلتے دل پر ٹھنڈی پھوار برسی۔ البتہ دعا کا دل اور موڈ نارمل تھا۔ اسے کسی کے بھی دل اور گھر میں جگہ نہیں چاہیے تھی۔

"مجھے نیند آ رہی ہے آنٹی! باقی سب میں بعد میں دیکھ لوں گی۔" دعا بڑی سادگی سے کہتی اٹھ گئی۔

وہ ان تینوں کی گفتگو کے بیچ مس فٹ تھی۔ اس نے زیورات پر ایک نگاہ غلط بھی نہ ڈالی البتہ انعم نے بڑے غور سے اس کے چہرے کو کھوجا تھا۔

☆☆☆

چھٹی کا دن تھا۔ گیارہ بج گئے تھے۔ عروہ اور زین ناشتہ کر کے اپنے باپ کے ساتھ ویڈیو گیم کھیل رہے تھے۔ الیاس احمد اب چھٹی کا دن مکمل طور پر بچوں کے ساتھ گزارتا۔

"صاحب جی...... تبریز صاحب آئے ہیں۔" ملازم نے آ کر اطلاع دی۔ الیاس احمد نے والیوم کم کیا۔ تب ہی لاؤنج کا دروازہ کھول کے وہ داخل ہوئے۔ مریم بھی کچن سے دیکھتی ہوئی نکل آئی۔ بچے ماموں کو دیکھتے ہی ویڈیو گیمز چھوڑ کے بھاگے۔

"ماموں جان...... ماموں جان......" دونوں بیک وقت چیختے ہوئے ان سے چمٹ گئے۔

"کیسے ہو میرے پیارے بچوں۔" انہوں نے دونوں کو ساتھ لگا کے چوما۔

"السلام علیکم! بھائی صاحب......" مریم بھی آگے بڑھی۔ انہوں نے پہلے کی طرح اسے ساتھ لگایا۔

"وعلیکم السلام!" وہ مسکرا رہے تھے۔ مریم نے محسوس کیا کہ ان کے ہنسنے میں پہلے جیسی گرم جوشی مفقود تھی۔

"بیٹھیں نا بھائی صاحب۔" الیاس احمد صوفے کی طرف بڑھا۔

"آپ کے لیے گرم لاؤں یا ٹھنڈا......" مریم آداب میزبانی نبھانے کو کھڑی تھی۔

"نہیں...... کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔ تم تو میری طبیعت کے اپس اینڈ ڈاؤن سے واقف ہو۔ بس میں تمہاری امانت تمہیں لوٹانے آیا ہوں۔"

تبریز ملک نے عذر تراشتے' مناسب الفاظ میں منع کر دیا۔ ان کا لہجہ اور انداز بالکل نارمل تھا، لیکن پھر بھی دونوں کو کچھ چبھ رہا تھا۔

مریم ہاتھ مسلتی ان کے برابر بیٹھ گئی۔ انہوں نے میز پر دھری فائل کھولی اور بہن کی طرف بڑھائی۔

"یہ لو مریم......"

"یہ کیا ہے؟" اس نے ٹھٹکتے ہوئے فائل پکڑی۔

"اچھی طرح سے پڑھ لو اور الیاس احمد کو بھی پڑھوا کے تسلی کر لو۔ یہ تمہارے حصے کی جائیداد کے پیپرز ہیں۔ ساتھ ہی ہماری کل جائیداد اور پراپرٹی کی فہرست اور بینک بیلنس کی ڈیٹیل الگ ہے۔ میں نے پورے انصاف اور ایمانداری کے ساتھ 1/3 حصہ تمہارے نام منتقل کر دیا ہے۔ دو لاکھ چھیاسی ہزار تمہارے مزید بنتے تھے۔ وہ میں نے تمہارے اکاؤنٹ میں جمع کروا دیے ہیں۔ کاٹن مل جس پر الیاس کی شروع سے نظر تھی' وہ بھی تمہارے حصے میں آئی ہے۔ اس کے علاوہ اگر تم لوگوں کو کچھ غلط یا کمی د بیشی لگتی ہے تو مجھ سے کہہ سکتے ہو۔"

انہوں نے الیاس اور مریم کے منہ پر بڑے زور کا طمانچہ مارا تھا۔ مریم سے تو سر ہی نہیں اٹھایا جا رہا تھا۔ الیاس کی حالت اس سے بھی بری تھی۔

"ہم آپ سے معافی مانگ چکے ہیں بھائی صاحب۔" وہ منمنایا۔

"معافی کا بھلا کیا ذکر؟ پھر یہ جائیداد مریم کا حق ہے جو اسے جلد یا بدیر ملنا ہی تھا۔"

"مجھے مزید شرمندہ مت کریں بھائی صاحب، میں تو پہلے ہی آپ کے سامنے سر اٹھانے کے قابل نہیں...... مجھے یہ سب نہیں چاہیے۔" مریم نے فائل پرے کھسکا دی۔

"مریم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے بھائی صاحب! اب مجھے بھی اس سب کی ضرورت نہیں۔ میں شرمندہ

ہوں۔ میری غلط حرکتوں کی وجہ سے آپ بہن بھائیوں کا رشتہ بھی خراب ہوا۔" الیاس نے بھی دھیمے پن سے اپنے جرم کا اعتراف کرلیا۔

"نہیں الیاس! یہ میری بہن کی امانت اور اس کا حق ہے۔ جو میں کبھی بھی رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ ہاں، میں تھوڑا لیٹ ضرور ہوا ہوں۔" وہ کہتے ہوئے کھڑے ہوگئے۔ مزید بحث فضول تھی۔

"تھوڑی دیر تو رک جائیں۔" وہ بھی کھڑی ہوگئی۔ وہ اپنے بھائی کی عادات، سنجیدگی اور چہرے کے اتار چڑھاؤ سے واقف تھی۔

"چلتا ہوں، پھر کبھی آیا تو ضرور بیٹھوں گا۔" وہ بہن کے سر پر دست شفقت رکھ کے باہر نکل گئے۔ وہ صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھی رہ گئی۔ الیاس یاسیت سے اسے دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆

بیوٹیشن نے صرف سوا گھنٹے میں اس کا رنگ و روپ بدل ڈالا تھا۔ ڈارک میرون کلر کا کامدار لہنگا جو سفید باریک نگوں اور موتیوں کے کام سے مزین تھا۔ سفید نگینوں کا ہیل والا جوتا۔ ایک کلائی میں بھاری دو کنگن، دوسری میں چھ سونے کی چوڑیاں، سونے کا بھاری سیٹ، اس کا مکمل بار سنگھار کیا گیا تھا۔ اس نے بلا چوں و چرا اس کیے بیوٹیشن کی ساری ہدایات پر عمل کیا۔ وہ بار بار آنکھوں میں امڈنے والے آنسوؤں کو اندر دھکیلتی، خود پر جبر کیے ہوئی تھی۔

"دیکھیں، خود کو۔" اس کی شاگرد نے پیروں میں سینڈل پہنا دیے تھے۔ بیوٹیشن نے اسے سہارا دے کے کھڑا کیا اور سیدھا رخ شیشے کی طرف موڑ دیا۔

دعا نے نہ چاہنے کے باوجود بھی خود کو آئینے میں دیکھا۔

"دلہن اگر دل سے خوش ہو تو روپ بھی جم کے آتا ہے۔" اس نے کسی عزیز کی شادی میں کسی بزرگ عورت کو کہتے سنا تھا۔ آج اتنے برس بعد اپنے روپ کو دیکھ کے اس کے ذہن میں یہ الفاظ گونج گئے۔ وہ تو دل سے راضی نہیں تھی پھر اس پر اتنا جم کے روپ کیسے آیا تھا۔

"انہوں نے کوئی اسکن ٹریٹمنٹ بھی نہیں لی پھر بھی کتنی پیاری لگ رہی ہیں۔"

بیوٹیشن آہستہ سے اپنی شاگرد سے مخاطب تھی۔ آواز اتنی آہستہ نہیں تھی کہ دعا سن نہ پاتی۔

"دعا ریڈی ہے۔" بہت مصروف سی دل آرا آن پہنچیں۔ اس پکار پر وہ اپنے حواسوں میں لوٹ آئی۔

"جی میم......" بیوٹیشن اپنا سامان سمیٹ رہی تھی۔

"دعا...... یو آر لکنگ سو گارجیس۔" بے اختیار ہی ان کی زبان سے تعریف کر گئی۔

وہ اس کے سجے روپ سے کئی لمحے نظریں نہ ہٹا پائی تھیں۔ انہوں نے اتنی خوب صورت دلہن، اتنا حسن کبھی کسی پر نہیں دیکھا تھا۔ ان کے دل کو تاسف اور پریشانی نے مل کر گھیرا۔ انہوں نے پندرہ روز قبل کپڑے دھونے والی نئی ماسی رکھی تھی۔ اسی ماسی سے بات کر کے اس کے محلے کی اس بیوٹیشن کو بلوایا گیا تھا۔ ان کے دل کے کسی کونے میں چور تھا۔ دلہن بنی سجی سنوری دعا کا پہلا روپ احسن کے دل میں کھب نہ جائے۔ اسی لیے چھوٹے سے محلے کی پارلر والی کو بلوایا گیا تھا۔ مگر ان کی یہ کوشش بھی ناکام رہی تھی۔

ان کا دل پہلی بار تیزی سے دھڑک اٹھا تھا۔ انعم بھی خوب صورت تھی، لیکن دعا کے حسن میں سادگی بھولپن اور چہرے پر الوہی سی چمک تھی وہ اسے انعم سے نمایاں کرتی تھی۔ اس کا حسن ہی انہیں کھٹکا تھا جو مرد کے دل کی کمزوری ہوتا ہے۔

"ماما جی...... کہاں رہ گئی ہیں...... دعا تیار نہیں ہوئی۔" انعم باہر سے بولتی ہوئی آ رہی تھی۔

اس نے ریڈ اور گولڈن کلر کی بھاری کامدار ساڑھی زیب تن کی تھی۔ ڈائمنڈ سیٹ گلے کی زینت بنا ہوا تھا۔

وہ اس شہر کے مہنگے ترین پارلر سے بن سنور کے لوٹی تھی، مگر دعا پر پہلی نگاہ پڑتے ہی انعم کی بھی وہی

حالت ہوئی جو دل آرا کی تھی۔ دل آرا خود پر کنٹرول پا چکی تھیں اور اب انعم کو ٹرانس میں جاتا نہیں دیکھ سکتی تھیں۔

وہ بیٹی تھی، اس کے مقابل سوتن کھڑی تھی۔

"انو، چلو دعا کو پکڑو، باہر لے کر چلیں۔ سب ویٹ کر رہے ہیں۔" انہوں نے جان بوجھ کر اونچا بولتے اسے بہت سی متضاد کیفیات سے کھینچ نکالا۔

"ہوں......" وہ ہلکا سا چونکی۔ دعا ان ماں بیٹی کا ارتکاز دیکھ کے سر جھکا گئی۔

انعم کا دل اور جوش بیٹھ سا گیا۔

اس نے دائیں طرف سے لہنگا اٹھایا اور دل آرا نے بائیں طرف سے بازو اور لہنگا پکڑا۔

لاؤنج میں احسن اپنی بڑی پھپھو، پھوپھا، بڑی خالہ اور ان کے صاحبزادے کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ان تمام لوگوں کی موجودگی میں بھی خاموشی تھی۔ پھپھو اور خالہ ایک دوسری سے منہ جوڑے محو گفتگو تھیں۔

دل آرا کو ان دونوں خواتین پر اعتماد تھا۔ اس لیے جنید آفندی کے بجائے انہیں اعتماد میں لیا گیا تھا۔ وہ بھی احسن کی دوسری شادی کے حق میں تھیں۔ دعا کو لا کے احسن کے برابر بٹھا دیا گیا۔ احسن کا سر جھکا تھا۔

"نکاح شروع کریں۔" دل آرا نے سب پر ایک نگاہ ڈال کے سنگل صوفے پر بیٹھے مولوی صاحب کو دیکھا۔

انعم کا دل کسی نے مٹھی میں لے لیا۔ وہ بیٹھ رہی تھی، مگر بیٹھ نہ پائی۔ دعا کا دل کسی تیز جھکڑ میں پھنس گیا۔ انعم کی دلی کیفیات بہت بری اور ناقابل فہم تھیں حالانکہ وہ کئی روز سے خود کو ان لمحات کے لیے تیار کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں پانی جمع ہونے لگا۔ وہ دبے قدموں چلتی لاؤنج کی گلاس وال کے قریب جا رکی۔

دل آرا نے بڑی دکھ بھری نظروں سے اسے جاتا دیکھا۔ میز پر نکاح کا رجسٹر دستخط ہونے کے لیے رکھا گیا۔ انعم نے نم آنکھوں سے مڑ کر دھندلے منظر کو دیکھا۔ تب ہی احسن نے بھی اس کی تلاش میں نگاہ دوڑائی۔ لمحہ بھر کے لیے نظر سے نظر ملی۔ انعم رخ پھیر گئی۔

"سائن کرو احسن۔" دل آرا کے لہجے میں کرب تھا۔

اس شراکت پر رویا تو بعد میں بھی جا سکتا تھا۔ انہوں نے بہت دقتوں سے اپنے آنسوؤں کو حلق میں اٹکالیا۔

"بس تھوڑا سا انتظار......"

وہ ماں کا قلم والا ہاتھ نظر انداز کرتا ہوا اٹھ گیا۔

وہ اس عورت کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جو خود کو کٹھ پتلی ثابت کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ وہ کئی برس سے اس کی متاع جاں اور متاع حیات تھی۔

یہ وہ عورت تھی جس سے اس نے ماں کے بعد سب سے زیادہ محبت کی تھی۔ بچپن سے لے کر آج تک بلا شرکت غیرے وہ اس کی محبت، چاہت و التفات کی حق دار تھی۔ بے ریا اور بے غرض محبت۔

"انو......" اس کی پکار میں دل و جاں کی اذیت سنی جا سکتی تھی۔

اس کی آنکھوں میں ٹھہرے آنسو گالوں پر لڑھک گئے۔ وہ مڑ نہ پائی تھی۔

"اس رجسٹر پر سائن کرنے کے بعد ہماری محبت، چاہت، رشتہ اور بھروسا...... سب کچھ دو حصوں میں بٹ جائے گا۔"

وہ جانتا تھا کہ وہ سن رہی ہے۔ اس نے اپنے طور پر آخری کوشش کی تھی۔ مرد ہونے کے باوجود اس نے اپنی انا، خودداری، عزت نفس اور "میں" کو یکسر بھلا کے، اپنی محبت کو بچانے کی خلوص نیت سے آخری کوشش کی تھی۔

صوفوں پر براجمان پھوپھی اور خالہ ماتھے پر تیوریاں ڈالے پہلو بدل رہی تھیں۔ انہیں اس گھر میں انعم کی اتنی اہمیت کبھی نہ بھائی تھی۔ وہ دل آرا کے بروقت فیصلے پر خوش تھیں۔

"یہ حصے داری مجھے بہت تکلیف دے رہی

ہے۔" اس نے پوری سچائی سے اپنی حالت زار بیان کی۔ وہ ٹشو سے گال صاف کرتی پلٹی۔

"ابھی بھی بہت دیر نہیں ہوئی، ایک بار کہہ کے تو دیکھو۔" اس کی آنکھوں کی زمین گیلی ہونے لگی۔ انعم نے گردن موڑ کے ماں کو دیکھا جن کی آنکھوں میں لاتعداد اندیشے وہ اتنے فاصلے سے بھی پڑھ سکتی تھی۔

"تمہیں پتا ہے ہماری شادی کے بعد ماما نے کینیڈا میں ہمارے بے بی کے لیے شاپنگ اسٹارٹ کر دی تھی۔ اس کے چھوٹے چھوٹے کپڑے، ٹوائز، کاٹ، فیڈر، سوئیٹر، سومنی تھنگز جو وہ سب کچھ اسٹور میں لاک کر چکی ہیں۔ اب تمہیں اس اسٹور کا لاک کھولنا ہے احسن!"

وہ ہنس رہی تھی۔ احسن کا جی چاہا کہ وہ اس کے منہ پر زور سے ہاتھ رکھ دے۔

"تمہاری چاہ ہر چاہ پر بھاری ہے انو......" وہ ابھی بھی ہمت نہیں ہارا تھا۔

"اچھا چھوڑو اس فضول بحث کو۔ سب تمہارے منتظر ہیں۔ آ جاؤ۔"

وہ اسے بازو سے پکڑ کے سب کے درمیان لے جانے لگی وہ ابھی بھی انعم کے ساتھ گھسٹتا اسی کو دیکھ رہا تھا۔ جو سنجیدگی سے ناک کی سیدھ میں چل رہی تھی۔

☆☆☆

احسن نکاح نامے پر دستخط کر کے فوراً اٹھ کے کہیں چلا گیا تھا۔ انعم کو سر اور طبیعت بہت بوجھل محسوس ہو رہی تھی۔ دل آرا مہمانوں کو پورچ تک چھوڑنے گئی تھیں۔ ان کے واپس آنے تک وہ صوفے پر ڈھے سی گئی۔ دعا دوسرے صوفے پر بیٹھی تھی۔

"آر یو فائن۔ انعم......" وہ اس کے تھکے انداز سے بھانپ گئی۔

"پلیز ماما کو بلواؤ......" وہ رو دینے کو تھی۔ تب ہی دل آرا ساڑھی کا پلو سنبھالتی اسی طرف آتی نظر آئیں۔

"آنٹی جی! انعم کو دیکھیں۔" وہ خود بھی اٹھ کے اس کے پاس گئی۔

"انعم...... کیا ہوا......؟" ان کے اوسان خطا ہو گئے۔

"ماما جی...... میرا سر گھوم رہا ہے۔" اس نے مضبوطی سے سر کو تھام رکھا تھا۔

"اچھا اٹھو، اندر جا کے لیٹو، میں ڈاکٹر کو کال کرتی ہوں۔" دعا نے ان کے ساتھ مل کے اسے کھڑا ہونے میں سہارا دیا۔

"بشریٰ...... بشریٰ......" انہوں نے ملازمہ کو زور سے آواز دی۔ وہ بھاگم بھاگ پہنچی۔

"انو میری جان، تمہارا جسم ٹھنڈا ہو رہا ہے۔" انہیں مزید تشویش ہوئی کیونکہ جب بھی انعم کوئی ٹینشن لیتی اس کا بی پی ہائی ہو جاتا تھا۔

"اس لڑکے کو بھی ابھی غائب ہونا تھا۔" وہ احسن کی غیر موجودگی کو کوس رہی تھیں۔

"شاید مجھے ریسٹ کی ضرورت ہے پھر بہتر فیل کروں گی۔" وہ بمشکل پاؤں اٹھا پا رہی تھی۔

"دعا! تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ ڈونٹ وری۔ میں انعم کو دیکھ لیتی ہوں۔" وہ ملازمہ کے ساتھ اسے اندر لے جانے لگیں۔

دعا اپنی جگہ پر جمی کھڑی سوچ رہی تھی کہ اس کا بیڈ روم کون سا ہے کیونکہ انہوں نے ابھی تک اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ اسے شادی کے بعد کس روم میں شفٹ ہونا ہے۔

آدھی رات بیت چکی تھی۔ سڑکوں پر ٹریفک کا زور کافی حد تک ٹوٹ چکا تھا۔ وہ بونٹ سے ٹیک لگائے شرٹ کے کف موڑے، ماتھے پر بل ڈالے کھڑا تھا۔ اس نے یوں ہی سر اٹھا کے آسمان کی طرف دیکھا۔ تاروں بھرا آسمان اس نے مایوسی سے سر جھکا کے بالوں کو زور سے جکڑا۔ آنکھیں زور سے بند کر کے کھولیں اور فرنٹ سیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ گھر تو اسے بہرحال جانا ہی تھا۔

☆☆☆

انعم کا بی پی واقعی ہائی تھا۔ ڈاکٹر نے اسے دوا دے دی تھی اور انجکشنز لگائے تھے۔ جب تک وہ نیند کی آغوش میں نہ اتر گئی دل آرا اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہیں۔ دن بھر کی تھکی ماندی وہ بھی تکیے سے کمر ٹیکے نیند کی آغوش میں اتر گئیں۔ ہڑبڑا کے اٹھیں تو آدھی رات بیت چکی تھی۔ وہ انعم پر بھرپور نگاہ ڈال کے اطمینان کرتیں اس کے اوپر ٹھیک سے کمبل ڈالتی باہر آ گئیں۔

احسن صوفے ـــــــ کی پشت سے سر ٹیکے آنکھیں موندے پڑا تھا۔ وہ اسے دیکھ کے ٹھٹک کے رک گئیں۔

"احسن......!" انہوں نے اس کی نیند کے خیال سے آہستہ سے پکارا۔

"جی......" اس نے فوراً گردن سیدھی کر لی۔ اس کی آنکھیں سرخ اور چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔

"تم نے اپنی حالت کیوں خراب کر لی ہے۔" انہیں اسے دیکھ کے زیادہ غصہ آیا۔

"بہتر ہوں میں، ٹھیک ہوں، کچھ نہیں ہوا مجھے۔" وہ فوراً اٹھ کے ان کے قریب سے گزرتا چلا گیا۔

"شاید تم بھول رہے ہو۔" دل آرا کے جملے نے اس کے بڑھتے قدم روک دیے۔ "دعا تمہاری منتظر ہے۔" ایک تکلیف دہ یقین دہانی۔

"آں...... ہاں سوری...... رئیلی سوری۔" وہ سر جھکائے دعا کے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ انہوں نے اس بھرپور مرد کو تاسف سے دیکھا اور نفی میں سر جھٹکا۔ وہ جو سکڑی سمٹی بیٹھی تھی دروازہ کھلنے پر یک دم سیدھی ہو گئی۔ احسن اس سجے ہوئے وجود کو بیڈ کے وسط میں مجسم انتظار دیکھ کے حیران رہ گیا۔ اس کے خیال کے مطابق اسے سو جانا چاہیے تھا۔

وہ اس پر طائرانہ سی نگاہ ڈال کے واش روم کی طرف بڑھ گیا۔

دل آرا نے ہی دعا کو آ کے اس کا انتظار کرنے کو کہا تھا اور اگر وہ ایسا نہ بھی کہہ کر جاتیں تب بھی وہ اسی طرح بیٹھی رہتی۔ نکاح کا اقرار کرتے ہی اس کے دل کی کیفیت عجیب سے رنگ میں ڈھل گئی تھی۔ اپنی زندگی کے اس اہم واقعے کی کوئی تو خوش گوار یاد ہونی چاہیے تھی۔ اس لیے وہ خود بھی دلی رضا سے اس کا انتظار کرنا چاہتی تھی۔

اب جب رشتہ بندھ گیا تھا تو انحراف کیونکر ممکن تھا۔ بیس منٹ شاور لے کر وہ خود کو کافی بہتر محسوس کر رہا تھا۔ وہ تولیے سے بال رگڑتا باہر آیا تو دعا ابھی تک اسی پوزیشن میں جم کے بیٹھی تھی۔ تولیہ اسٹینڈ پہ لٹکا کے وہ آئینے کی طرف بڑھ گیا۔ بالوں میں برش پھیرتے ہوئے اس کا دھیان سر جھکائے وجود میں اٹکا رہا۔ "آدھی سے زیادہ رات گزر گئی ہے۔ تم بھی چینج کر لیتیں۔" اس کا لہجہ سرسری تھا۔

"میرا خیال ہے کہ مجھے آپ کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔" اس نے صاف گوئی سے جواب دے دیا۔

وہ متضاد کیفیات کا شکار اس کے قریب بیٹھ گیا۔ دعا نے تھوڑا سا چہرہ اوپر اٹھایا۔ احسن نے اسے دیکھا تو بنا پلک جھپکے دیکھتا ہی رہ گیا۔ اتنا مکمل اور خوب صورت سراپا، انعم کا شمار بھی خوب صورت لڑکیوں میں ہوتا تھا، مگر اس کی چھب ہی نرالی تھی۔ حسن معصوم بھی تھا اور پاکیزہ بھی۔ دعا اس کے گہرے ارتکاز کی تپش سے پگھلتی سر جھکا گئی۔

"جب اتنے گھنٹے انتظار کیا ہے تو اب جی بھر کے دیکھ تو لینے دو۔" اس کا انداز والہانہ تھا۔ اسے قدرت کی کاریگری پر رشک آ رہا تھا۔

دعا کا دل ہتھیلیوں میں دھڑکنے لگا۔ وہ کوئی دل پھینک قسم کا مرد نہیں تھا۔

"سوری یار...... یہ رشتہ بہت ناخوش گوار ماحول میں جڑا میں تمہاری رونمائی کے لیے کوئی تحفہ بھی نہ لے سکا۔" اسے اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوا۔ جو بھی تھا اس لڑکی کے بھی جذبات تھے۔

"کوئی بات نہیں......" اس نے بے دلی سے کہا، لیکن دل میں کچھ ٹوٹ سا گیا تھا۔

''ہرگز نہیں دعا! جو تمہارا حق بنتا ہے۔ وہ تم ڈٹ کے لو۔ اپنا حق وصولنا اور فرض ادا کرنا سیکھو۔'' وہ اسے کیا پڑھا رہا تھا۔ اس کی پریشان نگاہوں نے پہلی بار اپنے محرم کا طواف کیا۔

''جی...... میں سمجھی نہیں۔''

اس نے حنا سے محروم دعا کا سفید مرمریں ہاتھ تھام لیا۔ ''غور سے سنو دعا! میری پوری زندگی پر صرف دو عورتوں کی اجارہ داری رہی ہے۔ پہلی میری ماں اور دوسری انعم۔ میں ان دونوں سے واقعی بہت محبت کرتا ہوں اور میں نہیں چاہتا کہ میں ان دونوں کی محبت میں اندھا ہو کے کسی تیسری عورت کا حق غصب کروں۔ ہم دونوں کو ہماری مرضی اور خواہش کے بنا ایک دوسرے کی زندگی کا ساتھی بنا دیا گیا ہے، لیکن ہمیں سب کچھ بھلا کے، ایک دوسرے کو اختیار دینا ہے۔ نکاح ایک بہت ہی مقدس بندھن ہے۔ ہم پر اس رشتے کا احترام واجب ہے۔'' اس نے خاموشی کا وقفہ لیا۔

اس کا حرف بہ حرف دعا کے دل پر پوری جزئیات سے لکھا جا رہا تھا۔ وہ واقعی ایک فرض شناس مرد تھا، مگر وہ اس رشتے کے حوالے سے بہت سی کٹھنائیوں کو سوچے ہوئے تھے۔

''میں جھوٹ نہیں بولتا اور اگر تم چاہتی ہو کہ ہمارا یہ رشتہ تاابد قائم رہے تو امید کرتا ہوں تم بھی کبھی جھوٹ کو اپنی بیساکھی نہیں بناؤ گی۔ اپنا دفاع خود کرنا سیکھو۔ میں ہمیشہ حق اور سچ کا ساتھ دوں گا۔'' وہ سانس لینے کو رکا۔

وہ دو کشتیوں کا مسافر بن کے کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کرنا چاہتا تھا اسی لیے وہ انعم اور دل آرا کو اس اقدام سے باز رکھنا چاہتا تھا۔

''تمہیں کچھ پوچھنا ہے۔'' وہ اسے کچھ الجھی ہوئی لگ رہی تھی۔ اس پر یک دم سے بہت سی باتوں، رویوں اور حالات کا بوجھ آ گیا تھا۔

''آپ انعم سے بہت محبت کرتے ہیں، اسے بہت مان ہے اپنی محبت پر......'' احسن کی ساری یقین دہانیوں پر وہ ڈانوا ڈول تھی۔ کیا وہ انعم سے کوئی بدلہ لینے والا تھا۔

''میں تم سے محبت نہیں کرتا، مگر اس رشتے کو پورے انصاف کے ساتھ نبھاؤں گا۔ بھروسا رکھو محبت بھی ان شاء اللہ ہو ہی جائے گی۔ مجھ پر جتنا حق انعم کا حق ہے۔ اتنا تمہارا بھی ہے۔ بس یا کوئی اور وہم یا خدشہ......''

اس کی مسکراہٹ بڑی جان دار اور حوصلہ افزا تھی۔

''فی الحال اتنا ہی کافی ہے۔'' وہ بھی سب بھلا کے دھیما سا مسکرا دی۔

اس کے مان اور تحفظ نے اس کا سارا بوجھ ختم کر دیا تھا۔ اس کو یقین آ گیا تھا کہ اس زندگی میں اس کے حصے کی بھی بہت سی خوشیاں ہیں۔

☆☆☆

دواؤں کے زیر اثر سوئی ہوئی انعم کی آنکھ چار بجے کے قریب کھلی تھی۔ اس نے حسب معمول دائیں طرف ہاتھ مارا، وہ جگہ خالی تھی۔ اس نے ہڑبڑا کے آنکھیں کھول دیں۔ چپل پیروں میں اڑستی، بال سمیٹتی وہ اندھا دھند باہر کو بھاگی۔ حواس باختہ سی لاؤنج میں ادھر ادھر دیکھتی وہ دعا کے کمرے کی طرف دوڑی۔ دروازہ بجانے کے لیے اس نے ہاتھ اٹھایا، لیکن یہ بہت بدتہذیبی ہو جاتی' اس کا ہاتھ پہلو میں گر گیا۔

اس نے سر دروازے سے ٹیک دیا۔ وہ کتنی بےبس اور لاچار تھی۔ اس کا سر مسلسل بل رہا تھا۔ ایک رات میں ہی اس کا سارا حوصلہ جواب دے گیا۔ اس کا شوہر اور محبت دو حصوں میں بٹ گئی تھی۔ رات بھر وہ کسی دوسری کے ساتھ تھا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی لاؤنج کے صوفے پر جا گری۔ اپنے بیڈروم میں جانے کو اس کا دل نہیں مانا تھا۔

دل آرا اپنے کمرے میں ہی نماز ادا کرکے، تسبیح پڑھتی پھر سے لیٹ گئیں۔ آٹھ بجے ان کی دوبارہ آنکھ کھلی تو انہیں چائے کی شدید طلب ہو رہی تھی۔ لاؤنج میں صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے

آڑی ترچھی لیٹی انعم کو دیکھتے ہی وہ اس کی طرف لپکیں۔

''انعم...... انعم جان اٹھو...... یہاں کیوں سو رہی ہو۔'' انہوں نے اسے کندھے سے پکڑ کر ہلکا سا جھنجوڑا۔

''کیا ہوا؟ دن چڑھ گیا۔ احسن اٹھ گیا۔'' اس نے آنکھیں ملتے اپنے اس برے خیال کو دہرایا۔

''آٹھ بج چکے ہیں اور احسن ابھی تک نہیں اٹھا۔ مگر تم کیوں یہاں پڑی ہو۔'' انہوں نے اس کے عمل کی وضاحت مانگی۔

''میں احسن کو جگاتی ہوں، وہ آفس کے لیے لیٹ ہو رہا ہے۔'' وہ انہیں کوئی جواب دینے کے بجائے اس کے کمرے کی طرف دوڑی۔

''سنو...... سنو تو......'' دل آرا آوازیں دیتی اس کے پیچھے تھیں۔ وہ پورے زور سے دروازہ دھڑ دھڑانے لگی۔

''تم تو لگتا ہے دروازہ توڑنے کے ارادے سے آئی ہو۔'' دعا دروازہ کھول کے بڑی سنجیدگی سے بولی۔

''میں نے سوچا تم گہری نیند میں ہو گی۔'' اسے ملکے تاسف نے گھیرا، اگلے لمحے وہ دعا کو ایک طرف دھکیلتی اندر داخل ہو چکی تھی۔ دل آرا بھی پہنچ چکی تھیں۔ دعا نے شکایتی انداز میں انہیں دیکھا۔

''احسن...... احسن۔'' اس نے زور سے تکیہ کھینچا۔

''کیا ہے یار، سونے دو۔'' احسن نے بند آنکھیں بمشکل وا کرکے اسے دیکھا۔ اس کی آواز پہ غنودگی طاری تھی، پھر سے منہ پر بازو رکھ لیا۔

''آفس نہیں جانا۔'' انعم کو یاد تھا، کل اسے کتنی مشکل سے چھٹی کروائی گئی تھی۔

''نہیں جانا، رات میری ٹھیک سے نیند پوری نہیں ہوئی، اب سونے دو پلیز۔'' وہ واضح طور پر بےزار ہوا۔

دعا سب کچھ نظر انداز کرکے، آئینے کے آگے کھڑی اپنے بال سلجھانے لگی۔

انعم نے غصے سے اس کے چہرے سے بازو ہٹایا۔ احسن نے اس حملے پر آنکھیں کھول دیں، اس کے ماتھے پر لاتعداد بل تھے اور آنکھیں بے تحاشا سرخ۔

''بدتمیزی نہیں کرو انعم، احسن کی طبیعت ٹھیک نہیں، تم چلو میرے ساتھ، ناشتا کرو۔''

دل آرا موقع کی نزاکت بھانپ گئیں۔ شاید وہ ان دونوں سے ناراض تھا۔ وہ اب مزید کوئی ایکشن نہیں لے سکتی تھی۔ اس لیے چپ چاپ ان کے ساتھ باہر نکلنے لگی۔ اس نے آخری نظر بے نیازی بال سلجھاتی دعا پر ڈالی۔ وہ اسے بہت بری لگ رہی تھی۔

☆☆☆

مریم بہت پژمردگی سے رات کا کھانا ٹیبل پر لگا رہی تھی۔ دو گھنٹے قبل تبریز ملک یہ ملک چھوڑ گئے تھے۔ ائیرپورٹ جاتے ہوئے رستے میں انہوں نے مریم کو مطلع کیا تھا۔ وہ اس سے ملنے نہیں آئے تھے اور نہ ہی اسے اپنے گھر بلوایا تھا۔

اس کا دل بھائی کی بے اعتنائی پر خون کے آنسو رو رہا تھا۔ میز پہ کھانا لگا کے وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

''بچوں! خاموشی کے ساتھ اپنی اپنی پلیٹیں صاف کرو، پھر پاپا آپ کے ساتھ مل کے کارٹون فلم دیکھیں گے۔'' وہ بچوں کو پیار سے پچکارتے، ان کا دھیان بٹا کے، وہاں سے ہٹا۔

وہ منیہ پر ہاتھ رکھے ایک نقطے پر نگاہیں جمائے اکڑوں بیٹھی تھی۔

''مریم......'' اس نے قریب جا کے ہاتھ تھام لیا۔

''پلیز الیاس...... لیو می الون...... جائیں کھانا کھائیں۔'' اس نے نگاہ غلط ڈال کے رخ پھیر لیا۔

اس شخص نے اس سے سب کچھ چھین لیا تھا۔

اس نے تو اپنے نقصان کا تخمینہ بہت کم لگایا تھا۔

''آئم سوری ..... میں ہی اس سب کا ذمہ دار ہوں، میری وجہ سے تمہارا ہر رشتہ چھوٹ گیا۔ میں نے

"بہت برا کیا۔" اس کا یہ اعتراف اس کے زخم مندمل نہیں کر سکتا تھا۔

"اب ان باتوں کا کیا فائدہ، تمہارے یہ کھوکھلے الفاظ میرا دکھ نہیں بانٹ سکتے، جتنا غلط ہو گیا، وہ پھر سے کبھی درست نہیں ہوگا۔ تم ایک بے رحم اور ظالم شخص ہو۔"

وہ اس کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھی، لیکن آنسوؤں پر اس کا اختیار نہیں رہا تھا۔

"تم نے کبھی مجھے بیوی چھوڑ ایک عورت ایک انسان تک کا درجہ نہیں دیا۔ ہمیشہ میری ہر صحیح بات اور مشورے کو رد کیا۔ ہزاروں بار مجھے پاؤں کی جوتی پکارا۔ میں نے جو اکلوتی اور اتنی نازوں پلی تھی، کبھی اپنے بھائی صاحب سے تمہاری شکایت نہیں کی، وہ جب بھی پوچھتے، میں ہنس کر سب اچھا کہہ کے ٹال دیتی۔ اور تم نے کیا، کیا؟ میری بارہ برس کی ریاضتوں پر بارہ دن میں پانی پھیر دیا، میرا بھرم چکنا چور کر دیا۔ میرے معذور بھائی نے خودکشی کر لی۔ ایک معصوم اور یتیم لڑکی پر شرمناک الزام لگا، اسے دربدر کر دیا۔ تمہارے اس سب کیے کی سزا مجھ اکیلی کے حصے میں آ گئی۔" وہ پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔

"میں تمہارے کس کس جرم کی پردہ پوشی یا تمہیں معاف کروں اور اپنے کس کس دکھ پر روؤں۔" اس کی ہچکی بندھ گئی تھی۔ وہ زار و زار روتی بہت اجڑی اور بکھری سی لگ رہی تھی۔

الیاس احمد کے پاس معافی تلافی اور اعتراف گناہ کے تمام الفاظ کمتر اور ہیچ تھے۔

"مریم......" اس نے مریم کے کاندھے پر ذرا سا ہاتھ رکھا۔ جو اس نے فوراً جھٹک دیا۔

"پلیز الیاس، چلے جاؤ میرے پاس سے، میری اولاد، میرے پاؤں کی بیڑیاں ہیں، ورنہ تم جیسے شخص کا ساتھ مجھے ہرگز قبول نہیں۔ تھکا دیا ہے مجھے اس رشتے نے، تم بہت برے شخص ہو...... بہت برے۔"

وہ گھٹنوں میں منہ چھپائے رو رہی تھی۔ وہ اپنے وجود کو گھسیٹتا اٹھ گیا۔

☆☆☆

دل آرا کو آج واپس جانا تھا۔ صد شکر کہ انعم میں اتنی عقل تھی کہ اس نے احسن کے معمولی سے غصے کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے یا رونے دھونے کی بجائے خود کو سنبھال لیا تھا۔ لیکن اس کا دل احسن کی طرف سے خاصا برا ہو گیا تھا۔

وہ آئینے کے سامنے کھڑی بال بنا رہی تھی۔ جب وہ سو کے اٹھا، فریش ہو کے سیدھا اس کے پاس آیا۔

"انو! زبردست سا ناشتا لگواؤ۔" وہ ڈریسنگ کے ساتھ جڑ گیا۔ "آج کا ناشتا اور لنچ اسپیشل ہونا چاہیے۔ کیونکہ ماما جان کا آخری لنچ ہے۔ جانے اب وہ کتنے ماہ بعد چکر لگائیں۔"

اس نے بولتے ہوئے انعم کے بالوں کو کھینچا، وہ پونی ٹیل بنا رہی تھی۔ اس کا سارا دھیان آئینے میں خود پر مرکوز تھا۔

"پلیز ڈونٹ ٹچ می احسن۔" وہ بدک کر دور ہٹی۔ ماتھے پر حسب عادت سینکڑوں بل تھے۔

"اس بدتمیزی اور روڈ بی ہیویر کی وجہ پوچھی جا سکتی ہے۔" اسے انعم کی حرکت خاصی بری لگی تھی۔

"اپنی بدتمیزی کے بارے میں کیا خیال ہے، یا مکر جاؤ کہ نیند میں منہ سے کچھ الٹا سیدھا نکل گیا۔" وہ غصے سے چیخ رہی تھی، دل چاہتا تھا کہ اپنا ہی سر پھاڑ ڈالے۔

"اب تم اوور ری ایکٹ کر رہی ہو۔ میں نے اپنے پورے ہوش و حواس اور واضح الفاظ میں بتا دیا تھا کہ مجھے آفس نہیں جانا، میری طبیعت ٹھیک نہیں۔" اس نے بہت ضبط سے اپنی صفائی دی۔

"مجھے تمہارے کسی ایکسکیوز کی ضرورت نہیں۔"

"میں تم سے ایکسکیوز نہیں کر رہا۔" اس نے غلط فہمی دور کی۔ "اور پلیز ...... تم بھی چھوٹی سی بات پہ ایشو کری ایٹ مت کرو۔" وہ خاصی حد تک سنجیدہ ہو چکا تھا۔ اسے بے موقع انعم کا بات بڑھانا خاصا برا

لگا تھا۔

"چھوٹی اور معمولی سی بات؟ تم نے اس دعا کے سامنے میری انسلٹ کی، تم اسے معمولی سمجھ رہے ہو۔" وہ حیرت سے مرنے کو تھی۔ احسن کی چھٹی اسے ہضم نہیں ہوئی تھی۔

"یہ دعا ہمارے بیچ میں کہاں سے آ گئی، تم اپنے لڑائی جھگڑے اور بدگمانیوں کے بیچ میں اسے مت گھسیٹو۔ اس کی اتنی جرات کبھی نہیں ہوگی کہ وہ ہمارے ذاتی معاملات میں اپنی رائے دے سکے۔ تم سب کچھ خود سے فرض کیے بیٹھی ہو۔" وہ غصے سے جھنجلانے لگا تھا۔

"میں......تو......"

"پلیز انو، ماما جان واپس جا رہی ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ ہمارے اس بے بنیاد جھگڑے سے آزردہ ہو کے ان کا سفر برا کٹے، میں باہر ناشتے پہ تمہارا ویٹ کر رہا ہوں۔"

وہ اسے ہاتھ اٹھا کے مزید بولنے سے روکتا ہوا اور اسے مناسب الفاظ میں تنبیہہ کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ جب کہ انعم کا بس نہیں چل رہا تھا کہ سارا کمرہ توڑ پھوڑ ڈالے۔

☆☆☆

عمیر نے وکیل سے میٹنگ کر کے، عمر سے ملاقات کا ٹائم لے لیا تھا۔ دعا جس حال میں بھی تھی آنکھوں سے اوجھل تھی۔ انصاف کرنے والی ذات اللہ تعالیٰ کی تھی۔ اس سے ماں کی دگرگوں حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔

ریاض احمد سے وہ دوست سے ملنے کا کہہ کر جیل آیا تھا۔ چند منٹ کی تاخیر کے بعد جس عمر کو اس کے سامنے والی کرسی پہ لا کے بٹھایا گیا۔ وہ عمر احمد تو نہیں تھا، ہاں اس کے نین نقوش وہی تھے۔ قد کاٹھ اور ہاتھ پاؤں کی ساخت پر بھی عمر احمد کا گمان گزرتا تھا۔ شیو بڑھی ہوئی، آنکھیں خاصی اندر کو دھنسی، ہونٹ پپڑی زدہ، آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے، سفید رنگت زردی مائل تھی۔ خاصے میلے کپڑے، کنپٹیوں پر بڑھے ہوئے بال گرے تھے۔ وہ پہلے سے کافی کمزور ہو گیا تھا۔

"کیوں آئے ہو یہاں؟ میری بے بسی کا تماشا دیکھنے۔" اسے عمیر کی اتنی گہری محویت تازیانے کی طرح لگ رہی تھی۔

"نہیں، تم ایسا کیوں سوچنے لگے۔" عمیر نے نوٹ کیا کہ اس کے لہجے میں پہلے جیسی گونج مفقود تھی۔

"تو پھر کوئی نئی امید دلانے آئے ہو۔" اس نے بے بسی سے ہنکارا بھرا۔

"فی الحال تو نہیں، مگر وعدہ کرتا ہوں تمہیں جلد لینے بھی آؤں گا۔"

"کیا میرے گناہوں کی سزا ختم ہو گئی، میں نے کبھی کسی کے ساتھ اچھا نہیں کیا، ہر رشتے کے لیے دکھ کا باعث بنا، میں سب کچھ کرتا، مگر الیاس چاچو کے دیے گئے لالچ میں نہ آتا۔"

"دیر آید درست آید، تمہیں اپنی غلطیوں کا احساس ہو گیا ہے۔"

"ماما جان کیسی ہیں؟ مجھے یاد کرتی ہیں۔"

"ملاقات کا وقت ختم ہو گیا ہے۔" سپاہی نے آواز لگائی۔ عمر فوراً کھڑا ہو گیا، عمیر نے بھی اس کی تقلید کی۔ عمیر چند لمحے اس بجھے اور بدلے ہوئے شخص کو دیکھتا رہا۔

"کوئی بھی تمہیں نہیں بھولا۔ ماما جان، نوال، میں اور نہ ہی......" اس نے لمحہ بھر کا توقف کیا۔ "پاپا جان......سب تمہیں یاد کرتے ہیں۔"

"ماما جان کو میرا سلام کہنا...... اور......" وہ جھجک کے خاموش ہوا۔ "اور پاپا جان کے ہاتھوں پر میرے لبوں کا بوسہ دینا۔"

وہ آنسوؤں کو اندر دھکیلتا، گیلے لبوں سے جملہ پورا کرتا تیزی سے واپسی کے لیے مڑ گیا۔ عمیر نے بہت یاسیت سے چھوٹے بھائی کو دیکھا۔

☆☆☆

دل آرا گلاسز بالوں میں اٹکائے، جھولا نما

بیگ بازو میں لٹکائے جانے کو تیار، پورچ میں کھڑی تھیں۔ واپس جانا ان کی مجبوری تھی۔ انعم کی جلد باز طبیعت کے پیش نظر وہ کچھ عرصہ مزید قیام کرنے کی خواہاں تھیں۔ مگر ایسا ممکن نہیں تھا۔

''انعم! میری جان وقت اور حالات بدل گئے ہیں۔'' دل آرا نے اس کا ہاتھ تھام کے سہلاتے ہوئے بات کا آغاز کیا۔

صبح اٹھتے ہی جو اس نے پہلی حرکت کی تھی، وہ انہیں بھی خاصی ناگوار گزری تھی۔ وہ اسے سرزنش کرنے کے بجائے نظر انداز کر گئیں۔

''تم ہماری خاندانی بہو اور بیٹی ہو۔ ہم بڑوں کا سایہ کسی مجبوری کے تحت تم لوگوں کے سر پر نہیں ہے۔ مگر ہمارے بعد یہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ تم گھر اور رشتوں کو جوڑے رکھو۔ کسی بھی مسئلے پر چیخنے چلانے یا غصہ کرنے سے قبل اسے جانچ لو۔ رشتوں کو بُردباری سے برداشت کرنا سیکھو اور جو برداشت نہ ہو اس پہ صبر کا گھونٹ بھر لو۔''

انہوں نے بہت چُن کے مناسب الفاظ میں اسے سمجھایا تھا، تا کہ اسے ان کے لہجے سے کسی کی طرف داری کی بو نہ آئے۔ وہ اس نہج پر پہنچ چکی تھی کہ طرف داری تو وہ احسن کی بھی برداشت نہیں کر پاتی تھی، جو وہ کہہ دیتی یا سوچ لیتی اسے وہی ٹھیک لگتا۔

''یہ میرا گھر، میرا محبوب شوہر اور دعا میری عزیز سہیلی ہے، لیکن پھر بھی ماما جی! آج پہلی بار مجھے آپ کے دور ہونے سے بہت ڈر محسوس ہو رہا ہے، پلیز آپ یہیں شفٹ ہو جائیں، مجھے آپ کی رہنمائی اور سہارے کی ہر قدم پر ضرورت ہے۔ میں اکیلی سنبھال نہیں پاؤں گی۔'' احسن کی صبح والی خفگی کا اثر تھا روہانسی ہو رہی تھی۔

''بس ایک بار تمہارے پاپا جی کو دادا ابا بننے کی خوش خبری مل لے، وہ سب چھوڑ چھاڑ کے پاکستان دوڑے چلے آئیں گے، میرا تو خود وہاں سے دل بہت اچاٹ ہے۔ تم لوگوں کو چھونے اور چومنے کو دل ترس جاتا ہے۔'' انہوں نے لگے ہاتھوں اپنا دکھڑا بھی سنا دیا۔

''ماما جی، احسن بدل تو نہیں جائے گا۔'' وہ دل میں آتے اس منفی خیال کو زیادہ دیر ضبط نہ کر پائی۔

''نہیں میری جان...... وہ بھلا کیوں بدلے گا۔ تم یہ ہمیشہ یاد رکھنا کہ اسے دو حصوں میں تقسیم ہم نے اپنی مرضی اور غرض کے لیے کیا ہے۔ تمہاری پوزیشن بے شک اسٹرانگ ہے، لیکن دعا بھی اب اس کی بیوی اور ذمہ داری ہے۔ تم دعا کو بھی خندہ پیشانی سے برداشت کرنا، سب رستے آسان اور ہموار ہوتے جائیں گے۔ بس یہ خیال رہے کہ میرے بچے کو تم دونوں کی وجہ سے کوئی تکلیف یا پریشانی نہ پہنچے۔''

انہوں نے اس کا گال تھپکتے ہوئے اسے نرمی سے سبق پڑھایا۔ وہ اس کی نادان فطرت سے واقف تھیں کہ وہ کتنی جلدی بچکانہ پن پہ اتر آتی ہے۔

''آئی ول ٹرائی مائی بیسٹ۔'' اس نے پھیکا سا مسکراتے ہوئے ہامی بھر لی۔

''بی بریو میری جان۔'' دل آرا نے اس کا ماتھا چوما۔

''چلیں ماما جان۔'' احسن کلائی پر گھڑی باندھتا باہر نکلا۔

''ہاں چلو، لیٹ نہ ہو جائیں۔'' وہ گلاسز آنکھوں پر لگا کے گاڑی کی طرف مڑیں۔

''اللہ حافظ۔'' انعم کے لب پھڑ پھڑائے۔

''اللہ حافظ۔''

احسن دروازہ کھولے کھڑا تھا، وہ بیٹھ گئیں۔ احسن نے مسکرا کے انعم کو ہاتھ ہلایا اور خود بھی گاڑی میں ماں کے ساتھ بیٹھ گیا۔

☆☆☆

ایئر پورٹ سے واپس آ کے وہ سیدھا انعم کے بیڈ روم میں گیا تھا۔ وہ اس کی صبح والی خفگی دور کرنا چاہتا تھا۔ وہ جو صبح سے احسن کی ناراضی اور غصے کو غلط رنگ دے رہی تھی، اب ایک دم سے ہلکی پھلکی ہو گئی تھی۔ وہ دونوں ہمیشہ کی طرح ایک دوسرے کی سنگت میں دنیا جہاں کی باتیں کرنے میں مصروف تھے۔

دوسری طرف دعا کا دل اور چہرہ کملا سا گیا تھا۔ رات جو احسن کا روپ تھا۔ صبح وہ اسے یکسر بدلا ہوا تھا۔ اس نے دن بھر میں ایک بار بھی اسے مخاطب نہیں کیا تھا۔ لنچ ٹیبل پر بھی اس نے ذرا سی نگاہ تک نہ ڈالی تھی۔ شام کو اس نے بے دلی سے نہا کے کپڑے بدلے۔ جب وہ فریش ہو کے بالوں کو ڈھیلا سا کیچر لگا کے باہر نکلی، تب ہی احسن اور انعم بھی کھلکھلاتے ہوئے لاؤنج میں وارد ہوئے۔

اس نے ان دونوں پر ایک گہری نگاہ ڈالی۔ نکاح کے دو لفظوں نے اس کے دل کی دنیا تہ و بالا کر دی تھی۔ وہ خود اپنے جسم و جاں میں دوڑنے والی بے قراری کو سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ وہ نظریں پھیر کے چپ چاپ باہر کی طرف بڑھنے لگی۔

''کہاں جا رہی ہو دعا؟'' احسن نے اس کی نظروں کا ارتکاز اور سنجیدگی پڑھ لی تھی۔

''لان میں، اندر دل گھبرا رہا تھا۔'' اب حال دل اس سے بیان کرنا تھا۔

''تو ہمیں ٹی ٹائم کون کروائے گا۔'' انعم نے اسے مصروف کرنا چاہا۔ اس کے دل کی گھبراہٹ کا بیان اسے بالکل فضول لگا تھا۔

''کیا لیں گے آپ دونوں۔'' وہ بہت پژمردگی سے مڑ کر تابعداری سے پوچھ رہی تھی۔

''بٹ انو! میرا دل تو تمہارے ہاتھ کے مزے دار نگٹس اور قیمے والے کباب کھانے کو چاہ رہا ہے۔ مجھے چھٹی کا پروٹوکول ملنا چاہیے۔'' احسن نے چہرے پر خاصی مسکینیت طاری کر لی۔

انعم اس کی چالاکی پکڑ نہ پائی۔ لیکن اسے دعا کے ساتھ تنہا چھوڑنے پر تاؤ آنا لازم تھا۔

''او...... کے...... ایز یو وش......'' وہ اپنی زبردستی کی مسکراہٹ میں اندر کا ابال چھپا گئی۔ وہ احسن کی فرمائش رد نہیں کر سکتی تھی۔

''میں اور دعا باہر تمہارا ویٹ کر رہے ہیں۔ جلدی آ جانا۔'' اس نے ڈائریکٹ دعا کو ساتھ چلنے کو نہیں کہا تھا۔ ساتھ ہی اسے بھی بڑی محبت سے جلدی آنے کا کہہ کر فکر مندی جتائی تھی۔

''اتنی اداس کیوں ہو؟''

دعا اس سے دو قدم پیچھے تھی۔ جب اس نے احسن کے منہ سے غیر متوقع جملہ سنا۔

''پتا نہیں۔'' اپنے دل کی بدلتی حالت زار کو وہ خود سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ اس سے کیا شیئر کرتی۔

''اور یہ دل کیوں گھبرا رہا تھا۔'' وہ بڑی اپنائیت سے احوال پوچھ رہا تھا۔ وہ اب لان میں آ گئے تھے۔

''دعا! میں تمہیں جتنا جانتا ہوں اس کے مطابق تم بہت بریو اور جینئس لڑکی ہو، تمہاری فطرت میں صبر کا مادہ بھی بہت زیادہ ہے۔ تم انعم کے مزاج سے واقف ہو۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ تمہیں ڈسٹرب کرے یا پھر مجھے لے کر تم دونوں کے بیچ کوئی جھگڑا ہو۔''

اس نے دعا کے لیے کرسی کھینچی۔ یہ عمل تو وہ ہمیشہ انعم اور اپنی ماں کے لیے کرتا تھا۔ اپنے ساتھ اس کا یہ پہلا سلوک اور انصاف دیکھ کے، وہ صبح سے لے کر شام تک کا سارا دکھ بھول گئی۔

''میں پوری کوشش کروں گی کہ انعم کو شکایت کا موقع نہ ملے۔ مگر اس کی نیچر بہت جلد باز اور غیر مستقل ہے، جس سے میں خوف زدہ ہوں، وہ بہت جلد تلخ ہو جاتی ہے۔''

وہ صبح سے انعم کے بدلتے تیور اور دن بھر کی خاموشی سے اندازہ لگا چکی تھی۔

''ڈونٹ وری، ہم دونوں مل کے اس انعم افلاطون کو ہینڈل کریں گے۔'' احسن نے قہقہہ لگایا، وہ بھی مسکرا دی۔

''کبھی آپ میری ڈھال بن جانا اور کبھی میں آپ کی ڈھال بن جاؤں گی، یہ رشتہ صبر اور خاموشی سے نبھ ہی جائے گا۔ ان شاء اللہ۔''

اس نے اپنے ساتھ کا اسے بھرپور یقین دلایا۔

"تم ہمیشہ مسکراتی ہوئی میری سامنے آیا کرو، ورنہ مجھے گلٹ رہے گا کہ تم میری وجہ سے اداس اور پریشان ہو۔" احسن نے بھی اپنے رشتے کا حق جتایا۔

دعا کا دل خوشی و مسرت سے بلیوں اچھلا۔

"جو حکم سرتاج......" اس نے سر کو خم دیا۔

احسن کو اس ادا پہ بھرپور پیار آیا۔ وہ کھل کے مسکرا دیا۔ دعا کے چہرے پر بھی قوس قزح کے سارے رنگ بکھر گئے۔

☆☆☆

مریم نے پھر سے اپنے گرد خاموشی کا دائرہ کھینچ لیا تھا۔ کچن، بچوں اور الیاس احمد کا وہ ہر کام پوری ذمہ داری سے سرانجام دیتی۔ رات کو وہ بچوں کو سلاتی، خود بھی ان کے کمرے میں سو جاتی۔ الیاس احمد لاؤنج میں ہی بیٹھا ٹاک شو دیکھ رہا تھا۔ جب وہ کچن کا دروازہ بند کرکے بچوں کے کمرے کی طرف بڑھی، وہ پھرتی سے ریموٹ پھینک کے اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کے آگے جا کے جم گیا۔

"پلیز مریم، میرے لیے یا اپنے لیے نہ سہی، دنیاداری کے لیے ہی سہی۔ ملازم روز یہ تماشا دیکھتے ہیں، وہ ہمارے بارے میں کیا، کیا فضول اندازے لگاتے ہوں گے۔"

وہ اس سے بات کرنے اور ساتھ بیٹھنے کو ترس گیا تھا۔ اصل سزا تو اب شروع ہوئی تھی۔ اس کا ذہن بہت تھکا تھکا اور بیمار رہنے لگا تھا۔

"کوئی کچھ نہیں کہے گا، تمہیں لوگوں کی فکر کب سے ہونے لگی، وہ بھی ان لوگوں کی جو تمہاری اصلیت سے اچھی طرح واقف ہیں، سگے رشتوں کے تقدس کو پامال کرتے ہوئے تمہیں ذرا خوف نہ آیا، اب ایروں، غیروں کی فکریں کیوں پالتے ہو۔" اس نے نخوت سے سر جھٹکا۔ اس کی آنکھیں ماتھے پر تھیں۔

"اتنی تلخی مریم، اتنی نفرت......" وہ ٹوٹ رہا تھا۔

"یہ نفرت نہیں، بلکہ میرے اندر کی بے سکونی ہے۔ میرا ضمیر مجھے کچوکے لگاتا ہے۔ کسی پل چین نہیں لینے دیتا مجھے، میں تمہاری باتوں میں آکے بہک گئی۔ ایک معصوم اور یتیم لڑکی کی پاک دامنی پہ انگلی اٹھائی۔ اپنا چھوٹا بھائی بھی کھو دیا۔ اس سب میں تمہارا کتنا نقصان ہوا، تمہارے حصے میں کون سے خسارے آئے۔ میرا بڑا بھائی مجھ سے ناراض ہے، وہی تو میرے میکے کا مان تھا، جو تمہارے لالچ نے مجھ سے چھین لیا۔"

وہ بہت ضبط کرکے اس کے سامنے کھڑی تھی۔ پھر بھی دو آنسو گالوں پر لڑھک گئے۔ وہ رونا نہیں چاہتی تھی۔

"مجھ پر رحم کھاؤ اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دو، تمہارا وجود اور موجودگی میرے لیے دلی تکلیف کا باعث ہے۔" وہ دکھ سہتے سہتے چیخ پڑی تھی۔

الیاس احمد کے پورے وجود کو جیسے کسی نے جلا کے بھسم کر دیا تھا۔ مریم کے الفاظ نے اسے سخت اذیت دی تھی۔ اس کی زبان گنگ تھی۔ وہ اس کے سامنے سے ہٹ گیا۔

☆☆☆

احسن نے کافی کا خالی کپ میز پہ دھرا اور بازو صوفے پر پھیلا کے گردن کو کھنچاؤ دے کے ڈھیلا چھوڑ دیا۔ دعا کا دھیان مکمل طور پر اسکرین کی طرف تھا۔ انعم کافی کا گھونٹ بھرتی گاہے بگاہے نظر احسن پر بھی ڈال رہی تھی۔

"آج تو بہت تھکاوٹ ہو گئی یار، اب تو میں صرف سوؤں گا...... دن بھر فارغ رہ کے فریش ہونے کے بجائے میں تو مزید تھک گیا ہوں۔" اس نے گردن کو دائیں سے بائیں ہلکا سا جھٹکا دیا۔

"چلیں آ جائیں پھر، میں بیڈ شیٹ درست کر لوں، تھکن تو مجھے بھی بہت ہو رہی ہے۔" انعم کپ رکھ کے فوراً کھڑی ہو گئی۔

"صبح آپ آفس چلے جایئے گا، ایک دن کی غیر حاضری سے کروڑوں کا نقصان ہو جاتا ہے۔" وہ بولتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی۔

احسن نے حیرت سے اس کے الفاظ، حرکت

اور اسے جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ کب سے کاروبار کی سدھ بدھ رکھنے لگی۔ وہ اس کے ذومعنی جملے اور حرکت کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ اگر پھر بھی ناسمجھی کا مظاہرہ کرتا تو وہ بھڑک بھی سکتی تھی۔ اس نے ایک شرمندہ سی نگاہ دعا پر ڈالی۔ جو ابھی بھی بڑے انہماک سے ٹی وی دیکھنے میں مشغول تھی، وہ اندازہ نہ لگا پایا کہ وہ سب سن کر انجان بن رہی ہے یا سنا ہی نہیں۔

"تم بھی سو جاؤ دعا۔" اس نے یوں ہی اسے متوجہ کیا۔ وہ جانے سے قبل اپنی غیر موجودگی سے اسے باخبر کرنا چاہتا تھا۔

"ابھی نیند نہیں آ رہی، بس تھوڑی دیر اور، پھر چلی جاؤں گی۔ آپ جا کے سو جائیں۔ صبح آپ پھر ارلی مارننگ اٹھ جاتے ہیں۔" اس کے ہونٹوں پر دھیمی مسکان تھی۔

اس کے چہرے پر ہلکی سی سلوٹ کا شائبہ تک نہیں تھا۔

احسن کا احساس ندامت ہلکا ہو گیا۔ وہ انعم کی طرح ناراض ہوئی تھی نہ ہی منہ ...را تھا۔ بلکہ وہ اس کی مجبوری کو بنا کہے یا جتلائے سمجھ گئی تھی۔

"سنو، صبح میرے لیے ناشتا تم بنانا۔" اس نے کچھ ازالہ کرنا چاہا۔

"جی بنا دوں گی۔" اس نے سعادت مندی سے سر ہلایا۔

"میں ناشتے میں جوس، بریڈ......"

"مجھے علم ہے، آپ ناشتے میں کیا لیتے ہیں۔" اس کے ہونٹوں پر شرمیلی سی مسکان تھی اور نظریں جھکیں۔ احسن کو وہ ایک دم بہت اچھی اور اپنی اپنی سی لگی۔

"گڈ نائٹ......" وہ کھڑا ہو گیا۔ انعم پھر سے چھاپہ مار سکتی تھی۔

"گڈ نائٹ، ود بیسٹ وشز......"

دعا نے اسے خوب صورت سی مسکراہٹ اور دعا کے ساتھ رخصت کیا۔ احسن کو اس کی اعلا ظرفی نے شرمندہ کر دیا تھا۔

☆☆☆

دعا نے ٹی پنک کلر کا جوڑا زیب تن کر رکھا تھا اور آئینے کے سامنے کھڑی اپنے لمبے ریشمی بالوں کو سلجھا رہی تھی۔ نکاح کے وقت اس کے دل میں بہت سے خدشات تھے۔ جب کہ احسن کے حوصلہ افزا رویے نے اسے کافی ہلکا پھلکا کر دیا تھا۔ وہ مکمل طور پر تو نہیں، مگر جتنی بھی خوش تھی، دل سے خوش تھی۔ بالوں کو ڈھیلا سا کیچر لگا کے، اس نے آنکھوں میں کاجل لگایا۔ پھر ساری لپ اسٹکس کھول کے دیکھنے لگی۔

آج اس نے دل آرا کی خریدی گئی ہر چیز کو بہت دل سے دیکھا اور سراہا تھا۔ ان کی پسند واقعی لاجواب تھی۔ انہوں نے ہر کپڑا، رنگ اس پہ کام تک بہت خوب خریدا تھا۔ بیگز، جوتے، کاسمیٹکس، جیولری غرضیکہ ہر چیز بہت معیاری اور اعلا تھی۔

سب سے خوب صورت اور اعلا وہ تھا، جس کے لیے وہ سج رہی تھی۔ جس نے اسے صرف اپنا نام ہی نہیں مان اور تحفظ بھی دیا تھا۔ وہ انعم سے بے تحاشا محبت کے باوجود اس کے حق میں کوتاہی کا مرتکب نہیں ہونا چاہتا تھا۔

اس کا عرصہ سے جلتا دل ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ اس کے سارے دکھ اس کی یادداشت سے غائب ہو گئے تھے۔ وہ بہت عرصے بعد رات پرسکون سوئی تھی۔ خوشی اس کے پورے وجود پر حاوی ہو کے، اس کے چہرے کو عجب سا سکون بخش بنا گئی تھی۔ اس کے ماتھے پر ایک بھی تفکر بھرا بل نہیں تھا۔

اس کے مجازی خدا کے چند جملوں اور وعدوں نے اس کی عزت نفس کو معتبر کر دیا تھا۔ اس مری ہوئی روح میں زندگی کی روح پھونک دی تھی۔

"دعا...... دعا...... کیا کر رہی ہو؟" دروازہ ادھ کھلا تھا۔ وہ بغیر جھانکے پوچھ رہی تھی۔

"آ جاؤ انعم......" اس نے اجازت دی۔ وہ اپنے بالوں کا سامنے سے رول بنا کے پن لگا رہی تھی۔

''کیا ہو رہا ہے۔'' اس کا چہرہ یک رخ تھا۔ وہ دیکھ نہ پائی۔

''سجنے کی کوشش......'' پن لگ گئی تھی۔ اس نے چہرا انعم کی طرف موڑا۔

وہ اپنی جگہ دنگ و ساکت رہ گئی۔ اسے لگا کہ پیروں کے نیچے سے زمین یک دم سے کھسک گئی ہے۔

''سجنے سنورنے کی کوشش......'' اس نے ٹھہر ٹھہر کے چار الفاظ ادا کیے۔ اس کی نظریں دعا کے روپ پر جم سی گئی تھیں۔

''صرف سجنے کی کوشش، سنوارنا تو مجھے احسن نے ہے۔'' بہت اعتماد و یقین سے کہہ کر، وہ انعم کی حالت کا نوٹس لیے بغیر ڈریسنگ پر بکھری سونے کی چوڑیاں کلائی میں ڈالنے لگی۔

انعم کو لگنے والا دوسرا جھٹکا پہلے سے زیادہ شدید تھا۔ کتنے استحقاق سے اس نے احسن کا نام لیا تھا۔ وہ مذاق کر رہی تھی یا پریشان......اس نے بغور اس کا چہرا پڑھا، مگر وہاں تو صرف مسکراہٹ اور ایک الوہی سے چمک پھیلی تھی۔ اس مسکراہٹ نے انعم کے دل کو چیر دیا تھا۔

''اچھی لگ رہی ہوں نا، مجھے تمہاری طرح زیادہ میک اپ نہیں کرنا آتا......بس جتنا آتا تھا' وہی کرلیا۔'' اس نے بڑی معصومیت سے اپنی نااہلی نفس کر بتائی۔

''آہستہ آہستہ سارے ہنر سیکھ جاؤ گی، ابھی بھی کوئی کم تیار نہیں ہوئیں تم، خاصی ''چیز'' لگ رہی ہو۔'' اس نے ''چیز'' کو خاصا دبا کے ادا کیا۔

''اچھا زیادہ کمپلیمنٹ پاس نہیں کرو۔ آئینہ بتا رہا ہے کہ میں کیسی لگ رہی ہوں۔'' دعا اس کی تلخی کا نوٹس لیے بغیر بلاوجہ کھلکھلا دی۔

''اچھا' کیا بتا رہا ہے آئینہ ماہ جبیں میڈم۔'' انعم کو وہ چوڑیاں پہنتی بہت عجیب سی لگ رہی تھی۔

''یہ جو بھی کہے، میں تو احسن کی آنکھوں میں لکھی تحریر پڑھنا چاہتی ہوں۔'' وہ اتنی مسرور مگن تھی کہ بلا ارادہ ہی اس کے منہ سے یہ پھسل گیا یا پھر شاید اس کی دلی خوشی تھی۔

''ایک ہی رات میں، تمہارا عکس احسن کی آنکھوں میں بھی اتر گیا۔'' انعم کے دل پر جیسے تیز دھار چھری پھری، اس کا جی چاہا کہ دعا کا سجا سنوارا روپ نوچ ڈالے۔ اس کا سارا حلیہ بگاڑ کے حشر برا کردے۔

''آنکھوں میں تو اتر گیا، اب دیکھو یہ عکس دل میں کب اترتا ہے۔'' انعم کے اندر کی کیفیت سے انجان اس نے برائے مذاق اسے بلاوجہ چھیڑا۔ وہ کس حد تک پوزیسو ہے، شاید اسے ٹھیک سے اندازہ نہیں تھا۔

''احسن کا دل صرف میرا ہے۔ کسی غلط فہمی میں رہیں تو بہت نقصان اٹھاؤ گی۔''

اس نے دعا کی آنکھوں میں جھانک کے حرف حرف چبا کے ادا کیا۔ دعا کی نئی نئی خود اعتمادی لمحہ بھر کو ہوا ہوئی۔

''لیو اٹ یار، چلو میں تمہارے لیے کافی بناتی ہوں، تمہیں پسند ہے نا میرے ہاتھ کی بنی۔''

دعا نے موضوع بدل دیا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ وہ رقیب نہیں، احسن کی جائز منکوحہ ہے اور اسے آہستہ آہستہ انعم کو بھی یہ سب سمجھانا تھا۔ لیکن ابھی یہ وقت مناسب نہیں تھا۔

☆☆☆

''ماما جان کدھر ہیں؟'' اس نے سارا گھر چھان لیا تھا۔ اپنے کوارٹر کی طرف جاتی ملازمہ کو آواز دے کے روکا۔

''وہ ادھر پچھلے لان میں بیٹھی ہیں۔'' ملازم نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا۔ وہ پچھلے لان میں تنگی بینچ پر بیٹھی ملی تھیں۔ ان کے چہرے پر حزن و ملال پھیلا تھا۔ وہ دکھی دل اور افسوس بھری نگاہوں سے ماں کو دیکھتا رہا۔

''آپ مجھ سے ناراض ہیں۔'' بہت دیر بعد اسے یاد آیا تھا۔ اس کا لہجہ بہت عرصہ بعد بدلا بدلا سا تھا۔

''ہوں......'' انہوں نے طنزیہ ہنکارا بھرا۔

''اب پہلے سا وقت اور حیثیت نہیں رہی میری، جب میں تم لوگوں سے روٹھا کرتی تھی۔'' وہ پھیکا سا مسکرا دیں۔ اس مسکراہٹ کے پیچھے بہت سے کرب چھپے تھے۔

''میں تو......میں تو آپ کا فرینڈ، ہمدرد اور ہم راز تھا۔ آپ کا بہت بہت فرماں بردار بیٹا۔ پھر کیوں......کیوں ماما؟ آپ نے مجھ سے کیوں سب کچھ چھپایا، آپ نے جب جب جو کچھ کہا، میں عمر کو دیتا گیا، کبھی پلٹ کر انکار نہیں کیا، پھر کیوں ماما......کیوں؟'' بہت ضبط کے باوجود بھی اس کی آواز اور آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ یہ سوال وہ پہلے بھی کرچکا تھا۔ یہ سوال اس کے ذہن و دل سے نکلتا ہی نہیں تھا۔

''میں خود غرض ہو گئی تھی۔ صرف عمر کا بھلا سوچنے لگی، لیکن میں یہ بھول گئی کہ ایک ذات اور بھی ہے جو سب کا بھلا کرنے والی ہے۔ اس یتیم و بے یار و مددگار لڑکی کو عمر کا نصیب بناتے بناتے میں اپنا نصیب بگاڑ بیٹھی۔'' سب کی ذات سے پچھتاوے وابستہ تھے۔

''اور عمر......''

''میرا خدا گواہ ہے۔ میں ہرگز عمر اور الیاس احمد کی پلاننگ سے آگاہ نہیں تھی۔'' ان کے چہرے اور آنکھوں سے سچ عیاں تھا۔

''اگر عمر رہا ہو کے آجائے تو کیا آپ اسے معاف کردیں گی۔'' اس نے ماں کی آنکھوں میں جھانکا۔

''پہلے تم اور تمہارا باپ مجھے معاف کردو۔ عمر نے میرے اعتماد کو دھوکا دیا ہے۔ اسے میں اتنی جلدی معاف نہیں کروں گی۔'' ان کا لہجہ قطعی اور حتمی تھا۔

''تو پھر آپ اس کی واپسی کی دعائیں کیوں مانگتی ہیں۔'' اسے ماں کی ممتا پر ٹوٹ کر پیار آیا۔

''وہ بیٹا ہے میرا۔ میں نے اسے اپنی کوکھ سے جنا ہے۔ وہ تکلیف میں ہے، تو مجھے بھی کسی پل چین نہیں۔'' ان کی ظاہری حالت بھی مخدوش تھی۔

''بالکل ٹھیک، بیٹا ہے وہ آپ کا۔ آپ نے اسے جنا ہے۔ میں آپ کو معاف کرتا ہوں، اپنی ہر اس خوشی کے لیے، جو آپ نے مجھ سے چھین کے کسی اور کی جھولی میں ڈالی۔'' اس میں ضبط کا یارا نہ رہا تھا۔ وہ اٹھ گیا تھا۔ وہ اپنی جگہ بے حس و حرکت بیٹھی گود میں دھرے ہاتھوں کو گھور رہی تھیں۔

''اور اپنی اس محبت کے لیے بھی معاف کرتا ہوں، جو آپ نے مجھ سے دور کی۔''

وہ بے جان قدموں کو گھسیٹتا جاتا تھا اور باقی کے تمام گناہ اپنے دل میں معاف کرتا جا رہا تھا۔

''اپنی اس بے چینی و بے قراری کے لیے بھی معافی دی، جو آپ نے میرے ذہن و دل اور روح کو دی ہے۔''

پہلی بار رابعہ احمد کے دل میں خیال گزرا تھا۔

''کیا دعا اس کی خوشی تھی؟'' چند لمحوں بعد وہ زور، زور سے نفی میں سر ہلا رہی تھیں۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

قرۃ العین سکندر

لاہور کے گنجان آباد علاقے میں واقع یہ محلہ صبح کی پہلی کرن کے ساتھ جاگ اٹھا تھا۔ صبح سویرے روایتی ناشتے کی مہک گھروں سے ہی نہیں بعض معروف دکانوں سے بھی اٹھ رہی تھی۔ کریانہ اسٹور کے مالکان نہایت مستعدی سے دکان کھولے جھاڑ پونچھ کے بعد کولڈ ڈرنکس کے کریٹ، گھی کے کنستر اور بچوں کی من پسند اشیا کو ترتیب سے سامنے رکھتے ہوئے اطراف کا جائزہ بھی لیتے جارہے تھے۔ علی الصباح ہی زندگی جاگ اٹھی تھی۔

ریاض صاحب بھی اپنا کریانہ اسٹور کھولنے کے بعد مصروف انداز میں دال، چاول، چینی تول کر گاہکوں کو دے رہے تھے، مگر ان کا ذہن مختلف النوع خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

زہرہ بیگم کی طبیعت کچھ دنوں سے خراب سی رہنے لگی تھی اور ان کی طبیعت کی خرابی کی بدولت ہی آج وہ زہرہ بیگم کو ہلکا پھلکا ناشتا کروا کر دوا دے کر دکان پر بھوکے ہی آ گئے تھے۔ ان کا کچھ کھانے پینے کا دل بھی نہیں چاہ رہا تھا۔

زہرہ بیگم صرف ان کی بیگم ہی نہ تھیں بلکہ اولین محبت بھی تھیں۔ ریاض صاحب کو دوپہر کی اتنی فکر نہ تھی۔ وہ جانتے تھے تب تک سارا محلہ جاگ چکا ہوگا اور پھر سب اڑوس پڑوس والے میل ملاقات رکھتے اور آپس میں محبت سے رہتے تھے۔ زہرہ بیگم نہ صرف محلے کے تمام بچوں کو مفت تعلیم دیتی تھیں، بلکہ اکثر گھروں کی بچیاں قرآن پاک پڑھنے ان کے پاس آیا کرتی تھیں۔ صرف درس و تدریس ہی نہیں کڑھائی، سلائی میں بھی وہ انہیں طاق کردیا کرتی تھیں۔

چھوٹی بچیاں ان کے بے حد منع کرنے کے باوجود بھی ان کے گھر کے بیشتر کام جھٹ پٹ نپٹا دیا کرتی تھیں۔ کمرے کی پرچھتی پر، برتنوں پر ذرا سی گرد لگتے ہی بچیاں ان کو دھو، چمکا کر صاف کرکے سلیقے سے دوبارہ ترتیب سے رکھ دیا کرتی تھیں۔ وہ سبزی کاٹ رہی ہوتی تھیں جب اسٹیل کی چمچماتی پرات میں آٹے کے کنستر سے آٹا نکال کے کوئی فرماں بردار لڑکی آٹا بھی گوندھ چکی ہوتی تھی۔ پھر جب تک وہ سالن کو بھونتی تھیں۔ بچیاں لپک جھپک ان کے آنگن سے پتوں کا ڈھیر چن چکی ہوتی تھیں۔ پھر وہ اپنا سبق دہراتیں سناتیں اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہوجایا کرتی تھیں۔

ان ہی گھروں میں سے ایک بچی عابدہ بھی آتی تھی۔ جو جوانی کی دہلیز پار کرچکی تھی۔ مگر اسے سلائی، کڑھائی کا بالکل بھی کوئی شوق نہ تھا۔ اس لیے زہرہ بیگم اسے اپنے پاس بطور خاص بٹھا کر دیتے کی بیل بنانا سکھاتی تھیں۔ سلائی کے نمونے دکھا کر نت نئے ڈیزائن بنواتی تھیں۔ وہ عابدہ کی واضح بے زاری



کو محسوس کرکے بھی نظر انداز کردیا کرتی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ وہ سلیقہ مندی سے یہ سب سیکھ لے۔

ایک تو اس کی وجہ یہ بھی کہ اس کی والدہ نسرین پورے محلے میں اپنی بدزبانی اور بدکلامی کی وجہ سے مشہور تھیں۔ ان کے دو بچے تھے۔ فیضان اور چھوٹی عابدہ۔ فیضان کی شادی انہوں نے پچھلے سال ہی کی تھی۔ بہو سعدیہ کے گھر آتے ہی ان کی زبان کی تندی و تیزی میں اضافہ ہوگیا تھا۔ وہ منہ بھر بھر کے صلواتیں سناتی تھیں۔ کاموں میں ذرا سی بھول چوک پر معاف نہ کرتی تھیں اور پھر بہو کی اپنے اکلوتے سپوت سے دھنائی کروانے کے بعد بھی تسلی نہ ہوتی تو پھر خود بھی اسے ماں کا طعنہ دینے لگتی تھیں۔

نسرین کی بدزبانی سے پورا محلہ خائف رہا کرتا تھا۔ اہل محلہ سے تو توقع نہ تھی کہ وہ عابدہ کو اپنی بہو بنائیں گے۔ آنکھوں دیکھی بھلا کون نگل سکتا ہے۔ پھر عابدہ کو گھر گرہستی سے رتی برابر رغبت نہ تھی۔ اس کی یہ لاتعلقی اور بے پروائی اس کے لیے اگلے گھر میں پریشانی کا باعث بن سکتی تھی۔ اس کے لیے نسرین نے عابدہ کے انٹر کرتے ہی اس کو مزید تعلیم دلانے کے بجائے سیدھا زہرہ بیگم کے پاس بھیج دیا تھا۔

زہرہ بیگم مٹھاس سے بھرپور لب ولہجہ رکھنے والی ایک پُرخلوص، نفیس سی خاتون تھیں۔ اہل محلہ زہرہ بیگم کے گن گاتے تھے۔ زہرہ بیگم کی بات میں ایسا اثر تھا کہ سب ان کی بات پر بلا چوں چراں' من و عن عمل پیرا ہوا کرتے تھے۔

رمضان عرف رمضو ایک دن شام ڈھلے ان کے گھر آئے تھے۔ زہرہ بیگم اپنے مجازی خدا کے گھر آنے کے بعد اس وقت جلدی سے تازہ تازہ گرما گرم چپاتیاں اتار کر ان کے سامنے رکھ رہی تھیں۔ سرسوں کا ساگ، مکھن اور ساتھ گرم خستہ روٹی، مزا دوبالا کرگئی تھی۔ رمضو جھجک سا گئے تھے۔ انہیں اپنی آمد بے وقت اور گراں محسوس ہونے لگی تھی۔ مگر یہ دونوں میاں، بیوی بے حد شائستہ اخلاق والے تھے۔ ریاض صاحب نے رمضو کو بھی ساتھ بٹھالیا تھا۔

''بھئی زہرہ بیگم اپنے رمضان بھائی کے لیے بھی کھانا لاؤ۔''

زہرہ بیگم نے اسٹیل کی چمچماتی ٹرے میں قرینے سے کھانا سجا دیا تھا۔ تازہ مکھن سے بھری کٹوری، بھاپ اڑاتا گرم ساگ اور گرم ہی چپاتی رومال میں لپٹی ہوئی' ان کے سامنے چند منٹوں میں حاضر ہوگئی تھی۔

بنا ماتھے پر شکن لائے مسکراتی ہوئی زہرہ بیگم پُرجوش انداز میں مہمان نوازی کررہی تھیں۔ لمحہ بھر کے لیے رمضان نے زہرہ بیگم کا تقابل اپنی بیگم سے کیا۔

عالم تصور میں انہوں نے اپنی بیوی کی تیوریاں چڑھی دیکھی تھیں۔ جو اب بسا اوقات نیند میں بھی چڑھی رہتی تھیں اور کمر پر دونوں ہاتھ رکھے جیسے کسی سے جنگ لڑنے کے لیے چوکس ہوں۔

جبکہ زہرہ بیگم خاندانی روایات کی پاسدار تھیں۔ رمضان اپنی بیوی سے ناخوش تھے۔ جبکہ ریاض صاحب کے چہرے پر گہری آسودگی چھائی تھی۔

رمضان آڑھت کا کاروبار کرتے تھے۔ طبیعت میں سادگی کا عنصر نمایاں تھا۔ بیگم کے غصیلے انداز سے واقف ہونے کے باوجود کبھی ٹوکا نہیں تھا۔ نتیجتاً بیگم ان پر بھی اکثر اپنے فیصلے مسلط کرتی تھیں۔ اب تو پانی سر سے گزر چکا تھا۔

نسرین جب بھی بات شروع کرتی تھیں۔ بات کا اختتام گالیوں، طعنوں، تشنوں اور محلے کی ہر گھر کی اندرونی داستان پر ہی ختم ہوتا تھا۔ محلے کے دورے پر نکلنے کی راسخ عادت گھر گھر کی خبر گیری اور مخبری میں معاون و مددگار ثابت ہوئی تھی۔ اب اہل محلہ ان سے منہ چھپاتے پھرتے تھے۔ ہر گھر کی ہم راز جو ٹھہری تھیں اور موقع دیکھتے ہی زبان سے آگ اگلنے لگتی تھیں۔ ہر کسی کو پل بھر میں بے عزت کر ڈالتی

تھیں۔ بے وقعت کرنے کا ہنر کوئی ان سے سیکھتا۔ زبان دانی کے اصل جوہر دکھا کر دوسرے کو شرمندگی کی اتھاہ گہرائی میں دھکیل دیتی تھیں۔

''کیا بات ہے رمضان بھیا، کیا کھانا سواد کا نہیں۔'' رمضان کو گہری سوچ میں دیکھ کر زہرہ بیگم نے ان کی توجہ کھانے کی جانب مبذول کروانا چاہی تھی۔

انہوں نے زیر لب مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا اور رغبت سے کھانے لگے۔

کھانے کے فوراً بعد وہ گرم بھاپ اڑاتی چائے کی پیالیاں لے آئی تھیں۔

''بھابھی! میں اصل میں آپ کے پاس حاضر ہوا تھا۔ میں بے حد پریشان ہوں۔''

رمضان نے ٹھہرے ہوئے لہجہ میں اپنا مدعا بیان کیا، جس کا لب لباب فقط یہ تھا کہ وہ اب عابدہ کو بھی نسرین کے رنگ، ڈھنگ اپناتے دیکھ کر بے حد پریشان ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اب عابدہ زیادہ وقت ادھر زہرہ بیگم کے پاس گزارے، تاکہ اگلے گھر نبھا کر سکے۔

''بھابھی! ہر کوئی مجھ جیسا شریف نہیں جو بیوی کے رنگ، ڈھنگ دیکھ کر بھی چپ کر جائے۔''

رمضان کی بات اپنی جگہ بالکل درست تھی۔ جس سے اختلاف ممکن ہی نہیں تھا۔

''ٹھیک ہے بھیا! آپ عابدہ کو بھیج دیں کل سے۔ میں حتی المقدور کوشش کروں گی کہ اس کو سب گھر گرہستی میں طاق کر دوں۔'' زہرہ بیگم نے ان سے کہا۔ مگر وہ پریشان سے ہو گئے تھے۔

''مگر بھابھی! میں چاہتا ہوں کہ آپ خود ہی کسی طرح اس کام کا آغاز کریں۔ میرے کہنے میں تو نسرین کو ضد ہو جائے گی۔ میں جانتا ہوں، اس نے انکار کر دیا تو بات وہیں ختم ہو جاتی ہے۔'' رمضان کی بات کا اصل مقصد اب وہ بھانپ چکی تھیں۔

قبل اس کے کہ زہرہ کوئی جواب دیتیں، پہلی مرتبہ ریاض صاحب بولے۔

''رمضان برا مت ماننا، قصور! تمہارا بھی ہے۔ یہ مرد ذات اگر عورت جیسے سرکش گھوڑے کو لگام نہ دے تو وہ گھوڑا بے قابو ہو کر دوسروں کو بھی نقصان پہنچا دیا کرتا ہے۔ ایڑھ لگانی پڑتی ہے۔ مگر یہ ایڑھ سختی سے تیزی کی د سُرعت سے نہیں بلکہ محبت سے، اعتماد سے اور اپنائیت سے لگتی ہے۔ جب عورت کو تم خود ہی گھر کی چابی، گھر کی مالکن کا درجہ دے دو تو پھر اسے یہ حق چھیننے اور کسی طرح سے ہتھیانے کی حاجت نہیں رہتی۔''

ریاض کی بات پر رمضان کا سر جھک گیا تھا۔

تاریخ گواہ تھی کہ نسرین سے پہلے اس گدی پر نسرین کی ساس سائرہ براجمان تھیں۔ سائرہ نے ایک دن بھی نسرین کو سکھ کا سانس نہیں لینے دیا تھا اور اب اس کا بدلہ شاید نسرین اپنی زبان کے چابک سے سب سے لے رہی تھیں۔ مگر ان کی زبان کے تیر بسا اوقات خود پلٹ کر ان کے اہل خانہ کو بھی گزند پہنچانے لگے تھے۔ ان کی اسی زبان کی سختی کی بدولت ان کی بیٹی کا رشتہ بھی نہیں طے ہو رہا تھا۔

وہ اپنی دانست میں اب معرکہ سر کر چکی تھیں۔ گھر کی مالکن بن گئی تھیں۔ حتیٰ کہ اپنی بہو پر بھی وہ سارے داؤ پیچ آزما رہی تھیں۔ جو ماضی میں ان کی ساس نے ان پر آزمائے تھے۔ دوسرے لفظوں میں تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی تھی۔

''پھر اب کیا ہوگا بھابھی؟'' مبہم سی امید کے سہارے رمضان نے زہرہ بیگم کو مخاطب کیا۔ اور زہرہ بیگم نے ان سے وعدہ کر لیا کہ وہ ان کا اصل مدعا بخوبی سمجھ چکی ہیں اور اس مسئلے کو حل کر کے ہی دم لیں گی۔

☆☆☆

''سعدیہ کپڑے دھل گئے ہیں کیا؟'' نسرین کی آواز پر سعدیہ بوکھلا کر صحن عبور کر کے راہ داری میں آئی، جہاں مین گیٹ کے قریب کھڑی نسرین کہیں جانے کو پر تول رہی تھیں۔

''جی بس الگنی پر پھیلا ہی رہی تھی۔'' سعدیہ نے پھنسی پھنسی آواز میں جواب دیا۔

وہ جانتی تھی کہ ساس کو ذرا سا را اونچا انداز تخاطب بھی سخت ناپسند تھا۔

''اچھا ٹھیک ہے، میرے آنے تک آلو، گوبھی کاٹ کر سبزی بنا لینا۔ آٹا بھی گوندھ لینا۔'' وہ چادر سر پر اوڑھتی نکل گئی تھیں۔

ان کا رخ سیدھا زہرہ بیگم کے گھر کی جانب تھا۔ زہرہ بیگم نے نہ جانے کیوں آج نسرین کو بلاوا بھیجا تھا۔ نسرین جب گھر کا دروازہ عبور کر کے راہ داری سے اندر صحن میں داخل ہوئیں تو ایک بچی ان کو ڈرائنگ روم کی جانب لے گئی۔ وہ حیرت زدہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں۔ سامنے ہی موجود دو نفیس سی خواتین تھیں۔ عابدہ بھی سر جھکائے بیٹھی تھی اور زہرہ بیگم کے لبوں پر میٹھی سی مسکان سجی تھی۔ وہ نسرین کو ہاتھ کے اشارے سے ایک جانب بیٹھنے کا کہہ کر ان خواتین کی جانب متوجہ ہوئی تھیں۔

''جی ماشاء اللہ...... ہمیں تو بچی بے حد بھائی ہے۔'' معمر خاتون نے عینک ناک پر جماتے ہوئے بے حد ٹھہرے ہوئے لہجہ میں اپنا عندیہ دیا۔

''عابدہ' جاؤ بیٹا! میں نے چولہے پر دال چڑھائی ہے، اسے دیکھو جا کر۔'' زہرہ بیگم نے جان بوجھ کر اسے وہاں سے ہٹا دیا۔ عابدہ بھی سعادت مندی سے وہاں سے اٹھ کر چلی گئیں۔ اب وہ خواتین نسرین کی جانب متوجہ ہوئیں۔

''ماشاء اللہ بہت اچھی تربیت کی ہے آپ نے۔ ہم نے سنا تھا کہ بیٹیاں ماں کا پرتو ہوا کرتی ہیں اور آج دیکھ بھی لیا، اتنا شائستہ لب و لہجہ ہے عابدہ کا اور ہمیں آپ کی بیٹی بے حد پسند آئی ہے۔ میرا ایک ہی بیٹا اور بیٹی ہے۔ یہ بیٹی شادی شدہ ہے اور بیٹا ماشاء اللہ ٹیکنیکل انجینئر ہے اور فرماں بردار ہے۔ آپ کی بیٹی کو ہم بے حد اپنائیت، اور خلوص سے رکھیں گے۔''

نسرین منہ کھولے یہ سب سن رہی تھیں۔

کہاں تو اہل محلہ ان پر ہنستے تھے۔ پیٹھ پیچھے مذاق اڑاتے تھے۔ تضحیک آمیز لب و لہجے ان کے کانوں میں پڑتے تھے اور آج یہ سب؟ وہ اپنی جگہ سُن بیٹھی رہ گئی تھیں۔

''ٹھیک ہے مسز عمر، ہم سوچ کر اپنے فیصلے سے مطلع کر دیں گے۔ آپ چائے پئیں نا۔'' زہرہ بیگم نے ان خواتین کی خاطر مدارت کے لیے پُرتکلف چائے کا اہتمام کیا تھا۔ شامی کباب، مٹھائی، سموسے اور ساتھ میں شیر خورمہ بھی تھا اور یہ ساری چیزیں بازاری نہیں، بلکہ گھر کی تیار کردہ تھیں۔ یہ ہی ان کی اصل خوبی بھی تھی۔

پھر وہ دونوں خواتین مطمئن سے انداز میں وہاں سے رخصت ہوگئی تھیں۔

نسرین لب بھینچے بیٹھی تھیں اور ان کے جانے کے بعد بھی گومگو کیفیت سے دوچار تھیں۔ نسرین ایک ماہ سے عابدہ کے اٹھنے بیٹھنے، بات چیت، ہر شے میں واضح تبدیلی محسوس تو کر رہی تھیں۔ صبح سویرے ہی وہ جاگ کر اپنی بھابھی کی مدد کروانے لگی تھی۔ ناشتا عموماً اب عابدہ ہی تیار کرتی تھی۔ پھر سارے آنگن میں جھاڑ و پھیرتی تھی۔ جھاڑ پونچھ کے بعد ہی وہ ادھر آتی تھی اور پھر ادھر بھی کاموں میں منہمک رہا کرتی تھی۔

واعظ و نصیحت نے اس کی شخصیت پر خوش کن اثرات مرتب کیے تھے۔ اس کی شخصیت صحیح معنوں میں سنور گئی تھی، کھل گئی تھی۔ نسرین کو کچھ کچھ اندازہ تھا۔ مگر آج تو یہ سب دیکھ کر وہ دم بخود رہ گئی تھیں۔

''زہرہ بہن، میں آپ کی بے حد مشکور ہوں۔ یہ سب احسان ہے آپ کا' مجھ کم بخت کی زبان سے سب تنگ تھے۔ اپنی ہی میں کڑھتی اور جلتی، پھر زبان کے جوہر دکھاتی، مگر اندر ہی اندر کلس رہی تھی۔ کوئی بھی میری بیٹی کا ہاتھ تھامنے کو تیار نہ تھا۔ میری بیٹی کا مستقبل داؤ پر لگا تھا۔ کوئی حل نہ ملتا تھا اور اب آج اس کا رشتہ طے ہو گیا ہے۔ محض آپ کی بدولت' میں آپ کی شکر گزار ہوں۔'' وہ زہرہ بیگم کے ہاتھ تھامے بیٹھی تھیں۔ زہرہ بیگم ہنس دی تھیں۔

''امی کھانا پک گیا ہے کیا۔'' جمشید جو ابھی ابھی کالج سے لوٹا تھا۔ اس نے ماں سے کھانے کی

بابت پوچھا۔ جمشید کو دیکھ کر نسرین کی آنکھوں میں چمک سی اتر آئی تھی۔ تب ہی عابدہ سلیقے سے کھانا ٹرے میں لے آئی تھی۔ جمشید نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ عابدہ کے بجے سنورے حلیے پر ڈالی تھی اور کھانا کھانے میں منہمک ہوگیا۔

اگلے دن رشتے والوں کا فون آ گیا تھا۔ ان کو کہیں سے نسرین کی زبان درازی کی سن گن مل گئی تھی۔ رشتہ سے انکار ہو گیا تھا۔ وہ ایسے بدزبان اور بدکلام لوگوں میں رشتہ استوار کرنے کے حق میں ہرگز نہ تھے۔ عابدہ نے شاید دل پر لے لیا تھا۔ دو دن سے نہیں آ رہی تھی اور پھر جمشید نے ماں سے پوچھا۔

''امی! کیا بات ہے، آپ کی وہ شاگرد عابدہ نہیں آ رہی ہے دو دن سے۔''

جمشید کی بات پر زہرہ بیگم بری طرح سے چونکی تھیں اور وہ جو اتنے دنوں سے اندر ہی اندر انسانیت کی معراج کے لیے کچھ نہ کر سکنے کا گہرا ملال لیے تھیں۔ ایک لمحہ میں ہی فیصلہ کر گئی تھیں۔

''ویسے تمہیں عابدہ کیسی لگتی ہے۔'' ماں کے سوال پر جمشید اپنی جگہ جز بز ہوا تھا۔

''یہ کیسا سوال ہے امی؟ اچھی لڑکی ہے۔'' وہ واقعی حیرت سے بولا تھا۔

''میرا مطلب ہے بطور جیون ساتھی؟''

زہرہ بیگم کے اس سوال پر اس نے شرما کر اپنے بالوں میں اپنی انگلیاں پھنسا لی تھیں اور وہاں سے رفو چکر ہو گیا۔ وہ ماں تھیں۔ اپنے بیٹے کے ہر رنگ، ہر انداز سے واقف تھیں اور انہیں اب وہی کرنا تھا جو ان کا فرض تھا۔ وہ مٹھائی ـــــ لے کر نسرین کے گھر کی طرف روانہ ہو گئی تھیں۔ زہرہ کا رشتہ مانگنے تک نسرین بس یک ٹک دیکھتی رہ گئی تھیں۔

''بس اسی جمعہ کو رسم رکھ دیتے ہیں۔'' زہرہ بیگم کی بات پر نسرین نے خوش دلی سے سر ہلایا تھا۔ زہرہ بیگم پھر قصداً جلدی واپسی کے لیے اٹھ گئی تھیں۔ اور وہ خوشی خوشی واپس لوٹ آئی تھیں کیوں کہ انہوں نے ایک اچھا کام کر دیا تھا۔

اچانک گلی کے بیچوں بیچ ان کو یاد آیا کہ انہوں نے اپنا پرس وہاں صوفے پر ہی چھوڑ دیا، جس میں شگن کے پیسے تھے۔ اور گیٹ کھلا دیکھا تو وہ اندر داخل ہو گئیں۔ انہوں نے اندر بڑھ کر بلند آواز میں صدا لگانی چاہی تھی مگر اپنا نام سن کر رک گئی تھیں۔

''زہرہ بہن کو کیسے الو بنایا۔ مجھے معلوم تھا کہ سارے زمانے میں کہیں تیرا رشتہ نہ ہو سکے گا۔ سب کو تجھ میں سو سو عیب دکھائی دینے لگے تھے۔ جو تمہاری زبان درازی کا نہیں بلکہ میری زبان درازی کا نتیجہ تھے۔ مگر میں جانتی تھی کہ بھگتنا اب تجھ کو ہی پڑے گا۔'' یہ نسرین کی آواز تھی جو عابدہ سے ہم کلام تھی۔ زہرہ بیگم صدمے سے دو چار تھیں۔

''اماں یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟'' عابدہ نے حیرت سے پوچھا تھا۔

''بالکل سچ اور رمضان کو بھی میں نے ہی کہا تھا کہ جا کر تجھے بھی وہاں کچھ سکھانے بھیج دینے کی بات کرے، اور رمضو میں اتنا دم کہاں کہ میری بات کو رد کرے۔'' نسرین کی فاتحانہ پُرجوش آواز سنائی دی۔

''امی مگر میں زہرہ آنٹی کو دھوکا نہیں دوں گی۔ انہوں نے مجھے ہمیشہ یہ ہی سبق پڑھایا ہے اور میں واقعی بدل چکی ہوں۔ مکاری، چال بازی اور فریب کا جو سبق آپ دیتی آئی ہیں، اب ان پر خلوص، محبت بھاری پڑ گئی ہے اور میں بے شک بن بیاہی یہاں بیٹھی رہوں، مگر میں اب یہ شادی نہیں کروں گی۔'' یہ ہی وہ ایک لمحہ تھا جو زہرہ کو سرشار کر گیا تھا۔ ان کی محنت رائیگاں نہیں گئی تھی۔

''محبت اپنا آپ منوا ہی لیتی ہے۔ خواہ اس کے لیے کٹھن راستے اپنانے پڑیں اور قربانی و خلوص کا اپنا ایک گہرا رنگ ہوا کرتا ہے جو ہر رنگ پر حاوی ہو جاتا ہے۔'' انہوں نے اندر داخل ہونے کا اپنا ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔ وہ عابدہ کا شرمندہ چہرہ نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ البتہ ان کا ارادہ کہ وہ عابدہ کو ہی اپنی بہو بنائیں گی۔ پہلے سے بھی زیادہ پختہ ہو گیا تھا۔ کیوں کہ انہیں ایک ایسی بہو کی ہی تلاش تھی جو من سے ان کی تعظیم کرے، لفظوں کے جال نہ بنے۔ ان کی نیت کا ثمر ان کو مل گیا تھا۔

☆

نازیہ جمال

تیری مہربانی

صبح ہی صبح شگفتہ پھپھو کا دادی کے لیے فون آگیا تھا۔

"ہیلو اماں! کیا آپ چند دنوں کے لیے میرے ہاں رہ سکتی ہیں۔ میں دراصل ملتان جا رہی ہوں اپنی نند ساجدہ کے پاس۔ حج کی مبارک باد دینے کے لیے۔"

"نہ سلام' نہ دعا۔ نہ دکھوں کی ماری' مجبور و بے کس ماں کی احوال پرسی۔ بس کھٹ سے اپنی غرض پیش کردی۔" دادی نے فوراً "بیٹی کو شرمندہ کرڈالا اور وہ ہو بھی گئیں۔

"سوری اماں! آپ اور ابا کیسے ہیں؟"

"کیا پوچھتی ہو ہم دکھیاروں کا۔ بس زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں۔ صبح کچھ دیر پہلے ناشتے کے نام پر کیا ملا... برائے نام گھی لگا ایک عدد پھلکا' پیالہ بھر سویاں۔ آدھے سے ذرا زیادہ دودھ گلاس کا۔ یہ ناشتہ دیا ہے تمہاری بھابھی نے جو تمہاری صابرہ ماں نے صبر شکر سے کرلیا۔" بولتے بولتے دادی کا لہجہ بھر آگیا تھا۔

"اچھا اماں! تو پھر آپ آ رہی ہیں ناں؟" شگفتہ کو جواب لینے کی جلدی تھی۔

ناولٹ

"نہیں' اگر میں آگئی تو تمہارے بوڑھے باپ کا خیال کون رکھے گا۔ اس کا بستر' دوائیں' پانی۔ بہو رانی تو بس اپنے مرد اور بچوں کی خبر رکھتی ہیں۔ میں نہیں آ سکتی۔" دادی نے صاف انکار کرتے ہوئے موبائل بند کردیا۔

"نگوڑ ماری اولاد' ایک ہی بیٹی ہے' مگر مجال ہے جو ماں کا دکھ کم کرنے کے لیے منہ سے ایک لفظ بھی پھوٹا ہو' بس اپنی غرض کی پڑی ہے۔" وہ غصے سے بڑبڑائیں۔

"نانی آگئیں... نانی آگئیں۔" صحن سے کچھ خوشگوار آوازیں بلند ہوئیں۔ انہوں نے ذرا آگے ہو کر کھڑکی سے جھانکا۔

ان کے پوتے' پوتیاں وفور شوق اور مسرت سے اپنی نانی جان سے لپٹے جا رہے تھے۔ وہ بے حد بدمزہ ہو کر پیچھے ہٹیں۔

سمدھن کی آمد ہمیشہ انہیں ناگوار گزرتی تھی۔ تاہم



بادل نخواستہ موت کے ہاتھوں ملنے کے لیے باہر آ گئی تھیں۔

”کبھی دادی کے لیے تو ایسی بے ساختہ خوشی کا اظہار نہیں ہوا‘ جیسے نانی کے لیے تم لوگوں کی محبت الڈی آرہی ہے۔“ زینب بی بی سے ملتے ہوئے نیلی کو گھورتے ہوئے کہا جو پیچھے سے نانی کے کندھے پہ ٹھوڑی ٹکائے کھڑی تھی۔

”تو دادی! محبت کا ایسا اظہار آپ کے نواسے‘ نواسیوں کی طرف سے آپ کے لیے ہونا چاہیے جو کبھی کبھار آپ سے ملتے ہیں۔ ہم اور آپ تو ایک ہی گھر کے فرد ہیں۔“ نیلی مسکراتی آنکھوں سے دادی کا زوٹھا انداز دیکھتے ہوئے بولی۔

زینب بی بی ہمیشہ کی طرح اپنے ساتھ کافی کچھ لائی تھیں۔ بیسن کا حلوہ‘ چاول کا آٹا‘ گھر کی بٹی سویاں۔

”ارے اماں! ان سب کی کیا ضرورت تھی۔“ نگہت سامان سنبھال کر ایک طرف رکھتے ہوئے محبت بھرے انداز میں بولیں۔ مگر جواب دادی کی طرف سے آیا تھا۔

”اچھے بھائی ہیں۔ جو بہن کے گھر اتنا کچھ بھیج دیتے ہیں۔ ورنہ تو میں جب بھی بیٹی کے گھر گئی۔ خالی ہاتھ ہی لٹکاتے گئی۔“ دادی کا لہجہ حد درجہ یاسیت زدہ تھا۔

”ارے نہیں مہن بہن! یہ چیزیں مجھے بیٹوں نے نہیں تھمائیں۔ بلکہ میں تو انہیں گھر پہ ہی تیار کرتی رہتی ہوں۔ بچے خوش ہو جاتے ہیں۔“ زینب بی بی سادگی سے بولیں۔

”دی گریٹ نانی جان! جئیں ہزاروں سال اور ایسی مزیدار چیزیں ہمیں کھلاتی رہیں۔“ شفیق کہتے ہوئے ان سے لپٹ گیا تھا اور دادی کے لیے مزید وہاں رکنا بے حد مشکل تھا۔



”یہ میری نگی! زری کم عقل۔ بچپن میں خشک چربی والا گوشت کوئلوں پہ بھون کر نمک مرچ چھڑک کر کھا ہی رہی تھی کہ تمہارا ماموں واحد آنکلا۔ نگہت نے اس خیال سے کہیں بھائی گوشت ہاتھ سے لے نہ لے‘ جلدی سے گھٹنوں میں چھپا لیا‘ گرم گرم بوندیں ٹپکاتے گوشت نے ٹانگوں کو جلا دیا تھا۔ نگی پورا ایک ہفتہ میں کچے آلو کا لیپ لگاتی رہی تھی اسے۔“ زینب بی بی بولتے بولتے مسکرا دی تھیں۔

ان کے ساتھ سارے بچے بستر میں گھسے گھٹنوں پہ ٹھوڑی ٹکائے محویت سے نانی کی باتیں سن رہے تھے۔

اور ایسے ہی دنوں میں دادی دم گھٹنے کی سی کیفیت میں مبتلا ہو جایا کرتی تھیں جب بچوں کی نانی مع ڈھیروں ڈھیر سوغات کے تشریف لاتیں اور بچے روز رات کو ان کے گرد گھیرا ڈال کر بڑے اشتیاق سے ان کے منہ سے ماں کے بچپن کے قصے سنتے۔ ماں کی نادانیاں‘ شرارتیں‘ شادی۔ کتنا کچھ دلچسپی کا سامان تھا نانی کی باتوں میں‘ تب ہی تو شفیق ان کے واپس جانے کا سن کر ان کے سامان کا تھیلا کہیں چھپا آتا تھا۔

”جا کر تو دکھائیں ذرا۔ ان ہیلر اور دواؤں کے بغیر ایک دن بھی نہیں رہ سکتیں۔“ دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر آنکھیں نچاتے ہوئے وہ کہتا۔

اور دادی کو بچوں کا نانی سے یہ لاڈ پیار ایک آنکھ نہ بھاتا۔

گھر میں زینب بی بی کی موجودگی انہیں خواہ مخواہ کی کوفت میں مبتلا کر دیتی تھی۔ اپنا وجود غیر اہم لگنے لگ جاتا تھا۔ ان کے خیال میں یہ ان کی بہو کی تربیت کی خرابی تھی جس کی وجہ سے بچے نانی اور دادی سے برابر کے التفات کا مظاہرہ نہیں کر پاتے۔ اسی لیے تو موڈ خاصا بگڑا بگڑا رہتا تھا آج کل۔ بہو کے ہاتھ کا کھانا ویسے بھی اتنے شوق سے نہیں کھاتی تھیں۔ اب تو بہ آواز بلند کھانے میں مین میخ نکالتیں‘ تاکہ زینب بی بی کے کانوں تک آواز بخوبی پہنچ جائے۔

دادا ٹی وی پہ نیوز سننے کے بے حد شوقین اور انہیں ہر وقت بلاوجہ کی بریکنگ نیوز کی ڈھائیں ڈھائیں دحشت میں مبتلا کر رہی تھی۔

”نگوڑ ماری! صرف رسہ تڑوا کر بیل بھاگا ہے اور حلق پہ زور دے کر یوں خبر سنا رہی ہے جیسے خدا نخواستہ قیامت آگئی ہو کہیں؟“

نیوز اینکر کے انداز پہ الگ تپ چڑھتی۔ دادا کو کون منع کرے نیوز سننے سے۔ بس ڈسکوری چینل لگا کے ٹی وی ریموٹ کہیں اسٹور میں چھپا آئیں۔

”جان چھوٹی بلاوجہ کی ٹینشن سے۔“

”کہاں گیا‘ مل کے نہیں دے رہا۔“ اور جب دادا پلنگ کے نیچے‘ الماریوں کے پیچھے تن دہی سے ریموٹ ڈھونڈ رہے تھے۔ دادی نے اپنا پرانا بٹنوں والا نوکیا موبائل نکال لیا۔

یہ موبائل انہوں نے بیٹے عتیق سے منگوایا تھا۔

”اپنی اکلوتی بیٹی سے دکھ سکھ کی باتیں کر لوں گی۔ وہ تو کام کے بکھیڑوں میں الجھی میکے نہیں آسکتی۔“

ہاں یہ اور بات کہ شگفتہ ان کے دکھڑوں پہ کوئی خاص رد عمل ظاہر نہیں کیا کرتی تھی۔ کیونکہ اس کے اکلوتی بھاوج اور بھائی سے تعلقات مثالی تھے۔ دوسرا ماں کی تلون مزاجی سے بھی خوب واقف تھی۔

”ہاں شگی! نقی کو بھیج کر آکے مجھے لے جائے۔“ موبائل میں محفوظ شگفتہ کا نمبر آسانی سے مل گیا تھا۔

ٹھیک ایک گھنٹہ بعد نقی رکشہ لے کر آگیا۔

”رکشے پر جاؤں؟ بڑھاپے میں اپنی ہڈیاں نہیں تڑوانی ہیں۔“

”تو پھر بتائیں کہاں سے آپ کے لیے کوئی اڑن کھٹولا ہائر کر کے لاؤں۔“ نقی مزاحیہ انداز میں بولا۔

”کیوں شہر بھر کی ٹیکسیاں کیا مرمت کے لیے کھڑی ہیں؟“ نقی کا انداز انہیں ایک آنکھ نہ بھایا۔

”ٹیکسی اتنی تنگ گلی میں کیسے آسکتی ہے؟“

”تو مجھے کیوں بتا رہے ہو۔ میں کوئی میونسپل میں کام کرتی ہوں۔ اگر ٹیکسی آسکتی ہے تو ٹھیک ورنہ جاؤ۔“ بے مروتی سے صاف انکار کر دیا۔ نقی کو یہ بات ماننا ہی پڑی۔

جانے سے پہلے نیلوفر کو دادا کا خاص خیال رکھنے کی تاکید کی۔

”یہ الماری میں ان کی کھانسی کی دوا رکھی ہے۔ فریج میں آئی ڈراپس رکھے ہیں۔ ٹوپی مفلر سرہانے‘ اور۔۔۔“

”دادی! مجھے بتانے کی ضرورت نہیں‘ آپ کے کمرے کی چیزوں کی ترتیب بچپن سے ایک سی دیکھتی آرہی ہوں اور ویسے بھی کون سا مہینہ رہنے کے لیے جا رہی ہیں۔“ نیلوفر ان کو اطمینان دلاتے ہوئے بولی۔

”اور ہاں! ٹی وی کا ریموٹ اسٹور والے ٹرنک میں رکھا ہے۔“ جھک کر قدرے سرگوشی سے بولیں تو نیلی کا منہ کھل گیا تھا۔

دادا گم شدہ ریموٹ کی بابت ہر ایک سے پوچھ چکے تھے۔ ہر ایک نے لاعلمی ظاہر کی تھی کیونکہ گم شدہ چیز تو ڈھونڈنے سے مل جاتی ہے مگر چھپائی گئی۔۔۔

ابھی چار دن ہی گزرے تھے کہ دادی‘ شگفتہ پھپھو کے ملتان لوٹنے سے قبل ہی گھر واپس آگئیں۔

”دادی آگئیں‘ دادی آگئیں۔“ شانی زور زور سے شور مچاتا ہوا ان کے گلے میں جھول گیا تھا۔

”چل ہٹ پرے۔ ڈرامابازکہیں کا۔“ شانی کو پرے دھکیلتے ہوئے خود چارپائی پہ ڈھیر ہو گئیں۔

”کمال ہے خود ہی گلہ کرتی ہیں کہ اپنی نانی پہ ساری محبتیں لٹائے جا رہے ہو اور اب خود ہی ناراض ہو رہی ہیں۔“ شانی کندھے اچکاتا ہوا چلا گیا۔

”یہ کیا دادی! مجھے دادا کے خیال رکھنے کا مہینے بھر کا چارٹ تھمایا اور خود پھپھو کے گھر کو ہاتھ لگا کر واپس آگئیں جیسے۔“ نیلی ان کے پیچھے تکیہ لگاتے ہوئے حیرانی سے بولی۔

”بس میرا دل نہیں لگا‘ مجال ہے جو بچوں نے مجھے ذرا بھی وقت دیا ہو اور جوائی صاحب‘ انہوں نے تو بالکل مجھے گھر کا فرد سمجھ لیا تھا۔“ انداز جلا کٹا تھا۔

”یہ تو اچھی بات ہے کہ انہوں نے مہمان نہیں بلکہ آپ کو اپنے گھر کا فرد سمجھا۔ اپنائیت دکھائی۔“ نیلی کو ان کی ناراضی سمجھ میں نہ آئی۔

”ہم تو بھر پائے ایسی اپنائیت سے۔ ایسی اپنائیت سے تو بیگانگی اچھی۔۔۔ غضب خدا کا‘ پورے چار دن ساگ کھلایا۔ کوئی گاؤں کا رشتہ دار گٹھڑ باندھ کر لے

آیا۔ اب جوائی صاحب پہ لازم ہو گیا کہ روز ساگ پکوائیں جب تک ختم نہیں ہوتا۔ نہ کوئی میٹھا نہ گوشت' ایک دن ناشتے میں انڈہ کھانے کی فرمائش کر دی ڈھیٹ بن کر۔ کم بخت ماری مرغی انڈہ دینے بیٹھی تو اوپر شیلف سے اسٹیل کی بھاری پتیلی گرنے سے وہیں اناللہ ہو گئی۔ جوائی صاحب نے وہیں پیٹ چاک کر کے انڈہ سالم نکال لیا۔ مرغی تو حرام موت مری۔ اب اس کے پیٹ سے نکلنے والا انڈہ حرام ہے یا حلال۔ دو دن تو اس بحث میں گزر گئے۔ ساتھ مسجد کے امام سے فتویٰ لینا تھا۔ مگر مصروفیت میں لینا یاد نہیں رہا۔ اب انڈہ ابھی تک شیلف میں رکھا سڑ رہا ہے نہ اس کی قسمت میں کسی کا پیٹ ہے نہ کوڑے کی ٹوکری۔" دادی جلے بھنے انداز میں بول رہی تھیں۔

"ہاہاہا۔" نیلو ہنس ہنس کر دہری ہو گئی۔ پھوپھا ظہیر احمد کی کنجوسی تو چہار دانگ عالم میں مشہور تھی۔ خود ایک دفعہ نیلی بھی ان کی کنجوسی کا بری طرح شکار ہوئی تھی۔

وہ ایک ہفتہ پھپھو کے گھر رہی تھی وردہ کے ساتھ دوستی کی وجہ سے وقت بہت اچھا گزر رہا تھا مگر بقر عید پر جمع کی ہوئی چربی سے بنے پراٹھے کھا کھا کر اس کی حالت پتلی ہو چکی تھی۔ دادی بلا کی خوش خوراک اور بسیار خور' سو قتل معاف کر دیتیں مگر ذائقے پر کوئی سمجھوتا نہیں' نیلی سمجھ سکتی تھی کہ پھپھو کے گھر قیام پر دادی پر کیا گزر رہی ہوگی۔

"جنم جنم کا کنجوس داماد مہینوں بعد آئی ساس کو ایسی ہی عزت دے سکتا ہے اور ایک ہمارا اپنا بیٹا ہے جو ساس کے آنے پر خاطر تواضع میں کوئی کسر نہیں اٹھائے رکھتا۔ بات ساری تربیت کی ہوتی ہے۔"

معاً ان کی نظر سامنے لیموں کے پودے پر پڑی۔ جس کی برہنہ شاخوں پر اکا دکا پتے لگے ہوئے تھے۔

"نیلی! میں نے تمہیں دادا کا خیال رکھنے کے ساتھ ساتھ پودوں کا خیال رکھنے کو بھی کہا تھا۔ اب دیکھا شیطان بچوں نے لے کے سارے پتے نوچ ڈالے ہیں۔" وہ پودے پہ نظر جمائے سخت رنجیدہ لہجے میں بولیں۔

انہیں اپنے پودوں سے بے حد عشق تھا۔ لیموں' فالسہ' امرود اور دیگر پھل دار پودے انہوں نے دادا کے ساتھ مل کر لگائے تھے۔ دونوں کا بیشتر وقت ان پودوں کی دیکھ بھال' تراش خراش میں گزرتا تھا۔ ایک کے ہاتھ میں کھرپی ہوتی تو دوسرے کے ہاتھ میں پانی کا پائپ

"اماں! بچے تو پودوں کے پاس گئے ہی نہیں۔ خزاں کا موسم ہے۔ زرد پتے کمزور ہو کر گرتے رہتے ہیں۔" شام کے کھانے کی تیاری میں مصروف نگہت نے سکون سے کہا تھا۔

"ہونہہ خزاں کا موسم' بندہ اپنی چیز کی جتنی اچھی حفاظت کر سکتا ہے۔ کوئی دوسرا کیوں کرے۔ پودا پتوں کے بغیر کتنا برا لگتا ہے۔" بہو کی بات رد کرتے ہوئے وہ ناراضی سے بولیں۔

تیرے جاتے ہی کیا ہو گئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

اسی دم دادا کمرے سے اسٹک کے سہارے چلتے ہوئے باہر آئے اور دادی پہ نظر پڑتے ہی شوخی بھری ہانک لگائی۔

"اجی! چھوڑو۔ بچوں کے سامنے۔" دادی نے جھینپتے ہوئے پہلو بدلا۔

"اور وہ کیسی ہے ہماری نور نظر' جان پدر؟" دادا بولتے ہوئے پودے کی طرف بڑھے۔ انار کے خزاں رسیدہ پودے پہ اسٹک ماری تو بے شمار زرد پتے پودے کے قدموں میں ایک دم سے ڈھیر ہوئے۔

"ہائے عتیق کے ابا! یہ کیا کر رہے ہیں؟" دادی جیسے کراہ کر بولی تھیں۔

"کتنے برے لگتے ہیں یہ زرد بے جان پتے۔ پودا جیسے برسوں کا بیمار ہو۔ ہواؤں کی چاپ بتا رہی ہے کہ موسم گل آنے کو ہے۔ پودوں کو سبز پیرہن ملنے ہی والا ہے۔"

دادا چھڑی برساتے تواتر سے پتے گراتے جا رہے تھے۔ دادی نے بے ساختہ سر ہاتھوں پہ گرا لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

بلال صبح سے کسی قرض خواہ کی طرح ڈٹے جمے کھڑے تھے۔ نہ چھٹتے تھے نہ برستے تھے۔ تاہم سہ پہر کے وقت مشرق سے چلنے والی ہوا نے ذرا سا شرارت سے گدگدایا تو کھلکھلا کر برس پڑے۔ اگلے ایک گھنٹے تک آبی تاریں زمین سے بندھی رہیں۔ موسم نے دل فریبی اور کیف آفرینی کی چادر ہر سو تان دی تھی۔

نگہت نے احتیاط سے موٹا سا توا چولہے پر چڑھایا اور باجرے کا آٹا گوندھنے لگیں۔ باجرے کی گرم گرم روٹی پہ مکھن کی ٹکیہ پگھلتی جا رہی تھی۔ ساتھ میں آلو بخارے کی میٹھی چٹنی۔

"واہ میری ماں! دل چاہتا ہے تیرے ان دو ہاتھوں کو دو ہزار بار چوم لوں۔" بلال نے روٹی کا نوالہ چٹنی میں اچھی طرح ڈبو کر منہ میں ڈالتے ہوئے پُر لطف انداز میں کہا۔

"ہاں تمہیں ہر نوالے پر ایسا کون سا ذائقہ اور لذت محسوس ہو رہی ہے جو مجھے پوری روٹی کھانے پر بھی محسوس نہیں ہوئی۔" دادی غضب سے بلال کے انداز کو ناپسندیدگی سے دیکھ رہی تھیں بالآخر تیکھے لہجے میں بولیں۔

"تو ایسی بے ذائقہ اور بد مزہ روٹی کو آپ نے پہلے ہی لقمے پر چھوڑ دینا تھا۔" بلال معصومیت سے بولا۔

"کیا کروں اب جیسی بھی ہے۔ دوزخ شکم تو کسی طور بھرنا ہے ناں۔ کون سا دو چار اور بہوئیں ہیں کہ ان کے چولہے کی امید رکھوں۔" دادی مایوسی سے کہہ رہی تھیں۔

"چہ چہ۔۔۔ ایک ہی بہو' وہ بھی بد سلیقہ اور پھوہڑ۔ دادی! مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔" نیلی دادی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے نرمی سے بولی۔

"چل نکمی اولاد' اگر ماں پھوہڑ ہے تو تم نے کون سا دل خوش کر رکھا ہے۔ کبھی کوئی میٹھا بنا کر کھلایا کہ دادی چکھیں' کوئی لذیذ ہانڈی' درجنوں پکانے کے چینل ٹی وی پہ دیکھتی ہو مگر دادی کی دل جوئی کا خیال بھی نہ آیا۔ کیا تھا جو تم مجھ پہ چلی جاتیں۔ چراغ تلے اندھیرا۔ میرے پکے ڈوسے کو برسوں تک کوئی نہیں بھول پاتا تھا۔ نرم' خستہ' کرارا' کون مانے گا کہ تم ایسی سگھڑ دادی کی پوتی ہو۔ نرا تاڑ قد' بس چھت کے جالے صاف کروا لو۔" دادی کا انداز شرمندگی کے دریا میں پور پور ڈبکیاں لگانے کے لیے کافی تھا۔

"بخدا! مجھے قطعاً علم نہیں تھا کہ میں اس قدر سگھڑ اور سلیقہ مند دادی کی پوتی ہوں۔ اگر علم ہوتا تو اور کچھ نہیں کم از کم نخرہ ہی کر لیتی۔" نیلی بے چارگی سے بول رہی تھی' دادی کی توجہ اپنے ہاتھ میں لیے بٹوے کی طرف تھی۔

"چل شانی! یہ پیسے پکڑ' محلے سے ایک درجن انڈے ڈھونڈ کر لے آ۔ مرغی کڑک ہو گئی ہے۔ چوزے نکلواؤں گی۔ اور سن انڈے مرغے والوں کے ہوں۔" شانی کی ہتھیلی میں پیسے تھما کر نیلی کی طرف رخ دوبارہ سے موڑا۔

"ہاں تو میں کیا کہہ رہی تھی۔ میں ایسی سلیقہ اور ہنر مند تھی کہ دور دور سے عورتیں میرے ہاتھوں کے کشیدہ کاری کے نمونے دیکھنے آتی تھیں۔ تکیے' میز پوش۔" دادی کا لہجہ تفاخر سے بھرپور تھا۔

"مگر دادی! میرا تو کوئی قصور نہیں اگر میں آپ کے جواہر پوشیدہ سے بے خبر ہوں تو میرا کیا دوش۔ جب سے ہوش سنبھالا ہے آپ کو کوئی کام کرتے نہیں دیکھا۔ بس چارپائی پہ بیٹھ کے مزے مزے کے کھانے کھانا اور گارڈننگ کرنا ہی آپ کے مشاغل ہیں۔"

"اچھا' یہ بات ہے' چل تجھے اپنے ہاتھ کا ڈوسہ کھلاتی ہوں۔" دادی کو جیسے نیلی کا انداز چیلنجنگ محسوس ہوا تھا' اسی لیے جوش سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ شانی بھی اسی وقت خالی ہاتھ لٹکاتا آ گیا تھا۔

"دادی! چھ سات گھروں میں انڈے لینے گیا۔ کہیں دو تو کہیں تین۔ کسی گھر میں پورے ایک درجن انڈے نہیں ملے مجھے۔" شانی سخت مایوسی سے کہہ رہا تھا۔

دادی نے ایک زور دار دھموکا شانی کی کمر میں

جڑا۔ کم بخت' عقل سے پیدل! اگر دو چار گھروں سے تھوڑے تھوڑے انڈے لے لیتا تو پورے درجن ہو ہی جانے تھے۔ یہ تو نہیں کہا تھا کہ ایک درجن ایک ہی گھر سے لینا۔ چل دوبارہ نکل' بس خیال رکھنا انڈے مرغے والی مرغی کے ہوں۔ میں نے کڑک مرغی بٹھانی ہے۔ تل کر ناشتہ نہیں کرنا ان کا۔" بازو سے پکڑ کر شانی کو گھما کر رخ دروازے کی طرف کیا اور نیلی سے بولیں۔

"ہاں تو چلو ڈوسہ بناتے ہیں۔" کچن میں پہنچ کر کچن کا ناقدانہ جائزہ لیا گیا۔

"کیا حشر کر رکھا ہے کچن کا تمہاری ماں نے۔ ساس نے چولہا چوکی حوالے کی تو جو جی چاہے کرے۔ ایک میں تھی' کچن جگمگاتا رہتا تھا۔"

"دلیں دادی! بیٹھیں۔" نیلی نے چوکی' دادی کو پیش کی۔

"پہلے آگ جلاؤ۔" حکم صادر کیا گیا۔

نیلو نے بہتیری پھونکیں ماریں مگر آگ جل کر نہ دی۔ سارے میں دھواں پھیل گیا تھا۔ دادی نے دوپٹا آنکھوں پر رکھ لیا تھا۔

"کم بخت ماری' ساری آنکھوں میں دھواں بھر دیا۔ پھونکوں میں جان نہیں ہے کیا۔" دادی کھانستے ہوئے چیخ کر بولیں۔

ان کی آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ پھر قدرے سنبھل کر اندازے سے تیل توے پر ڈالا۔ نیلی نے گال زور سے پھلا کر زور سے پھونک ماری تو آگ تیزی سے بھڑک اٹھی۔ ساتھ ہی تیل نے بھی آگ پکڑ لی۔ لمبے لمبے شعلے بلند ہونے لگے۔ دونوں گھبرا گئیں۔

"نیلی کی بچی! بجھا اسے' جلائے گی کیا؟" دادی چیخیں۔

نیلی نے گھبراہٹ میں ہاتھ میں پکڑی صافی زور زور سے ماری تو آگ بجھی' ساتھ میں دھواں بھی پھیلا اور مزید گہرا ہوا۔

"کھو' کھو' کھو مار ڈالا ظالم بجھ بڑھیا کو۔" دادی کو کھانسی کا دورہ پڑ چکا تھا۔

"دادی!" دھوئیں کے اندھیرے میں ڈوبے کچن میں شانی کی آواز ابھری تھی۔

"مجھے انڈے نہیں ملے۔ سب نے کہا ہمارے پاس مرغی والے انڈے ہیں۔ ہمارے مرغے انڈے نہیں دیتے۔ سب نے اتنا مذاق اڑایا کہ حد نہیں۔" شانی رونے والا ہو رہا تھا۔

"ٹھہر کم بخت۔ میں تجھے بتاتی ہوں۔ میں نے کہا تھا کہ انڈے ان مرغیوں کے ہوں جہاں مرغے بھی موجود ہوں۔ یہ نہیں کہا تھا کہ مرغ انڈے دیتے ہوں۔"

دادی غصے بھرے انداز میں کہتی شانی کو دو لگانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں مگر دھوئیں کی وجہ سے ایسا چکر آیا کہ دروازے کا پٹ تھامنا پڑ گیا تھا۔ نیلی الگ ہنس ہنس کر بے حال ہو چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

"نیہوڑے آ آ ظالما' وے میں مر گئی آں' بکھر گئی آں۔" نیلوفر نیلم لمبی لمبی تانیں لگاتے ہوئے گھر کی صفائی میں جتی ہوئی تھی۔ پورا فرش دھویا' دھلے چمکتے نئے نکور پردے لٹکائے۔ دیوار میں نصب گملوں کو دھو کر لوہے کے اسٹینڈز تک کو رنگ کر ڈالا۔

"خواہ مخواہ خود کو تھکا رہی ہو۔ لازمی نہیں کہ آنے والے ظاہر پرست لوگ ہوں۔ یہ بستر کی چادریں' نئے پردے' تازہ پھول۔ اصل چیز تو لڑکی کے گُن ہوتے ہیں۔" دادی تخت پہ بیٹھی اس کی تمام پھرتیوں کو بغور ملاحظہ کرتی اپنا تجزیہ بھی پیش کر رہی تھیں۔

"ہاں تو کون سی کمی ہے میرے اندر۔" نیلی تڑپ کر سیدھی ہوئی تھی۔

"دسوں انگلیاں' دسوں چراغ ہوں۔"

"ہاں چراغ مگر بجھا ہوا۔" دادی نے نخوت سے سر جھٹکا۔

"پوچھتی ہے کون سی کمی ہے۔ میں کہتی ہوں بی بی! زیادتی سی زیادتی ہے۔ لمبا تاڑ سا قد' چھت کے جالے صاف کروا لو' سیڑھی کی بچت" آرام سے ہاتھ بڑھایا اور

دو چھتی کا سامان نیچے اتار لیا۔"

"دو چھتی کیوں۔ اسی قد کے بل بوتے پہ تو آسمان کے تارے بھی توڑ کر لا سکتی ہوں۔" دادی تے مسلسل طنز پر وہ جل کر بولی تھی۔

"ارے آپ کیوں تارے توڑیں گی' تارے تو وہ توڑ کر لائے گا جو آپ کا ہم سفر بنے گا۔ قسم سے اتنی محنت' مان گئے بہنا! اپنا گھر آج اپنا نہیں لگ رہا۔" کرسی پہ پاؤں رکھے کپڑے سے جوتے چمکاتا بلال توصیفی انداز میں بولا۔

"ہاں بس اسی صفائی ستھرائی کو ہی لاکھ جانیں تو اور بات ہے ورنہ تو اندر کا حال ہم ہی جانتے ہیں۔" بلال کی بات پہ دادی نے مایوسی بھرا تبصرہ کیا تھا۔

نگہت کی کزن شہلا نے اپنی سسرال میں سے نیلی کے لیے رشتہ بھجوایا تھا۔ اسی سلسلے میں نگہت کچن میں مصروف تھیں۔ شہلا نے بتایا تھا کہ شریف خاندان ہے۔ نیلی کو تو جیسے سن کر سکتہ ہو گیا تھا۔

"ہائیں! شریف فیملی' مطلب صاحب اقتدار کنبہ' اتنی امیر اور پاور فل فیملی' محل' ملیں اور مریم نواز' ان کی بیوی اور گریس۔" نیلوفر بس لڈیاں ڈالنے ہی والی تھی کہ جب نگہت نے جھنجھوڑ کر سیدھا کیا تھا۔

"پاگل مت بنو نیلی! شہلا کے کہنے کا مطلب ہے آنے والے مہمان شریف' نیک سبھاؤ اور سادہ مزاج کے ہیں۔"

☼ ☼ ☼

"لڑکا خیر سے کرتا کیا ہے۔" دادی نے ہی مہمانوں سے انٹرویو کا آغاز کیا تھا۔

"جی واپڈا میں ملازم ہے۔" لڑکے کی بہن نے ادب سے جواب دیا۔

"واپڈا میں تو اس کا مطلب ہے سارا دن ویلا نکما بیٹھا رہتا ہو گا۔" دادی نے پر سوچ انداز میں بہ آواز بلند کہا۔

"ہائیں جی ویلا نکما کیوں' اچھی خاصی سیلری مطلب تنخواہ ہے اس کی۔" بہن قدرے برا مان کر بولی۔

"تنخواہ کس بات کی لیتا ہو گا' جب بجلی دن میں دو دفعہ جھلک دکھاتی ہے۔ منحوس مارے گرمی سے تڑپا تڑپا کر مارتے ہیں اور ہزاروں کے بل آرام سے ڈکار جاتے ہیں۔"

دادی بجلی جانے پر واپڈا والوں کو جو صلواتیں سناتی رہتی تھیں' جوش خطابت میں اب بھی شروع ہو گئیں۔

"خدا ان سے پوچھے' جہنم کے داروغے لگے ہوئے ہیں۔"

نگہت بے بسی سے مہمانوں کو پہلو بدلتا دیکھ رہی تھیں۔ اتنے میں نیلوفر سر پہ دوپٹا اوڑھے ٹرے اٹھا کر اندر داخل ہوئی۔ ماں بہنوں کی نظریں لڑکی کو دیکھنے کے لیے اوپر اٹھیں۔ نظریں ٹرے تھامے ہاتھوں تک ہی جا رکی۔ نظر مزید اوپر اٹھی تو گردن کا آخری مہرہ سب سے پہلے مہرے سے جا ملا تھا۔ رنگ گورا' آنکھیں گہری سیاہ' مگر قد' اتنا لمبا قد! ماں بیٹی کو اپنی گردنوں میں دکھن کا احساس ہوا تھا۔ اف توبہ' پھر کھانے کے دوران ہی دادی نے اپنا فیورٹ ٹاپک چھیڑ دیا تھا۔

"کیا پوچھتی ہو بچیو! میں بڑھیا' بیماریوں کی پوٹلی' پندرہ سال تو ظالم کھانسی نے نہ چھوڑا اور یہ گھٹنوں کا درد پورے پچیس سال سے جھیل رہی ہوں۔ یہ نیلو جس دن پیدا ہوئی' اس سے اگلے ماہ سے اس بیماری نے مجھے آلیا۔"

"پچیس سال؟" دونوں ماں بیٹیوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔

"پچیس سال کا تو ہمارا اپنا بھائی ہے' شہلا آنٹی تو بتا رہی تھیں کہ نیلوفر بیس سال کی ہے۔" لڑکے کی بہن اس صاف گوئی سے بولی کہ سب ہی چپ رہ گئے تھے۔ اتنے گہرے چپ کہ تیسرے دن جا کر سب کی قوت گویائی لوٹی تھی۔

"آہا! جس کی بیوی لمبی اس کا بھی بڑا نام ہے۔ کاندھے پہ بٹھا لو' گھوڑی کا کیا کام ہے۔"

بلال پلیٹ اور چمچ بجاتا اونچی آواز سے گا رہا تھا۔

نظروں کا فوکس نیلوفر تھی جو تین دن سے اٹوائی کھٹوائی لیے پڑی تھی۔

"بکواس مت کرو۔ بڑا آیا شوخا۔" وہ آنسوؤں سے لبریز آنکھوں کے ساتھ بلال پہ چلائی تھی۔ پھر پھنسے ہوئے دانے کھاتی دادی کی طرف مڑی۔

"دادی! یہ سارا کیا دھرا آپ کا ہے۔ چلتا پھرتا اسپتال ہیں آپ۔ خواہ مخواہ کا آتے ہی اپنی بیماریوں کی شیخی بگھارنا شروع کردی۔ اور کیا لازم تھا کہ آپ اپنی ہر بیماری کا تعلق میری عمر سے جوڑتیں' کھانسی لگی تو نیلوفر پندرہ سال کی' ٹائیفائیڈ ہوا تو نیلوفر ساتویں جماعت میں تھی' نیلی اور گھٹنے کے درد کی عمر ایک ہی ہے۔"

"اے لو' بیماری کا شیخی سے کیا تعلق' اللہ بچائے ان بیماریوں سے جو میری ناتواں جاں کو لپٹی ہوئی ہیں۔" دادی برامان کر بولی تھیں۔

"اور اپنے اس برج خلیفہ جتنے قد کو کیا کہو گی۔ سنا نہیں تھا لڑکے کی بہن کیا کہہ کر گئی تھی۔ ہمارا بھائی بونے قد کا اور بیوی اتنی لمبی کہ دیکھنے کے لیے اسے بیس فٹ دور کھڑا ہونا پڑے۔ بات کرتی ہیں دادی کے منہ پھٹ ہونے کی۔ اتنا تاڑ قد کہ لڑکا بیوی کو منہ پہ چانٹا مارنے کی حسرت ہی دل میں رکھ کر رہ جائے' ساتھ فوٹو نہ بنوا سکے۔ موٹر سائیکل پہ پیچھے بٹھائے تو لگے کہ بیوی موٹر سائیکل چلا رہی ہے۔ آگے چھوٹا بھائی بٹھا رکھا ہے جس نے ڈر سے موٹر سائیکل کو پکڑ رکھا ہے۔" دادی نے خود پہ مہمانوں کو بھگانے کا الزام اچھی طرح دھو ڈالا' تھا۔

"اب ایسا بھی مبالغہ نہ کریں۔ لمبا قد تو خوب صورتی میں شمار ہوتا ہے۔" دادی کی لن ترانیوں سے نیلی چڑ کر بولی۔ "ماڈلز دیکھی ہیں آپ نے' کون سی کوتاہ قد ہوتی ہیں؟ اونچا لمبا سڈول سراپا اور آپ کی فیورٹ ڈرامہ ایکٹریس سورا ندیم' ساتھ میں دپیکا' کتنی لمبی ہائیٹ کی مالک ہیں۔ ایک دنیا ان کی فین ہے۔"

"ہاں تو کون سا گھر بسائے بیٹھی ہیں۔" دادی طنز سے نہ چوکیں۔

"ویسے کتنے کم عقل اور نادان لوگ تھے۔ اپنے گھاٹے کا سودا کر گئے۔" ناشپاتی کھاتے ہوئے بلال نے ستون سے ٹیک لگالی' ساتھ میں دائیں ٹانگ بھی موڑ کر پیچھے ستون سے جمادی۔

"اتنی بلند قامت۔ چوڑے ڈیل ڈول والی بہو اگر گھر میں ہو تو مجال ہے کوئی چور اچکا گھر میں غلط نیت سے داخل ہو۔" کن اکھیوں سے نیلی کو دیکھا جو سرخ رنگت کے ساتھ اسے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہی تھی۔

"ہاں' میری بھی یادداشت میں نہیں پڑتا کہ کبھی کوئی چور اچکا ہمارے گھر میں داخل ہوا ہو۔ باقی چیزیں تو دور کی بات' صحن میں لگے آم و امرود کے درختوں کے قریب کوئی بچہ بھی پھٹک نہیں پاتا کجا کہ چور' ڈاکو ہمت کرلیں۔ سب چین' شانتی اسی کرموں والی کے دم قدم سے ہے۔" دادی کے انداز میں سراسر چھیڑ ہی تھی اور وہ بھی "چھڑ" ہی گئی۔

"جی ہاں' یہ سب اس دراز قامتی کے ہی کرشمے ہیں۔ ورنہ تو کوئی جانتا نہیں کہ اس گھر میں ایک ڈنڈا بردار دادی رہتی ہیں۔ جو اپنے پودوں کا پھل تو کیا پتہ تک توڑنے پر دھلائی کردیتی ہیں۔" جل کر کہتے ہوئے نیلی وہاں سے واک آؤٹ کرگئی تھی۔

پیچھے دادی کی دبی دبی ہنسی اور بلال کا زوردار قہقہہ صحن میں بکھرا تھا۔

☆ ☆ ☆

"کہاں ہو ولید بیٹے! یہاں سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں؟" اس کے کال اوکے کرنے پر شمائلہ عجلت سے بولی تھیں۔

"سوری امی! آڈٹ کی وجہ سے آفس میں کام زیادہ ہے۔ اس لیے دیر ہو رہی ہے۔ میں بس نکل رہا ہوں۔ ڈونٹ وری۔"

آج نائلہ آنٹی کے گھر سب مدعو تھے۔ شمائلہ اس دعوت کے بارے میں اسے ناشتے پہ بتا چکی تھیں۔ بار بار اس تاکید کے ساتھ کہ آف ہوتے ہی آنٹی کے گھر

آجانا۔ اس کا ارادہ فریش ہونے کے بعد دعوت میں جانے کا تھا۔ سو گھر آکر نہا دھو کر آف وائٹ شلوار قمیص زیب تن کیا۔ خود پہ ڈھیروں پرفیوم چھڑک کے قد آدم آئینے سے ذرا دور ہو کر اپنا جائزہ لیا۔ دل نے کچھ توصیفی کمنٹس دیے۔

"ماشاء اللہ چشم بددور' خدا لمبی عمر عطا کرے میرے چاند کو۔" کانوں میں محبت بھری ضعیف آواز کی سرگوشی ابھری تو وہ چونک اٹھا۔ یہ الفاظ کم و بیش ہر دفعہ دادی اسے دیکھ کر کہا کرتیں' جب بھی وہ ان کے سامنے جایا کرتا۔

"آگیا ولید! میری آنکھوں کی ٹھنڈک۔" دادی جو آنکھیں موندے کب سے چپ چاپ لیٹی تھیں۔ اس کے مخصوص پرفیوم کی خوشبو پا کر بول اٹھیں۔

"جی دادی! آپ سنائیں کیسی ہیں؟ سوری اتنے دنوں سے آپ کے کمرے میں چکر نہیں لگا پایا' بس وہی آفس کا برڈن۔" وہ انہیں سہارا دے کر اٹھاتے ہوئے لوب سے کہہ رہا تھا۔ پھر ان کا ہاتھ پکڑ کر تشویش بھرے انداز میں بولا۔

"دادی! آئی تھنک آپ کو بخار ہے۔ آپ کا جسم تو گرم ہو رہا ہے۔"

"ہاں بچے! پچھلے ایک ہفتے سے جان بخار میں پھنک رہی ہے۔ تیرا ابا ڈاکٹر لے آیا۔ اس نے کئی سرنجیں کھبائیں' مگر فرق نہیں پڑ رہا۔ تو اس کو چھوڑ' مجھے کچھ کھانے کو لا دے' مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے۔" یکمہ خاتون نقاہت سے بولیں۔

"جی دادی! میں ابھی لے کر آیا۔" وہ تیزی سے اٹھ کر باہر گیا۔ گھر میں خاموشی کا راج تھا۔ اس کی اپنی فیملی تو نائلہ آنٹی کے گھر جا چکی تھی۔ تاہم فائقہ بھابھی (تایا زاد عمران کی بیگم) کے کمرے کی لائٹ جل رہی تھی۔

کچن میں جھوٹے برتن پڑے تھے۔ اس نے سارا کچن چھان مارا کہ کہیں بیمار دادی کا پرہیزی کھانا امی تیار کرکے رکھ گئی ہوں' مگر کچھ نہ ملا' نہ کوئی دلیہ' یخنی۔

"کمال ہے' حد ہے بے حسی کی۔ گھر میں بزرگ بیمار ہے اور کھانے کو کچھ تیار کرکے نہیں رکھا۔" اس کے دل میں غصہ جاگا تھا۔ فریج میں جھانک کر دیکھا تو سبزی و چکن موجود تھے۔ اس نے آہستہ سے عمران بھائی کے دروازے پہ دستک دی۔

"آجاؤ۔" اجازت ملنے پہ اندر داخل ہوا۔

"بھابھی! دادی کی طبیعت خراب ہے۔ آپ پلیز ان کے لیے کچھ سوپ وغیرہ بنادیں۔"

عمران بھائی بیڈ پر نیم دراز تھے اور فائقہ ان کے ساتھ بیٹھی ڈرائی فروٹ کھا رہی تھیں۔ دونوں کی نظریں دیوار پہ نصب ایل ای ڈی پہ لگی تھیں۔

"سوری ولید! اس وقت اٹھنے کی ہمت نہیں ہو رہی۔ ویسے بھی عمران پورے دو ہفتے بعد اسلام آباد سے واپس آئے ہیں۔" بولتے ہوئے فائقہ بھابھی نے عمران کے بازو پہ ہاتھ رکھا تو عمران بھائی مسکرا دیے۔

وہ خاموشی سے باہر نکل آیا۔ جیب تھپتھپا کر بائیک کی چابی کی موجودگی محسوس کی۔ قریبی درمیانے درجے کے ہوٹل سے چکن سوپ لے آیا۔ دادی کے قریب بیٹھ کر بہت پیار اور توجہ سے انہیں سوپ پلایا۔ شمائلہ کی بار بار کال آرہی تھی مگر اس نے موبائل سائلنٹ پہ لگا دیا۔

دوائیں دیتے ہوئے اسے ایک اور جھٹکا لگا تھا۔ اکثر دواؤں کی سیل تک کو کھولا ہی نہیں گیا تھا۔

"یہ کیا دادی! آپ میڈیسنز نہیں لیتی ہیں۔ صرف انجکشنز پہ گزارا کرتی رہیں؟" وہ صدمے کے زیر اثر پوچھ رہا تھا۔

"بچے کون پلاتا دوائیں' یہاں تو کھانے کو لالے پڑے ہیں۔ کوئی جھانک کر نہیں پوچھتا' بڑھیا مر گئی ہے یا زندہ ہے؟ یہ بوڑھے ہاتھ اتنے سخت ڈھکن کیسے کھول سکتے ہیں؟" بے چارگی سے بولتے ہوئے یکمہ خاتون کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے تھے جو چہرے کی جھریوں میں مدغم بھی ہوتے جارہے تھے۔

ولید نے خود کو شرمندگی کی دلدل میں لحہ بہ لحہ دھنستا محسوس کیا تھا۔

"اف! کیا ہو رہا ہے یہ؟ کیوں ہو رہا ہے یہ؟"

شرمندگی، دکھ اور بے یقینی نے اس کے حواس کو لمحہ بھر کے لیے ماؤف کر دیا تھا۔ کیا اس دو منزلہ پر تعیش "رضا ولا" میں ہنستے بستے دو خاندانوں کے ایک فرد کے دل میں بھی اتنی سی ہمدردی نہیں تھی کہ وہ دور ایک کونے میں بنے سادہ سے کمرے میں پڑے نحیف و نزار وجود سے اس کے کھانے، پینے یا طبیعت کا پوچھ لے۔ کسی ایک کے پاس بھی لمحہ بھر کی فرصت نہ تھی کہ ان کے پاس بیٹھ کر ان کے من کی چار باتیں سن لے۔

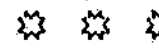
یہ بستر پر پڑی ہوئی بیمار، لاچار اور شدید بھوک کا شکار عظیم رضا اور کلیم رضا کی والدہ ماجدہ تھیں جنہوں نے اس گھر کی بنیادیں اپنی محبت، خلوص، چاہت اور نیک نیتی سے کھڑی کی تھیں اور آج پیرانہ سالی کا شکار ہو کر خود محبت اور چاہت کی ایک ایک بوند کو ترستی زندگی کے ایام پورے کر رہی تھیں۔ دونوں بہوؤں کی دو دو بہویں، اپنے پوتے، پوتیوں میں سے کسی کے پاس بھی اتنا وقت نہ تھا کہ گھڑی بھر کو جھانک کر ان کی خیر خیریت دریافت کر لیتا۔

طویل و عریض "رضا شاپنگ پلازہ" کے مالک، جن کی دکانوں کا شمار مشکل اور ان دکانوں سے حاصل ہونے والی آمدنی کا شمار اور بھی مشکل۔ کلیم و علیم کے دونوں بڑے بیٹے بھی اسی پلازے میں اپنی کاروباری صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنی فیملیز کی ذمہ داریاں بحسن و خوبی ادا کر رہے تھے۔

جبکہ ولید ایم بی اے ——— کی ڈگری حاصل کر کے اپنے گھر کے تمام مرد حضرات کے کاروباری سیٹ اپ میں ذرہ برابر دلچسپی نہ ہونے کی بنا پر ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں بطور کو آپریٹو منیجر کا کام کر رہا تھا۔ دادی سے محبت اس کی گھٹی میں پڑی تھی۔ ففتھ اسٹینڈرڈ تک تو وہ ان کے ساتھ ان سے لپٹ کے سوتا تھا۔ پھر رات گئے پڑھائی کی بنا پر اسے الگ کمرے میں شفٹ ہونا پڑا تھا کہ دادی کو لائٹ ڈسٹرب کرتی تھی۔

ان کے کھانے پینے کا خیال رکھنے سے لے کر بالوں میں کنگھی کرنے تک وہ سارے کام نہایت خوش دلی اور ادب سے کرتا تھا۔ بس ان ہی ایک دو ہفتوں میں آفس میں آڈٹ کی وجہ سے کام بے تحاشا بڑھ گیا تھا اور وہ دادی کی خبر گیری نہیں کر سکا تھا جس کا نتیجہ انتہائی افسوس ناک صورت حال کی شکل میں اس کے سامنے تھا۔ ایک تو بخار اور اوپر سے شدید بھوک۔ کمزوری و نقاہت نے دادی کی کیا حالت بنا رکھی تھی۔

رات کافی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ شمائلہ کی لاتعداد مسڈ کالز شو ہو رہی تھیں جو اس نے انگوٹھے سے سوئپ کر کے اسکرین سے ہٹا دیں۔ دادی سوپ کے بعد دوائیاں لیتے ہی پر سکون نیند سو گئی تھیں۔ وہ بھی ساتھ والے بیڈ پہ آ کے لیٹ گیا۔



ساتھ والی نغمہ آنٹی کے چھوٹے بیٹے کو پچھلے کئی دنوں سے قے اور دست آ رہے تھے۔ گرین ٹی میں چند قطرے لیموں کے ڈالنے کے لیے انتہائی عاجزی و ادب کے ساتھ دادی سے لیموں مانگنے آئیں مگر دادی نے کھٹ سے انکار کر دیا۔

"ابھی کچے ہیں۔ رس نہیں آیا۔ خواہ مخواہ ضائع ہوں گے۔" نغمہ بے چاری مایوس لوٹ گئی۔

"قسم سے دادی، بڑی ظالم ہیں۔ کیا تھا جو ایک دو لیموں دے دیتیں۔ بھرے باغ میں کیا فرق پڑ جاتا۔" نیلی نے متاسفانہ انداز میں سر ہلایا تھا۔

"مجھے تو افسوس ہو رہا ہے کہ مجھ جیسی دیالو کی آپ کیسے دادی بن گئیں۔ ابو جیسے سخی کی ماں ہو کر اتنی تھڑدلی دکھائی، کل کو قیامت کو اللہ کو کیا منہ دکھائیں گے چہ چہ، بے چارہ بچہ۔"

"چپ کر نگوڑ ماری!" دادی نے غصے سے اسے ڈپٹ دیا۔ "بڑی آئی علامہ کہیں کی۔ کبھی چلو بھر پانی ڈالا ہے پودوں کو، کبھی گوڈی، صفائی کی جو یوں بڑھ کر دادی کو نصیحت جھاڑ رہی ہو۔"

دادی اپنی کزن عزیزہ کی عیادت کے لیے جا رہی تھیں۔

ہوا کچھ یوں کہ عزیزہ قریبی مارکیٹ سے کچھ سامان خریدنے گئیں۔ سڑک کے دوسری طرف انہیں اپنی جوانی کے ایام میں بچھڑی ایک سہیلی نظر آ گئیں۔ سہیلی کی ایک جھلک نے انہیں اس درجے مسرت سے ہمکنار کیا کہ گرد و پیش کی تیز رفتار ٹریفک کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے سڑک پار کرنے لگیں تاکہ جلد از جلد سہیلی کو گلے لگا کر برسوں کی تشنگی مٹا سکیں، اس خیال سے کہ عزیز از جان دوست کہیں نظروں سے اوجھل نہ ہو جائے، صرف ان پر نظر ٹکائے سیدھ میں چل ہی رہی تھیں کہ سامنے سے آتی تیز رفتار بائیک کی زد میں آ گئیں۔

موٹر سائیکل سوار خدا ترس اور ایمان دار تھا جس نے انہیں اٹھنے اور گھر پہنچانے میں مدد کی۔ مگر یہی ہمدردی اس بیچارے کے گلے پڑ گئی۔ عزیزہ کے بیٹوں نے بائیک سوار کو گلے سے پکڑ کر ماں کی تکلیف کا حساب مانگا۔ اور یہی بات دادی کو کھولائے جا رہی تھی۔

"بھلا بتاؤ، نیکی کا زمانہ ہی نہیں۔ وہ نیک بخت ایک تو گھر چھوڑنے آیا مگر عزیزہ نگوڑ ماری جونک کی طرح اس غریب کی جان کو چمٹ گئی ہے۔"

سننے میں آیا ہے کہ تائی عزیزہ کو طاقت کے سیرپ اور انرجی ڈرپس لگائی جا رہی ہیں۔ اگرچہ ٹکر سے انہیں کوئی چوٹ وغیرہ نہیں آئی تھی مگر موت کو اتنے قریب پا کر حواس ایسے گم ہوئے کہ ساری انرجی جاتی رہی اور ہاسپٹل کا سارا خرچ اس موٹر سائیکل سوار کو ادا کرنا پڑ رہا ہے۔ گلو خلاصی کی یہی شرط تائی عزیزہ کے بیٹوں کی طرف سے رکھی گئی تھی۔ ورنہ بصورت دیگر جیل کا منہ دیکھنا پڑے گا۔

دادی کی ساری ہمدردیاں اس موٹر سائیکل والے کے ساتھ تھیں، جس کی جیب کو عزیزہ بڑے مزے سے خالی کروا رہی تھیں۔

"ارے یہ عزیزہ ہے ہی چالاک اور موقع پرست، غریب بچے کی شرافت اور ایمان داری سے ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہے۔ ارے ایسی کون سی خون نم خون ہو گئی تھی جو اس نمانے کی جان نہیں چھوڑ رہی۔ حد ہو گئی غلطی اپنی تھی۔ سہیلی کے دیدار نے ایسی کیا بینائی چھین لی۔"

سفید ململ کا دوپٹہ جھٹک کر اوڑھتے ہوئے دادی ناگواری سے کہہ رہی تھیں۔ وہ بلال کے ساتھ تائی عزیزہ کی عیادت کو جا رہی تھیں۔

ادھر بلال نے بائیک اسٹارٹ کی۔ ادھر نیلوفر نے ڈھیر سارے لیموں توڑے، انار، امرود اور فالسے بھی شاپر میں ڈال دیے اور نغمہ کے گھر دے آئی۔ نگہت اسے منع کرتی رہیں۔ "نیلی! مت توڑو، پھل، اماں واپس آ کر ایک ایک درخت کا جائزہ لیں گی۔" مگر ادھر پروا کسے تھی۔

"ارے امی! ڈریں مت۔ کیا ہو گا؟ زیادہ سے زیادہ دادی چیخیں گی، چلائیں گی۔ ابو کو شکایت لگائیں گی بس۔"

"امرود پہ چاٹ مسالہ لگا کر مزے سے کھاتے ہوئے نیلی آرام سے بولی۔

وہ تو شکر اس نے صرف نغمہ پہ اکتفا کر لیا تھا ورنہ تو اس کا دل چاہ رہا تھا سارے باغ کے کچے پکے پھل توڑ کر شاپر بھر بھر کر پورے محلے میں بھیجے۔ دادی نے جو اس کے ساتھ کیا تھا، اس کے مقابلے میں یہ کم تھا۔ پچھلے ہفتے شگفتہ پھپھو کی سسرال میں سے چند خواتین نیلی کو دیکھنے آئیں۔ چار عدد خواتین کے ہمراہ کوئی نصف درجن بچے تھے، جنہیں دادی کے ہاتھ سے سینچا گیا یہ باغ بے حد پسند آیا تھا۔ اتنا پسند کہ پھول توڑ توڑ کر کانوں میں اڑسے، پھلوں سے جیبیں بھریں اور ایک دوسرے پر پھلوں سے خوب نشانہ بازی کی مشق کی۔

دادی جب اندر خواتین کے انٹرویو سے فارغ ہو کر باہر آئیں تو چکرا کر رہ گئیں۔ باغ اور صحن کا حلیہ ہی بگڑا ہوا تھا۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ، دادا کی چھڑی لے کر بچوں کی خوب دھلائی کی۔ چھڑی کی ضرب سے ناچتے، ناچتے، روتے بچے دیکھ کر مائیں آبدیدہ سی ہو گئیں۔ ایک نے تو آگے بڑھ کر دادی کو ان کو ان کی بے رحمانہ کارروائی پر شرمندہ کرنا چاہا مگر دادی کیا شرمندہ ہوتیں الٹا انہیں ہی شرمندہ ہونا پڑا۔

"اتنے بدتمیز، ڈھیٹ اور ندیدے بچے میں نے

زندگی میں کبھی نہیں دیکھے۔ بہتر تھا کہ منہ پہ اتنی لیپا پوتی کرنے کے بجائے بچوں کو کسی کے گھر میں بیٹھنے کی تمیز سکھا آتیں۔" کمر پہ ہاتھ ٹکا کے دادی نے وہ بھگو بھگو کے جملے مارے کہ خواتین کو جاتے ہی بنی۔

لڑکے والوں کو نیلی بہت پسند آئی تھی۔ مگر دادی نے سند پسندیدگی بخشنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

"میں ایسے شیطان بچوں کو گھر میں داخلے کی اجازت ہرگز نہیں دوں گی۔ جنہوں نے میری ساری محنت کو لمحوں میں نوچ کر رکھ دیا۔"

"اماں! یہ تو کوئی وجہ نہ ہوئی انکار کی' لڑکا پڑھا لکھا اور سلجھا ہوا ہے۔ ایگری کلچرڈ یپارٹمنٹ میں اچھی پوسٹ پہ ہے۔ ہمیں اور کیا چاہیے۔" بیٹے نے نرمی سے انہیں رام کرنا چاہا مگر بے سود۔

"بچے تو بدتمیز تھے ہی' ماؤں کو کون سا لحاظ تھا۔ فٹ میرے منہ کو آ گئیں۔ ہائے ہاں جی! ذرا سے پھل ہی تو توڑے ہیں۔ پھر اگ آئیں گے۔ اتنا چھوٹا دل بھی کس کام کا؟" دادی جل کر لڑکے کی بہن کی نقل کرتے ہوئے بولیں۔

"یعنی شرم نام کی چیز نہیں' ایک تو نقصان کیا اوپر سے اپنے بچوں کو مورد الزام ٹھہرانے کے بجائے میرے منہ کو آنے لگیں۔ آئیں مجھ سے معافی مانگیں پھر دیکھتے ہیں۔" شان بے نیازی سے فیصلہ سنا دیا گیا۔

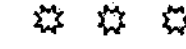
نگہت اور عتیق کسی طور اس رشتے کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتے تھے' اس لیے ان کے درخواست کرنے پر لڑکے کی بہن بخوشی ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنے کو تیار ہو گئی' مگر مسئلہ باقی تین خواتین کا تھا' جن میں سے پھپھو کے پوتے کے گھٹنے پہ زور سے چھڑی لگی تھی اور گھٹنا سوج چکا تھا' گھٹنا بھی اس پوتے کا جو چار پوتیوں کے بعد اس دنیا میں آیا تھا۔ اس لیے دادی سے معافی مانگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اچھی خاصی ضربیں تو لڑکے کے بھتیجے کو بھی لگی تھیں جس کی ماں بہن کو دیورانی بنانے کی خواہش دل میں دبائے' محض ساس کے دباؤ پہ آ بیٹھی تھی بھلا دادی سے سوری کر کے نیلوفر کو کیوں دیورانی بناتی۔

یوں یہ بیل منڈھے چڑھنے کے بجائے چند دنوں بعد ہی مرجھا کر رہ گئی۔ نگہت اور عتیق اس رشتے کے ہاتھ سے جانے پہ بے حد افسردہ تھے اور نیلی کو لگتا تھا دادی کے ہوتے ہوئے اس کے ہاتھ پیلے ہونا ناممکن ہیں۔

"آپ چاہتی ہی نہیں ہیں کہ میں خوش رہوں۔ اچھے اچھے کپڑے اور جیولری پہنوں۔ اس سڑی بسی' بے رنگ زندگی سے نکلوں۔" وہ دادی کے سر پر جا کر خوب چلائی تھی۔

"ہاں تو مجھے خوب سکھ آرام دے رہی ہے ناں اس لیے میں چاہتی ہوں کہ تو میری آنکھوں کے سامنے رہے۔ مجھے مزے مزے کے کھانے بنا کر کھلاتی ہے۔ میرے پاؤں دباتی ہے۔ میرا کہنا مانتی ہے' میرے بال بناتی ہے۔ اس لیے میں چاہتی ہوں کہ تو لمحے بھر کو میری نظر سے اوجھل نہ ہو۔"

دادی کا لفظ لفظ طنز میں ڈوبا ہوا تھا۔ اور نیلی اپنے دکھ کو کم کرنے کی خاطر دادی سے چھپ کر پھل توڑ توڑ کر محلے میں بھیجتی رہی۔



شمائلہ اس پہ اتنی ہی ناراض ہو رہی تھیں جتنا ان کا خیال میں انہیں ہونا چاہیے تھا۔

"ولید! میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم اتنی لاپروائی اور غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کرو گے۔ کتنی شرمندگی اٹھانی پڑی مجھے سب کے سامنے۔ کچھ اندازہ ہے تمہیں؟ پورا خاندان جمع تھا۔ ایک تم نہیں تھے۔ کیا سوچتے ہوں گے وقار بھائی کہ سب ملنے آئے ایک بھانجے کو ہی ٹائم نہیں ملا۔" بولتے بولتے آخر میں شمائلہ کی آواز کچھ پھٹ سی گئی تھی۔

"امی! دادی کو سخت بخار تھا۔ اوپر سے ان کے کھانے کے لیے بھی کچھ نہیں بنا ہوا تھا۔ اتنی سنگ دلی اور بے رحمی کی وجہ جان سکتا ہوں؟" وہ تحمل سے پوچھ رہا تھا۔

"ہاں تو کیا اماں صرف ہماری ذمہ داری ہیں کیا۔ عظمیٰ بھابھی کا بھی تو فرض بنتا ہے۔ ساس کے حقوق

کچھ ان پر بھی واجب ہوتے ہیں کہ نہیں۔ وہ تو بال بچوں کو لے کر بھانجی کی شادی نمٹانے کوئٹہ چل پڑیں مزے سے اور اس بوڑھی جان کی فکریں ہمارے سر منڈھ گئیں۔" شمائلہ کا لہجہ بے حد ترش تھا۔

"چچی کا طرز عمل خود ان کے ذمے' مگر آپ کو تو دادی کا کچھ خیال رکھنا چاہیے۔ بزرگ گھر کی چھاؤں اور رحمت ہوتے ہیں۔ سوچیں یہ وقت آپ پر اور مجھ پر سب پر آنا ہے۔ بے بسی' لاچاری' تنہائی اور بیماری ان کے بڑھاپے کی دین ہے' ورنہ تو کس کا دل چاہتا ہے اکیلے کمرے میں دیواریں تکنے کو۔" ولید بے حد رنجور ہو رہا تھا۔

"شاباش ہے بیٹے! ایک تو خاندان کے سامنے ماں کو شرمندہ کیا۔ سب سے کہا میرا ولید وقت کا پابند اور ذمہ دار ہے اور ماں کے کہے کی خوب لاج رکھی۔ بس دادی کے حقوق یاد آ رہے ہیں۔ میری سمجھ میں تو یہ نہیں آ رہا گھر میں اور بھی افراد رہتے ہیں۔ مگر یوں دادی کی محبت کی' ہڑک ہر وقت تمہیں ہی اٹھتی رہتی ہے۔" شمائلہ خوب طنز سے بولیں۔

"وہ اس لیے کہ انہوں نے بچپن سے ہی مجھے گود لے لیا تھا۔ پیار کیا' ساتھ سلایا' بیماری میں پہروں میرے ساتھ جاگیں' نوالے بنا بنا کر میرے منہ میں ڈالے' مجھے تیار کر کے اسکول بھیجا۔ میرے بال سنوارے' میرا ماتھا چوما' بتائیں گھر میں ڈھیروں پوتے' پوتیوں میں سے کس کو ان کی اتنی محبت نصیب ہوئی ہے جتنی مجھے ہوئی۔" وہ تو پھٹ پڑا تھا جیسے۔ ماں کے طنزیہ انداز نے بے حد دکھی کیا تھا۔ شمائلہ اس کے یوں پھٹ پڑنے پر خفیف سی ہو کر رہ گئی تھیں۔

یہ سچ تھا کہ اٹھائیس سال قبل ولید اور فروا کی ایک ساتھ پیدائش پہ وہ سخت بیمار پڑ گئی تھیں۔ ولید ماشاءاللہ خوب صورت' گبھلو اور صحت مند بچہ تھا۔ جب کہ فروا جسمانی لحاظ سے بے حد کمزور اور بیمار بچی تھی' جو ہر وقت روتی رہتی تھی۔ شمائلہ کے لیے دو بچوں کو سنبھالنا بے حد مشکل امر تھا۔ ایسے میں بیگمہ خاتون نے ولید کو آگے بڑھ کر گود میں لے لیا تھا۔

خوب صورت' چست' اور من موہنا ولید دادی کے زیر شفقت پروان چڑھتا گیا۔ اٹھائیس سال قبل بیگمہ خاتون بھی ایک صحت مند' چست اور رعب دار خاتون تھیں' گھر کی راجدھانی کی ملکہ' شوہر رضا احمد کی من چاہی بیوی' دو بیٹوں اور تین بیٹیوں کے فرض سے سبکدوش ہونے کے بعد مکمل فراغت اور یکسوئی سے ولید کی پرورش کرنے لگیں۔ وقت گزرتا گیا۔ وہ فروا جس کی وقت پیدائش جسمانی صحت کو دیکھتے ہوئے یہ یقین کرنا محال تھا کہ چند ماہ سے زیادہ زندہ رہ پائے گی' ماں کی طرف سے ملنے والی بھرپور' توجہ' محبت اور محنت کی بدولت آنے والے چند سالوں میں ایک صحت مند چست اور ذہین بچی بن چکی تھی۔ بیسویں برس گریجویشن کرتے ہی بڑی پھپھو بیاہ کر لے گئیں اب جب کہ ولید کے دل میں دادی کی محبت' احترام اور تابع داری رچ بس گئی تھی تو ایسے میں بیٹے کا دادی کے بارے میں حد سے زیادہ متفکر و ہلکان رہنا انہیں تپا کے رکھ دیتا تھا۔

ایسا نہیں تھا کہ ولید ماں کی عزت و احترام نہیں کرتا تھا مگر دادی کے حقوق کے حوالے سے ہر وقت اس کا لیکچر بھی دوسرے افراد کی طرح ان پہ بھی گراں گزرتا تھا۔ اب جیسے ان کے بھائی وقار احمد جرمنی سے پورے دس برس بعد اپنی فیملی کے ہمراہ پاکستان آئے تھے۔ بڑے بھائی ابرار نے اس خوشی میں پورے خاندان کو مدعو کیا تھا۔ سب ہی چھوٹے بڑے دعوت میں موجود تھے سوائے ولید کے' جس نے برسوں بعد آنے والے ماموں سے ملنے کے بجائے' بیمار' دادی کی تیمارداری کو زیادہ ترجیح دی تھی۔ خفا ہونا تو بنتا تھا ناں۔

"اچھا چھوڑو' تمہیں وقار بھائی کی بیٹی حریم یاد ہے؟ کتنی چھوٹی سی ہوتی تھی' اب ماشاءاللہ سے بہت بڑی اور خوب صورت ہو گئی ہے۔ لمبی' اسمارٹ۔" بیٹے کے وجیہہ چہرے کے تنے تنے نقوش دیکھ کر وہ کچھ دھیمی پڑی تھیں۔

"فُل انگلش اسپیکنگ ہے۔ میرے تو ایک لفظ بھی پلے نہیں پڑا۔" شمائلہ ذرا سا ہنسیں۔ "مگر ہے

بہت خوش اخلاق۔"

وہ اب توجہ اور دلچسپی سے ماں سے دعوت کی روداد سن رہا تھا۔ ماں سے محبت اس کی گھٹی میں پڑی تھی۔ ماں کا احترام اس کے لیے عین عبادت کا درجہ رکھتا تھا۔



جولائی کے حبس بھرے جلتے بلتے دن انتہائی سست روی اور بے کیفی سے گزر رہے تھے کہ اتنے میں دادا کے کزن کے ہاں سے شادی کا دعوت نامہ آگیا۔ جو ہوا کے ٹھنڈے جھونکے کی مانند محسوس ہوا تھا۔ نیلی نے اسی دن لان کے تین سوٹ نگہت سے سلوا لیے۔ قریبی پارلر جاکر جلد چمکوائی' بال رنگوائے۔

"ہونہہ' بیگانی شادی میں عبداللہ دیوانہ" دادی نے اس کی پرجوش تیاریوں پہ تبصرہ کیا تھا۔

"کیا بیگانی شادی؟ دادا کے کزن کے سالے کی پوتی کیا بیگانی لگتی ہے ہماری؟" نیلی کو دادی کی بات پہ حیرانی ہوئی تھی۔ "چلیں بیگانی ہی سہی گھر کی بور' بے رنگ اور اکتاہٹ بھرے معمولات میں کوئی تبدیلی تو آئی۔ دلہن کی بڑی بہن ثمینہ نے تو بطور خاص اس کا نام لے کر کہا تھا۔

"نیلی! تمہیں شادی پہ ضرور آنا ہے۔ اگر تم نہ آئیں تو ہم ناراض ہو جائیں گے۔"

ثمینہ باجی کے اپنائیت بھرے لہجے میں چھپی دھونس نے اسے نہال سا کر دیا تھا۔ بے حد اترا کر دادی کو دیکھا جنہیں اس کی تیاری پسند نہیں آرہی تھی۔ ان کے خیال میں شادی پہ صرف نگہت کو جانا چاہیے۔ دادا کے شوخے رشتہ داروں میں نیلی کو نہیں جانا چاہیے۔ لیکن نیلی چونکہ سجنے' سنورنے کی شوقین' شادیوں کا ہلا گلا' رونقیں' ڈانس اور رسمیں بہت پسند تھیں' اس لیے جی جان سے بینا کی شادی کی تیاری میں لگی ہوئی تھی۔ اوپر سے باجی ثمینہ کا محبت بھرا اصرار۔

"بینا نے کہا کہ نیلی کو میری طرف سے بھی انوائٹ کرنا۔ کوئی عذر نہیں چلے گا۔" بولتے ہوئے ثمینہ نے شربت کا گلاس منہ سے لگایا۔

"جی ضرور کیوں نہیں۔" نیلی کا عاجزی بھرا انداز مگر ثمینہ کا اگلا جملہ۔

"اور نہیں تو کیا' سارے کام تو تمہیں ہی کرنے ہیں۔ بینا کا جہیز کا سارا سامان د   کے گھر شفٹ ہو چکا ہے۔ مگر روم کی سیٹنگ تو کرنی ہے۔ دیوار پہ کلاک لگانا ہوگا' سیڑیاں' اونچی الماریوں میں برتن سیٹ کرنے ہیں۔ پردے لٹکانے ہیں۔ یہ سب اب تمہیں ہی کرنا ہے۔ بھلا تمہارے علاوہ اور کس کا اتنا لمبا قد ہے کہ اونچی اونچی الماریاں سیٹ کرے۔"

ثمینہ توصیفی انداز میں کہہ رہی تھی۔ اس نے کئی منٹ ایک ہی زاویے میں بیٹھے رہنے کے بعد چہرہ موڑ کر دیکھا تو دادی کے چہرے پہ دبی دبی ہنسی تھی۔

"ثمینہ باجی! دلہن کے کمرے میں چھت والا پنکھا بھی تو لگانا ہوگا۔ ڈونٹ وری' میں لگا دوں گی۔" وہ ٹھنڈے ٹھار انداز میں بولی تھی۔

"ارے نہیں جانو! اب سارا کام تمہیں تھوڑی کرنا ہے۔ یہ دولہا والوں کا کام ہے۔" ثمینہ نے ہنس کر اس کی سنجیدگی کم کرنے کی کوشش کی تھی۔

"پاگل لوگ ہیں جو اتنی غضب کی گرمی میں شادی کر رہے ہیں۔" ثمینہ کے جانے کے بعد دادی نے منہ بنا کر کہا تھا۔

"اور اس سے زیادہ پاگل وہ جو اتنی گرمی کی شادی اٹینڈ کریں گے۔" اپنی بات پہ نیلی خود ہی ہنس پڑی تھی۔



"چٹیاں کلائیاں وے
بے بی تیری چٹیاں کلائیاں وے"

شوخ سروں میں گنگناتے ہوئے نیلی بھر بھر کانچ کی چوڑیاں کلائیوں میں چڑھا رہی تھی۔ پورے بازوؤں پہ مرمی وانے الگ بہار دکھا رہے تھے۔ اونچے لمبے وجود پہ سجا من موہنا مگر صحت مند مکھڑا۔ گلوس لگے بھرے بھرے کٹاؤ دار لب' (میک اپ کی وجہ سے بھرا بھرا صحت مند چہرہ اور بھی بڑا لگنے لگا تھا)

"کتنا زیادہ سوہنا مجھے رب نے بنایا۔" آئینے میں اپنا جائزہ لیتے ہوئے وہ زیر لب گنگناتے ہوئے ہنس پڑی تھی۔ مگر یہ سارا بناؤ سنگھار شادی والے گھر تک پہنچتے پہنچتے پسینے کی صورت بہہ نکلا تھا۔

مہمانوں کا رش' گرمی' تیز میوزک کا شور' اس کی تو طبیعت بھی خراب ہونے لگی تھی۔ نگہت رشتہ داروں سے ملنے میں مصروف ہو گئیں۔ وہ اندر دلہن والے کمرے میں آگئی جہاں سولر کولر کی وجہ سے ماحول قدرے ٹھنڈا اور پرسکون تھا۔

"پتا ہے نیلی! جو شہہ بالی دلہن کے ساتھ رہتی ہے اس کی ضروریات کا خیال رکھتی ہے۔ اس کا جھوٹا کھانا کھاتی ہے تو اس لڑکی کے نصیب بھی جلد کھل جاتے ہیں۔" زرد ملبوس اور گیندے و بیلے کے پھولوں سے سجی بینا نے اس کے کان میں سرگوشی کی تو اس کی آنکھیں لمحے بھر کو چمکی تھیں۔ بینا کی بات نے دل پہ اثر کیا تھا۔

"تو اس کا مطلب ہے باجی! آپ کبھی کسی دلہن کی شہہ بالی نہیں بنیں۔ نہ ہی دلہن کا جھوٹا کھایا۔" بینا کی تاخیر سے ہونے والی شادی کی وجہ جو اس وقت ذہن میں آئی تھی' فوراً" بینا سے شیئر بھی کرلی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ میں بڑی عمر کی ہوں۔ جاؤ باہر جاکر دیکھو' مصباح کو' منزہ کو' مجھ سے چار چار سال بڑی ہیں مگر شادی تو کیا منگنی کا بھی دور دور تک کوئی امکان نہیں۔" بتیس برس کی بینا غصے سے چنگھاڑ رہی تھی۔

"اوہ سوری بینا باجی! میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" اس نے گھبرا کے فوری معذرت کی اور بینا کے بگڑے موڈ کو دیکھتے ہوئے باہر نکل آئی۔ ناچ گانا بہت ہو چکا تھا۔ اب بری دکھائی جانی تھی' مگر بری کے بیگ کی چابی دولہا کی بہن کے پرس میں تھی۔ اور دولہا کی بہن غائب۔

"ہائیں' یہ اتنے اہم موقع پہ بہن کا غائب ہونا کچھ تو معنی رکھتا ہے۔" عورتوں کی معنی خیز بلند آوازیں دولہا کی اماں جان کا بلڈ پریشر ہائی کیے جارہی تھیں۔

"نگوڑ ماری کہاں مر گئی' گھر سے تو ساتھ چلے تھے۔" ہر کمرہ چھان مارا۔ گھر بھر میں دولہا کی بہن کی ڈھنڈیا مچ چکی تھی۔ اوپر سے رشتہ داروں کے کلیجہ جلاتے جملے۔

"یہ لیٹیری تو چاہتی ہی نہیں تھی کہ بینا اس کی بھابھی بنے۔ دیکھا عین ٹائم پہ بدمزگی پھیلا دی۔" بینا کی اماں کے ماتھے پہ تیوریاں چڑھی تھیں۔

"یہ لڑکی ابھی سے دل برا کر رہی ہے تو آگے میری بچی کے ساتھ کیا کچھ نہیں کرے گی۔" مجمع ٹھٹھے اڑا رہا ہے اور بری ہے کہ بند پڑی ہے۔"

"کہیں خالی بیگ تو نہیں اٹھا لائے' شرمندگی کے ڈر سے بہن کو ادھر ادھر کر دیا۔" دلہن کی چچی نے بہ آواز بلند تشویش ظاہر کی تھی۔

اس سے پہلے کہ کوئی ان کے خیالات سے اتفاق ظاہر کرتا' دلہن کی بہن بشریٰ ہنستی مسکراتی' بے حد خوش اور سرشار' کیوں کہ اس لمبی گلی کے شروع میں دلہن کے گھر آنے کے لیے نکلتی ایک سجی سنوری لڑکی اس کے گلے لگ گئی تھی۔ یہ لڑکی بشریٰ کی اسکول کے زمانے کی پکی سہیلی تھی۔ جو گردش حالات سے نجانے کہاں چھپ گئی تھی۔ اب اچانک سر راہ پرانی دوست ملی تو بشریٰ کے ذہن سے نکل گیا کہ آج رات اس کے بھائی کی مہندی کا فنکشن ہے۔ سہیلی ہاتھ پکڑ کر گھر لے گئی۔ اور بیٹھ کر بیتے سنہری دنوں کی یادوں کو تازہ کیا گیا۔ وہی دوست اب ہمراہ تھی۔ اماں جان نے مارے خجالت و شرمندگی کے زور سے تھپڑ صاحب زادی کے منہ پہ دے مارا۔ اتنی بے عزتی وہ بھی سب کے سامنے' بشریٰ نے چابی والا پرس ماں کی طرف اچھال کر وہیں بیٹھ کر رونا شروع کر دیا۔

اب وہی سہیلی اسے چپ کروا رہی تھی۔ نیلی کے لیے یہ ساری صورت حال بے حد دلچسپ تھی۔ اندر بینا بھی نند کی اس غیر ذمہ دارانہ حرکت کی وجہ سے کھول رہی تھی۔ برملا غصے کا اظہار کر رہی تھی۔

"اچھا بس اب چپ کرو۔ بشریٰ لاڈلی ہے ایسا نہ ہو کہ اسے کوئی جاکر تمہاری گل افشانیاں بتا آئے۔ پہلے بھی بڑی مشکل سے رشتہ ہوا ہے۔" ثمینہ نے غصے

سے ڈانٹا تو بینا چپ ہوگئی۔
نگہت تو فنکشن کے بعد گھر چلی گئیں۔ مگر نیلی کے دل پہ بینا کی بات جم سی گئی تھی۔
رات کو سونے کے لیے بینا کا بستر خود اپنے ہاتھوں سے بچھایا۔ بینا گھر کا آخری چیں تھی۔ اس لیے گھر کی ذمہ داریاں خوب نمٹاتی تھیں۔
"ارے جاؤ نیلی! گھر کی بڑی بتیاں بند کر آؤ۔ خوامخواہ بجلی ضائع ہو رہی ہے۔" محلے کی بیوٹیشن سے مہندی لگواتے ہوئے حکم صادر کیا گیا تھا۔ ہر پانچ منٹ بعد کوئی نہ کوئی کام بینا کو یاد آجاتا۔
"دیکھو واش روم کو زیادہ خراب تو نہیں کر دیا دیہاتی رشتہ داروں نے۔"
"کام والی ماسی نے پلیٹیں اچھی طرح دھوئی ہیں یا نہیں۔ ہماری بھابھیاں تو یقیناً" ادھر ادھر ٹہل رہی ہوں گی۔ مجال ہے جو کوئی کام ٹھیک طریقے سے کر لیں۔" اور نیلی کو بینا کی دونوں بھابھیوں کے چہرے پہ جھلکتی خوشی کی وجہ سمجھ میں آگئی تھی۔ سب رات گئے تھکے ہارے سوئے مگر صبح سویرے ہی بینا نے سب کو جھنجھوڑ کر اٹھا دیا۔
"اگر سب دن چڑھے اٹھیں گے تو دولہے والوں کا استقبال کریں گے؟" بینا بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ کولر کا سوئچ بھی بند کر دیا۔
"اُہ بینا باجی! اللہ آپ سے پوچھے۔" سب مندی مندی آنکھوں سے بینا کو گھور رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

بارات والے دن وہ دادی کے ان کار نگین کھجور کے پتوں والا پنکھا لے آئی تھی۔ جو شیشوں سے مزین تھا، اس کے کناروں پر پھندنے لگے ہوئے تھے۔ دادی پنکھا دینے پر صاف انکاری تھیں۔
"چالیس سال سے اس پنکھے کو میں نے سنبھال کر رکھا ہے۔ ٹرین کے سفر میں تمہارے دادا نے مجھے لے کر دیا تھا۔ جب میں ایک مہینے کی دلہن تھی۔ ایسے ہی تمہیں اٹھا کر دے دوں۔ واہ! اتنا نادان سمجھ رکھا ہے مجھے۔"
"پلیز دادی! شادی والے گھر میں غضب کی گرمی ہے۔ آئی پرامس میں بحفاظت اسے واپس لے آؤں گی۔" وہ ایسے ملتجیانہ انداز سے بولی کہ دادی کو پنکھا دیتے ہی بنی وہ بھی ہزار ہا تاکید کے ساتھ۔
"اگر یہ تم سے گم ہوا یا ٹوٹا تو نیلی تمہاری خیر نہیں ہو گی۔ جان لے لوں گی تمہاری۔"
"جی دادی ضرور، اپنی جان سے بڑھ کر حفاظت کروں گی۔"
"کنجوس، بے عمل لوگ ہمگر ہوا کا انتظام نہیں کر سکتے تو ایسے جھلتے موسم میں شادی کیوں کر رہے ہیں۔" دادی کو دلہن والوں کے انتظامات پر اعتراض تھا۔
ہوا کا انتظام تھا تو سہی مگر دلہن کے کمرے تک اور نیلی نے سوچ لیا تھا کہ وہ آج بینا والے کمرے میں زیادہ دیر نہیں ٹکے گی۔ بے شک ٹھنڈا ٹھار تھا پر بینا نے کل جو اس کا حشر کیا تھا اس سے باہر کی گرمی ہی بھلی تھی۔ جی بھر کر سونے بھی نہیں دیا تھا۔
بینا کی قریبی رشتہ دار فروا برائیڈل میک اپ کر رہی تھی۔ اچھے بھلے چلتے روم کولر کو نجانے کیا ہوا تھا کہ بند ہو گیا۔ گھر کا کوئی مرد فالٹ ٹھیک کرنے میں لگا ہوا تھا۔ اتنی دیر میں بینا کی فاؤنڈیشن بیس پہ پسینے کی لکیریں نمودار ہونے لگی تھیں۔
"او کم عقلو! جب تک پنکھا نہیں چلتا تو ہاتھ سے ہی جھل دو۔" بینا دلہناپے کی پروا کیے بغیر چلائی تو کئی لڑکیاں اس کے اوپر دائرہ بنا کر دستی پنکھے جھلنے لگی تھیں۔ فروا کا رکا ہوا ہاتھ بھی چل پڑا تھا۔ نیلی بھی اپنے رنگین پنکھے سے اپنے ساتھ ساتھ بینا کو ہوا جھل رہی تھی۔ نظریں فروا پہ جمی تھیں، جس کے چہرے کی جلد بہت صاف اور نقوش پیارے تھے۔ لگتا نہ تھا کہ دو بچوں کی ماں ہے۔ کولر ٹھیک ہوتے ہی ماحول پر سکون ہو گیا تھا۔ مکمل دلہن بنتے ہی بینا سنجیدہ اور چپ چاپ ہو گئی تھی۔ پنکھا جھلتی لڑکیوں کے ہاتھوں کو بھی سکون مل گیا تھا۔

فروا بے حد خوش مزاج اور بے تکلفانہ مزاج کی لڑکی تھی۔ اپنے بیوٹیشن کورسز کے متعلق بتانے لگی۔ باتوں باتوں میں انکشاف کیا کہ شہر کا مشہور شاپنگ پلازہ "رضا پلازہ" کے مالک اس کے والد اور چچا ہیں۔
"اللہ اللہ، اتنی امارت اور غرور نام کو نہیں۔" نیلی بے حد متاثر ہو رہی تھی۔
رضا ہاؤس کی دیگر خواتین بھی شادی میں آئی ہوئی تھیں۔ فروا کی ماں، چچی اور بھابھیاں سب کے انداز سے ان کی امارت جھلک رہی تھی۔
رات کا سیاہ آنچل پھیلتے ہی بینا کی رخصتی عمل میں لائی گئی۔ حسب دستور دلہن کے ماموں کو دلہن کندھوں پہ اٹھا کے دہلیز پار کرانی تھی مگر یہاں یہ مسئلہ تھا کہ بینا کے اکلوتے ماموں جن کی عمر ساٹھ سال تھی اور کچھ عرصہ پہلے ہی ان کی ریڑھ کی ہڈی کا آپریشن ہوا تھا بھاری تن توش کی مالک بھانجی کو کندھے پہ کیسے اٹھاتے جب کہ ان سے تو ڈھائی کلو کا تھیلا نہیں اٹھایا جاتا تھا۔
"کچھ بھی ہو، یہ پرکھوں سے رواج آرہا ہے۔ دہلیز تو ماما ہی پار کروائے گا دلہن کو۔" دولہا کی اماں دو ٹوک انداز میں فیصلہ سناتے ہوئے بولیں۔
"ہائے چچی! خدا کا خوف کرو۔ میرا خاوند کمر کا مریض، لاکھوں اس کے آپریشن پہ اٹھ گیا۔ مہرے تک ہلے ہوئے ہیں۔ جھک کر جوتے نہیں پہن سکتا اور تو کہتی ہے یہ منوں وزنی بینا کمر پہ لاد لے۔" ممانی ممتاز گلوگیر انداز میں بولی تھیں۔
لفظ منوں وزنی پہ بینا نے خوب دانت پیسے تھے۔ معاملہ گمبھیر ہوتا جا رہا تھا۔ نہ دولہا کی اماں نسلوں پرانی رسم توڑنے پر آمادہ تھیں ناں اکلوتے ماموں میں اتنا بوجھ اٹھانے کی ہمت ہو رہی تھی۔ آخر شمائلہ آگے بڑھیں۔
"رسمیں انسانوں کی زندگی سے زیادہ اہم نہیں ہوتیں۔ فرسودہ رسم نمٹانے کے لیے آپ کسی بیمار بندے کی جان کیوں عذاب میں ڈال رہی ہیں۔ رخصتی تو ان دلہنوں کی بھی ہو جاتی ہو گی جن کے پاس ماموں کا رشتہ نہ ہو گا۔ وقت ضائع نہ کریں۔ ہمیں گھر بھی جانا ہے۔" شمائلہ کا انداز دو ٹوک اور دبنگ تھا اس لیے سب کو مصلحت آمیز رویہ اپنانا ہی پڑا۔ آخر کو اتنی امیر اور صاحب حیثیت رشتہ دار کی بات کیسے غیر اہم ہو سکتی تھی جنہوں نے بینا کو جہیز کے کئی آئٹمز دیے تھے۔ کئی ہزار روپے دولہا کی سلامی اور خود شادی میں شریک ہو کر جو عزت افزائی بخشی وہ سب سے بڑھ کر تھی، ورنہ تو بینا کے دونوں بھائی رضا پلازہ میں کراکری کی دکان چلا رہے تھے۔
بینا کو ایک بازو سے ماموں دوسرے سے بھائی نے پکڑ کر دہلیز پار کروائی تو نگہت نے شمائلہ کے احسن اقدام کو دل میں بے حد سراہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"پنکھا۔۔۔؟" دادی کا انداز سوالیہ تھا۔
"ہاں آپ کا پنکھا۔۔۔؟" نیلی کا بھی سوالیہ انداز۔ دادی کی تیوری چڑھی۔
"میرا پنکھا۔" انداز جارحانہ۔
"ہاں دادی! وہ آپ کا پنکھا۔ میں شادی پہ جھلتی رہی بینا باجی کو جھلتی رہی مگر گھر نہیں لا سکی۔" آواز مری مری تھی۔
"نیلی! میں تیرا سر چکی کے دو پاٹوں میں دے دوں گی اگر میرا پنکھا تو نے ادھر ادھر کیا تو۔" دادی غصے سے بولیں۔
"دادی! یقین کریں، پنکھا میرے ہاتھ میں تھا۔ پھر کھانا کھایا، تصویریں بنائیں، اس وقت ہاتھوں میں کچھ نہیں تھا، مجھے یاد نہیں آرہا پنکھا کہاں رکھا تھا۔" وہ بے بسی سے ذہن پہ زور دیتے ہوئے بولی اور یہ سچ بھی تھا۔
"منحوس، کم بخت ماری، جب چیز سنبھال نہیں سکتی تو لی کیوں تھی؟" دادی نے غصے سے بولتے ہوئے زور سے دو ہتھڑ اس کے کندھے پر جمائے تھے۔ اتنے زور سے کہ وہ بلبلا اٹھی تھی۔
"اللہ دادی! کچھ تو خوف کریں۔ تھا تو ایک پنکھا ہی ہزاروں اور خریدے جا سکتے ہیں۔ ویسے بھی سولر سسٹم

کی بدولت آج کل ان دستی پنکھوں کی کیا ضرورت رہ گئی ہے۔" وہ کندھا سہلاتے ہوئے بولی تھی۔

"نگوڑی اولاد' بات ہزار پنکھوں کی کرتی ہے۔ یہ لاکھوں کی قیمت پہ بھاری تھا میرے لیے۔ تیرے دادا نے لائل پور سے ملتان جاتے ہوئے ریل میں خرید کر دیا تھا۔ ہائے' میری زندگی کے سنہرے محبت بھرے دنوں کی نشانی تھا یہ پنکھا۔ پورے سفر تیرے دادا مجھے جھلتے آئے تھے۔ کبھی میں انہیں جھل دیتی۔ برسوں سے اسے سنبھال کر رکھا تھا۔ دیکھتی تو دل خوش ہو جاتا تھا۔ ہائے خدا تجھ سے پوچھے نیلی۔" دادی پنکھے کے غم سے نڈھال ہوئی جا رہی تھیں۔ دن کا کھانا بھی نہیں کھا رہی تھیں۔ صبح سے شام تک جاری ان کا واویلا بخوبی باور کرا رہا تھا کہ واقعی وہ پنکھا دادی کے لیے بے حد اہمیت کا حامل تھا۔

"تمہیں کیا ضرورت تھی پنکھا لے جانے کی۔ اگر اتنی ہی گرمی لگ رہی تھی تو نہ جاتیں شادی پہ۔" نگہت کو بھی اس پہ غصہ آ گیا تھا۔

"امی میں نے تو بہت خیال سے اسے پکڑ رکھا تھا۔ نجانے کب ہاتھوں سے نکلا۔ مجھے یاد ہی نہیں آ رہا۔" وہ روہانسی ہو کر بولی۔

دادی کی بھوک ہڑتال نے واقعی اسے پریشان کر دیا تھا۔

"ایسا کرو' بینا کے گھر پتا کرو۔ کہیں وہاں نہ رہ گیا ہو۔" نگہت کی بات دل کو لگی تھی۔ فوراً" پھپھو شگفتہ کی وردہ کو لے کر بینا کے گھر گئی۔ بینا والے کمرے کی ہیئت ہی بدل چکی تھی۔ شادی والا ماحول تو شادی کے فوراً" بعد ہی ختم ہو گیا تھا۔ اسے یاد تھا' روم کولر ٹھیک ہوتے ہی اس نے پنکھا جھلنا بند کر دیا تھا۔ اس کے بعد ہی ادھر ادھر ہوا ہو گا۔ پنکھا کمرے میں تو کیا بینا کے پورے گھر میں نہیں تھا۔

"اتنے سارے مہمان آئے تھے۔ شاید کوئی اپنے ساتھ لے گیا ہو۔" اس کی رونی صورت دیکھ کر بینا کی بھابھی بولی تھیں۔ پھر کچھ یاد آنے پر بولیں۔

"ہاں ایک رنگین شیشوں والا پنکھا میں نے فروا کے بیگ میں دیکھا تھا۔"

"کون فروا؟ اچھا وہ بیوٹیشن۔" یاد آنے پر دل کو ذرا حوصلہ ملا تھا۔

"ہاں بینا کا میک اپ کرنے کے بعد میں اس کا سارا سامان بیگ میں سیٹ کر رہی تھی تو پنکھا بھی بیگ میں رکھ دیا۔ میں سمجھی اس کا ہے۔ کافی خوب صورت اور دیدہ زیب پنکھا تھا۔"

"بھابھی! آپ مجھے فروا کا ایڈریس بتا دیں پلیز؟" سکون کی ایک لمبی سانس اس کے سینے سے برآمد ہوئی تھی۔

"لو اتنے مشہور کھاتے پیتے لوگ ہیں جن کے پلازے میں میرے میاں آصف کی دکان ہے۔" رضا شاپنگ پلازہ" والے۔"

☼ ☼ ☼

"دادی! آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ زبیدہ کو جانے کی اجازت کیوں دے دی آپ نے۔ اسے میں نے آپ کے لیے فل ٹائم اپائنٹ کیا تھا۔ اب آپ کا خیال کون رکھے گا؟" ولید بے حد خفا ہو کر ان سے کہہ رہا تھا۔

"ارے بچے بوڑھی ہوں پر معذور نہیں' تھوڑا بہت اپنے جوگا کام کر لیتی ہوں۔ پھر زبیدہ بچی ہے۔ سب سیر سپاٹے کو جا رہے تھے تو اس کا دل بھی مچل گیا۔ میں کیوں خواہ مخواہ روک کر اس کے دل کو بجھا لی۔ اچھا ہے' یہی عمر تو ہوتی ہے گھومنے پھرنے کی۔" ایک ملازمہ کے لیے بھی دادی کے لہجے میں پیار ہی پیار تھا۔

"کمال ہے۔ آپ جیسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں اس جہاں میں۔" ولید سر جھٹک کر رہ گیا تھا۔

اس نے دادی کے لیے ایک چوبیس گھنٹے خیال رکھنے والی ملازمہ' زبیدہ دو بچوں کی ماں' جسے کبھی عرانہ اپنے کاموں کے لیے بلا لیتیں تو کبھی شمائلہ' کبھی بھار ہی وہ بیگمہ خاتون کے کمرے میں جھانکتی تھی۔ ہاں جب ولید کی آمد کا وقت ہوتا تو فوراً" بیگمہ خاتون کے پاس حاضر ہو جاتی کیونکہ ولید نے ہی اسے رکھا تھا اور اسے وقتاً" فوقتاً" دادی کی صحت اور آرام کے خیال سے اسے ہدایت جاری کرتا رہتا تھا۔ بوڑھے جی کو کون کب تک بہلائے۔ زبیدہ موقع دیکھ کر ادھر ادھر کھسک جاتی۔ بیگمہ خاتون اس کی ہوشیاری خوب سمجھتی تھیں۔ مگر نیک خوئی کی بنا پر کبھی ولید کے سامنے شکایت تو کیا تذکرہ تک نہیں کیا تھا۔

بچوں کی گرمیوں کی چھٹیاں ہوتے ہی سب شمالی علاقہ جات کی سیر کو نکل گئے تھے۔ اسرار بھائی کی بیوی کو اپنی بیٹی سنبھالنے کے لیے زبیدہ کی خدمات درکار تھیں تو وہ اسے کاغان ساتھ لے گئیں۔ جانے سے پہلے بیگمہ خاتون سے اجازت ضرور لی تھی۔

"مگر ولید صاحب! وہ ناراض تو نہیں ہوں گے۔" زبیدہ کو ولید کا خیال آیا تھا۔

"میں اسے سمجھا دوں گی۔ تم جاؤ' سیر کر آؤ۔" اور ولید اس بات پہ بھی خفا کہ زبیدہ نے اسے بتانا بھی ضروری نہیں سمجھا۔

"ارے تم مصروف تھے۔ صبح کے گئے رات کو لوٹتے۔ کیسے اطلاع دیتی۔ ویسے بھی غیروں سے خدمت کروانے میں کون سا سکون ملتا ہے۔ تمہاری بیوی ہوتی تو دھونس' رعب سے خدمتیں کرواتی' ساتھ بٹھا کر باتیں کرتی' کچھ اس کی سنتی' کچھ اپنی سناتی ... ہاہ یہ اجرت پہ خدمت کرنے والے لوگ' کب تک ساتھ باندھ کے رہ سکتے ہیں؟" دادی نے ایک لمبی سانس کھینچی تھی۔

"آ ئے تیرا ابا تو تیری شادی کی بات کرتی ہوں۔ بہت ہو گئیں کمائیاں' اب کوئی خرچ کرنے والی آنی چاہیے۔" وہ محبت سے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے شرارت سے بولیں تو اس کے ذہن میں گزشتہ ہفتے ہونے والی ماں سے گفتگو ابھر آئی تھی۔

"میں بس اپنی بھتیجی حریم کو ہی بناؤں گی۔ بھائی ابرار کی بیٹی کو۔"

"نہیں امی! میں حریم سے شادی نہیں کر سکتا' حریم کے اندر اتنا ایٹی ٹیوڈ اور نزاکت ہے کہ وہ دادی کے ساتھ ایڈجسٹ نہیں کرے گی۔ وہ جب بھی ہمارے گھر آئی۔ دادی کے کمرے میں جھانک کر بھی نہیں دیکھا' شادی کے بعد وہ کیسے انہیں ٹائم دے پائے گی۔ اس کی فرینڈز' اس کی پارٹیز' نو حریم جیسی لڑکی کی میری زندگی میں کوئی گنجائش نہیں نکلتی۔" اس نے دوٹوک انداز میں فیصلہ سنایا تھا۔

"حریم ہی میری بہو بنے گی' تمہاری دلہن۔ اس نے میرے اور تمہارے ساتھ ایڈجسٹ کرنا ہے ناں کہ اماں کے ساتھ۔" شمائلہ کو جی بھر کر غصہ آیا تھا بیٹے پہ جس کے سر پر ہر وقت دادی کی محبت سوار رہتی تھی۔

"میں شادی اس لڑکی سے کروں گا جو دادی کو پراپر ٹائم دے گی' ان کی خدمت کرے گی۔ حریم سے میں ایسی کوئی بھی توقع نہیں رکھ سکتا۔ وہ دادی کی عزت نہیں کرے گی تو میری طرف سے محبت' عزت اور توجہ نہیں حاصل کر پائے گی جس کی وہ مستحق ہو گی۔" اس نے رسان سے ماں کو اپنا نکتہ نظر سمجھانا چاہا تھا۔

"خدا پوچھے اماں آپ سے۔ میرے بیٹے کو میرے ہی مقابل لا کھڑا کر دیا۔ کاش میں دونوں بچوں کو جیسے تیسے خود ہی پال لیتی تو آج یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔" بولتے بولتے شمائلہ کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"واؤ' مکین جتنے خوب صورت ہیں۔ مکان بھی اتنا ہی خوب صورت ہے۔" نیلوفر کے منہ سے بے ساختہ توصیفی انداز میں نکلا تھا۔ ابھی ابھی رکشہ انہیں رضا ولا کے مین گیٹ پر چھوڑ گیا تھا۔ چوکیدار کے پوچھنے پر یہی کہا۔

"جی ہم فروا رضا کی سہیلیاں ہیں۔"

اتنا بڑا خالی گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ وہ دونوں ٹرانس زدہ سی چاروں اطراف میں نوع بہ نوع پودوں سے آراستہ لان کو دیکھ رہی تھیں کہ اتنے میں اندرونی حصے کا مرکزی دروازہ کھول کر ایک نوجوان باہر آیا۔

"یہ فروا رضا کا گھر ہے ناں؟" نیلی نے ہینڈسم سے بندے کو مشکوک نظروں سے اپنی جانب دیکھتا پا کر جلدی سے پوچھا۔

"جی ہاں' یہ فروا رضا کا گھر ہے بھی اور نہیں بھی۔"

ولید نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"جی کیا مطلب؟" بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

"مطلب یہ کہ یہ فروا کے پیرنٹس کا گھر ہے۔ یعنی اس کا میکہ اور فروا کا اپنا گھر شہر کے دوسرے کونے میں ہے۔" ولید نے متانت سے بات کی وضاحت کی۔

"اوہو خواہ مخواہ ادھر آ گئے۔ کیا آپ ہمیں فروا کا ایڈریس دے سکتے ہیں؟" (ایک اور خواری 'اف دادی آپ کا پنکھا)

"جی ضرور' ایک منٹ میں چولہے پہ کچھ چھوڑ آیا ہوں' آپ اندر آ کر بیٹھیں۔" وہ شائستگی سے کہتا انہیں لے کر دادی کے کمرے میں آ گیا۔

دادی کو بھوک لگی ہوئی تھی۔ وہ اپنے ہاتھوں سے ان کے لیے چکن کارن سوپ بنا رہا تھا۔ گرما گرم سوپ کا بھاپ اڑاتا باؤل چند لمحوں بعد آ کر دادی کے سامنے رکھ دیا۔

"یہ کیا ولید! میرے کھانے کے لیے لے آئے ہو۔ ان بچیوں کے لیے بھی کچھ لاؤ ناں' آخر کو مہمان ہیں۔" دادی شفقت سے بولیں۔

"ارے نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ آپ بس فروا کا ایڈریس ہمیں سمجھا دیں۔ ہمیں جلد از جلد وہاں پہنچنا ہے۔" نیلوفر تیزی سے بول پڑی۔

"ایڈریس تو بتا دوں مگر اتنا بتا تا چلوں کہ فروا ان دنوں اپنے گھر میں نہیں ہے۔ بچوں کے ساتھ آزاد کشمیر گرمیاں گزارنے گئی ہوئی ہے۔"

"اوہ نو..." ولید کی بات پر مایوسی کا ایک پہاڑ نیلی کے سر پر آ گرا تھا۔ چہرے پہ مایوسی اور دل گرفتی کے تاثرات اتنے واضح تھے کہ ولید چونک اٹھا تھا۔

"ویسے پوچھ سکتا ہوں کہ آپ فروا سے کس سلسلے میں ملنا چاہتی ہیں۔ میری بہن ہے وہ۔" ولید کو لگا تھا کہ یہ لڑکی ابھی کے ابھی رو کرے گی۔ تاثرات ایسے تھے جیسے سخت مشکل میں گرفتار ہو۔

جواب میں نیلی نے دادی کے پنکھے کی ساری روداد بتا دی کہ اب اس کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا۔

"اگر میں خالی ہاتھ گھر گئی تو دادی میری جان کو آ جائیں گی۔ یہ پنکھا ان کے لیے کسی خزانے سے کم نہیں ہے۔ مجھے ہر صورت پنکھا ان کے حوالے کرنا ہے۔" وہ سخت بے چارگی سے کہہ رہی تھی۔ ولید کو پنکھے والی کہانی دلچسپ لگی تھی۔

"اوکے ریلیکس۔ میں ابھی فروا سے بات کرتا ہوں۔" ہلکے پھلکے انداز میں کہتے ہوئے ولید نے سیل نکال کے فروا کو کال ملائی اور پنکھے کی بابت تفصیل سے پوچھا۔

"کہیں اسے ساتھ تو نہیں لے گئیں؟" قدرے شرارت سے پوچھا تھا۔

"کمال کرتے ہو' اتنے ٹھنڈے علاقے میں پنکھے کی کیا ضرورت اور میں بھی حیران کہ یہ میرے سامان میں کس نے رکھ دیا۔ اچھی وے یہ جس کا بھی ہے واپس کر دو۔" فروا نے پنکھا جہاں رکھا تھا۔ وہ مقام ولید کو اچھی طرح سمجھا دیا۔

"آپ بیٹھیں۔ میں فروا کے گھر سے پنکھا لے آتا ہوں۔" ولید گاڑی کی چابی اٹھا کر چل دیا۔ اب بیگمہ خاتون ان کی طرف متوجہ تھیں۔ نیلم کی دادی کے پنکھے کے لیے کی جانے والی تگ ودو انہیں خاصا متاثر کر چکی تھی۔

"شکل سے تو ماشاءاللہ دونوں اچھے خاندان کی لگتی ہو۔ ہماری فروا سے کیسے ٹاکرا ہوا تھا؟" جواب میں نیلوفر نے باجی بینا سے دادا کی رشتہ داری' شادی میں بھرپور شمولیت اور دادی کی پنکھے سے حد درجہ محبت و لگاؤ کا پس منظر تک سب کہہ سنایا۔

"تم خلیق الزماں کی پوتی تو نہیں ہو جو ڈپٹی کلکٹر تھے۔" کافی دیر بعد بیگمہ خاتون کے منہ سے سرسراتے ہوئے الفاظ نکلے تھے۔

"جی بالکل وہ میرے دادا ہیں۔ باغ بانی کے شوقین' پہلے اسموکنگ کرتے تھے اب چھوڑ دی۔ اب زیادہ وقت دادی کے ساتھ پودوں کی دیکھ بھال میں گزارتے ہیں۔ کبھی کبھار آپس میں دونوں بچوں کی طرح الجھ بھی پڑتے ہیں۔" نیلوفر کہتے ہوئے... ہنس پڑی۔

"اور چائے نوشی کیا اب بھی ویسے ہی کثرت سے ہوتی ہے۔" دادی بیگمہ نے کھوئے کھوئے انداز میں پوچھا تھا۔

"جی اب بھی بہت چائے پیتے ہیں۔ مگر آپ کو کیسے علم ہوا؟" نیلوفر نے حیرانی سے پوچھا۔

"بس ایسے ہی منہ سے نکل گیا۔" دادی بیگمہ نے سنبھل کر بات بنائی تھی۔ اتنے میں ولید پنکھا لے کر واپس آ گیا۔ نیلوفر نے کسی بیش بہا متاع کی طرح پنکھے کو تھاما تھا۔ چہرے کی رنگت بحال ہونے لگی تھی۔

"مجھے لگتا ہے آپ کی دادی کافی سخت گیر خاتون ہیں۔ محض ایک پنکھے کے لیے آپ کو یہاں سے وہاں گھما دیا۔" ولید دوستانہ انداز میں بولتے ہوئے دادی کے قریب بیٹھ گیا۔

"جی نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ میری دادی مجھ سے بہت محبت کرتی ہیں۔ بس وہ اپنی چیزوں کے بارے میں بہت پوزیسو ہیں۔ خاص طور پر یہ پنکھا انہیں دادا نے گفٹ کیا تھا۔ اگر یہ گم ہو جاتا تو واقعی میں ساری زندگی ان سے شرمندہ رہتی۔ اس پنکھے کو انہوں نے اپنے بچوں کو ہاتھ نہیں لگانے دیا۔ مگر میرے مانگنے پر دے دیا۔ میری پکی فرینڈ ہیں۔ روز ہماری لڑائی ہوتی ہے۔" وہ صاف گوئی سے بولی۔ لفظ لڑائی پہ ولید ہنس دیا تھا۔

"میں اور دادی بھی پکے فرینڈ ہیں۔ مگر ہماری کبھی لڑائی نہیں ہوئی۔ ہے ناں دادی؟" وہ مسکرا کر دادی سے تائید چاہ رہا تھا۔

"بس بچے ــــ محبّت کے اظہار کے اپنے طریقے ہوتے ہیں۔ ورنہ تو اصل سے زیادہ سود سب کو ہی پیارا ہوتا ہے۔" بیگمہ دادی نے مسکرا کر شفیق لہجے میں جواب دیا۔

"اوکے ولید صاحب! ہماری مدد کرنے کا بہت شکریہ۔" وہ وردہ کو اٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ناٹ مینشن۔ چلیں میں آپ کو گیٹ تک چھوڑ دوں۔ کہیں یاسر (کزن) کا پٹ بل ٹیریر نہ کھلا ہو۔ اجنبیوں کے ساتھ ذرا بھی رعایت نہیں کرتا۔" وہ اس کی ہم راہی میں چلتی گیٹ تک آ گئیں۔

یاسر کا کتا صرف رات کو تھوڑی دیر کے لیے کھلا چھوڑا جاتا تھا' ورنہ تو دن کے اوقات میں وہ بندھا ہی رہتا تھا۔ پتا نہیں کیوں ولید کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اس خوب صورت نقوش والی اونچی لمبی سی لڑکی کو ذرا کچھ دیر کے لیے روک لے۔ جانے نہ دے۔ اس کے صاف گو لب و لہجے میں کچھ باتیں سنے۔

اور تیزی سے قدم اٹھاتی نیلوفر کا دل چاہ رہا تھا وہ یہاں سے بھاگ جائے۔ اسے یہ گھر سنڈریلا کی جادو نگری لگا تھا۔ جہاں اگر وہ کچھ دیر اور رکتی تو اس گھر کی ایک ایک چیز اسے اپنا اسیر بنا لیتی۔ اس کے پاؤں جکڑ لیتی اور یہ بلند قامت شخص' یہ تو اسے شہزادہ نہیں کوئی سحر کار لگ رہا تھا جس کے فسوں میں سارا ماحول ڈوبا ہوا لگ رہا تھا۔ دل کا ایک کونہ چپکے سے آباد ہو چکا تھا۔ نجانے کس کے...؟

☆ ☆ ☆

"ہاں تو میں بتا رہی تھی کہ جب میری شادی ہوئی تو میں بہت کم عمر تھی۔ سولہ سترہ سال کی' نا سمجھ' بھولی بھالی۔" رات کے کھانے کے بعد معمول کے مطابق آم چوستے ہوئے دادی اپنی پرانی یادوں کا جہاں آباد کیے بیٹھی تھیں۔ نیلوفر ان کے ساتھ والی چارپائی پہ چت لیٹی تاروں سے سجے آسمان کو تکے جا رہی تھی۔

"ہمارے خاندان میں رواج تھا کہ دلہن شادی کے دوسرے روز جا کر آنکھیں کھولتی تھی۔ سارا وقت آنکھیں بند ہی رہتی تھیں۔ اس کی پہلی نظر اپنے میاں پہ پڑتی پھر وہ سر اٹھا کر آنکھیں کھول کر سب کو دیکھ سکتی تھی۔ مجھے خاندان کی بیاہتا عورتوں نے یہ تو سمجھایا تھا کہ آنکھیں بند رکھنی ہیں پر کھولنی کب ہیں یہ نہیں بتایا تھا۔ ایک دن گزر گیا' دو دن گزر گئے' تیسرا دن آ گیا۔" نیلوفر نے ہاتھ الٹا کر کے جمائی روکی تھی۔ پھر اکتا کے دادی کو ٹوک دیا۔

"جی پھر چوتھا دن آ گیا۔ دادا آپ کو آپ کے میکے

لے گئے۔ آپ کے اماں' ابا سے شکایت کی کہ یہ بینائی سے محروم اپنی بیٹی میرے متھے کیوں لگادی۔ پھر پٹ سے آپ کی آنکھیں کھلیں' سندری نشیلی آنکھیں جن کو دیکھتے ہی دادا فریفتہ ہو گئے۔ دادی! ہر سال یہ اسٹوری آپ ہمیں سناتی ہیں۔ کچھ اور بتائیں۔" نیلوفر نے قصہ ہی ختم کر دیا تھا۔

"بے ادب اولاد! نانی سے تو فرمائشیں کر کے پرانی یادیں پوچھی جاتی ہیں۔ اگر جو دادی دل کا حال کھول لے تو سب سناسنایا لگتا ہے۔" آم سے سنے ہاتھ دھوتے ہوئے دادی غصے سے بولیں۔ اتنے میں نگہت نے آواز لگائی۔

"نیلی! ابا کو چائے دے آؤ۔"

دادا کے سر کو شانی ہلکی انگلیوں سے کھجا رہا تھا۔ دادا ایک سرور کی کیفیت میں آنکھیں بند کیے بیٹھے تھے۔ چائے کی خوشبو پا کر فوراً سیدھے ہوئے اور بہ آواز بلند نعرہ مستانہ بلند کیا تھا۔

"جس چاہ میں چاہ نہیں' اس چاہ کو چاہ (کنویں) میں ڈال دو۔"

"دادی! آپ کی شادی ہوئی سولہ سترہ سال میں' پھپھو کو آپ نے سترہ سال کی عمر میں بیاہ دیا۔ کیا آپ کا دل نہیں چاہتا کہ آپ کی پوتی بھی سولہ سترہ تو نہیں بس اب تئیسویں سال میں اپنے گھر کی ہو جائے۔" وہ واپس آکر اپنی چارپائی پہ بیٹھ گئی تھی۔

"دل تو چاہتا ہے۔ پر کیا کروں' میرے دل چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ اتنا لمبا قد' الٹے سیدھے ہاتھ مار کر کام کرلیتی ہو۔ دادی کے عزت احترام کا نہیں پتا' تو دل کیسے دعائیں دے کہ پوتی جلد از جلد اپنے گھر کی ہو۔ خیر' جو بھی ہو اللہ بہتر کرے۔"

دادی نے کچھ دیر پہلے اپنی بات پوری نہ سنانے کی بھڑاس ٹھنڈے لہجے میں نکالی تھی۔ نیلوفر نے آسمان کو تکتے ہوئے ایک لمبی سانس کھینچ کر خارج کی تھی۔

☆ ☆ ☆

"یہ شادی ہرگز نہیں ہو سکتی۔" دادی کا لہجہ بھڑک دار تھا۔

"اور یہ شادی ہو کر رہے گی۔" دادا کا لہجہ غیر لچک دار تھا۔

"نیلوفر میری پوتی ہے۔ اس کی زندگی کا فیصلہ میں کروں گا۔" دادا سینے پر ہاتھ مار کر بولے تھے۔

"اور عتیق میرا اکلوتا بیٹا ہے۔ میری مرضی کے بغیر وہ بیٹی کو وداع نہیں کر سکتا۔" دادی کے لہجے میں بیٹے کی فرماں برداری کا غرور بول رہا تھا۔

"مہرالنساء! اگر اس دفعہ آپ نے نیلوفر کے رشتے میں کوئی مین میکھ نکالنے کی کوشش کی تو تاعمر آپ سے کلام نہ کروں گا۔" جذباتیت سے دادا کی آواز کانپ اٹھی تھی۔

"اور خلیق صاحب! اگر آپ نے ہر حال میں نیلوفر کا رشتہ "اپنوں" میں کرنا ہے تو میں ہمیشہ کے لیے اپنی بیٹی شگفتہ کے ہاں چلی جاؤں گی۔ وہیں سے جنازہ نکلے گا میرا۔" دادی کا لہجہ بلا کا سنجیدہ تھا۔

عتیق الرحمٰن اور نگہت دونوں بزرگوں کو بے حد پریشانی سے الجھتا' جھگڑتا دیکھ رہے تھے۔

کل کا سورج خوشیوں کا پیام لے کر طلوع ہوا تھا۔ شمائلہ بیگم' کلیم رضا اور یکمہ خاتون ڈھیروں ڈھیر سوغاتوں کے ہمراہ نیلوفر کے لیے ولید کا رشتہ لے کر آئے تھے۔ نگہت اور عتیق الرحمٰن تو خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ اتنے خوشحال' صاحب حیثیت اور باعزت گھرانے سے ان کی بیٹی کے لیے پیام آیا تھا۔ اور سب سے بڑھ کر ولید کی ذاتی خوبیاں' نیک خوئی' جاب' خوش اخلاقی' یہ رشتہ تو نعمت غیر مترقبہ محسوس ہو رہا تھا۔

اور نیلوفر تو جیسے سکتے میں آگئی تھی۔ دل کی مرادیں بھی پوری ہوتی ہے؟ دعائیں اتنی جلدی بھی مستجاب ہو جاتی ہیں۔ اس کے لیے یقین کرنا محال ہو رہا تھا۔ تقدیر اس دراز قامت' خوبرو' شخص کا ہاتھ ہمیشہ کے لیے اس کے ہاتھ میں تھمانا چاہتی ہے۔ جس کے حصول کی خواہش چپکے سے اس کے من میں آکر بیٹھ گئی تھی' دادی کا پنکھا تو لے آئی تھی۔ مگر اپنا دل وہیں

چھوڑ آئی تھی شاید۔

دادا تو خود تقدیر کی اس کرنی پہ گنگ کھڑے تھے جب یکمہ خاتون کو اپنے گھر کی دہلیز پہ سوالی پایا۔ یکمہ ان کی خالہ زاد' بچپن کی منگ' ان کے ساتھ کھیلتی' لڑتی' جھگڑتی' دھونس جما کر اپنی منواتی' جب جوانی کی دہلیز پہ دونوں آئے تو دونوں کے بزرگوں کے درمیان جائیداد کے کسی تنازعے کی بنا پر ناچاقی شروع ہو گئی پر رنجشیں اتنی بڑھیں کہ ان کی بچپن کی طے کردہ نسبت کو ہی نگل گئیں۔

ہاہ!... زندگی کے کتنے ماہ و سال ماضی کی صورت پیچھے پڑے تھے اور عمارتیں آج کھنڈر بنی کھڑی تھیں۔ دادا کو ولید بہت پسند آیا تھا۔ یکمہ خاتون سے رشتہ داری کے علاوہ بھی ولید کی تابع دار فطرت نے انہیں بہت متاثر کیا تھا۔

اور دادی نے ساری زندگی جس ہستی سے ٹوٹ کر نفرت کی تھی تو وہ یہ یکمہ خاتون تھیں جنہوں نے ان کی ساس مرحومہ کے دل پہ ساری زندگی راج کیا تھا۔

یکمہ خاتون ان کی ساس کی بھانجی تھیں۔ بے حد عزیز اور جان سے پیاری' نسبت ٹوٹنے کا قلق انہیں ساری زندگی رہا تھا۔ قسمت نے دادی مہرالنساء کا ہاتھ دادا کے ہاتھ میں آتھمایا تو دادا نے پورے خلوص دل اور نیک نیتی سے ان کے ہاتھوں کو تھام لیا تھا۔ مگر ساس مرحومہ کے دل سے کبھی یکمہ کی یاد نہ گئی۔ دادی کی صورت بھائی نہ سیرت' اٹھتے بیٹھتے بھانجی کو یاد کرتیں اور ایسے میں دادی کا دل چاہتا تھا کہ کسی طرح یکمہ نام کی عورت کو اس دنیا سے غائب کر دیں جو موجود نہ ہوتے ہوئے بھی موجود تھی۔ ایسے میں اس کے پوتے کو پسند کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

"ساری زندگی اس عورت نے میرا جی جلایا۔ اب رشتے داری جوڑ کر پھر اس کا سامنا کروں۔ ہرگز نہیں۔" دادی سختی سے انکار پر جمی ہوئی تھیں۔ اور ادھر دادا نے ہاں کرنے کے بعد شادی کی تیاری شروع کرنے کا عندیہ دے دیا تھا۔ نگہت اور عتیق کے لیے یہ صورت حال پریشان کن تھی۔

☆ ☆ ☆

خلیق الزماں کی طرف سے کی جانے والی باقاعدہ "ہاں" کے بعد شمائلہ نے نیلوفر کے لیے کچھ تحفے بھجوائے تھے جس پہ دادی خوب سیخ پا ہو رہی تھیں۔

"جب میں نے کہہ دیا کہ یکمہ کے گھر سے کوئی تعلق نہیں رکھنا تو ان تحفے تحائف کا کیا جواز بنتا ہے۔ بڑی آئی مہارانی' موٹر پہ چڑھ کے دولت کا رعب ڈالنے۔ رمضو ہٹی والے کی بیٹی ہو کر چلی ہیں متاثر کرنے۔"

"خدا کا خوف کرو' کیوں میری خالا زاد کے پیچھے پڑی ہو۔ ہمارے خالو کی اچھی بھلی چلتی دکان کو ہٹی کہہ رہی ہو۔ صرف دکان ہی نہیں' اچھی خاصی زمینیں تھیں۔ سونا اگلتی' ہمارے ابا اور خالو کی مشترکہ جائیداد' کوئی یکمہ کو شہر کے گھر جا کر بخت لگا تھا۔" دادا اپنی کزن کا بھرپور دفاع کر رہے تھے۔ اور یہی بات دادی کو کھائے جا رہی تھی۔

"ہاں' وہی جائیداد نا' جس کے جھوٹے قصے سنا کر میرے اماں ابا سے میرا ہاتھ مانگا گیا تھا کہ جی اتنے کھاتے پیتے لوگ ہیں ہم' کلیم میں اتنی زمینیں' اتنے باغ ہمارے حصے میں آئے ہیں اور مجھے رخصت کرا کے ساس صاحبہ کے کمرے میں لے جایا گیا جہاں ایسی جھلنگا چارپائی پہ مجھ معصوم کو بٹھایا کہ غڑاپ سے چارپائی پہ اوندھے منہ جا گری تھی۔ مارے شرمندگی کے سر اٹھایا تو نوشے میاں کھڑے ہنس رہے تھے۔ دل پہ کیا بیتی تھی' میں ہی جانتی ہوں۔" دادی بولتے بولتے آبدیدہ ہو گئی تھیں۔

"ہاں میرے مرحوم اماں ابا نے جھوٹ بولا تھا تو میرے محترم ساس' سسر نے کون سا صاف گوئی سے کام لیا تھا۔ ہماری بٹیا ایسی' ہماری بٹیا ویسی' تعلیم میٹرک اور لفظ کو میں کا مطلب — شکریہ آتا تھا ان کی لاڈلی کو۔" دادا بھی باقاعدہ مقابلے پہ اتر آئے تھے۔

"اماں' ابا کیا ہو گیا ہے آپ کو؟" عتیق الرحمٰن ماں اور باپ کے سرخ پڑتے چہروں کو دیکھ کر بے حد پریشان

ہو گئے تھے۔

”ارے میری بات کو اتنا ہلکا نہ لو‘ اس عورت نے ماضی میں بھی ہمیشہ اپنی نا سمجھی اور کم عقلی سے میری زندگی اجیرن بنائے رکھی۔ انتھونی کوئین۔۔۔ میرا پسندیدہ ہالی وڈ اداکار‘ سینما میں جب بھی اس کی فلم لگتی تو میں لازمی دیکھنے جاتا اور یہ ذہین فطین محترمہ انتھونی کوئین سے بھی بیر پال بیٹھی تھیں۔ اٹھتے بیٹھتے مجھے طعنے مارے جاتے تھے۔“ دادا ماضی کی پٹاری سے ایک اور واقعہ چٹک کر سنا رہے تھے۔

”ہاں تو کم جی جلایا تھا میرا اس موئی انگریزن کے پیچھے‘ ہر وقت اس کا تذکرہ‘ اس کی تعریفیں‘ میں اور بچے گھر پڑے ہیں اور یہ سینما میں اس منحوس کی پکچر دیکھنے گئے ہیں۔“

”انتھونی کوئین کا انداز خوب صورت‘ بیٹھنا‘ چلنا‘ مکالمے‘ سب ہی نے تو ان کو اسیر کر رکھا تھا۔“ دادی جل کر کہہ رہی تھیں۔

”ملاحظہ کر لی اپنی والدہ کی ذہانت و فطانت۔ یہ انتھونی کوئین میں لفظ کوئین سے کوئی زنانہ ہستی گمان کیے رہیں‘ شکر ہے بس لفظ کوئین کا مطلب آتا تھا۔“ دادا کسی قدر استہزائیہ انداز میں بولے تھے۔

بلال کو اتنی گھمبیر صورت حال میں بھی زور کی ہنسی آ گئی تھی۔

”واہ‘ دادی! آپ کا بھی جواب نہیں۔ دادا سے محبت میں ایک میل ایکٹر سے جیلس ہو بیٹھیں اور دادا نے بھی کبھی کنفیوژن دور نہیں کی۔“ بلال جتنا اس بات سے محظوظ ہو رہا تھا‘ نیلوفر اتنی ہی رنجیدہ و سنجیدہ تھی۔

”دادی! مجھے تو لگتا ہے کہ آپ کی شادی کوئی سترہ سال کی عمر میں نہیں ہوئی ہو گی۔ کوئی تیس بتیس برس کی عمر میں ہوئی ہو گی‘ اسی لیے تو ہر رشتے میں کیڑے نکال کر میری عمر بڑھائے جا رہی ہیں۔ کوئی نفسیاتی گرہ تو نہیں ہے آپ کی شخصیت میں۔“ نیلوفر ٹٹولتی نظروں سے دادی کو دیکھتے ہوئے بولی۔

”تو جا کر ٹرنک میں نکاح نامہ دیکھ لو‘ سترہ سال لکھی ہو گی یا اپنے دادا سے پوچھ لو وہ بیس کے میں سترہ کی۔“ دادی اطمینان سے بولیں۔

”تو پھر میری شادی میں اتنی رکاوٹیں کیوں کھڑی کیے جا رہی ہیں۔ جب بیاہ نہیں سکتے تو پیدا کیوں کرتے ہو؟“ نیلو اتنے دل گیر انداز میں بولی تھی کہ اگر شعیب منصور بھی اس وقت قریب ہوتا تو فوراً ”اسے ”بول ٹو“ میں سائن کر لیتا۔

”تو پریشان مت ہو‘ پیکمہ والے رشتے کو تو جانے دے۔ آگے ان شاءاللہ اور اچھے رشتے آئیں گے۔“ دادی نے پچکار کر کہا تھا۔

”دادی! اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ اگلا رشتہ بھی ایسا ہی اچھا اور کھاتے پیتے گھر کا ہو گا۔“ نیلوفر کا لہجہ مایوسانہ تھا۔

”کہیں اپنی ماں کی طرح تیرا بھی تو دل نہیں آ گیا اونچی حویلی پہ۔“ دادی کا انداز ٹٹولنے والا تھا۔ (نہیں اونچے قد پہ) نیلو کا دل چپکے سے بولا تھا۔

”پیکمہ کا پوتا تجھے اس لیے بیاہ کے لے جا رہا ہے کہ تو اس کی دادی کی خدمت کرے۔ اس کے پاؤں دبائے‘ چٹیا گوندھے۔ منہ میں نوالے ڈالے‘ میں سگی دادی ہو کر ان خدمتوں سے محروم رہی اور تو میری پوتی ہو کر اس عورت کی خدمت کرے جس سے میں نے ساری زندگی نفرت کی ہے۔ اس نے کبھی میری ساس کو میرا نہ ہونے دیا۔ جب بھی میکے آتی تو خالہ کو کھانا بنا کر کھلاتی۔ میری ساس میرے پکے ہوئے کھانے میرے سامنے پھینک دیتی‘ میرا کوئی کام انہیں پسند نہ آتا‘ پیکمہ کی وجہ سے میں کبھی ساس کا دل نہیں جیت پائی۔“ دادی کے لہجے میں کوئی پرانا دکھ بول رہا تھا۔

”تو دادی اس میں میرا کیا قصور؟“ نیلوفر کا لہجہ بھیگ رہا تھا۔

”نیلی! اللہ اپنا کرم کرے گا۔ اور رشتے آئیں گے۔“ دادی تیزی سے بولیں۔

”اور رشتوں میں کوئی ولید رضا تو نہ ہو گا۔ ولید۔۔۔ جس کا تصور کسی بلا کی طرح میرے پیچھے پڑ گیا ہے۔ جس کا لہجہ مجھے رات کو پہروں جگاتا ہے۔ اس کے چند

الفاظ کی تکرار ہی مجھے پاگل کیے جا رہی ہے۔ دادی! پلیز مجھ پہ کچھ دم کر کے پھونکیں‘ مجھے سب بھول جائے‘ اس کی آواز‘ اس کا چہرہ‘ اس کی مسکراہٹ مجھے ایسا کر دیں جیسے میں پہلے تھی‘ رضا ولا میں جانے سے پہلے جیسے میں کبھی کہیں گئی ہی نہ ہوں۔ کسی ولید کو نہ دیکھا ہو۔“ وہ دادی کا ہاتھ تھامے بلک بلک کر رو رہی تھی اور دادی جیسے سناٹے میں آ گئی تھیں۔



گھر کا ماحول ایک دم سے اداسی کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ دادی کی طبیعت خراب تھی۔ ہلکے بخار کے ساتھ معدہ بھی خراب ہو گیا تھا۔

”اگر سارا دن وقت بے وقت کھاتی رہیں گی تو یہی تو حال ہو گا۔“ دادا نے دادی کی صحت پہ تبصرہ کیا تھا۔ دادی کی تو چلو طبیعت خراب تھی۔ نیلوفر کو کیا ہوا تھا۔ نہ کھانا نہ پینا‘ سارا دن منہ لپیٹے اندر کمرے میں پڑی رہی تھی‘ گھر کے سارے کام ویسے پڑے تھے۔ نگہت کی تو جان مشکل میں تھی۔ نہ بیٹی کے مزاج سمجھ میں آ رہے تھے نہ ساس کے حلق سے کچھ اتر رہا تھا۔ میاں کی باتیں الگ پریشان کیے جا رہی تھیں۔

”میں بس کلیم رضا کو صاف صاف انکار کرنا چاہتا ہوں۔ مجھ سے اماں کی حالت دیکھی نہیں جا رہی۔ ایسا نہ ہو کہ یہ ضد ان کی جان لے لے خدانخواستہ۔“ عتیق الرحمن بے حد سنجیدہ تھے۔

”کمال کرتے ہیں۔ اماں بالک ہٹ پہ آئی ہوئی ہیں۔ آپ تو سمجھداری سے کام لیں۔ محض ان کی جذباتیت کو دیکھتے ہوئے ہم اتنے اچھے رشتے سے انکار کر دیں۔ نیلی کو اگلے ماہ چوبیسواں سال لگنے والا ہے۔ تیزی سے اس کی عمر بڑھ رہی ہے۔ پھر ہم جیسے متوسط لوگوں کے ہاں ایسے متمول لوگوں کے رشتے کہاں آتے ہیں۔ یہ تو بھلا ہو خالہ پیکمہ کا جو ابا سے خونی رشتے کی بدولت بہو بیٹیوں کو ہمارے گھر تک لے آئی ہیں۔ ورنہ تو بھابھی شمائلہ کے مزاج سے پتا چل رہا تھا کہ یہ رشتہ سراسر خالہ پیکمہ کی ایما پر ہو رہا ہے۔ اماں تو ضد پہ آئی ہوئی ہیں۔ آپ تو کچھ سمجھ سے کام لیں۔“ نگہت نے رسان سے عتیق کو سمجھانا چاہا تھا۔

”نہیں نگہت! میں اماں کو ناراض کر کے نیلی کو رخصت نہیں کر سکتا۔ میری بیٹی تعلیم یافتہ اور خوش شکل ہے۔ اسے بہتیرے رشتے مل جائیں گے۔“ عتیق الرحمن نے دو ٹوک انداز میں بات ہی ختم کر دی۔



پھل‘ جوسز‘ کیک‘ قیمتی کاٹن کا سوٹ‘ ڈرائی فروٹ اور دوسری ڈھیروں چیزیں دیکھ کر دادی نے نروٹھے پن سے پوچھا تھا۔

”یہ آپ میری عیدی کس خوشی میں لے آئی ہیں؟“

”بہن بھابھی! آپ کی طبیعت کا سنا تو رہا نہیں گیا۔ سوچا ولید کے ساتھ چل کر آپ کی عیادت کر آؤں۔ ولید کو بھی اپنی دادی ساس سے ملنے کا بہت شوق ہو رہا تھا۔“ پیکمہ خاتون نے ذرا سا ہنس کر کہا تو لفظ ”دادی ساس“ پہ نگہت پہلو بدل کر رہ گئی تھیں۔ کمرے میں سب ہی موجود تھے۔ مگر ایک وہی نظر نہیں آئی تھی جسے ایک نظر دیکھنے کی خواہش میں وہ دادی کے ہمراہ چلا آیا تھا۔

محبت‘ خلوص اور اپنائیت۔۔۔ زندگی کے رنگ بس ان ہی سے عبارت ہیں۔ ولید اپنی سیاہ چمچماتی کار میں دادی کو بہترین سہولیات سے آراستہ ایک پرائیویٹ ہسپتال میں ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا جہاں پیکمہ خاتون خود ہر ماہ معمول کے چیک اپ کے لیے آتی تھیں۔

”دادی! اب آپ کو بھی میں ہر ماہ ڈاکٹر کے پاس لے جایا کروں گا دادی کے ساتھ۔“ ولید ہر دو دن بعد عیادت کے لیے آتا تو کافی کچھ اس کے ہمراہ ہوتا تھا۔

”میری بیٹی کے لیے پیکمہ کا پوتا نا منظور اور خود اس کے ساتھ کار میں بیٹھی ان بیماریوں کا بھی علاج کروانے جا رہی ہیں جو انہیں ہیں ہی نہیں۔ پیکمہ بری‘ مگر اس کے پوتے کے لائے گئے پھل‘ میوے‘

کیک بڑے شوق سے کھائے جارہے ہیں سپاٹی کی جگہ انرجی ڈرنکس پیے جاتی ہیں۔ آخر ٹن کے ٹن جو فراہم کیے جارہے ہیں 'اپنی ماں کے اس دہرے رویے کو کیا نام دیں گے؟" طنزیہ انداز میں بولتے ہوئے نکہت شوہر سے پوچھ رہی تھیں۔

"واقعی 'جب رشتہ ہی طے نہیں کرنا تو ولید کی ہر دو دن بعد آمد کیا معنی رکھتی ہے؟" عتیق الرحمٰن بھی سنجیدہ ہوگئے تھے۔

"ابا! رشتے میں ولید آپ کا پوتا لگتا ہے۔ مجھے ہر وقت اس کا گھر میں کچھ نہ کچھ لے کر آنا اچھا نہیں لگتا۔ آپ نیلوفر کے لیے بھی انکار کردیں۔ میرا ایک کولیگ اپنے بیٹے کے لیے مجھ سے بات کرچکا ہے۔" دوباپ کے قریب بیٹھ کر دھیمے سے کہہ رہے تھے۔

"عتیق الرحمٰن! میں تمہارے ابا کی کیا لگتی ہوں؟" دادی نے کڑے تیوروں سے بیٹے سے پوچھا تھا۔ وہ نجانے کب وہاں آئی تھیں۔

"جی اماں! آپ ہماری ماں ہیں۔ ابا کی بیوی۔" عتیق الرحمٰن بوکھلا کر بولے تھے۔ ماں کی بات اور انداز دونوں سمجھ میں نہیں آئے تھے۔

"میں خلیق الرحمٰن کی بیوی ہوں۔ ان کی نسبت سے ولید میرا بھی پوتا لگتا ہے۔ تم کون ہوتے ہو اسے اس گھر میں آنے سے روکنے والے۔" چہرہ سرخ 'انداز جلالی۔

عتیق الرحمٰن تو پریشان ہو اٹھے تھے۔ "اماں! وہ تو آپ ہی..."

"اور رشتے سے انکار کس کی مشاورت سے کیا جارہا ہے؟" آپ کے زیادہ کڑے انداز میں پوچھا گیا تھا۔

"اماں! آپ خود ہی اس رشتے سے انکاری ہیں 'پھر میں معاملے کو آگے کیسے بڑھاؤں؟" عتیق الرحمٰن قدرے ناراضی سے بولے۔

"اچھا میں انکاری تھی 'تم آئے تھے مجھ سے مشورہ یا اجازت لینے۔" خوب طنزیہ انداز میں پوچھا گیا تھا۔

"نہیں تو 'آپ کی اور ابا کی بحث روز تو سنتے ہیں۔"

"ہاں تو تمہارے ابا سے بیگمہ کے پوتے والا تنازعہ تھا۔ تم میرے پاس کلیم رضا کے بیٹے کا رشتہ آنے پر صلاح مشورہ کرنے آئے تھے جو میں نے انکار کا اقرار کیا ہو۔"

نکہت اور عتیق الرحمٰن دونوں نے ایک دوسرے کو نا سمجھی سے دیکھا تھا۔ اماں کی باتیں ان کے سر سے گزر رہی تھیں۔ بیگمہ کا پوتا نامنظور۔ کلیم رضا کا بیٹا منظور۔ فرق کیا ہوا؟

"بس بہت ہو گیا آنا جانا 'اب بیگمہ کے سارے گھر والوں کی دعوت کرو۔ ولید کو داماد کی حیثیت سے بلاؤ اور ہاں ان سے کہہ دو 'اپنے شرارتی بچوں کو گھر ہی چھوڑ آئیں۔ اگر کوئی شرارت کی تو اپنے لاڈلوں کے کیے کی خود ذمہ دار ہوں گی۔" حکمیہ انداز میں کہتے ہوئے دادی اندر بڑھ گئیں۔ دروازے کے فریم سے ٹیک لگائے نیلوفر کھڑی تھی۔ آنکھوں میں چمکیلا پانی تیر رہا تھا۔ دادی نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

"بھلا جس نے میری نیلی کے من نگر کو آباد کر رکھا ہو 'مجھے وہ برا لگ سکتا ہے۔"

باوجود کوشش کے نیلوفر اپنے آنسوؤں پہ قابو نہ پا سکی اور روتے ہوئے دادی کے گلے لگ گئی۔

"تھینک یو دادی! اگر آپ کی مہربانی نہ ہوتی تو سب کچھ محض ایک خواب ہی رہ جاتا۔"

"اونہوں 'مہربانی اس رب کی جو ہمارے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے محبت پیدا کرتا ہے۔ ہمارے سنجوگ جوڑتا ہے پھر انہیں نبھانے کی توفیق بخشتا ہے۔ رب کی اس مہربانی پہ شکر بجالایا کرو۔ وہ تمہیں ہمیشہ سکون آشنا رکھے۔" بھیگے لہجے میں بولتے ہوئے دادی نے اس کا ماتھا چوم لیا تھا۔ نیلی کا من اندر تک شانت ہوگیا تھا۔

"ویسے ایک بات ہے۔ یہ ولید بچہ ہے بڑے دل کا۔ بہت مزے کی چیزیں لاتا ہے۔ ایسے کیک اور بسکٹ تو میں نے زندگی میں کبھی نہیں کھائے۔ طاقت کی شیشیوں نے مجھے دنوں میں بھلا چنگا کردیا ہے۔" دادی نیلی کا پرسکون چہرہ دیکھتے ہوئے شرارت سے بولیں۔ پھر دونوں ایک ساتھ ہنس پڑیں۔

☆

صائمہ اکرام چوہدری

شہر زاد

شہرزاد غیر معمولی حسن کی مالک نہیں تھی لیکن حالات کی تلخیوں نے اس کی شخصیت کو مضبوط بنا دیا تھا۔ اس کے اعتماد نے اس کی شخصیت کو دلکشی عطا کی تھی۔

ٹرین میں ایک عورت اور مرد سفر کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ ایک بچہ بھی تھا۔ عورت اور مرد کو احساس تھا کہ موت ان کے تعاقب میں ہے ان کے تمام گھر والوں کو مار دیا گیا تھا۔ گاڑی ایک اسٹیشن پر رکی تو ماں نے فیصلہ کیا کہ بچے کو کسی جگہ چھوڑ دے' تاکہ اس کی جان بچ سکے۔ اس نے بچے کو ایک بینچ کے نیچے رکھ دیا اور خود ٹرین کی پٹڑی پار کرتے ہوئے حادثہ کا شکار ہو گئی۔

میر ہاؤس میں محتشم علی اور خاقان علی کا خاندان آباد ہے۔

محتشم علی خان ایم این اے ہیں' ان کے تین بیٹے وہاج' برہان اور شاہ میر ہیں۔ بیٹی ایک ہی ہے جس کا نام در شہوار ہے۔

خاقان علی نے دو شادیاں کی ہیں' پہلی بیوی شارقہ بیگم سے دو بیٹیاں انابیہ اور طوبیٰ ہیں۔ بیٹے کے لیے انہوں نے ندرت بیگم سے دوسری شادی کی' لیکن ان سے کوئی اولاد نہ ہو سکی۔



خاقان علی کی بہن فوزیہ اور ان کے شوہر ایک فضائی حادثے میں چل بسے تو' تو ان کے دونوں بچے نیمو اور ارسل کی پرورش ندرت بیگم نے کی ہے۔ نیمو کو لگائی بجھائی کی عادت ہے۔

ان کے گھر کے سامنے جنگل ہے جہاں طوبیٰ اور در شہوار امتحان میں کامیابی کے لیے برگد کے درخت پر دھاگا باندھنے رات کو جاتی ہیں اور شاہ میر انہیں پکڑ لیتا ہے۔ شاہ میر گھر والوں کے سامنے ان کا بھانڈا پھوڑ دیتا ہے' جس کی بنا پر ان کو گھر والوں سے بہت ڈانٹ پڑتی ہے۔

انابیہ کا نکاح برہان سے ہو چکا ہے' لیکن برہان کا سرد رویہ اسے افسردہ کرتا ہے۔

ٹینا بیگم فیشن انڈسٹری کی ایک معروف شخصیت تھیں۔ دو شادیاں ناکام ہو چکی تھیں۔ آج کل وہ تیسرے شوہر سے جان چھڑانے کے چکر میں تھیں۔ معروف بیوروکریٹ سیف الرحمٰن کے ساتھ ان کا نام لیا جا رہا تھا۔

پہلے شوہر سے ان کی دو بیٹیاں تھیں' بڑی شہرزاد جسے اعلا تعلیم کے لیے انہوں نے باہر بھجوا دیا تھا۔ رومیصہ چھوٹی تھی اور اس کی اپنی ماں سے بالکل نہیں بنتی تھی۔ ان کے آئے دن کے اسکینڈل اس کے لیے مسئلہ بنتے تھے۔

اس نے خودکشی کی دھمکی دے کر شہرزاد کو پاکستان آنے پر مجبور کر دیا۔ شہرزاد کی آمد ٹینا بیگم کو شدید ناگوار گزری۔ شہرزاد پاکستان آئی تو ایک پرانی فون کال نے اسے ڈسٹرب کر دیا۔ طوبیٰ اور در شہوار غلطی سے برابر والے گھر میں داخل ہوئیں تو پتا چلا کہ جو گھر پچھلے ایک ماہ سے خالی پڑا تھا۔ وہاں محمد ہادی آ چکا ہے۔ محمد ہادی فاریسٹ آفیسر ہے۔ تعلق ایک امیر اور اعلا تعلیم یافتہ گھرانے سے ہے۔ وہ اپنے دوست سعد کو بھی اپنے بنگلے میں لے آیا ہے۔

محتشم علی کا بیٹا وہاج شادی شدہ ہے' لیکن گھر کی ملازمہ صندل پر بری نظر رکھتا ہے۔ رومیصہ نے گھر میں شدید توڑ پھوڑ کی اور ٹینا بیگم سے شدید نفرت کا اظہار کیا۔ شہرزاد اسے ماہر نفسیات کو دکھانے کا مشورہ دیتی ہے۔

در شہوار اور طوبیٰ محمد ہادی کے بنگلے میں جاتی ہیں اور درخت پر چڑھ کر خوبانیاں توڑتی ہیں۔ محمد ہادی سختی سے پیش آتا ہے تو در شہوار اسے دھمکی دیتی ہے۔ ان دونوں کے درمیان ٹھن جاتی ہے۔

یہ جان کر کہ مناہل' ہادی کی بہن ہے۔ در شہوار کا رویہ اس سے بدل جاتا ہے۔ مناہل اور برہان کی بے تکلفی سے اسے



انابیہ کے مستقبل کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ وقار درانی شہزاد کے پاس سمجھوتے کے لیے آتے ہیں۔ ہارون رضا سیفی کے فون سے مشتعل ہو کر ٹینا بیگم کو طلاق دے دیتے ہیں۔ شجاع غنی کیس واپس لے لیتا ہے۔ اس بات پر ہادی اور شہزاد بہت چراغ پا ہوتے ہیں مگر کچھ کر نہیں پاتے۔ رومیصہ اور وہ ایک گھر میں جاکر چھپتے ہیں جہاں رومیصہ اسے اپنے حالات وواقعات سے آگاہ کرتی ہے۔ دونوں کو نیا رشتہ قریب لے آتا ہے۔ یہ جان کر کہ شاہ میر طوبیٰ کو پسند کرتا ہے تاجدار بیگم کا غصہ گھر میں سب پر اترتا ہے۔ صندل کی بہن سندس کو طوبیٰ کی پرانی کتابوں سے اپنی بہن کا آخری خط ملتا ہے اور وہ حقیقت جان لیتی ہے۔

مونیکا ذوالکفل کو مائیکل کی آمد سے آگاہ کرتی ہے۔ وہ اسے لاہور آنے کا مشورہ دیتا ہے۔

صندل کے گھر والے اس کی موت کی وجہ جان کر راتوں رات حویلی چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ رومیصہ کو ارسل بحفاظت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے۔ شجاع غنی میر حاکم کی دھمکیوں کی وجہ سے کیس واپس لے لیتا ہے۔ شہزاد کو یہ جان کر صدمہ ہوتا ہے۔ ہادی کو بھی غصہ آتا ہے اور اسی وجہ سے اسے درشہوار مزید بری لگتی ہے۔

انابیہ درشہوار اور منال کی بے تکلف گفتگو سن کر صدمے کا شکار ہوجاتی ہے اور درشہوار اور برہان کے ساتھ بے رخی سے پیش آتی ہے جسے وہ دونوں بہت محسوس کرتے ہیں۔

مسجد کے برابر میں گھر لینے پر مونیکا شدید غصے کا اظہار کرتی ہے۔ ہم زاد کو شہزاد اور ارتضیٰ کا ساتھ بہت برا لگتا ہے۔

صندل کے گھر والے شہزاد کے چوکیدار کے رشتے دار ہیں اور اسی حوالے سے وہ شہزاد کے گھر ملازمت کے لیے پہنچ جاتے ہیں۔

میر حاکم کے حریف تجمل حسین کے کرپشن کیس کے خلاف شہزاد مقدمہ جیت جاتی ہے۔ سب اسے مبارک باد دیتے ہیں، مگر ہم زاد کا مبارک باد دینے کا انداز اس کی محبت کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ ہم زاد بہانے سے شہزاد سے بھی ٹکراتا ہے، مگر مفلر میں چہرہ چھپا ہونے کی وجہ سے وہ اس سے مل کر بھی اس سے انجان رہتی ہے۔

میر حاکم ایک معمولی بات پر شاہ میر سے خفا ہوجاتے ہیں۔ شاہ میر کے والد اسے گھر سے نکال دیتے ہیں۔ میر دراج مسلسل بے سکونی کا شکار ہیں۔ ارتضیٰ حیدر رومیصہ سے اس کے اغوا کے حوالے سے تفتیش کرتا ہے تو اسے لگتا ہے کہ رومیصہ کسی کو بچانا چاہ رہی ہے۔

جارج کی پورے دن کی غیر حاضری پورے گھر کو تشویش میں مبتلا کردیتی ہے، مگر وہ کسی کو کچھ نہیں بتاتا۔

گیارہویں قسط

"ہوسکتا ہے ارتضیٰ، آپ کو غلط فہمی ہوئی ہو۔۔۔؟"

شہزاد کا دل اگرچہ بے شمار اندیشوں کی آماجگاہ بن گیا تھا لیکن اس نے بڑی سرعت سے خود کو سنبھالا۔

ارتضیٰ حیدر جو شہزاد کے لان میں اس کے عین سامنے چائے کا مگ ہاتھ میں پکڑے اس کو بڑی گہری نگاہوں سے دیکھنے میں مگن تھا۔ وہ اندازہ کرسکتا تھا کہ اس وقت اس کے اندر کس قسم کے جوار بھاٹے اٹھ رہے ہوں گے۔۔۔

"غلط فہمی۔۔۔؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔۔۔" اس نے پراعتماد نظروں سے شہزاد کی آنکھوں میں جھانکا۔

"لیکن آپ کیسے، اتنے حتمی انداز میں کہہ سکتے ہیں۔۔۔؟" وہ ہلکا سا گڑبڑا کر گویا ہوئی۔

"اس لیے کہ رومیصہ سہگل، مجھے گولی دینے کے چکروں میں ہے۔" اس نے ہاتھ میں پکڑا مگ اپنے دونوں ہاتھوں میں گھمایا۔

"لیکن انہیں شاید اندازہ نہیں تھا کہ میں ان کی ساری گفتگو ریکارڈ کرچکا ہوں، جسے کوئی بھی سینس ایبل بندہ ایک دفعہ بھی سنے گا تو اسے اندازہ ہوجائے گا کہ وہ اپنے بیانات کیسے منٹ منٹ بعد تبدیل کررہی ہیں۔۔۔" ارتضیٰ نے اس دفعہ قدرے تفصیل سے بتایا۔

"ہوسکتا ہے وہ آپ کے سامنے کنفیوز ہورہی ہو۔" شہزاد بھی بیرسٹر تھی، اسے مطمئن کرنا کون سا آسان تھا۔

"ہاں وہ اس بات پر ضرور کنفیوز تھیں کہ انہیں کون سی بات بتانی چاہیے اور کون سی نہیں۔۔۔" وہ مسکرایا۔

"مطلب؟" شہزاد نے الجھ کر اس کا چہرہ دیکھا۔۔۔

"مطلب یہ کہ وہ اس سارے معاملے میں کوئی بڑی بات ہم سے چھپا رہی ہیں اور یہ چیز خدانخواستہ کل کو ان کے خلاف بھی جاسکتی ہے۔ کم از کم آپ تو سمجھ سکتی ہیں یہ بات۔۔۔" ارتضیٰ نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"ہاں یہ بات تو واقعی پریشانی والی ہے۔۔۔" شہزاد نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"لیکن ایک بات لکھ لیں آپ، اصل بات بہت جلد نکل کر سامنے آجائے گی، لیکن ہمیں تھوڑا صبر سے کام لینا پڑے گا کیونکہ اس موقعے پر اگر ہم نے کوئی سختی کی تو رومیصہ بہت زیادہ محتاط ہوجائیں گی۔۔۔"

"ٹھیک کہتے ہیں آپ۔۔۔" شہزاد کو نہ چاہتے ہوئے بھی اس سے متفق ہونا پڑا۔

"چلنا چاہیے اب مجھے، ایک آفیشل ڈنر پر جانا ہے۔" وہ چائے کا خالی مگ میز پر رکھ کر کھڑا ہوا تو شہزاد بھی پھیکے سے انداز میں مسکرادی، اس کی نظریں بظاہر ارتضیٰ حیدر پر تھیں لیکن ذہن رومیصہ والی گتھی سلجھانے میں مگن تھا۔

"شیری۔۔۔!!" وہ پورچ میں کھڑی اپنی جیپ کی طرف بڑھتے ہوئے پلٹا تو وہ ٹھٹک کر رک گئی۔

ارتضیٰ نے بہت گہری نظروں سے اس کے چہرے پر پھیلی تشویش کو پڑھا، وہ جان چکا تھا کہ رومی کی بات نے اسے پریشان کردیا ہے۔

"کیوں اپ سیٹ ہورہی ہیں آپ۔۔۔؟؟" وہ دونوں بازو اپنے سینے پر باندھ کر اس کے سامنے کھڑا ہوگیا، گھنی مونچھوں کے نیچے اس کے لبوں پر وہی ازلی مسکراہٹ تھی جو بہت کم اس کے ہونٹوں سے جدا ہوتی تھی۔

"پریشانی والی بات تو ہے ناں ارتضیٰ۔۔۔!!!"

"میں ہوں ناں آپ کے ساتھ۔۔۔" اس کے لہجے میں کچھ خاص تھا، شہزاد نے بے ساختہ نظریں چرائیں۔ وہ ارتضیٰ کے کسی قسم کے کسی جذبے کی پذیرائی کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔۔۔

"میں کسی چھوٹی موٹی بات پر پریشان نہیں ہوتی۔۔۔"

اس نے سر اٹھا کر اب ڈائریکٹ ارتضیٰ کی آنکھوں میں اعتماد سے جھانکا اور مزید گویا ہوئی۔ "مجھے صرف یہ ڈر ہے کہ رومی پھر انجانے میں یا اپنی سادگی میں خود کو کسی بڑی مصیبت میں نہ پھنسالے۔۔۔"

"بے فکر رہیں، ایسا نہیں ہوگا۔۔۔" ارتضیٰ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ شہزاد کی پریشانی کو اپنی انگلیوں کی نرم پوروں سے چن لے۔

"ان شاء اللہ۔۔۔" شہزاد نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا، وہ اپنی جیپ میں بیٹھ چکا تھا اور اب متبسم نگاہوں سے شہزاد کی طرف دیکھ رہا تھا، ایسا لگتا تھا جیسے اس کی آنکھوں میں جگنوؤں کی ایک برات آکر ٹھہر گئی ہو۔

"میرا خیال ہے اب آپ کو جانا چاہیے۔۔۔" شہزاد کے جتاتے ہوئے انداز پر وہ تھوڑی سی خفت کا شکار ہوا، اور جلدی سے اپنی جیپ اسٹارٹ کی۔

"ٹیک کیئر۔۔۔" اس کی گاڑی گیٹ کی طرف رینگنے لگی۔

ارتضی نے جیپ کا شیشہ نیچے کر کے شہرزاد پر ایک الوداعی مسکراہٹ اچھالی اور تیزی سے اپنی جیپ نکال کر لے گیا۔ وہ اسے خدا حافظ کہہ کر پورچ سے واپس لان کی طرف پلٹ آئی اور پچھلے ایک گھنٹے سے وہاں ٹہل ٹہل کر شہرزاد کی ٹانگیں شل ہو چکی تھیں۔۔

ارتضی کی باتوں نے اس کا سارا سکون برباد کر دیا تھا، وہ جانتی تھی کہ اس کا اندازہ غلط نہیں ہے لیکن، اسکا دل یہ ماننے سے بھی انکاری تھا کہ رومیصہ کوئی بڑی بات ان لوگوں سے چھپا سکتی ہے۔ اس نے کچھ سوچ کر ہم زاد کا نمبر ڈائل کیا، جو تیسری بیل پر اٹھا لیا گیا۔

''زہے نصیب۔۔۔۔!!!'' دوسری طرف وہ چہکا۔

''کیسے ہیں آپ۔۔۔''؟ اس نے ہلکا سا جھجک کر پوچھا۔

''میری خیریت چھوڑو، یہ بتاؤ تم کیوں پریشان ہو۔۔۔؟'' اس نے بے تکلفی سے دریافت کیا۔ وہ اس کے لہجے سے اس کے دل کی پریشانی کو بھانپ لیتا تھا اور اب تو شہرزاد نے اس کی باتوں پر حیران ہونا بھی چھوڑ دیا تھا۔

''رومیصہ کی وجہ سے۔۔'' شہرزاد نے بغیر کسی لگی لپٹی کے کہا، کیونکہ وہ جانتی تھی کہ ہم زاد کے تجزیے نوے فیصد درست ہوتے ہیں۔۔

''ایسا کیا کر دیا اس معصوم بچی نے۔۔۔؟'' وہ مسکرایا۔

''وہ معصوم بچی، چالاکیاں کر رہی ہے ہمارے ساتھ۔۔'' وہ ہلکا سا چڑ کر گویا ہوئی۔

''اس بے چاری کو کیا پتا کہ اس کے اردگرد بھانت بھانت کے شیطانی دماغ والے لوگ موجود ہیں، جو اس کی چالاکیوں کو ایک منٹ میں بھانپ سکتے ہیں۔۔'' اس کا ہلکا پھلکا لہجہ شہرزاد کو زچ کر گیا۔

''میں سیریس ہوں یار۔۔۔۔'' وہ جھنجھلا کر گویا ہوئی۔

''اور میں تم سے زیادہ سیریس ہوں تمہارے لیے۔'' اس کی بے ساختگی شہرزاد کو لمحے بھر کے لیے چپ کروا گئی۔

''میرا خیال ہے ہر بات کا کوئی مناسب وقت ہوتا ہے۔۔۔'' وہ سنجیدہ ہوئی۔

''تو۔۔۔؟'' ہم زاد نے جھٹ سے پوچھا۔

''یہ بے وقت کی راگنی بعض دفعہ انسان کو بہت کوفت میں مبتلا کرتی ہے۔'' وہ محتاط انداز میں قدرے ناگواری سے گویا ہوئی اور وہ سیکنڈوں میں اس کی بات کو سمجھ کر سنجیدہ ہوا۔ ''چلیں بتائیں، کیا ایشو ہوا ہے؟

''رومی، اصل بات نہیں بتا رہی ہمیں۔۔۔'' اس نے اپنا مسئلہ بتایا۔

''آپ کو کیسے لگا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔۔۔'' اس نے ہلکا سا چونک کر پوچھا۔

''ارتضی اسکا بیان ریکارڈ کرنے کے لیے آیا تھا گھر۔'' شہرزاد کی اطلاع نے ہم زاد کو جی بھر کر بدمزا کیا۔

''کیا اس پورے شہر میں ایک ہی پولیس آفیسر ہے، انہیں آپ کی ہی خدمت کا بہت شوق ہے؟'' وہ طنزیہ انداز میں گویا ہوا۔

''ارتضی دوست ہے میرا۔۔۔'' اس دفعہ شہرزاد نے بھی اس کی دکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھا اور دوسری طرف حسب توقع سناٹا چھا گیا۔ ہم زاد کی تو لگتا تھا قوت گویائی سلب ہو گئی تھی اور شہرزاد کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ تبسم نے کروٹ لی۔۔۔

''کیا ہوا، خاموش کیوں ہو گئے آپ۔۔۔''؟ اس کے دل جلاتے انداز پر ہم زاد نے خود کو بڑی سرعت سے سنبھالا۔

''اچھا تو پھر، کیا کہا آپ کے ''دوست'' ارتضی حیدر نے۔۔۔؟'' ہم زاد کے جتاتے ہوئے انداز پر شہرزاد نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرا دی۔

''وہ کہہ رہا تھا روی بار بار بیان بدل رہی ہے اپنا لیکن وہ ایسا کیوں کر رہی ہے یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔''

''اگر ایک سی ایس ایس آفیسر کو اتنی سی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تو اسے پہلی فرصت میں اپنی جاب سے ریزائن کر کے ڈرائی فروٹس کی ریڑھی لگا لینی چاہیے، کیونکہ آج کل اسی کا سیزن ہے۔۔۔۔'' ہم زاد کے طنزیہ لہجے پر شہرزاد کا منہ سرخ ہوا۔

وہ جان گئی تھی کہ وہ اس کی دوست والی بات کا غصہ کہیں اور نکالنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن یہ موقع اس سے الجھنے کا نہیں تھا، تبھی تو اس نے تحمل کا عظیم مظاہرہ کیا اور خاموش رہی۔۔۔

''سادہ سی بات ہے شہرزاد، اگر رومیصہ ایسا کر رہی ہے تو اس کے دو مطلب نکلتے ہیں، نمبر ایک یا تو اس کی ہمدردیاں وہاں پر موجود لوگوں کے ساتھ ہیں یا پھر اس کے ساتھ کچھ ایسا ہوا ہے جو وہ آپ لوگوں سے شیئر کرنا نہیں چاہ رہی۔۔۔''

''لیکن کیوں۔۔۔؟'' وہ ہلکا سا جھنجھلا گئی۔

''آئی تھنک، اگر کچھ غلط ہوا ہوتا تو وہ اب تک ضرور بتا دیتی، ایسی صورت میں کسی کے لیے بھی کوئی نرم گوشہ اس کے دل میں نہ ہوتا۔'' ہم زاد کی بات جھٹ سے اس کے دل کو لگی۔ ''آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں۔ کھل کر بتائیں۔۔؟''

''اس کا ایک ہی مطلب نکلتا ہے مائی ڈیئر، وہاں جو کچھ ہوا، اس میں کہیں نہ کہیں رومیصہ کی رضامندی بھی شامل تھی اور وہ ابھی بھی انہی کو اسپورٹ کرنا چاہ رہی ہے۔۔۔'' ہم زاد کے تجزیے میں دم تھا، تبھی تو شہرزاد کچھ سیکنڈوں کے لیے بالکل چپ ہو گئی۔

''کیسے پتا چلے گا ان لوگوں کا۔۔۔؟''

''ایک منٹ میں۔۔'' وہ مسکرایا۔

''کیسے۔۔؟؟؟''

''آپ رومیصہ کا سیل نمبر دیں، میں اس کی تازہ ترین کالز کا ریکارڈ نکلوا لیتا ہوں۔'' ہم زاد نے چٹکیوں میں اس کا مسئلہ حل کیا۔

''آپ کے خیال میں رومی کا ابھی بھی رابطہ ہو گا ان لوگوں سے۔۔۔؟'' شہرزاد کو فطری پریشانی نے گھیرا۔۔

''آف کورس یار، وہ جو اتنی آسانی سے اسے گھر کے دروازے تک چھوڑ کر گئے ہیں، یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اس سے رابطہ نہ رکھیں۔۔۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔۔۔''

''بائی ایک آدھ ہفتے تک آپ کا دوست ارتضی حیدر بھی اسی پوائنٹ پر سوچنے لگے گا، آفٹر آل اتنا بھی ڈفر نہیں، یہ اور بات کہ آپ جیسی شاندار خاتون کے سامنے تو میری بھی عقل کام کرنا چھوڑ دیتی ہے۔۔'' وہ طنزیہ لہجے میں کہہ کر کال کاٹ چکا تھا لیکن شہرزاد کے ذہن کی گتھی کسی حد تک سلجھ چکی تھی۔

☆☆☆

رومیصہ کو نیا فون اور سم کارڈ مل چکا تھا۔۔۔
اس وقت وہ سیل فون ہاتھ میں پکڑے اپنے کمرے میں ٹہل رہی تھی۔۔۔

ایک طرف ''انا'' تھی جو اسے ارسل کو فون کرنے سے روک رہی تھی جس نے گھر جانے کے بعد خود سے ایک دفعہ بھی رابطہ کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی اور دوسری طرف تازہ تازہ ہونے والی وہ ''محبت'' تھی، جس نے رومیصہ کو بے چین کر رکھا تھا۔

''مجھے پوچھنا تو چاہیے، آخر ہوا کیا ہے۔۔'' انا اور محبت کی کشمکش میں بالآخر محبت جیت گئی، اس نے کچھ سوچ کر ارسل کا نمبر ملایا۔

''ہیلو۔۔!!'' دوسری طرف ارسل کی بیزار سی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔۔۔

''ارسل۔۔!!'' رومیصہ نے ہلکا سا جھجک کر کہا، دوسری طرف ارسل کو کرنٹ لگا۔۔

''تھینکس گاڈ، دو دفعہ فون کر چکا ہوں میں تمہارے گھر کے پی ٹی سی ایل فون پر، ہر دفعہ کوئی ملازم ہی اٹھا رہا تھا۔ کہاں چلی گئی تھیں تم۔'' ارسل کی اس بات نے رومیصہ کے تنے ہوئے اعصاب کو ایک دم ڈھیلا کیا۔

''ہاں وہ میں اپنے روم میں آ گئی تھی۔۔۔''

''کیسی ہو تم۔۔۔؟ کیا صورتحال ہے تمہاری طرف۔۔۔؟''

''اے ایس پی، ارتضٰی حیدر آئے تھے میرا بیان ریکارڈ کرنے۔۔۔'' اس نے اس کی سماعت میں بم پھوڑا۔

''اوہ مائی گاڈ۔۔۔۔ پھر۔۔۔۔؟'' وہ بے چین ہوا۔

''میں نے بات گھما پھرا کر کرنے کی کوشش تو کی تھی لیکن وہ کسی صورت بھی مطمئن ہونے کا نام نہیں لے رہے۔'' رومیصہ نے اپنی پریشانی سے آگاہ کیا۔

''دیکھو رومیصہ، تمہیں بہت عقل مندی سے یہ سب ہینڈل کرنا ہوگا۔ ورنہ ہم سب لوگ پھنس جائیں گے۔۔'' ارسل ٹھیک ٹھاک پریشان ہوا۔

''میری کچھ سمجھ میں نہیں آر ہا ارسل۔۔۔'' وہ واقعی ٹھیک کہہ رہی تھی اور ارسل کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہوا، کہ اسے سب کچھ سمجھا کر اسے واپس بھیجنا چاہیے تھا لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

اسی وقت کمرے کا دروازہ کھلا اور شہزاد اندر داخل ہوئی، رومیصہ کی نیلگوں آنکھوں میں بوکھلاہٹ اور خوف کے ملے جلے رنگ چھلکے، اس نے گھبرا کر فون بند کیا اور شہزاد نے بہت غور سے اس کی اس حرکت کو نوٹ کیا۔

''کس سے بات کر رہی تھیں تم۔۔۔۔'' اس نے دانستہ سرسری انداز میں پوچھا۔

''ایک کلاس فیلو تھی میری۔۔۔۔'' رومیصہ نے فوراً ہی جھوٹ گھڑا، دوسری طرف ارسل اس سچویشن سے بے خبر تھا، اس نے کال کٹ جانے پر فوراً ہی رومی کا نمبر ملایا اور سیل فون کی گھنٹی کی آواز پر رومیصہ ایک دفعہ پھر بوکھلا گئی۔

اس نے گھبرا کر شہزاد کی طرف دیکھا، جو خود کو لاپرواہ ظاہر کرنے کی بڑی کامیاب اداکاری کر رہی تھی اور کمرے میں سیل فون کی گھنٹی کی آواز صور بن کر گونج رہی تھی۔۔

''فون اٹینڈ کرو ناں رومی۔۔۔۔'' شہزاد نے نرمی سے اس کی طرف دیکھا۔

''نہیں، وہ لمبی بات کرنے کے موڈ میں ہے، میں بعد میں کرلوں گی اس سے بات۔۔۔'' رومی نے کچھ سوچ کر فون ہی پاور ڈ آف کر دیا۔

''ارتضٰی کیسا لگا تمہیں۔۔۔؟'' شہزاد ڈائریکٹ اس موضوع پر آنا نہیں چاہ رہی تھی۔

''تم میں انٹرسٹڈ ہے کیا۔۔؟'' رومیصہ کے منہ پھٹ انداز پر وہ ہنسی۔

''لیکن میں ہرگز نہیں ہوں۔۔۔۔'' اس نے فوراً ہی صفائی پیش کی۔

''اچھا شخص ہے، تمہیں سوچنا چاہیے اس کے بارے میں۔۔۔'' رومیصہ نے نظریں چرا کر اسے مشورہ دیا۔

''لیکن میں تو اسے تمہارے لیے سوچ رہی ہوں، ہینڈسم ہے، ایجوکیٹڈ ہے اور سب سے بڑی بات مام کو بھی پسند ہے۔۔''

''وہ تمہیں پسند کرتا ہے شیری۔۔۔؟'' رومی نے ہلکا سا بُرا مانا۔۔۔

''ہاں تو کیا حرج ہے، پسند تو ہمیں زندگی میں ہزاروں لوگ آ جاتے ہیں۔ اب سب کے ساتھ شادی تو نہیں کی جا سکتی ناں۔۔'' شہزاد دانستہ ہلکے پھلکے لہجے میں بولی، وہ اپنے اور رومی کے درمیان موجود فاصلوں کو تیزی سے گھٹانا چاہتی تھی۔

''لیکن مجھے کسی سے شادی نہیں کرنی۔۔۔'' وہ ہلکا سا جھنجلا گئی۔

''کوئی اور پسند ہے کیا۔۔؟؟'' شہزاد نے غور سے اس کی شکل دیکھی۔

''کون پسند کرے گا ایسی لڑکی کو، جس پر کسی کے قتل کا مقدمہ چل رہا ہو، اور وہ اتنے دن گھر سے غائب بھی رہی ہو۔۔'' رومیصہ کا تلخ لہجہ اس بات کا گواہ تھا کہ وہ ضرورت سے زیادہ حقیقت پسند ہو چکی ہے۔

شہزاد کا دل دکھ کے گہرے احساس سے بھر گیا۔

''کوئی ہو بھی تو سکتا ہے جو تمہیں اچھی طرح جانتا ہو۔۔۔۔'' شہزاد نے ہلکا سا جھجک کر کہا۔

''جب انسان کا بُرا وقت چل رہا ہو تو بڑے بڑے آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔۔۔'' اس نے تھک کر بیڈ سے ٹیک لگائی۔

''ٹھیک کہتی ہو تم۔۔۔'' شہزاد فوراً ہی اس کی بات سے متفق ہوئی لیکن پھر اسے تسلی دینے کے لیے مزید گویا ہوئی۔ ''لیکن تم بے فکر رہو، بعض دفعہ مشکل وقت میں بھی اللہ نے بہت سی آسانیاں رکھی ہوتی ہیں، جس کا اندازہ انسان کو بہت دیر بعد ہوتا ہے۔۔۔''

شہزاد کی بات پر رومیصہ پھیکے سے انداز میں مسکرا کر چپ ہو گئی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اللہ نے ارسل کی صورت میں جو آسانی اس کی قسمت میں لکھی تھی وہ اس حادثے کے بعد ہی اسے ملی تھی۔

☆☆☆

''بلڈ پریشر مسلسل ہائی چل رہا ہے آپ کا۔۔۔''

برہان کی بات پر تاجدار بیگم نے خفا نظروں سے سامنے صوفے پر بیٹھے میر محتشم کی طرف دیکھا، جو بظاہر تو اخبار میں منہ دیے بیٹھے تھے لیکن ان کی تمام تر توجہ دونوں ماں بیٹے کی طرف تھی تاجدار بیگم ان سے سخت خفا تھیں۔۔

تاجدار بیگم نے خصوصی طور پر اپنا بی پی چیک کرنے کے لیے برہان کو اپنے کمرے میں بلوایا تھا۔ دونوں میاں بیوی کے درمیان تعلقات خاصے کشیدہ چل رہے تھے اور یہ بات سب ہی کو معلوم تھی۔۔

''امی، میں آپ سے کہہ رہا ہوں، اپنی میڈیسن باقاعدگی سے کیوں نہیں لے رہیں آپ۔۔؟'' برہان نے فکرمندی سے ماں کی طرف دیکھا، جو پچھلے چوبیس گھنٹے سے احتجاجاً اپنے کمرے تک محدود ہو چکی تھیں۔

شاہ میر والے واقعے نے ان کو اچھا خاصا ہلا کر رکھ دیا تھا، وہ جو سمجھتی تھیں کہ تین بیٹوں کو جنم دے کر اور میر حاکم علی کی چہیتی بہو کا اعزاز حاصل کر کے وہ پورے خاندان پر ساری زندگی حکمرانی کر سکتی ہیں، اس واقعے نے ان کی خوش فہمیوں کی دیوار کو ریت کی طرح ڈھا دیا تھا۔

اپنی اس طویل شادی شدہ زندگی میں انہوں نے پہلی دفعہ اپنے میاں کا وہ روپ دیکھا تھا جسے دیکھنے کی ان کی دونوں دیورانیوں کو خاصی حسرت تھی لیکن وہ بڑی عقل مندی کے ساتھ سارے معاملات کو لے کر چل رہی تھیں۔

شاہ میر کے جذباتی پن نے ان کی پوزیشن سسر اور میاں کے سامنے تو خراب کی ہی لیکن وہ خود بھی اس دھچکے سے اچھی خاصی متاثر ہوئی تھیں، ان کا سارا زعم اور طنطنہ دھرا کا دھرا رہ گیا تھا اور یہ بات انہیں گھن کی طرح اندر ہی اندر کھائے جا رہی تھی۔۔

"اچھا اب آپ یہ بلڈ پریشر کی دوائی تو کھائیں۔۔۔" برہان نے ایک ٹیبلٹ نکال کر ان کی طرف بڑھائی۔

"ایسا کرو زہر لا دو کہیں سے، جان چھوٹ جائے گی تم سب لوگوں کی مجھ سے، پھر خوشی کے شادیانے بجانا بیٹھ کر یہاں۔۔" وہ ایک دم چڑ گئیں۔

"امی۔۔۔" برہان نے صدمے بھرے انداز میں ان کی طرف دیکھا۔

وہ جو میر خاندان کی سب سے مضبوط اعصاب کی حامل خاتون سمجھی جاتی تھیں، اس وقت ریت کی دیوار کی طرح گری پڑی تھیں، اور ان کا بات بات پر چڑنا اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ وہ ذہنی طور پر کس حد تک پژمردگی کا شکار ہیں۔۔

"بابا، آپ سمجھائیں ناں انہیں۔۔" برہان نے مڑ کر اپنے باپ کی طرف دیکھا، وہ ہلکا سا گڑبڑا گئے۔۔

برہان کو علم نہیں تھا کہ ان دونوں کے درمیان بات چیت بالکل بند ہے، شاہ میر کے گھر چھوڑنے والے واقعے پر تاجدار بیگم کو سب سے زیادہ غصہ اپنے میاں پر ہی تھا۔۔۔ جنہوں نے اس موقعے پر خاصے جذباتی پن کا مظاہرہ کیا تھا۔

"ہونہہ، یہ سمجھائیں گے۔۔۔" وہ بیزاری سے سر جھٹک کر لیٹ گئیں۔

"تم میڈیسن رکھ دو سائیڈ ٹیبل پر، کھا لے گی خود ہی۔۔۔"

میر محتشم نے نظریں چرا کر کہا، ان کا غصہ ختم ہو چکا تھا اور اب وہ فطری۔۔ شرمندگی کے حصار میں تھے، کیونکہ اتنا تو وہ بھی جانتے تھے کہ تاجدار بیگم نے زندگی میں کبھی بھی انہیں شکایت کا موقع نہیں دیا تھا اس لیے انہیں بھی اس بات کا لحاظ کرنا چاہیے تھا۔۔

"بیگم صاحبہ، ندرت بی بی پوچھ رہی ہیں کہ رات کے کھانے میں کیا بنے گا۔۔۔؟" ملازمہ نے بڑے غلط وقت پر کمرے میں انٹری دی۔

"ایسا کرو کلیجہ کاٹ کر پکا لو میرا، شاید اسی سے ارمان ٹھنڈے ہو جائیں سب گھر والوں کے۔۔۔" وہ یکدم جل کر بولیں۔

"تم جاؤ زلیخا، جا کر بڑی چچی سے پوچھ لو۔۔۔" برہان نے نظریں چرا کر شرمندگی سے ملازمہ کو کہا اور ناراض نگاہوں سے اپنی ماں کی طرف دیکھا، جو اس وقت کمبل تان کر لیٹ گئی تھیں، جو اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ اس وقت کسی سے بھی بات کرنا نہیں چاہتیں۔

"امی کم از کم گھر کے ملازموں کے سامنے تو اس قسم کی باتیں نہ کریں۔۔۔"

"یہ بات مجھے نہیں اس گھر کے سب ہی لوگوں کو معلوم ہونی چاہیے جو آئے دن تماشے لگاتے رہتے ہیں ان ہی ملازموں کے سامنے۔" وہ ڈھکے چھپے الفاظ میں میر محتشم کو یہ بات سنا رہی تھیں۔

"تم جاؤ برہان، ریسٹ کرنے دو اپنی ماں کو۔۔۔" انہیں نہ چاہتے ہوئے بھی بولنا پڑا، برہان کچھ سوچ کر کمرے سے نکل آئے۔

جیسے ہی انہوں نے ہال کمرے میں قدم رکھا، سامنے انابیہ گھٹنوں میں سر دیے صوفے سے ٹیک لگائے قالین پر اکیلی بیٹھی تھی۔ پورا ہال کمرہ خالی تھا، شاہ میر کے گھر چھوڑ جانے کے بعد میر ہاؤس میں لگتا تھا کسی آسیب کا بسیرا ہو گیا تھا۔۔

برہان آہستہ سے قدم اٹھاتے ہوئے اسی صوفے پر آ کر بیٹھ گئے، جس سے ٹیک لگائے انابیہ بیٹھی تھی۔ ان کے قدموں کی چاپ پر انابیہ نے سر اٹھا کر دیکھا اور برہان کو سامنے دیکھ کر اس کے اعصاب تن گئے اور پیشانی پر ناگواری کے اظہار کے طور پر لکیریں ابھریں۔۔

وہ ایک جھٹکے سے اٹھی، برہان اس کا ارادہ جان گئے تھے، انہوں نے لاشعوری انداز میں اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے جانے سے روکا، انابیہ کو کرنٹ لگا۔ اس نے خفا نظروں سے برہان کو گھورا، جو اس سے بات کرنے کے موڈ میں تھے۔۔

"کیا پرابلم ہے تمہارے ساتھ انابیہ۔۔؟" انہوں نے اس کے افسردہ وجود سے دانستہ نظریں چرا کر پوچھا۔۔

"یہ آپ مجھ سے نہیں، خود سے پوچھیں۔۔۔" انابیہ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

"تم بیٹھو، بات کرنی ہے مجھے تم سے۔۔۔؟" برہان نے بے ساختہ انداز سے کہا۔

"جی کہیے۔۔۔؟"

"کیوں تم کل سے مجھے اور درشہوار کو بہانے بہانے سے سنا رہی ہو۔۔" اس نے بغیر کسی لگی لپٹی کے پوچھا۔

"میں اگر بتاؤں گی تو شاید اچھا نہیں لگے گا آپ کو۔۔۔" وہ ناراض لہجے میں بولی۔

"نہیں، آج بتانا ہی ہو گا تمہیں۔۔۔" برہان کے ضدی انداز پر انابیہ نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

برہان کی مکمل توجہ اس کی طرف تھی اور زندگی میں ایسے مواقع بہت کم کم آئے تھے، ورنہ دونوں کے درمیان فاصلوں کی دیوار چین کھڑی تھی جسے جب بھی انابیہ نے گرانے کی کوشش کی، منہ ہی کی کھائی۔

"آپ کیوں نہیں بتا دیتے کھل کر سب کو۔۔۔" اس کے لہجے میں دبا دبا سا غصہ ہلکورے کھانے لگا۔

"کیا۔۔۔؟" برہان نے ابھی تک اس کا ہاتھ نہیں چھوڑا تھا اور نہ ہی انابیہ نے چھڑوانے کی کوئی کوشش کی۔

"یہی کہ آپ کو کوئی دلچسپی نہیں ہے مجھ میں اور نہ ہی آپ شادی کرنا چاہتے ہیں مجھ سے۔۔۔"

انابیہ نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنا سیکھ لیا تھا اور برہان کے آج شاید ستارے گردش میں تھے جو یہ جملہ بقائمی ہوش و حواس ہال کمرے میں داخل ہوتے میر حاکم علی نے خود سنا اور ان کے چٹان جیسے چہرے پر گویا زلزلے کی سی کیفیت ابھری۔۔

"کیوں اس کی دلچسپی کہاں ہے۔۔۔؟" میر حاکم بولے نہیں پھنکارے تھے۔

برہان نے بوکھلا کر انابیہ کا ہاتھ چھوڑا اور گھبرا کر پلٹے۔ سامنے میر حاکم علی ان دونوں کو غضب ناک نگاہوں سے گھور رہے تھے۔ ان کے چہرے کے تاثرات گواہ تھے کہ وہ ان دونوں کی گفتگو سن چکے ہیں، اور گفتگو بھی کوئی ایسی خوشگوار نہیں تھی جسے سن کر وہ کسی خاص ردعمل کا اظہار نہ کرتے۔۔۔

”کک کہیں نہیں داجی۔۔۔“ برہان کا رنگ فق ہوا۔
”تم بتاؤ انابیہ، یہ کیا سلسلہ چل رہا ہے تم دونوں کے بیچ۔؟ کون ہے وہ، جس میں دلچسپی لے رہے ہیں موصوف۔؟“ ان کے اس جملے سے انابیہ کی تو جو روح فنا ہوئی سو ہوئی، پیروں کے نیچے سے زمین تو ایک دفعہ برہان کے بھی نکل گئی۔
”ایسی کوئی بات نہیں ہے داجی۔۔“ انابیہ نے بوکھلا کر صفائی دینے کی ناکام کوشش کی۔
”یاد رکھنا برہان، اس گھر میں، میں کوئی اور خاقان علی برداشت نہیں کروں گا۔۔۔“ انہوں نے انگلی اٹھا کر ڈھکے چھپے الفاظ میں بہت کچھ کہہ دیا۔
”اور نہ ہی میں اس گھر کی کسی بچی کے ساتھ زیادتی کرنے دوں گا۔۔“ انہوں نے مزید کہا۔ برہان کا چہرہ ضبط کی کوشش میں سرخ ہوا۔
”ایسا کچھ نہیں ہے داجی۔۔۔“ وہ خود کو سنبھال چکے تھے۔
”اور ہونا بھی نہیں چاہیے، اس چیز کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی اب ہمارے خاندان میں۔۔۔“ انہوں نے دو ٹوک انداز اپنایا۔
”میں جاؤں داجی۔۔؟؟ انابیہ نے ہراساں نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔
”ہاں جاؤ، اور برہان تم اپنے ماں باپ کو بھیجو میرے کمرے میں۔۔۔“ انہوں نے برہان کو غصے سے گھورتے ہوئے نیا حکم جاری کیا۔
”جی۔۔۔“ برہان نے ناراضی سے انابیہ کی طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں کہ اب تمہیں سکون آ گیا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بڑھتے ہوئے میر محتشم کے کمرے کی طرف بڑھ گئے جبکہ انابیہ کا دل یوں دھڑک رہا تھا جیسے پسلیاں توڑ کر سینے سے باہر آ جائے گا۔۔

☆☆☆

”ارتضٰی دوست ہے میرا۔۔۔“
شہزاد کے اس چار لفظی جملے نے ہم زاد کے حلق تک میں کڑواہٹ گھول دی تھی۔۔۔
پچھلے چوبیس گھنٹوں میں ہم زاد نے اس جملے کو کوئی چوبیس سو دفعہ سوچا اور ہر دفعہ سوچنے پر اسے نئے سرے سے تکلیف کا احساس ہوا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے ماؤنٹ ایورسٹ کی بلند و بالا چوٹی اسکے سینے پر دھر دی ہو۔
وہ شدید بے بسی محسوس کر رہا تھا۔۔۔
اس کی آنکھوں میں جلتی جوت مدھم ہوگئی اور وہ شکست خوردہ انداز سے ٹہلنے لگا۔۔۔۔
”کیوں میرے جذبات سے کھیلتی ہے وہ اور مجھے سمجھنے کی کوشش نہیں کرتی؟ آخر ہم دونوں تعلق کی کس ڈور سے بندھے ہوئے ہیں۔۔۔“ اپنے چٹختے ہوئے اعصاب کو پرسکون کرنے کے لیے اس نے سگریٹ سلگایا۔
”کاش اسے اندازہ ہوسکے، اس کے بے دھیانی میں بولے ہوئے بعض زہر آلود جملے، قطرہ قطرہ بن کر میری رگوں میں اترنے لگتے ہیں۔“ اس نے ہاتھ میں پکڑا ادھ جلا سگریٹ بُری طرح ایش ٹرے میں مسلا، جیسے اپنے اندر کا سارا غصہ اس پر نکالنا چاہتا ہو۔
وہ اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس آن کھڑا ہوا، جیسے ہی اس نے بلائنڈز ہٹائے تو اس کی نظر صنوبر کے

دیوقامت درختوں پر پڑی، فضا میں پیڑوں کی سبز خوشبو پھیلی ہوئی تھی، اور سامنے ایک سنگلاخ سڑک بل کھاتی ہوئی دُور تک جارہی تھی۔
سائیڈ میز پر رکھے ہم زاد کے سیل فون کی گھنٹی بجی، دوسری طرف وہی دشمن جان تھی، بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اتنی شدت سے اسے سوچتا اور دوسری طرف اس کے دل کو کچھ نہ ہوا ہوتا۔
ہم زاد نے سیل فون ہاتھ میں پکڑا اور اسکرین پر لکھے ”شہزاد کالنگ“ کے الفاظ دیکھنے لگا۔۔۔
ان الفاظ کو دیکھنے کے لیے پتا نہیں کتنے سال اس کی آنکھیں ترسی تھیں، ابھی تو بصارتوں کے آدھے قرض بھی ادا نہیں ہوئے تھے اور ارتضٰی حیدر ان دونوں کے بیچ آن کھڑا ہوا تھا۔
”کیوں تنگ کرتی ہو مجھے۔۔۔؟“ ہم زاد نے کال اٹینڈ کر کے شکوہ بھرے انداز میں کہا۔
”میں کیوں کروں گی ایسا۔۔؟“ دوسری طرف وہ حیران ہوئی۔
”تم ہی تو کرتی ہو، اور دکھ کی بات یہ ہے کہ تمہیں اس بات کا احساس تک نہیں ہوتا۔۔۔“ ہم زاد کی آنکھوں میں رقم کرب کی تحریر صاف پڑھی جا رہی تھی۔
”ارتضٰی والی بات بُری لگی ہے تمہیں۔۔۔“ شہزاد نے گویا اس کے دل کی بات بوجھ لی۔
”نہیں، مجھے کیوں لگے گا بُرا۔۔۔؟“ وہ صاف مکر گیا۔
”حالانکہ بُرا لگنا چاہیے تمہیں۔۔۔“ فضا میں شہزاد کا نسوانی قہقہہ گونجا۔۔
”وہ کیوں۔۔؟؟“ ہم زاد نے انجان بن کر پوچھا۔
”اس لیے کہ تم محبت کرتے ہو مجھ سے۔۔“ شہزاد کے شوخ لہجے پر اس کے من میں پھانس چبھی، کہ ایک لمحے کو سانس لینا دشوار ہو گیا۔
”اور تم کیا نفرت کرتی ہو مجھ سے۔۔۔؟“ اس نے اپنے لہجے کو لاپرواہ بنانے کی حتی المقدور کوشش کی۔
”ایسا ہوسکتا ہے بھلا۔۔۔“ شہزاد کو پہلی دفعہ اس کے لہجے میں موجود سنجیدگی کی سنگینی کا احساس ہوا۔۔
”تو پھر کیا تعلق ہے تمہارے اور میرے بیچ۔۔۔؟“ اس کے اس سوال پر شہزاد کو اپنی سانس سینے میں اٹکتی ہوئی محسوس ہوئی۔
”ہم زاد ہو تم میرے۔۔۔“
”لیکن یہ دعویٰ تو میں کرتا ہوں، ضروری تھوڑا ہے کہ تم بھی اس سے متفق ہو۔۔؟“
”میں اگر متفق نہ ہوتی تو کیا ہر مشکل میں تمہاری طرف دیکھتی، تم سے بات کرتی۔۔؟“ شہزاد نے اسے لاجواب کیا۔
”تمہارے ہر مشکل وقت میں تو ارتضٰی بھی ساتھ ہوتا ہے تمہارے۔۔۔“
”لیکن میں اس کے ساتھ نہیں ہوتی۔۔۔“ شہزاد کے لہجے کی بے ساختگی، اس کی سچائی کی گواہ تھی۔
”تو پھر اس خبیث انسان کو ہر وقت ساتھ لے کر گھومنے کی ضرورت کیا ہے۔۔۔“ اسکی جھنجھلاہٹ شہزاد کو لطف دے گئی۔
”میں کوئی ہاؤس وائف نہیں ہوں یار، ایک ورکنگ وومن ہوں اور دن میں سو بار ملنا پڑتا ہے مجھے بہت سے لوگوں سے۔۔۔“ اسے نہ چاہتے ہوئے بھی صفائی دینا پڑی۔
”لیکن ان سب لوگوں میں، کسی دن یہ ارتضٰی حیدر قتل ہو جائے گا میرے ہاتھوں۔۔۔“ وہ چڑ کر مزید

گویا ہوا۔

”یقین مانو — اتنی بڑی دنیا میں اپنا ایک رقیب بھی برداشت نہیں کرسکتا میں۔۔“ ہم زاد کے لہجے میں موجود جھنجلاہٹ اور غصے کی کیفیت کو سمجھ کر وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ دوسری طرف ہم زاد بھی کچھ پرسکون ہوا تھا۔ تبھی تو اگلے ہی منٹ وہ دونوں بڑے نارمل انداز سے گفتگو کررہے تھے۔

☆☆☆

آج بھی مری میں سردی کی شدت انتہا پر تھی۔۔۔ درجہ حرارت منفی — چار ہا تھا۔۔۔

لیکن میر ہاؤس کے اندر ہونے والے ”سانحہ شاہ میر“ کی وجہ سے بھی مکینوں کے مزاجوں کا موسم خاصا گرم تھا اور ہر کوئی ایک دوسرے سے نظریں چرائے گھوم رہا تھا۔

طوبیٰ موٹا سا اونی کوٹ پہنے ہوئے انابیہ کے ساتھ ہال کمرے کے صوفے پر تھی، اور پیروں کے پاس الیکٹرک ہیٹر جلا کر رکھا ہوا تھا۔۔

ٹی وی پر کسی ڈرامے کی آخری قسط چل رہی تھی اور اس دوران شاہ میر کی اچانک آنے والی کال نے اسے بوکھلا کر رکھ دیا، وہ فون اٹھا کر اپنے اور انابیہ کے مشترکہ کمرے کی طرف بھاگی، جو اس وقت خالی تھا، طوبیٰ نے اندر گھستے ہی دروازہ لاک کرکے پریشان انداز سے کال اٹینڈ کی۔

”شاہ میر۔۔۔ کیوں فون کیا ہے مجھے۔۔؟“ اس کی سانسیں ابھی تک بے ربط تھیں۔

”کیوں بابا نے ”گھر“ سے اور تم نے ”دل“ سے نکال دیا ہے مجھے۔۔۔؟“ اپنے میس میں موجود شاہ میر جو پورے میر ہاؤس کے مکینوں پر ہی تپا بیٹھا تھا۔ اس نے طنزیہ انداز اپنایا۔ جسے سن کر طوبیٰ سلگ کر رہ گئی۔

”بکومت۔ میں نے ایسا کب کہا۔۔“ وہ جل کر بولی۔

”ری ایکٹ تو تم ایسے ہی کررہی ہو جیسے کال کرکے کوئی بڑا گناہ کرلیا ہو میں نے۔۔۔“ وہ بےزاری کی انتہا پر تھا۔

”داجی، تایا ابا سب موجود ہیں گھر میں۔۔۔“ طوبیٰ نے بوکھلا کر صفائی دی۔

”تو میں نے کون سا ویڈیو کال کرلی ہے تمہیں، جو انہیں میری منحوس شکل دکھائی دے — گی تمہارے سیل فون پر۔۔۔“ آگے بھی شاہ میر تھا، جس سے باتوں میں جیتنا کم از کم طوبیٰ کے لیے ناممکن تھا۔

”شکل تو منحوس نہیں ہے لیکن باتیں ضرور کرتے ہو ایسی۔۔۔“ طوبیٰ کے دل جلے انداز پر نہ چاہتے ہوئے بھی وہ ہنس پڑا۔

”چلو اسی خوشی میں آجاؤ مجھ سے ملنے۔۔۔“ اس کی اگلی فرمائش پر طوبیٰ کا دماغ بھک کرکے اڑا۔

”بھنگ تو نہیں پی لی تم نے سردی کی شدت کو کم کرنے کے لیے۔۔۔“

”نہیں، تمہاری محبت کا نشہ ہی اتنا اسٹرونگ ہے کہ اس کے سامنے دنیا بھر کے نشے بےمعنی ہیں۔۔۔“ وہ پٹڑی سے اترا۔

”شاہ میر، یہ فضول باتیں کرنے کے لیے فون کیا ہے تم نے۔۔۔؟“

”نہیں، تمہیں یہ بتانے کے لیے کہ آج شام سات بجے جی پی او چوک پر انتظار کروں گا میں تمہارا۔۔۔“

”لیکن میں کیسے آسکتی ہوں۔۔۔؟“ اس نے گھبرا کر وال کلاک پر ٹائم دیکھا، شام کے پانچ بج رہے تھے۔

”جیسے درشہوار اور نمیرہ کے ساتھ سارا دن گھومتی ہو ان روڈز پر۔۔۔“ وہ لاپروائی سے گویا ہوا۔

”ان کو بھی ساتھ لے آؤں کیا۔۔۔؟“ طوبیٰ کی اگلی بات نے اسے جی بھر کر بدمزا کیا۔

”خبردار کسی کو نہیں بتاؤ گی تم۔ ان کو بھی لے آؤں۔۔“ شاہ میر نے چڑ کر اس کی نقل اتاری۔

”لیکن، کس لیے بلا رہے ہو تم۔۔۔؟“

”کچھ دینا ہے تمہیں۔۔۔“ وہ پراسرار انداز میں گویا ہوا، طوبیٰ کے کان کھڑے ہوئے۔

”کیا۔۔۔؟“

”یہ تو تم آؤ گی تو پتا چلے گا تمہیں۔۔۔۔“ وہ ابھی کچھ بھی بتانے کے موڈ میں نہیں تھا۔

”بہت مشکل ہے میرو، آج بابا، داجی اور تایا ابا سب موجود ہیں گھر میں۔۔۔“

”بےفکر رہو، شام کو ایک منسٹر کے ہاں ڈنر ہے ان کا، یہ تینوں نکل جائیں گے گھر سے ایک دو گھنٹوں میں۔۔۔“ شاہ میر کی بات پر وہ کچھ پرسکون ہوئی۔

”تمہیں کس نے بتایا۔۔۔؟“

”ارسل کے علاوہ کون بتا سکتا ہے مجھے، لیکن چھوڑو، پھر آرہی ہو ناں۔۔۔؟“ اس نے منہ بنا کر دوبارہ تصدیق چاہی۔۔

”شاہ میر ڈر لگ رہا ہے مجھے۔۔۔“

”بےوقوف لڑکی، میں آجاتا تمہیں لینے، لیکن پتا ہے ناں، روڈ سنگل ہے اور سارا دن بابا اور داجی کی گاڑیاں اسی سڑک پر گھومتی رہتی ہیں، کسی نے دیکھ لیا تمہیں میرے ساتھ، تو شامت اب کی بار تمہاری ہی آئے گی۔۔۔“ شاہ میر نے اس دفعہ نرمی سے کہا۔۔

”اچھا میں کوشش کروں گی۔۔۔“ طوبیٰ نے ہلکا سا سوچ کر کہا۔

”کوشش نہیں کرنی، آنا ہے تم نے۔۔۔“ دوسری طرف وہ ہلکی سی ناراضی سے گویا ہوا تو طوبیٰ نے نہ چاہتے ہوئے ہامی بھر ہی لی، لیکن فون بند کرکے وہ ٹھیک ٹھاک پریشان ہوچکی تھی کیونکہ اسے اب یہ سوچنا تھا کہ وہ کیا بہانہ بنا کر گھر سے نکلے۔۔

☆☆☆

رومیصہ گود میں رکھے لیپ ٹاپ پر آج کافی عرصے بعد سوشل میڈیا کھنگال رہی تھی۔

فیس بک پر شوبز کے ایک پیج پر لگی ٹینا بیگم اور سیف الرحمٰن کی تصویر دیکھ کر اسے دھچکا لگا۔ آنکھیں ضبط کی کوشش میں لال ہوئیں۔

اس کے جسم میں دوڑتے خون کے اندر اشتعال اور غصہ ٹھاٹھیں مارنے لگا۔

اس کا خیال تھا کہ اتنے بڑے سانحے سے گزرنے کے بعد اب ٹینا بیگم کافی حد تک سدھر گئی ہوں گی، لیکن اس خبر کو دیکھتے ہی رومیصہ کی خوش فہمی بھاپ بن کر فضاؤں میں تحلیل ہوگئی۔۔۔

اس پوسٹ کے نیچے موجود لوگوں کے فضول کمنٹس پڑھ کر رومیصہ کا منہ غصے سے سرخ ہوا، لوگوں نے دونوں کو اور خاص طور پر ٹینا بیگم کو بےنقط سنائی تھیں۔ اس نے جھنجلا کر لیپ ٹاپ بند کیا اور غصے سے سائیڈ پر رکھا۔

ٹینا بیگم کے شوبز کے لوگوں کے ساتھ تعلقات خاصے گہرے تھے اور آئے دن ہونے والے فیشن شوز، سیمی نارز اور گیدرنگز کے علاوہ وہ مارننگ شوز میں بھی لوگوں کو بیوٹی ٹپس وغیرہ دیتی ہوئی دکھائی دیتی تھیں بلکہ اب تو انہوں نے یوٹیوب پر باقاعدہ اپنا بیوٹی ٹپس کے حوالے سے چینل لاؤنچ کررکھا تھا جسے بہت زیادہ

لوگ سبسکرائب کر چکے تھے۔۔

رومیصہ کو اپنا دماغ کھولتا ہوا محسوس ہوا، اپنے اندر کی کھولن کو کم کرنے کے لیے اس نے سائیڈ میز پر رکھے کرسٹل کے جگ کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اچانک اس کی نظر سامنے رکھے انگلش اخبار پر پڑی جس کے پچھلے صفحے پر ٹینا بیگم اور سیف الرحمن کی وہی تصویر بڑے نمایاں انداز سے شائع ہوئی تھی، جس میں سیف الرحمن نے بڑی بے تکلفی کے ساتھ ٹینا بیگم کے کندھے پر ہاتھ رکھا ہوا تھا اور انہیں پیار بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اخبار نے اس خبر کو بڑے چٹ پٹے انداز میں شائع کیا تھا اور اخبار کے ذرائع کا دعویٰ تھا کہ ٹینا بیگم عنقریب سیف الرحمن سے چوتھی شادی کرنے والی ہیں۔۔

''واٹ دا ہیل ۔۔۔۔'' رومیصہ نے ہاتھ میں پکڑا پانی کا جگ اٹھا کر سائیڈ میز پر پٹخا اور اس میں سے کچھ پانی چھلک کر زمین پر جا گرا۔

وہ اخبار اٹھا کر فیصلہ کن انداز میں پاؤں پٹختی ہوئی اپنے کمرے سے نکلی اور بدقسمتی سے ٹینا بیگم اس وقت سیف الرحمن کے ساتھ ہی سٹنگ روم میں کافی پینے میں مگن تھیں، اسے دیکھ کر وہ بے ساختہ انداز میں مسکرائیں۔

''سیفی، یہ میری چھوٹی بیٹی ہے رومیصہ۔۔۔'' انہوں نے محبت سے تعارف کروانا چاہا۔

سیف الرحمن نے اپنائیت بھرے انداز سے رومی کی طرف دیکھا، جس کے چہرے پر بیزاری کا ایک جہان آباد تھا۔

''آپ سے علیحدگی میں کچھ بات کرنی ہے مجھے۔۔'' اس کے لہجے اور چہرے پر موجود برہمی پر ٹینا بیگم ہلکی سی خفت کا شکار ہوئیں۔ رومیصہ نے سیف الرحمن کو بالکل بھی لفٹ نہیں کروائی تھی اور اس کی یہ حرکت ٹینا بیگم کو نادم کرنے کے لیے کافی تھی۔

''کیا ہوا رومی۔۔۔؟''

''آپ چلیں میرے روم میں، مجھے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔۔''

''تم چلو میری جان، میں آرہی ہوں۔۔۔'' وہ تھوڑا سا پریشان ہوئیں۔۔

''میں نے کہا ناں مجھے ابھی اور اسی وقت بات کرنی ہے۔ آپ چلیں میرے ساتھ۔'' اس کے ضدی انداز پر سیف الرحمن کافی کا کپ ایک سائیڈ پر رکھ کر کھڑے ہوئے اور ٹینا بیگم نے گھبرا کر ان کی طرف دیکھا۔

''میرا خیال ہے ٹینا، مجھے چلنا چاہیے، کل کلب میں ملاقات ہوگی۔''

''شیور۔۔'' وہ پھیکے سے انداز میں مسکرائیں۔

''ٹیک کیئر۔۔۔'' وہ سٹنگ روم سے نکل گئے۔۔۔

''یہ کون تھے ؟ اور کیوں منہ اٹھا کر بیٹھے ہوئے تھے ہمارے گھر میں۔۔؟'' ان کے کمرے سے نکلتے ہی رومی کی آنکھوں سے شعلے نکلے۔

''کیا ہوا ہے رومیصہ، تم سے کسی نے کچھ کہا ہے کیا۔۔؟'' وہ ٹھیک ٹھاک پریشان ہوئیں۔

''کسی کے کہنے، سننے سے کوئی فرق پڑتا ہے تو وہ صرف اور صرف آپ کی اولاد کو، ورنہ آپ کی زندگی میں تو بس عیاشی، انجوائے منٹ اور اسکینڈلز ہونے چاہئیں، چاہے اس کی کوئی بھی قیمت ادا کرنی پڑے۔۔۔'' اس نے ماں کو آئینہ دکھانے کی کوشش کی۔

''یہ کیا فضول باتیں کر رہی ہو تم۔۔۔'' وہ ہلکا سا جھنجلائیں۔

''میری فضول باتیں آپ کو نظر آرہی ہیں، کبھی اپنی فضول حرکتیں نظر نہیں آئیں ؟ کیوں کرتی ہیں آپ ایسا۔۔؟ بس کردیں، خدا کے لیے اب بس کردیں۔''

رومیصہ نے مشتعل انداز سے ماں کے سامنے ہاتھ جوڑ یے۔۔

اسی لمحے شہزاد کی گاڑی گھر میں داخل ہوئی، وہ نہیں جانتی تھی کہ ایک نیا ہنگامہ اس کا منتظر ہے۔ وہ تھکے تھکے انداز سے سٹنگ روم کی طرف بڑھی۔

''کیوں خود کو تماشا بنا رہی ہیں آپ ساری دنیا کے سامنے۔۔۔؟'' رومیصہ کی مشتعل آواز باہر تک آئی تو شہزاد کو دھچکا لگا۔

بہت عرصے بعد ٹینا ہاؤس کے در و بام نے رومیصہ کے چیخنے کی آواز سنی تھی۔ ایک لمحے کو تو شہزاد کو بھی یوں لگا جیسے وہ کسی اور کے گھر آگئی ہو۔

اس نے جیسے ہی لاؤنج کا گلاس وال دروازہ اندر کی طرف دھکیلا، سامنے رومیصہ سرخ چہرے کے ساتھ ٹینا بیگم کے عین سامنے کھڑی تھی اور اس کی آنکھوں میں اشتعال، غصہ اور ناراضی کے ملے جلے تاثرات تھے۔

دوسری طرف ٹینا بیگم جھنجلائی ہوئی سر پکڑے کاؤچ پر بیٹھی ہوئی تھیں اور شہزاد کے لیے زیادہ پریشانی کی بات رومیصہ کا چیخنا نہیں بلکہ ٹینا بیگم کا خاموش ہونا تھا، تبھی وہ لپک کر ان کے پاس گئی۔۔۔

''کیا ہوا ماما۔۔۔؟؟؟'' شہزاد نے گھبرا کر ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''ان سے کیوں پوچھ رہی ہو، یہ کیا بتائیں گی تمہیں۔؟'' رومیصہ نے سائیڈ میز پر رکھا ایک انگلش اخبار اٹھا کر شہزاد کے سامنے اچھالا۔ اخبار کے صفحات قالین پر بکھر گئے۔

''ذرا دیکھو ان کے چٹ پٹے قصے، دوبارہ سے اخبارات کی زینت بننے لگے ہیں۔ پتا نہیں انہیں سکون کیوں نہیں آتا۔۔'' رومیصہ متنفر انداز میں گویا ہوئی۔

شہزاد نے ایک نظر زمین پر گرے اخبار پر ڈالی، سامنے ٹینا بیگم اور سیف الرحمن کی کسی پارٹی کے دوران بے تکلفانہ انداز میں کھینچی ہوئی تصویر سے اسے سارا معاملہ سمجھ میں آگیا تھا اس نے بہت تیزی سے خود کو سنبھالا۔

''ہاں تو کیا ہے۔۔۔؟'' شہزاد نے اپنے مخصوص متحمل انداز میں رومی کی طرف دیکھا۔ ٹینا بیگم پریشان انداز میں ایک سائیڈ پر رکھے کاؤچ پر یوں بیٹھی ہوئی تھیں جیسے موضوع گفتگو ان کی ذات نہیں کوئی اور ہو۔

''تمہاری نزدیک یہ کچھ نہیں ہے۔۔۔'' رومیصہ نے غصے سے اخبار کی طرف اشارہ کیا۔

''ماما کا شوبز سے تعلق ہے، سیلبرٹیز کے فیشن شوز کنڈکٹ کرواتی ہیں، ایسے لوگوں کے پیچھے تو میڈیا ویسے ہی ہاتھ دھو کر پڑا رہتا ہے۔۔'' شہزاد نے شعوری طور پر ماں کا دفاع کرنے کی کوشش کی اور ٹینا بیگم کی سانس بحال ہوئی۔

''تم کہہ سکتی ہو، کیونکہ تمہارے ساتھ وہ سب کچھ نہیں ہوا، جو اس گھر میں صرف اور صرف ان کی وجہ سے میرے ساتھ ہوا۔۔'' رومیصہ نے نفرت بھری نگاہوں سے اپنی ماں کو گھورا، جن کا چہرہ ایک دم فق ہوا تھا۔

''کیا ہوا ہے تمہارے ساتھ۔۔۔؟'' شہزاد اپنے ازلی متحمل انداز میں اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔

''سن سکو گی۔؟ اتنا حوصلہ ہے تم میں۔؟'' رومیصہ نے استہزائیہ انداز سے اپنی بہن کا پرسکون چہرہ

دیکھا۔

''ہاں ہے۔۔۔بولو۔۔۔''

''رہنے دو، یہ جن کی تم آج طرفداری کر رہی ہو ناں، ان کا بھیانک چہرہ کھل کر سامنے آجائے گا تمہارے۔۔۔'' رومیصہ نے نفرت بھری ایک نگاہ ٹینا بیگم پر ڈالی تو شہزاد نے گھبرا کر اپنی ماں کی طرف دیکھا، جو نظریں چرائے بیٹھی تھیں۔۔۔

''رومی، میں نے کہا ناں، تم بتاؤ، آخر مجھے بھی تو پتا چلے۔۔۔'' اس نے فکرمندانداز سے اپنی بہن کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''میرا سارا بچپن، میری معصومیت، میری ساری خوشیاں چھین لیں۔۔۔'' وہ بولتے بولتے ایک دم رو پڑی، شہزاد کے دل کو کچھ ہوا۔۔۔

''کس نے۔۔۔؟؟؟'' شہزاد کے حلق سے پھنسی ہوئی آواز نکلی۔۔

''پوچھو ان سے، انہیں سب پتا ہے۔۔۔'' رومیصہ کا لہجہ زہر آلود تھا۔

''نہیں، تم بتاؤ مجھے۔۔۔'' شہزاد کا دماغ ایک دم بھک کرکے اڑا۔

''ان کے سابقہ شوہر ہارون رضا نے کیا، کیا تھا میرے ساتھ۔۔۔؟ پوچھو ان سے۔۔'' الفاظ نہیں خنجر کی تیز دھار تھی جو شہزاد کے پورے وجود کو کاٹتی ہوئی چلی گئی۔ شہزاد کو اپنی سانس تنگ ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''اس کے باوجود بھی انہوں نے نہیں چھوڑا اس بدبخت شخص کو۔۔۔'' رومیصہ کی بات پر شہزاد یوں ساکت ہوئی جیسے اس کے تن سے روح نکل گئی ہو۔

رومیصہ کی پیچیدہ شخصیت کی ایک گرہ بہت بدصورت انداز میں اس کے سامنے کھلی تھی اور اسے پہلی دفعہ اپنی بہن پر بُری طرح سے رحم آیا۔ شہزاد کا دل بے آواز ہی ٹوٹ گیا۔۔۔

''مام۔۔۔'' صدمے سے شہزاد کے لفظ اس کے تالو سے چمٹ گئے۔

ٹینا بیگم اس وقت کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح بیٹھی تھیں۔ ان کے لبوں پر خاموشی کی مہر ثبت تھی اور ان کے جھکے ہوئے سر نے شہزاد کو باور کروا دیا تھا کہ رومی کا ایک ایک لفظ سچائی پر مبنی ہے، اس نے تو آج اپنی بہن کو جلتے ہوئے کوئلوں پر لا کھڑا کیا تھا۔

''ایسا نہیں ہے شیری، اسی واقعے کے بعد میں نے ہارون رضا کو گھر سے نکالا تھا۔۔۔'' انہوں نے بوکھلا کر اپنی صفائی دینے کی کوشش کی۔

شہزاد کو یاد آیا جب وہ پاکستان آئی تھی تو تب ہارون علیحدہ گھر میں شفٹ ہو چکے تھے۔

''لیکن اس درندے کا اپنے گھر میں آنا تو بند نہیں کیا تھا ناں آپ نے۔۔۔'' رومی نے لفظوں کا ایک اور چابک ان پر برسایا۔

''وہ شوہر تھا میرا، میں نہیں روک سکتی تھی اسے۔۔'' ان کے ہر انداز میں بے بسی کا رنگ غالب تھا۔

''آپ کی جگہ میں ہوتی تو اس شخص کے منہ پر تھوکنا بھی پسند نہ کرتی۔۔۔'' رومی متنفرانداز میں کہتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

''ٹرسٹ می شیری، میں نے بہت لعن طعن کی تھی اور دوبارہ اس شخص کو اپنے گھر میں رات رکنے کی کبھی اجازت نہیں دی۔۔'' انہوں نے لپک کر شہزاد کا ہاتھ پکڑ کر اسے صفائی دینے کی کوشش کی۔

لیکن شہزاد خود بھی اس وقت حواسوں میں نہیں تھی، وہ آہستہ سے ان کا ہاتھ پیچھے کر کے سٹنگ روم سے باہر نکل آئی۔

اسے اپنے ہی گھر میں گھٹن کا شدید احساس ہو رہا تھا، اسے لگا کہ وہ دو منٹ بھی اس چھت کے نیچے کھڑی رہی تو اس کا دم گھٹ جائے گا۔

☆☆☆

اوائل جنوری کے دن تھے اور شام ڈھلے ہی دامن کوہ کے پہاڑوں پر تیرگی کا بسیرا ہو جاتا۔۔

رات کے نو بج رہے تھے اور دامن کوہ پکنک پوائنٹ پر اکا دکا لوگ یا پھر سیکورٹی گارڈز ہی موٹے اونی کوٹ پہنے گھوم رہے تھے۔

بے تحاشا سردی کی شدت نے لوگوں کو اپنے گھروں تک محدود کر دیا تھا۔۔۔

شہزاد نے ہلکا سا سویٹر پہنا ہوا تھا اور وہ موسم کی شدت سے بے نیاز صدمے بھرے انداز میں سنگ مرمر کے بینچ پر تنہا بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے دماغ میں رومیصہ کے جملوں نے ایک بھونچال برپا کر رکھا تھا۔

اسے پہلی دفعہ ماں بیٹی کے رشتے میں موجود نفرت کی دیوار کے پار کھڑی بدصورت سچائی نظر آئی تھی، اور وہ جو ہمیشہ رومیصہ کو بدتمیز، بدلحاظ اور ناسمجھ سمجھتی تھی،

اس کے وہم و گمان کی آخری سرحدوں پر بھی نہیں تھا کہ وہ اپنے ساتھ اس قدر خوفناک ماضی لیے گھومتی ہوگی۔

ہارون رضا اس کی توقع سے کہیں زیادہ گھٹیا اور گرا ہوا انسان نکلا تھا۔

''میرا سارا بچپن، میری کل معصومیت، میری ساری خوشیاں چھین لیں۔'' شہزاد کو جیسے ہی رومی کا یہ جملہ یاد آیا اس کا دل گویا کسی شکنجے میں کس گیا۔

''تم کہہ سکتی ہو، کیونکہ تمہارے ساتھ وہ سب کچھ نہیں ہوا، جو اس گھر میں صرف اور صرف ان کی وجہ سے میرے ساتھ ہوا۔'' رومی کی اس بات پر اسے مارگلہ کی ساری پہاڑیاں اپنے اوپر گرتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

انتہائی سرد موسم میں اسے وہاں اکیلے بیٹھے ہوئے پورے چالیس منٹ ہو چکے تھے لیکن دل و دماغ ابھی تک اس صدمے سے باہر نہیں نکلا، ایسے لگتا تھا جیسے زندگی میں کوئی بھونچال سا آگیا ہو، جس نے ہر چیز کو تہس نہس کر کے رکھ دیا ہو۔

رومیصہ جس قیامت سے آج سے کئی سال پہلے گزری تھی وہ شہزاد کے وجود میں آج قطرہ قطرہ بن کر داخل ہو رہی تھی۔ اس زہریلی سچائی نے اس کے سارے وجود کو نیلا کر دیا تھا۔

دل و دماغ کسی کھولن کی زد میں تھا اور آنسو بغاوت پر اترے ہوئے۔

دامن کوہ کی سرسبز پہاڑیوں پر رات اپنا بستر بچھا چکی تھی، اور ہر طرف گہری تاریکی کا راج تھا، دور کہیں گھنے درختوں میں گیدڑوں اور بندروں کے بولنے کی آوازیں رات کے سناٹے میں عجیب سا تاثر پیدا کر رہی تھیں۔

شہزاد اس وقت، رات کی تاریکی، موسموں کی شدت اور جنگلی جانوروں کے خوف سے بے نیاز تھی۔ پراسرار خاموشی میں سیل فون کی آواز اسے حقیقت کی دنیا میں لے آئی، دوسری طرف ہم زاد تھا۔

''ہیلو۔۔۔!!!'' شہزاد کا گلوگیر لہجہ دوسری طرف ہم زاد کو بے چین کر گیا۔

''تم رو رہی ہو شہزاد۔۔۔؟''

''نہیں تو۔۔۔'' اس نے اپنے بازو کی پشت سے بے دردی سے اپنے آنکھوں کو رگڑ کر صاف کیا۔ دنیا میں یہ واحد شخص تھا جس کے سامنے وہ لاکھ پردوں میں نہاں ہو کر بھی عیاں ہوتی تھی۔ اب اس نے اس کے

سامنے چھپنا ہی چھوڑ دیا تھا۔

"کیا ہوا شہزاد۔۔۔؟ تم رو کیوں رہی ہو؟ پلیز بتاؤ مجھے۔۔۔۔۔"

"مجھے ضرورت ہے تمہاری۔۔۔" وہ نہ چاہتے ہوئے بھی رو پڑی اور دوسری طرف ہم زاد کو لگا جیسے کسی نے اس کا دل کاٹ کر خنجر کی نوک پر رکھ دیا ہو۔

اس کا پورا وجود یوں لرز رہا تھا جیسے آندھی کی زد میں آیا ہوا کوئی خشک گھاس کا تنکا ہو۔

"کہاں ہو تم۔۔۔؟" وہ مضطرب ہوا۔

"دامن کوہ میں۔۔۔"

"اس وقت۔۔۔۔؟" وہ اچھا خاصا پریشان ہوا۔ "ٹیک اٹ ایزی پلیز، میں آرہا ہوں۔۔۔"

ہم زاد نے فون بند کیا اور شہزاد نے ایک لمبی سانس بھر کر اپنے اندر کی گھٹن کو باہر نکالنے کی کوشش کی۔

ابھی اسے فون پر بات کیے دو ہی منٹ ہوئے تھے، جب اس نے رات کے اندھیرے میں دامن کوہ کے بلند بالا درختوں میں دو افراد کو ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے دیکھا، شہزاد گھبرا کر کھڑی ہو گئی، اسی وقت فضاؤں میں گولی کے چلنے کی آواز کے ساتھ انسانی چیخ گونجی اور ساتھ ہی درختوں پر موجود پرندے خوف زدہ انداز میں فضاؤں میں اڑے۔

شہزاد بینچ سے اٹھ کر بے ساختہ ایک موٹے سے درخت کی آڑ میں کھڑی ہو گئی، فضا میں۔۔ تاریکی کا راج تھا لیکن چاند کی روشنی میں اس نے دیکھا، وہ کوئی دو تین لمبے تڑنگے مرد تھے، جو درختوں سے نکل کر سامنے آئے۔

"ہی از نو مور، لیٹس موو۔۔۔" ایک مرد زور سے چیخا اور ساتھ ہی فضا میں بھاگتے دوڑتے قدموں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ شہزاد بھی گھبرا کر اٹھی، اس کی چھٹی حس کسی بڑے خطرے کی گھنٹی بجا چکی تھی۔

دامن کوہ کے سارے ریسٹورنٹ اس وقت بند تھے اور اکا دکا روشنیاں ہی دکھائی دے رہی تھیں، وہ بوکھلائی ہوئی درختوں کے درمیان بنی ہوئی ایک چھوٹی سی روش پر پر تیز تیز چلنے لگی، اندھیرے میں اس کا پاؤں کئی دفعہ الجھا لیکن اس نے اپنے حواس قابو میں رکھے۔

شہزاد کو درختوں میں چھپے ہوئے جنگلی جانوروں کا بھی خوف تھا کہ کوئی اس پر اچانک حملہ نہ کر دے اور سیل فون کی روشنی کسی کو بھی اس کی موجودگی سے آگاہ کر سکتی تھی، اس لیے وہ چاند کی مدھم روشنی میں خوف زدہ انداز کے ساتھ پارکنگ کی طرف بڑھ رہی تھی۔

رومیصہ والا سارا معاملہ کچھ لمحوں کے لیے اس کے ذہن سے بالکل نکل گیا، اسے اپنی بے وقوفی کا شدت سے احساس ہوا کہ اسے رات کے اس پہر یہاں اکیلے آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔۔۔

"ایک نوجوان کا قتل ہوا ہے، اللہ جانے کون ہے بیچارہ۔۔۔" وہ جیسے ہی پارکنگ میں پہنچی، اس نے کچھ سیکورٹی گارڈز کو بھاگ کر جائے وقوعہ کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ اتنے میں ایک سیکورٹی گارڈ کی نظر شہزاد پر پڑی، وہ ٹھٹک کر رکا اور مشکوک نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"بی بی آپ یہاں کیا کر رہی ہیں۔۔۔؟"

"میں اوپر گرل کے پاس بیٹھی تھی اور گولی چلنے کی آواز سن کر بھاگی ہوں وہاں سے۔۔۔" شہزاد خود کو سنبھال چکی تھی۔

"آپ نے دیکھا، کون لوگ تھے وہ۔۔۔؟"

"نہیں، میں نے صرف آوازیں سنی تھیں۔۔۔" شہزاد پراعتماد لہجے میں کہہ کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھی۔

اس کے پراعتماد انداز پر سیکورٹی گارڈ تھوڑا مطمئن ہوا اور جب وہ اپنی گاڑی چلا کر دامن کوہ سے نیچے کی طرف جا رہی تھی تب اس نے پولیس کی ایک وین کو اوپر جاتے ہوئے دیکھا۔

وہ جیسے ہی اپنی اسٹریٹ میں داخل ہوئی، اس کے سیل فون پر ہم زاد کا نمبر بلنک ہوا۔ اس نے کال اٹینڈ کی، دوسری طرف وہ فکر مند لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

"کہاں ہو تم۔۔۔؟ یہاں منسٹر عنایت اللہ کے بھانجے کا مرڈر ہوا ہے ابھی ابھی۔۔۔"

"ہاں، میں اسی وجہ سے آ گئی ہوں واپس۔۔۔" شہزاد کی بات سن کر ایک اطمینان بھرا سانس اس کے حلق سے برآمد ہوا۔

"تھینکس گاڈ۔۔۔ تم ٹھیک ہو ناں۔۔۔؟" اس کے لہجے میں کئی اندیشے اور وہم پنہاں تھے۔۔

"ہاں، اب ٹھیک ہوں۔۔" اس نے ٹینا ہاؤس کے گیٹ پر پہنچ کر ہارن دیا۔۔۔

"میرے لیے کیا حکم ہے؟ ٹینا ہاؤس آ جاؤں کافی پینے یا واپس چلا جاؤں۔۔۔" ہم زاد کی شوخی لوٹ آئی۔

"واپس چلے جانا ہی بہتر ہے اب آپ کے لیے۔" شہزاد اپنے گھر کے پورچ تک پہنچ چکی تھی۔

"او کے، لیکن رات کو مجھ سے تفصیل سے بات کرنی ہے تم سے۔۔" وہ سنجیدگی سے گویا ہوا تو شہزاد نے فوراً اثبات میں سر ہلا کر اسے اطمینان دلایا اور فون بند کر دیا، وہ ایک دفعہ پھر اسی جگہ پر پہنچ چکی تھی جہاں آج اس پر زندگی کی سب سے بدصورت حقیقت کا ادراک ہوا تھا، پورے گھر پر سناٹے کا راج تھا، ٹینا بیگم اور رومی دونوں ہی اپنے کمروں میں جا چکی تھیں۔

☆☆☆

طوبیٰ پچھلے ایک گھنٹے سے پورے گھر میں بولائی ہوئی پھر رہی تھی۔

داجی کے کمرے میں ہونے والی میٹنگ خاصی طویل ہو چکی تھی اور باہر سردی کی شدت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ شاہ میر سے ملنے کا وعدہ تو کر چکی تھی لیکن اب وہ اسے اپنی زندگی کی سب سے بڑی بے وقوفی لگ رہی تھی۔

"کوئی مسئلہ ہے تمہارے ساتھ۔۔۔" مونگ پھلیوں کی پلیٹ گود میں رکھے بیٹھی نمیرہ نے طنزیہ انداز سے اس کی طرف دیکھا۔

"نن۔۔۔۔۔ نہیں تو۔۔۔۔۔" وہ بوکھلا کر اوپر والے پورشن میں آ گئی اور اس نے کچھ سوچ کر پچھلے لان کی طرف جاتی ہوئی سیڑھیوں کے استعمال کا سوچا، وہ ایک لمبا چکر کاٹ کر جب گیٹ پر پہنچی تو چوکیدار نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا، لیکن پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔

پورا مری اس وقت اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا، بجلی کا کوئی بڑا بریک ڈاؤن ہوا تھا اس لیے گھروں اور دکانوں میں ہر طرف جنریٹر کے چلنے کی آوازیں تھیں، اور تازہ ترین ہونے والی برف باری کی وجہ سے سڑکوں پر پھسلن بھی کافی زیادہ تھی۔

"شاہ میر کے بچے نے کس مصیبت میں ڈال دیا۔۔۔" وہ دل ہی دل میں اسے کوستی ہوئی مال روڈ کی طرف بڑھ رہی تھی۔

اچانک ایک برف کی ڈھیری سے اس کا پاؤں پھسلا اور وہ دھڑام سے سڑک پر جا گری، کوئی نوکیلا پتھر اس کی کمر میں چبھا اور اس کا پاؤں بہت برے انداز سے مڑا اور اس کے منہ سے چیخ نکلی۔ وہ ٹھنڈی یخ نم

سڑک پر بہت بے ہودا انداز سے گری تھی، اور یہ بھی شکر تھا کہ سامنے سے ہادی کی گاڑی نے اسے گرتے دیکھ کر بڑی مہارت سے بریک لگائی، ورنہ رات کے اندھیرے میں وہ انہی کی گاڑی کے نیچے آ کر کچلی جاتی۔

''اوہ مائی گاڈ، کیا ہوا آپ کو۔۔۔؟ وہ دونوں بوکھلا کر گاڑی سے اترے اور گاڑی کی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں انہوں نے اسے پہچان بھی لیا تھا۔

''میرا پاؤں۔۔۔'' طوبیٰ درد کی شدت سے رو پڑی۔۔۔

''میرا خیال ہے، کوئی مسل پل ہوا ہے ان کا۔۔۔'' ہادی نے فکرمند لہجے میں سعد سے کہا۔

''پھر تو ہاسپٹل لے جانا ہوگا ان کو۔۔۔''

''پلیز خاتون، آپ کو تھوڑی ہمت کرنا ہوگی۔۔۔'' ہادی نے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا، وہ بمشکل کھڑی ہوئی، تکلیف کا احساس اس کے چہرے کے ایک ایک نقش سے نمایاں تھا اور وہ بار بار کراہ رہی تھی۔

ہادی اور سعد نے اسے اپنی گاڑی میں بٹھایا اور پاس ہی ڈاکٹر کے کلینک پر لے گئے۔

''جتنی ان کو تکلیف ہے، مجھے تو یہ سیدھا سادا فریکچر لگ رہا ہے، آپ کو ایکسرے کروانا ہوگا۔۔'' اس وقت کلینک پر ڈاکٹر کا اسسٹنٹ موجود تھا، جس نے طوبیٰ کی چیخ و پکار کے دوران بمشکل ہی اس کے پاؤں کا جائزہ لیا تھا۔

''اب کیا کریں۔۔؟؟'' ہادی نے پریشانی سے سعد کا چہرہ دیکھا۔

''آپ پلیز شاہ میر کو کال کریں میرے سیل فون سے، وہ آ جائے گا۔۔۔'' طوبیٰ نے بازو کی پشت سے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

''کہاں ہے آپ کا فون۔۔؟'' سعد نے حیرانی سے پوچھا۔

''اوہ مائی گاڈ، میرا کلچ کہاں ہے۔۔۔؟'' طوبیٰ نے بوکھلا کر دائیں بائیں ہاتھ مارا۔

''میں نے تو ایسی کوئی چیز نہیں دیکھی تھی آپ کے ہاتھ میں۔۔۔'' سعد کے اس جملے نے طوبیٰ کی پریشانی کو بڑھا دیا۔

''میرا خیال ہے، وہیں گر گیا ہے وہ۔۔۔'' طوبیٰ نے گھبرا کر اپنا سر پکڑ لیا۔۔

''کوئی بہت قیمتی چیز تھی اس میں۔۔۔؟'' ہادی نے اسے روتے دیکھ کر گھبرا کر کہا۔۔

''نہیں، بس میرا سیل فون اور پیسے تھے کچھ۔۔۔''

''میرا خیال ہے ہادی، ہم لوگ انہیں گھر ہی چھوڑ آتے ہیں، راستے میں ان کا پرس بھی چیک کر لیں گے، کیا پتا مل جائے۔'' سعد نے رسٹ واچ پر ٹائم دیکھا، رات کے آٹھ بج رہے تھے۔۔۔۔

کمپاؤڈر نے طوبیٰ کے پیر کی بینڈیج کر دی تھی لیکن وہ اتنا سوج چکا تھا کہ اب جوتے میں آنا ناممکن تھا، سعد اور ہادی نے اسے سہارا دے کر دوبارہ گاڑی میں بٹھایا۔ راستے میں انہوں نے رک کر طوبیٰ کا پرس بھی تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن وہ شاید کسی کے ہاتھ لگ چکا تھا کیونکہ طوبیٰ کا نمبر بند جا رہا تھا۔

''آپ پلیز مجھے گھر چھوڑ دیں۔۔'' طوبیٰ کو پاؤں میں تکلیف کا احساس بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

سعد کی گاڑی جیسے ہی میر ہاؤس کے سامنے پہنچی، پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی طوبیٰ نے جیسے ہی اپنے لان کا منظر دیکھا، اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ وہ بے ساختہ پیچھے کو ہو کر بیٹھ گئی۔۔

سڑک چونکہ اونچائی پر تھی، اور گھر خاصی ڈھلوان پر تھا اس لیے باہر سے اندر کا منظر صاف نظر آتا تھا۔ داجی اس وقت برآمدے میں لکڑیاں جلائے، کچھ مردوں کے ساتھ براجمان تھے، اور یہ کسی صورت بھی ممکن

نہیں تھا کہ طوبیٰ گیٹ سے اندر داخل ہوتی اور داجی اور مہمانوں کی نظروں سے بچ جاتی۔

''پلیز گاڑی اپنے گھر لے جائیں۔۔۔'' طوبیٰ نے بوکھلا کر کہا اور ہادی اور سعد بھی ایک لمحے میں ساری صورت حال سمجھ گئے۔

''لیکن آپ ہمارے گھر جا کر کیا کریں گی۔۔۔؟'' ہادی کو فطری۔ پریشانی نے گھیرا۔

''میں پچھلی سائیڈ والے لان سے کود کر اندر چلی جاؤں گی، لیکن پلیز آپ لوگ چلیں یہاں سے، ورنہ داجی میرے ساتھ ساتھ آپ کو بھی گولی مار دیں گے۔'' طوبیٰ کی یہ بات سن کر سعد نے بوکھلا کر دوبارہ گاڑی اسٹارٹ کی۔

وہ لوگ جیسے ہی ہادی کے پورچ میں پہنچے، آسمان پر کڑکتی بجلیوں کو جوش آیا اور دیکھتے ہی دیکھتے بارش کے ساتھ برف کے ننھے ننھے سے گولے بھی پوری قوت سے زمین پر گرنے لگے۔

مری کا موسم اچانک ہی پلٹا کھاتا تھا۔

''آپ کیسے جائیں گی اپنے گھر، کیونکہ پچھلے لان میں تو ویسے ہی برف کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔'' سعد نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے پریشانی سے مڑ کر اس کی طرف دیکھا جو پچھلی سیٹ پر سکڑی ہوئی بیٹھی تھی۔

نم آلود سڑک اور برف پر گرنے سے اس کا لباس گیلا ہو گیا تھا۔ جس سے سردی کی شدت کا احساس بھی بڑھ گیا تھا۔

''آپ پلیز اپنا سیل فون دیں ذرا۔۔۔'' طوبیٰ اب درشہوار سے مدد مانگنے کا فیصلہ کر چکی تھی، ہادی نے اپنا فون اس کی طرف بڑھایا۔

طوبیٰ نے تیزی کے ساتھ درشہوار کا نمبر ڈائل کیا، جو پہلی ہی بیل پر اٹھا لیا گیا، دوسری طرف درشہوار کی آواز میں شدید حیرت تھی، جس سے طوبیٰ کو اندازہ ہو گیا کہ اس کے پاس ہادی کا نمبر پہلے سے محفوظ تھا۔۔

''درشہوار، یہ میں ہوں طوبیٰ۔۔۔!!!'' وہ دبے دبے لہجے میں بولی۔

دوسری طرف موجود درشہوار کو ہادی کے سیل فون سے آنے والی طوبیٰ کی آواز نے ٹھیک ٹھاک شاک لگایا تھا، وہ بوکھلا کر کھڑی ہو گئی۔ یہ تو خیریت تھی کہ وہ اس وقت اپنے کمرے میں اکیلی تھی۔

''اوہ مائی گاڈ، تم ہادی کے گھر پہنچی ہوئی ہو بے غیرت، مجھے کیوں نہیں بتایا۔۔۔'' درشہوار چیخ کر بولی اور سیل فون کا والیوم فل ہونے کی وجہ سے گاڑی میں بیٹھے ہوئے ہادی اور سعد نے اس کا یہ جملہ مکمل ہوش و حواس کے ساتھ سنا تھا۔ ہادی کے چہرے پر ناگواری کا تاثر ابھرا۔

''بکواس بند کرو، مجھے شاہ میر نے بلایا تھا کوئی ضروری بات کرنے کے لیے۔۔''

''پڑوس میں۔۔۔؟ ہادی کے گھر۔۔۔؟'' درشہوار صدمائی لہجے میں گویا ہوئی۔۔

''تم اپنی زبان بند کر کے سکون سے میری بات نہیں سن سکتیں دو منٹ کے لیے۔۔۔'' طوبیٰ جھنجھلا سی گئی۔

''ہاں بولو، ہمہ تن گوش ہوں میں۔۔۔''

''میرو نے بلوایا تھا مجھے جی پی او چوک پر۔۔۔'' اس نے قدرے آہستگی سے کہا۔

''پھر۔۔۔؟'' درشہوار نے بے تابی سے پوچھا

''سڑک پر پھسلنے سے میرا پاؤں زخمی ہو گیا تھا یار اور شکر ہے یہ لوگ راستے میں مل گئے مجھے۔۔۔''

''تو پھر گھر آتی ناں ڈائریکٹ۔۔۔'' درشہوار نے بیزاری سے کہا۔

''بے وقوف لڑکی، سامنے والے برآمدے میں داجی پنچایت سجائے بیٹھے ہیں۔ کیسے آؤں میں

گھر۔۔؟ طوبیٰ نے اپنی پریشانی بتائی۔

''جب میرے بغیر جاؤ گی تو ایسا تو ہو گا ہی اور میرو بھیا کو تو میں پوچھوں گی۔۔'' دوسری طرف درشہوار کو غصہ آ گیا۔

''بعد میں پوچھتی رہنا، لیکن پلیز مجھے نکالو یہاں سے کسی طرح، مجھ سے تو ایک قدم بھی نہیں چلا جا رہا۔'' طوبیٰ کی پریشان آواز پر اسے ترس آ ہی گیا۔

''اس وقت تم ہو کہاں۔۔؟؟؟''

''ہادی بھائی کے پورچ میں۔۔۔''

طوبیٰ نے جیسے ہی ہادی کا نام لیا، درشہوار کے کان کھڑے ہو گئے اور اب اسے وہاں پہنچنے سے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی تھی۔

☆☆☆

''بے وقوف انسان، اپنے گھر کی لڑکیوں کو کون بلواتا ہے اس طرح اکیلے۔۔؟؟''

ارسل سیل فون پر شاہ میر سے بات کرتے ہوئے ایکدم غصے میں آیا، کیونکہ شاہ میر نے دو گھنٹے طوبیٰ کا انتظار کرنے اور اس کا فون مسلسل آف جانے کی وجہ سے گھبرا کر ارسل کو کال کر دی تھی، جو سارا قصہ سننے کے بعد اچھا خاصا بوکھلا گیا تھا۔

''یار برتھ ڈے تھا کل اس کا، سوچا تھا وش کر کے گفٹ دے دوں گا اسے۔۔'' شاہ میر نے شرمندگی سے جواب دیا۔

''اب وہی گفٹ ہار میں پرو کر اپنے گلے میں لٹکا لو۔۔'' ارسل نے جل کر کہا۔

''تم چوکیدار سے جا کر تو پوچھو۔۔'' شاہ میر نے پریشانی سے اسے مشورہ دیا۔

''تمہاری پہلی کال کے بعد یہی کیا تھا میں نے۔۔'' ارسل نے بے زاری سے وضاحت کی۔ ''گھر کا ایک ایک کمرہ دیکھ لیا اور چوکیدار سے پوچھا تو پتا چلا وہ دو گھنٹے پہلے گھر سے اکیلی نکلی تھی۔۔''

''او مائی گاڈ، لیکن کہاں گئی وہ۔۔؟'' شاہ میر کے ہاتھوں کے بھی طوطے اڑے۔

''تم کہاں ہو اب۔۔؟'' ارسل نے الجھ کر پوچھا۔

''اپنے گھر کی باہر والی روڈ پر، گھر سے جی پی او تک کا سارا راستہ دو دفعہ دیکھ آیا ہوں، لیکن وہ تو کہیں بھی نظر نہیں آئی مجھے۔۔'' شاہ میر نے پریشانی سے کہا۔

''سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس نے اپنا سیل فون کیوں آف کر رکھا ہے۔۔'' ارسل کو بھی تشویش لاحق ہوئی۔

''یار ارسل، مجھے سخت ٹینشن ہو رہی ہے۔۔ کوئی حادثہ نہ ہو گیا ہو اس کے ساتھ۔۔''

''اللہ نہ کرے، تم یہیں رکو، میں باہر آتا ہوں، ایک دفعہ دونوں دوبارہ دیکھ کر آتے ہیں۔۔''

''چھتری لے آنا، باہر بہت تیز بارش ہو رہی ہے۔۔۔'' شاہ میر نے فکر مند انداز میں کہہ کر کال کاٹ دی۔

دوسری طرف اب ارسل بھی ٹھیک ٹھاک پریشان ہو چکا تھا، اور یہ بات بھی ایسی تھی جو وہ گھر میں کسی سے شیئر نہیں کر سکتا تھا کیونکہ شاہ میر کے گھر چھوڑنے کے بعد حالات خاصے سرد چل رہے تھے۔۔

☆☆☆

تیز موسلا دھار بارش اور برف کے اولوں نے زمین پر ایک اودھم مچا رکھا تھا۔

جسم کو کاٹتی ہوئی سرد ہواؤں نے ایک دفعہ تو درشہوار کے ہوش ٹھکانے لگا دیے، وہ جو اپنی طرف سے ٹارزن بن کر گھر سے نکلی تھی، میر ہاؤس اور ہادی کے گھر کے درمیان کی منڈیر عبور کر کے جب وہاں پہنچی تو اچھی خاصی بارش میں بھیگ چکی تھی، اس کا جسم باقاعدہ کانپ رہا تھا۔

مجبوراً ہادی اور سعد کو انہیں پورچ سے سٹنگ روم میں لانا پڑا، جہاں آتش دان جلنے کی وجہ سے ماحول کافی گرم تھا اور درشہوار کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ آتش دان کے اندر گھس کر بیٹھ جائے۔

''یہ کافی پئیں گرم گرم۔۔'' سعد نے مسکراتے ہوئے چھوٹی سی ٹرے ان دونوں کے آگے رکھی۔

ہادی، درشہوار اور طوبیٰ کو مکمل طور پر نظر انداز کیے ایک سائیڈ پر رکھے صوفے پر بیٹھا، اپنے سیل فون پر مصروف تھا اور درشہوار بار بار کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی، اور کیسے ممکن تھا کہ ہادی اس کی اس حرکت کو نوٹ نہ کرتا۔ وہ کوفت بھرے انداز میں دو دفعہ پہلو بدل چکا تھا۔

''گھر کیسے جائیں گے؟ باہر تو تیز بارش ہے۔۔۔'' طوبیٰ نے پریشانی سے درشہوار کی طرف دیکھا، جو اس وقت ایسے مطمئن انداز میں بیٹھی تھی جیسے اپنے کسی قریبی رشتے دار کے گھر رہنے کے ارادے سے آئی ہو۔

''جب تک بارش نہیں رکتی، میں تو ہرگز نہیں جاؤں گی۔۔۔''

درشہوار کے بلند آواز میں کیے گئے اعلان پر ہادی نے گھبرا کر سعد کی طرف دیکھا۔ جیسے کہہ رہا ہو کہ اس لڑکی کا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا۔

''بارش اگر صبح تک نہ رکی تو کیا یہیں بیٹھے رہیں گے۔۔۔؟'' طوبیٰ نے ہلکا سا جھنجھلا کر دبے دبے انداز میں کہا۔

''ذرا باہر نکل کر دیکھو، لگ پتا جائے گا، مجھے نمونیا کروانے کا کوئی شوق نہیں۔۔'' اس نے کمال بے نیازی سے جواب دیا۔

''تم ارسل کو فون کرو، وہ گاڑی لے کر آ جائے گا۔۔'' طوبیٰ نے ہلکا سا سوچ کر مشورہ دیا۔

''گاڑی لے کر نہیں داجی کا پسٹل لے کر آئے گا، میرا ابھری جوانی میں فوت ہونے کا کوئی ارادہ نہیں۔'' اس کی شوخی ہادی کو سخت ناگوار گزری۔

''مس طوبیٰ ٹھیک کہہ رہی ہیں، آپ کو فون کر لینا چاہیے ارسل کو۔۔'' سعد نے ہلکا سا جھجک کر مشورہ دیا۔

''لیکن، میں کیا کہوں گی اس سے۔۔۔'' درشہوار کشمکش و پیچ کا شکار ہوئی۔

''وہی جو اصل بات ہے، حادثہ تو کہیں بھی اور کسی کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔۔۔'' اس دفعہ جواب خلاف توقع ہادی کی طرف سے آیا تھا اور اس بات کے بعد تو درشہوار کا سوچنا بنتا ہی نہیں تھا۔ اس نے کچھ سوچ کر ارسل کا نمبر ڈائل کیا، جو پہلی ہی بیل پر اٹھا لیا گیا۔

''ارسل کہاں ہو تم۔۔۔؟''

''شاہ میر کے ساتھ، اور تم کدھر ہو۔۔؟'' ارسل نے محتاط انداز میں پوچھا۔

''اپنے پڑوس میں، ہادی صاحب کے گھر۔۔۔۔''

''واٹ۔۔؟'' دوسری طرف ارسل کو شاک لگا۔

''زیادہ اوور ایکٹنگ کرنے کی ضرورت نہیں، طوبیٰ کے پاؤں میں فریکچر ہو گیا ہے شاید، وہ بھی ساتھ ہے میرے، اور اسی نے بلوایا تھا مجھے یہاں۔۔''

درشہوار کے ساتھ طوبیٰ کا نام سن کر دوسری طرف ارسل کے اعصاب کچھ پرسکون ہوئے۔

''اچھا، تم لوگ بیٹھو، ہم لوگ آ رہے ہیں وہاں۔۔۔'' ارسل نے جلدی سے فون بند کیا۔

ٹھیک پندرہ منٹ بعد ارسل اور شاہ میر دونوں ہی ہادی کے سٹنگ روم میں پہنچ چکے تھے اور شاہ میر خاصی پریشان نظروں سے طوبیٰ کی طرف دیکھ رہا تھا جو اس وقت منہ پھلائے بیٹھی تھی۔۔

''تمہیں واپس اپنے گھر جانا چاہیے تھا طوبیٰ۔۔۔'' شاہ میر نے دبے دبے انداز میں کہا۔

''ہزار دفعہ بتا چکی ہوں، سامنے داجی بیٹھے تھے، اور ان کے سامنے اس حالت میں جاتی تو اس وقت تم لوگ میری تدفین کی تیاریاں کر رہے ہوتے۔'' طوبیٰ اس دفعہ چڑ کر بولی اور ہادی اور سعد کے سامنے اس بات نے ارسل اور شاہ میر دونوں کو ہی خفت میں مبتلا کیا۔

''اچھا، اچھا، اب اتنے بھی ظالم نہیں ہیں وہ۔۔۔'' شاہ میر نے بات سنبھالنے کی کوشش کی، جو اسی کے گلے آن پڑی۔

''ظالم نہیں ہیں تو تمہیں گھر سے کیوں نکالا ہے ان سب نے مل کر۔۔۔'' وہ بیزاری سے گویا ہوئی۔ ہادی اور سعد دونوں کو سارا معاملہ سمجھ میں آ گیا، جبکہ اس سچویشن میں شاہ میر اور ارسل دونوں ہی طوبیٰ کی باتوں پر کوفت میں مبتلا ہوئے۔۔

''فضول بولنا بند کرو، اور اٹھو۔۔۔'' ارسل کو حد درجہ شرمندگی ہو رہی تھی۔ کچھ بھی تھا، وہ لوگ ان کے پڑوسی تھے اور کسی بھی صورت حال میں وہ اپنے گھر کی خواتین کو کیسے ان دو اکیلے مردوں کے پاس زیادہ دیر تک بیٹھنے دے سکتے تھے۔

''میں کیسے چلوں۔۔۔؟'' طوبیٰ نے بیزاری سے اپنے پیر کی بینڈیج کی طرف اشارہ کیا۔

''میرو کی گاڑی ہے، میں اندر تک چھوڑ آتا ہوں، کوئی پوچھے گا تو کہہ دوں گا میرے ساتھ تھیں تم دونوں۔'' ارسل نے سنجیدگی سے کہا۔

''لیکن گاڑی تک بھی کیسے جاؤں گی۔۔۔؟''

''میں اٹھا کر پھینک آؤں۔۔۔؟'' شاہ میر کو اس کا مسلسل بولنا کوفت میں مبتلا کر رہا تھا۔ اس دفعہ اس نے بھی بدلحاظی دکھائی۔ درشہوار نے تو ان دونوں کے بگڑے تاثرات دیکھ کر کان لپیٹ لیے تھے۔۔

''چلو اٹھو ہمت کرو، میں اور میرو بھیا سہارا دیتے ہیں تمہیں۔۔'' درشہوار نے اپنے بھائی کا خراب موڈ بھانپ لیا تھا۔

ارسل، فوراً سٹنگ روم سے باہر نکلا، وہ شاہ میر کی گاڑی گھر کے اندر تک لے آیا، بارش رک چکی تھی لیکن سرد اور خنک ہوائیں جسم کی ہڈیوں تک گھسی چلی آ رہی تھیں۔

ہادی کے گھر کا دروازہ کھلا، طوبیٰ، درشہوار اور شاہ میر کے سہارے بمشکل چلتی ہوئی گاڑی تک پہنچی، شاہ میر نے انتہائی احتیاط کے ساتھ اسے پچھلی سیٹ پر بیٹھایا۔

ارسل نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور درشہوار جھٹ سے اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی۔

''میں ادھر ہی ہوں، انہیں چھوڑ کر جلدی واپس آنا۔۔۔'' شاہ میر نے گہری نظروں سے طوبیٰ کا تپا تپا ہوا چہرہ دیکھتے ہوئے ارسل سے کہا۔

''شرافت سے مجھے نیا سیل فون لے کر بھیج دو، ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔۔۔'' طوبیٰ نے کھڑکی کا شیشہ نیچے کر کے شاہ میر کو انگلی اٹھا کر وارننگ دی۔

''وہ کس خوشی میں۔۔؟'' شاہ میر کا موڈ کچھ بہتر ہوا۔ اس وقت ہادی اور سعد ان کے ساتھ موجود نہیں تھے۔

''تمہیں ہی ملنے کا شوق تھا، اچھا خاصا میرا معاشی اور جسمانی نقصان کروا دیا۔'' طوبیٰ کے ناراض لہجے پر شاہ میر بے ساختہ ہنس پڑا۔

''ذرا باتیں سنو میڈم طوبیٰ کی، ان کا ''معاشی'' اور ''جسمانی'' نقصان ہو گیا ہے۔۔۔'' شاہ میر نے شرارت سے ارسل کو اشارہ کیا اور نہ چاہتے ہوئے بھی ارسل کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی، ایک دم شاہ میر کو کچھ یاد آیا۔۔۔۔

''ایک منٹ، ایک منٹ، ایک چیز تو رہ ہی گئی۔۔۔'' شاہ میر نے جلدی سے اپنی جیکٹ کی جیب سے ایک چھوٹا سا لفافہ نکال کر طوبیٰ کی طرف بڑھایا۔

''یہ لو، اسی کے لیے بلایا تھا میں نے۔۔۔''

''یہ کیا ہے۔۔؟'' اس نے کھا جانے والی نظروں سے شاہ میر کو دیکھا، جس کی گہری نظریں اس کے چہرے کا حصار کیے ہوئے تھیں۔

''تمہارا برتھ ڈے گفٹ۔۔۔۔'' شاہ میر کے محبت بھرے انداز پر طوبیٰ کے چہرے کے تاثرات میں نمایاں تبدیلی آئی۔

''تھینک یو۔۔۔'' وہ منہ بنا کر مسکرائی۔۔

''بھائی، خدا کے واسطے بس کر دیں، گھر سے کوئی نکل آیا تو شامت آ جائے گی ہماری۔۔۔'' درشہوار نے اپنی طرف کا شیشہ نیچے کر کے ہلکا سا چڑ کر کہا، تو شاہ میر نے ارسل کو گاڑی چلانے کا اشارہ کیا۔

گاڑی کے باہر نکلتے ہی شاہ میر نے حسرت بھری نگاہوں سے اپنے گھر کی طرف دیکھا، جس کے دروازے اس کے لیے بند ہو چکے تھے اور اللہ جانے کب تک بند رہنے تھے۔

☆☆☆

''ندرت امی، آپ مانیں یا نہ مانیں، لیکن اندر کوئی بڑا فیصلہ ہو رہا ہے۔۔۔''

نمیرہ جو کہ داجی کے دروازے سے کان لگائے اندر کی گفتگو سننے میں ناکام ہو گئی تھی، وہ دبے پاؤں واپس پلٹ آئی اور اس وقت ندرت امی کے کمرے میں موجود انہیں بھڑکانے کی کوشش کر رہی تھی۔

وہ شروع سے میر ہاؤس میں ندرت امی کے ہی قریب تھی جو رشتے میں اس کی چھوٹی ممانی لگتی تھیں لیکن اس نے انابیہ اور طوبیٰ کی دیکھا دیکھی انہیں ندرت امی ہی کہنا شروع کر دیا تھا۔

''ہاں وہ تو جغتائی صاحب اور سوتن صاحبہ کے بلوانے پر ہی ماتھا ٹھنک گیا تھا میرا۔۔۔'' وہ بھی اس وقت تپی بیٹھی تھیں کہ اس اہم اجلاس میں شرکت کرنے کی انہیں دعوت نہیں دی گئی تھی۔

''بڑے ابا، آپ کے ساتھ تو اکثر ہی زیادتی کر جاتے ہیں۔۔۔'' نمیرہ نے بظاہر ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

''ہاں، انہوں نے خاقان صاحب کی دوسری شادی کو کہاں دل سے قبول کیا، تبھی تو سارے اہم موقعوں پر شارقہ کو آگے رکھتے ہیں۔'' ندرت امی نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر مزید کہا۔ ''اللہ اولاد کے نام پر ایک بیٹی ہی دے دیتا، چلو پیر تو مضبوط ہو جاتے میرے۔۔''

''چھوڑیں ندرت امی، دو بیٹیوں کی ماں بن کر شارقہ ممانی نے کون سا تیر مار لیا، خاقان ماموں تو آج بھی آپ کا ہی دم بھرتے ہیں۔۔'' اس نے ان کی دل جوئی کی خاطر کہا تو ایک استہزائیہ مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی۔

''چھوڑو بیٹا، خاقان صاحب کی طبیعت میں ٹھہراؤ کہاں، مزاج میں رنگینی کا عالم تو یہ ہے کہ اب تک تو

انہیں خود اپنے ہی معاشقوں کی اصل تعداد بھول چکی ہوگی۔۔۔" ندرت بیگم کو خاقان صاحب کی سیماب طبیعت بہت کھلتی تھی اور آج اس کا اظہار انہوں نے بھی کھلے لفظوں میں کر دیا تھا۔

اسی وقت ملازمہ ٹرے میں چائے کے دو کپ رکھے اندر داخل ہوئی۔ دونوں چپ ہوگئیں۔

"بڑے ابا کے کمرے کا دروازہ کھلا کہ نہیں۔۔؟" نمیرہ نے بے چینی سے پوچھا۔

"وہ سب تو چلے بھی گئے اسلام آباد۔۔۔" ملازمہ کے جواب پر نمیرہ کے ساتھ ساتھ ندرت امی کو بھی دھچکا لگا۔

"کچھ پتا چلا کہ کیا بات کر رہے تھے بڑے ابا۔۔؟" نمیرہ نے دانستہ اپنا لہجہ سرسری بنا کر پوچھا کیونکہ اتنا تو وہ بھی جانتی تھی کہ اس میٹنگ میں ملازمہ دو دفعہ اندر چائے اور قہوہ وغیرہ پہنچانے گئی تھی۔

"جی بی بی جی، برہان صاحب اور انابیہ بی بی کی رخصتی کی تاریخ طے ہوئی ہے۔۔" ملازمہ نے ان دونوں کے کانوں میں بم پھوڑا۔ ندرت بیگم نے تو ہاتھ میں پکڑا چائے کا کپ بھی بوکھلا کر واپس ٹرے میں رکھ دیا۔

"کب ہے رخصتی۔۔۔؟"

"اگلے مہینے کی چودہ تاریخ کو۔۔" ملازمہ کے پاس خبر پوری تھی۔

"ٹھہر جائیں ندرت امی، باقی تفصیلات میں لے کر آتی ہوں درشہوار سے، اسے سب پتا ہوگا۔"

نمیرہ بھی اپنی چائے وہیں چھوڑ کر بے چین انداز سے کمرے سے نکلی، جبکہ ندرت بیگم کے چہرے پر ہلکی سی پریشانی ابھری۔

☆☆☆

"سخت زیادتی ہے امی۔۔۔" برہان نے غصے سے ٹہلتے ہوئے پلٹ کر تاجدار بیگم کو دیکھا۔

وہ اپنے بیٹے کی فراخ پیشانی پر پڑے ہوئے بلوں کو دیکھ کر کچھ مضطرب ہوئیں، برہان کے اندر لاوا ابل رہا تھا، جو شادی کی تاریخ مقرر ہونے کی خبر کے ساتھ ہی باہر امڈ پڑا تھا، انہوں نے اس کی جھنجھلاہٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"جب نکاح ہوا تھا بیٹا، تو رخصتی تو ہونی ہی تھی کبھی نہ کبھی۔۔۔"

"تو نکاح کون سا میری مرضی سے ہوا تھا، اٹھا کر زبردستی مسلط کر دیا تھا اپنی پوتی کو میرے سر پر داجی نے۔۔۔" برہان جھنجھلا کر گویا ہوا۔

"تو ٹھیک ہے اس وقت انکار کر دیتے۔۔۔" انہوں نے قدرے ناگواری سے کہا۔

"خاک انکار کرتا، داجی نے باہر جا کر پڑھنے کی شرط ہی یہ لگائی تھی۔۔۔" اس نے بیزاری سے سر جھٹکا۔

"جب ان کی شرائط پر باہر پڑھنے گئے تھے تو اب بات بھی ماننی پڑے گی، ویسے بھی کیا کمی ہے انابیہ میں، اس گھر کی سب سے زیادہ سمجھدار اور سلجھی ہوئی بچی ہے وہ۔۔"

تاجدار بیگم نے نرم لہجے میں انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

"میرا دل نہیں مانتا امی، اور میں نے لائف پارٹنر کا جو خاکہ بنا رکھا ہے اپنے ذہن میں، وہ بالکل بھی پورا نہیں اترتی اس پر۔" برہان نے اس دفعہ دوٹوک انداز میں صاف صاف کہا۔

"چھوڑ دو بیٹا، دو چار سالوں میں لڑکیاں ویسے ہی سانچے میں ڈھل جاتی ہیں، جیسا ان کے شوہر چاہتے ہیں۔۔۔" تاجدار بیگم نے نرمی سے کہا۔

"اگر اس سے پہلے ہی اپنے پسندیدہ سانچے میں ڈھلا ہوا کوئی ہو آپ کے پاس تو۔۔؟" انہوں نے ہلکا سا جھجک کر اپنی ماں کی طرف دیکھا، جن کے ماتھے کی تیوری کے بل ایک دم ہی گہرے ہوئے۔

"تو ایسے کسی وجود کی نہ تو ہمارے گھر میں اور نہ ہی دل میں کوئی گنجائش نکلتی ہے۔۔۔" ان کے سفاک لہجے پر برہان کو دھچکا لگا، وہ خاموش رہے۔

"نکاح ہوا ہے تمہارا انابیہ کے ساتھ، کوئی مذاق نہیں، اب یہ فضول باتیں کرنا بند کر دو تم۔" وہ ایکدم غصے میں آ کر کھڑی ہوئیں، برہان نے بے بس انداز میں ان کی طرف دیکھا۔ وہ نظریں چرا گئیں۔

"شاہ میر کی دفعہ تو پھر بھی تمہارے باپ نے کچھ لحاظ کر لیا تھا میرے بڑھاپے کا، لیکن تمہاری دفعہ تو وہ خود ہاتھ سے پکڑ کر نکالیں گے مجھے اس گھر سے، اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے، اپنی ماں کو ذلیل کروالو یا بڑوں کی بات مان لو۔۔۔" لفظوں کی تیز تلوار ان کے وجود پر چلا کر وہ کمرے سے نکل گئیں۔

برہان جھنجھلا کر اپنے بیڈ پر بیٹھ گئے، اسی وقت ان کے سیل فون کی گھنٹی بجی، دوسری طرف مناہل قریشی تھی، جسے پہلی ہی نظر میں ان کے دل نے قبول کر لیا تھا اور ان کی آنکھوں نے ہمیشہ اسی کے ساتھ کے خواب دیکھے تھے۔

"ہاں مناہل بولو۔۔؟؟" ان کا بجھا ہوا لہجہ دوسری طرف مناہل نے فوراً ہی محسوس کیا۔

"برہان، آپ کی طبیعت ٹھیک ہے۔؟ کچھ ڈپریس سے لگ رہے ہیں آپ۔۔۔" مناہل کے لہجے میں فکرمندی چھلکی۔

"ہاں، بس طبیعت ٹھیک نہیں، تم بتاؤ، خیریت سے کال کی تھی تم نے۔۔؟؟؟"

"آپ کو پتا تو ہے رات کو جب تک آپ سے بات نہ کروں، نیند نہیں آتی مجھے۔۔" وہ ہلکے پھلکے لہجے میں گویا ہوئی، کبھی مناہل کے اس طرح کے معنی خیز جملے گھنٹوں ان کا موڈ خوشگوار رکھتے تھے لیکن آج تو داجی نے ایک ہی جھٹکے میں ان کے سارے کس بل نکال دیے تھے۔

"انسان کو ہر قسم کے حالات کو فیس کرنے کی عادت ڈالنی چاہیے مناہل۔۔۔" وہ کچھ نہ کہتے ہوئے بھی بہت کچھ کہہ گئے۔

"سوری، جو عادتیں آپ نے خراب کی ہیں، وہ آپ ہی کو برداشت کرنا پڑیں گی۔۔" مناہل کے لہجے میں چاہے جانے کا زعم تھا اور برہان کے اندر چھن کر کے کچھ ٹوٹا اور کچھ لمحے تک تو وہ کچھ بول ہی نہ سکے۔۔۔

☆☆☆

کمرے میں زیرو واٹ بلب کی مدھم سی روشنی تھی۔۔۔

رومیصہ اس وقت شہزاد کی گود میں سر رکھے افسردہ انداز میں لیٹی ہوئی تھی، اس نے رومی کے اسٹائکش سے بیڈ سے ٹیک لگا رکھی تھی اور اپنے نرم ہاتھوں سے اس کے بالوں کو سہلا رہی تھی۔

دونوں بہنوں کے درمیان خاموشی گفتگو کر رہی تھی۔

نہ تو شہزاد میں اتنی ہمت تھی کہ وہ اس واقعے کی تفصیلات پوچھتی اور نہ رومیصہ میں اتنا حوصلہ تھا کہ وہ اس طوفانی بارش والی رات کا سارا قصہ اس کے سامنے دہرا سکتی۔ جب ہارون رضا اچانک اس کے کمرے میں گھس آئے تھے اور اس کی چیخوں نے ٹینا ہاؤس کے در و بام ہلا دیے تھے لیکن اس رات ٹینا بیگم ——
کلب کے سالانہ ڈنر میں مصروف تھیں۔

"رومی۔۔۔!!!"

"ہوں۔۔۔" وہ اپنی انگلیاں چٹخانے لگی۔

"کچھ بولو ناں۔۔۔" شہزاد نے ہلکا سا جھجک کر کہا۔

"کیا بولوں۔۔۔؟" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی، اور زخمی نگاہوں سے شہزاد کو دیکھنے لگی، جو اس سے نظریں چرائے بیٹھی تھی۔

"تم نے اس وقت کیوں نہیں بتایا مجھے۔۔۔؟" وہ سر جھکا کر مدھم لہجے میں بولی۔

"کیا بتاتی، جب مام نے ہی اس وقت میری بات کا یقین نہیں کیا، انہیں لگا، میں الزام لگا رہی ہوں ان پر۔۔" وہ پھیکی سی مسکراہٹ چہرے پر لا کر بولی۔ اس کا سرخ و سپید اجلا چہرہ خون کی حدت سے دہکا اور دودھیا پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے چمک اٹھے۔

"تو پھر کیسے یقین آیا۔۔۔؟"

"سچائی کو وقتی طور پر دبایا جا سکتا ہے لیکن ہمیشہ کے لیے دفن نہیں کیا جا سکتا۔۔۔" رومیصہ تلخی سے گویا ہوئی۔

"ٹھیک کہتی ہو تم، اس لیے بہتر ہوگا کہ ارسل بھی جو تم سے پوچھ رہا ہے، اسے صاف صاف بتا دو۔۔" شہزاد نے ڈھکے چھپے الفاظ میں اسے سمجھانے کی کوشش کی تو رومیصہ نے بے ساختہ اپنی نظریں چرائیں، جو شہزاد کی زیرک نگاہوں سے چھپی نہیں رہ سکیں۔

"میں نے سب کچھ ٹھیک بتایا ہے انہیں۔۔۔" رومیصہ کی آواز میں پہلے کی طرح دم نہیں تھا۔

"اس بات کا فیصلہ تو وقت کرے گا اور تم جانتی ہو کہ وقت کے بعض فیصلے بہت بے رحم ہوتے ہیں۔۔" شہزاد اپنی بات مکمل کر کے رکی نہیں اور کمرے سے نکل گئی، رومیصہ کے دل و دماغ میں بے شمار اندیشے اور وہم جگہ بنا کر بیٹھ گئے۔

اسی وقت اس کے سیل فون کی گھنٹی اسے حقیقت کی دنیا میں لے آئی، دوسری طرف ارسل تھا جو اس وقت خاصا تھکا تھکا سا لگ رہا تھا۔

"کیسی ہو رومی۔۔۔؟؟"

"خیال آ گیا تمہیں میرا۔۔۔؟" رومیصہ نے نہ چاہتے ہوئے بھی شکوہ کیا۔

"تمہارا شکوہ بجا ہے میری جان، لیکن کیا کرتا، گھر آتے ہی بہت سے ایشوز میں پھنس چکا ہوں، بہت دنوں سے یونیورسٹی بھی نہیں جا پایا، اسکی علیحدہ ٹینشن ہے مجھے۔۔" ارسل کے ایک ایک لفظ سے پریشانی چھلک رہی تھی، جسے محسوس کر کے رومیصہ بے چین ہوئی۔

"لیکن تم تو کہہ رہے تھے کہ تمہارے پیرنٹس کا انتقال ہو چکا ہے اور بس ایک چھوٹی بہن ہے؟" رومیصہ نے اسے یاد دلایا۔

"والدین کا بے شک انتقال ہو چکا ہے، لیکن الحمد للہ میں ایک بھرے پرے خاندان سے تعلق رکھتا ہوں، میرے نانا، دو ماموں اور ان کی آل اولادیں سب ایک ہی گھر میں رہتے ہیں۔۔۔" اس نے اس دفعہ تفصیل سے بتایا۔

"اوہ، آئی سی۔۔۔" اس کے منہ سے بمشکل یہی نکلا۔

"رومی، ایک بات مانو گی میری۔۔۔" ارسل کے التجائیہ لہجے پر اس کے کان کھڑے ہوئے۔

"ہاں بولو۔۔۔"

"بہت دل کر رہا ہے میرا، تمہیں دیکھنے کو۔۔۔" ارسل کی اگلی بات پر اس کا دل اتنی زور سے دھڑکا کہ

وہ کچھ لمحوں کے لیے بول ہی نہیں پائی۔

"تم کل آ سکتی ہو یونیورسٹی۔۔۔؟" وہ بڑے مان بھرے انداز سے پوچھ رہا تھا۔

"ماما اور شیری مجھے اکیلے نہیں جانے دیں گی کہیں بھی۔۔۔" رومی نے اپنی مشکل سے آگاہ کیا۔

"ڈرائیور کے ساتھ کوئی بھی بہانہ بنا کر آ جانا۔ میں لائبریری میں ہوں گا۔۔۔"

"اوکے، کوشش کروں گی۔۔۔" رومیصہ کھل کر مسکرائی، سچ بات تو یہ تھی کہ وہ خود بھی اس دشمن جاں سے ملنا چاہتی تھی، ایسا لگتا تھا جیسے اسے دیکھے ہوئے صدیاں بیت گئی ہوں۔ وہ ارسل کے ساتھ اس رات دو گھنٹے بات کر کے سوئی تو اس کے بعد اس کی آنکھ اگلی صبح ہی کھلی۔

☆☆☆

برہان اور انابیہ کی شادی کی بات پورے گھر میں آگ کی طرح پھیل چکی تھی۔

کچن میں طوبیٰ کے لیے سوپ بناتی ہوئی انابیہ، داجی کے اس آناً فاناً فیصلے کے پیچھے چھپے تمام محرکات سے بخوبی آگاہ تھی اور یہ بھی جانتی تھی کہ اس وقت برہان کس قیامت سے گزر رہے ہوں گے۔

"تم نے اپنی تائی اماں کے چہرے کے تاثرات نہیں دیکھے، ایک لفظ نہیں بولیں بابا جان کے سامنے تمہاری شادی والے معاملے پر۔" شارقہ بیگم نے کارن فلور اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بیزاری سے کہا۔ ویسے بھی انہیں اپنے تمام دکھ سکھ انابیہ ہی سے کہنے کی عادت تھی۔

"وہ خفا جو ہیں داجی اور تایا ابا سے۔۔۔" بیا نے لاشعوری طور پر ان کا دفاع کیا۔

"ہاں اس گھر میں ایسے نخرے جیٹھانی صاحبہ کے ہی اٹھائے جا سکتے ہیں، ہم لوگ تو سوچ بھی نہیں سکتے۔" وہ جل کر بولیں۔ ویسے بھی انہیں اور ندرت بیگم کو ہمیشہ اس بات کا قلق رہتا تھا کہ تاجدار بیگم کو ان کے مقابلے میں کہیں زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔

"تایا ابا نے بھی کون سا لحاظ کیا تھا ان کا، یاد نہیں شاہ میر والے واقعے پر کیسے پورے خاندان کے سامنے جھڑک دیا تھا تائی اماں کو۔" انابیہ نے یاد دلایا۔

"تو تمہارا کیا خیال ہے تاجدار بھابھی معاف کر دیں گی انہیں۔۔؟؟" شارقہ بیگم نے استہزائیہ نگاہوں سے اپنی بیٹی کا حیران چہرہ دیکھتے ہوئے مزید کہا۔ "گھٹنوں پر ہاتھ لگوا کر معافی نہ منگوائی انہوں نے پورے خاندان سے، تو نام بدل دینا میرا۔۔۔"

"اچھا چھوڑیں آپ تائی اماں کو، میں طوبیٰ کو سوپ دے آؤں، طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس کی۔۔" اس نے گرم گرم سوپ پیالے میں انڈیلتے ہوئے بات ختم کرنا چاہی۔۔ ویسے بھی اپنی رخصتی والی بات سن کر اس کا موڈ کچھ بہتر تھا۔

"ہاں جا کر پوچھو اس سے، کہاں سے چوٹ لگوائی ہے اس نے پاؤں پر۔ ؟ اندھوں کی طرح تو چلتی ہے یہ لڑکی۔۔" شارقہ بیگم کی بڑبڑاہٹ نے کچن کے دروازے تک اس کا پیچھا کیا۔

انابیہ جیسے ہی ہال کمرے میں پہنچی، سامنے سے برہان خاصے بگڑے ہوئے تیوروں کے ساتھ سیڑھیاں اتر رہے تھے۔ ایک سرد اور لاتعلق سے نگاہ انہوں نے اس پر ڈالی۔

انابیہ کے ہاتھوں میں پکڑا پیالہ کانپا، وہ تو خیریت رہی کہ وہ اسے ایک لفظ بھی کہے بغیر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے اور انابیہ اپنے روم میں چلی آئی۔

جہاں اس وقت طوبیٰ کے علاوہ در شہوار اور نمیرہ بھی موجود تھیں۔ در شہوار کا منہ لٹکا ہوا تھا۔

"سچ سچ بتاؤ، تم لوگ کہاں کی خاک چھان کر آرہی ہو۔۔۔" تمیرہ نے کمر پر ہاتھ رکھ کر مشکوک نگاہوں سے درشہوار اور طوبیٰ کو گھورا۔

"ان بارشوں کے موسم میں کون سی خاک اڑتی ہے فضاؤں میں۔۔۔" طوبیٰ نے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

"تو پھر کون سے موت کے کنویں میں چھلانگ لگا کر یہ چوٹ لگوائی ہے تم نے۔۔؟" تمیرہ نے طنزیہ انداز میں اس کے پاؤں کی طرف اشارہ کیا۔

"بتایا تو ہے، پچھلے لان میں پاؤں پھسل گیا تھا میرا۔"

"پچھلے لان میں درشہوار کا پاؤں پھسلنا تو سمجھ میں آتا ہے، یہ تم کس خوشی میں چوٹیں لگواتی پھر رہی ہو۔" تمیرہ کو مطمئن کرنا آسان نہیں تھا۔

"بکواس بند کرو اپنی، پہلے ہی اتنا درد ہو رہا ہے میرے۔" طوبیٰ نے بیزاری سے کہا۔

"محترمہ آپ کو لگتا ہے بھائی کی رخصتی کی اطلاع سن کر سکتہ ہو گیا ہے۔۔؟" تمیرہ نے بالکل خاموش بیٹھی درشہوار کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا تو درشہوار نے گھبرا کر انابیہ کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر ایک عجیب سا تاثر ابھرا تھا۔

"خوشی سے تو نہیں البتہ صدمے سے ضرور سکتہ ہو سکتا ہے ان دونوں بہن بھائیوں کو۔۔۔" انابیہ کے کھلم کھلا طنز پر درشہوار خفت زدہ انداز میں فوراً کھڑی ہوئی۔ اتنے سرد موسم میں بھی اس کی پیشانی پسینے کی ننھی ننھی بوندوں سے بھر گئی تھی۔

"تم کہاں جا رہی ہو یار، بیٹھ کر ڈھولکی کا پروگرام سیٹ کرتے ہیں۔۔۔" تمیرہ رخصتی کی خبر سن کر خاصی پرجوش تھی۔

"میں ذرا امی کو دیکھ آؤں، وہ بلا رہی تھیں مجھے۔۔۔" وہ چھلاوے کی مانند کمرے سے نکلی اور اپنے کمرے میں آکر ہی سکون لیا۔

ہادی کے گھر سے واپسی پر برہان اور انابیہ کی رخصتی کی اطلاع نے حقیقتاً درشہوار کے ہونٹوں پر تالے لگا دیے تھے، وہ جو سمجھ رہی تھی کہ اگر برہان کے دل کی خواہش پوری ہو گئی تو وہ بھی کسی نہ کسی طرح منائل کے ذریعے ہادی تک پہنچنے میں کامیاب ہو ہی جائے گی لیکن داجی کے اس اچانک فیصلے نے دونوں بہن بھائیوں کی خوشی ملیامیٹ کر دی تھی۔

لیکن درشہوار کے لیے زیادہ پریشانی کی یہ بات بھی تھی کہ آخر انابیہ کو ان کے دل کی بات کیسے پتا چلی؟ اور ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے وہ اب انابیہ کا سامنا کیسے کرے گی۔

☆☆☆

جس وقت جارج گھر میں داخل ہوا۔۔۔ شام کے سرمئی سائے ہر طرف پر پھیلا چکے تھے۔

فضا میں دونوں وقت ملنے پر جو گہرا سکوت چھا جاتا ہے، وہ اس وقت ہر چیز پر حاوی تھا۔ فضاؤں میں بسا حزن اور کچھ اپنے مشن میں ناکامی کی افسردگی جارج کے پورے وجود سے لپٹی ہوئی تھی۔ وہ تھکے تھکے انداز میں برآمدے میں رکھے تخت پر آکر بیٹھ گیا۔

مارتھا نے کچن کی کھڑکی سے باہر جھانکا اور اپنے ساتھ پکوڑوں کا آمیزہ تیار کرتی مونیکا کی طرف ناراضی سے دیکھا۔ "تم نے اپنے باپ کی حرکتیں دیکھی ہیں مونیکا۔۔؟؟"

"اب کیا ہوا۔۔۔؟" مونیکا نے پیاز کاٹتے ہوئے اپنی ماں کا برہم چہرہ دیکھا۔ وہ کچن کی کھڑکی سے

اپنے شوہر کو گھور رہی تھیں۔

"تمہارے باپ نے رات بھی دیر سے آنے کی وجہ نہیں بتائی، اور صبح صبح گھر سے نکل گئے اور اب پھر شام ڈھلے تھکے ہارے لوٹے ہیں، پتا نہیں کن چکروں میں گم ہیں۔۔۔" مارتھا کا ایک ایک لفظ تشویش میں ڈوبا ہوا تھا۔

"اچھا، آپ جا کر پوچھیں ناں ان سے، اور پلیز آرام سے بات کیجیے گا، میں چائے تیار کر کے لاتی ہوں۔۔۔" مونیکا نے ماں کا بازو پکڑ کر نرمی سے باورچی خانے کے دروازے کی طرف دھکیلا۔

"آخر آپ بتاتے کیوں نہیں ہیں کہ مسئلہ کیا ہے۔۔؟" مارتھا اپنے شوہر کے پاس جا کر بیٹھ گئیں اور مونیکا کی ہدایات کے مطابق نرمی سے پوچھا۔

"تم ٹھیک کہتی تھیں، مجھے یہ گھر خریدنا ہی نہیں چاہیے تھا۔۔۔" انہوں نے اپنی پٹاری سے اصل بات نکالی۔ ویسے بھی وہ اکیلے ٹینشن لے لے کر تھک گئے تھے اور انہوں نے اب اپنی پریشانی شیئر کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔

☆☆☆

ٹینا بیگم کو اس دن ڈپریشن کا شدید دورہ پڑا تھا۔

وہ پچھلے چوبیس گھنٹے سے اپنے کمرے میں بند تھیں اور ان دونوں بہنوں نے بھی اندر جھانکنے کی زحمت نہیں کی۔

شہزاد کو آفس پہنچے ہوئے ابھی دس منٹ ہی ہوئے تھے جب گھر سے آنے والی رومیصہ کی کال نے اسے بوکھلا دیا۔

وہ گاڑی اڑاتی ہوئی گھر پہنچی تو ٹینا بیگم کے دروازے کے باہر نوکروں کا ہجوم تھا اور رومیصہ ایک طرف پتھر کا بت بنی اندر سے آنے والی آوازوں کو سن رہی تھی لیکن اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ ان کے دروازے پر دستک دے پاتی۔

ٹینا بیگم نے شاید کوئی بھاری چیز ڈریسنگ کے شیشے پر پوری قوت سے ماری تھی تبھی تو کرچیوں کی آواز پورے گھر میں گونجی۔

"آپ لوگ جائیں یہاں سے۔۔۔" شہزاد کے سخت لہجے پر سبھی ملازمین وہاں سے کھسک گئے۔

"مام دروازہ کھولیں پلیز۔۔۔۔" شہزاد نے ان کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

"وہ نہیں کھولیں گی۔۔۔" دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی رومیصہ نے آہستہ سے کہا۔

"مام فار گاڈ سیک دروازہ کھولیں، کیوں تماشا بنا رہی ہیں اپنا۔۔۔" شہزاد نے دبے دبے لہجے میں انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

ٹینا بیگم نے شاید، غصے میں اپنے دماغ کا سوئچ آف کر رکھا تھا تب ہی تو ان پر کسی بات کا اثر نہیں ہو رہا تھا، اندر سے چیزیں توڑنے کی آوازیں مسلسل آرہی تھیں، لگتا تھا انہوں نے بھی آج ہر چیز تہس نہس کرنے کی قسم کھا رکھی تھی۔

"آجاؤ ادھر سے، کچھ دیر بعد خود ٹھیک ہو جائیں گی۔۔۔" رومی نے اس کا ہاتھ پکڑا اور سٹنگ روم کی طرف لے آئی۔

"پہلے کبھی انہوں نے ایسا کیا ہے۔۔؟" شہزاد نے فکر مند لہجے میں اس سے دریافت کیا۔

"ہاں، جب ہارون رضا نے ان سے شادی کے بعد کسی سیکرٹری کی بیٹی سے افیئر چلایا تھا۔۔۔" ایک استہزائیہ مسکراہٹ رومی کے چہرے پر ابھری۔ شہزاد نے اس کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور دانستہ موضوع بدلا۔

”صبح تم سے کوئی بات ہوئی ہے ان کی۔۔۔؟“
”نہیں، لیکن آج کے نیوز پیپر میں سیف الرحمٰن کے حوالے سے ایک نیوز ضرور پبلش ہوئی ہے۔۔۔“
”کیا۔۔۔؟“ شہرزاد نے بے تابی سے پوچھا۔
”بیوروکریٹ سیف الرحمٰن کی نئی ابھرتی ہوئی ماڈل میگھا میں دلچسپی اور دونوں نجی محفلوں میں اکھٹے دکھائی دے رہے ہیں اور مام کے لیے یہ بات یقیناً کسی بڑے ڈپریشن سے کم نہیں ہوگی۔“
رومیصہ کے لہجے اور لفظوں سے ٹپکتی خوشی شہرزاد کو ناگوار گزری۔
”رومی، وہ ماں ہیں ہماری۔۔۔“ اس نے جتاتے ہوئے لہجے میں کہا۔
”مائیں ایسی ہوتی ہیں کیا۔۔۔؟“ رومیصہ نے استہزائیہ لہجے میں الٹا اس سے پوچھا۔
”کبھی تم نے ان کی پوزیشن کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔؟ ان کی جگہ پر خود کو رکھ کر دیکھا ہے کبھی۔۔؟“
شہرزاد کی بات پر وہ بیزاری سے بولی۔
”تم کہنا کیا چاہ رہی ہو۔۔۔؟“
”کیا مام کی قسمت میں کسی مخلص بندے کا ساتھ نہیں ؟ ہمارا باپ ہمیں دنیا میں لا کر مر گیا، تم خود ایمانداری سے سوچو ایک عورت اس سوسائٹی میں اکیلے کب تک سروائیو کر سکتی ہے؟
مام کی بدقسمتی ہے، انہیں ہمیشہ مرد کی طرف سے دھوکا اور فریب ملا ہر وہ شخص جسے انہوں نے اپنی زندگی میں خلوص دل سے شامل کرنے کی کوشش کی، اسی نے دغا دی کا نہیں۔۔۔“ شہرزاد کے تلخ انداز پر رومی کچھ لمحوں کے لیے خاموش ہوئی۔
”اور جو وہ کر تی رہی ہیں ان سب کے ساتھ۔۔۔؟“ رومیصہ نے نظریں چرا کر کہا۔
”انہوں نے ہارون رضا کے ساتھ وہی کیا، جو وہ ڈیزرو کرتا تھا۔ اگر وہ خود کو ان تک محدود نہیں رکھ پایا تو مام کو کتنے نفلوں کا ثواب تھا کہ وہ اس کرپٹ بندے کے لیے خود پر خوشیوں کے دروازے بند کر لیتیں۔“
شہرزاد کی اپنی ماں کے معاملے میں بہت پریکٹیکل سوچ تھی۔
”اور جو ان کی وجہ سے میرے ساتھ ہوا۔۔۔؟“ رومیصہ نے اسے لاجواب کرنے کی کوشش کی۔
”مجھے یقین ہے، اس بات پر وہ کہیں نہ کہیں گلٹی ضرور ہوں گی، کون یار اپنی بیٹی کے لیے ایسا چاہ سکتی ہے ؟“
”آئی ایم سوری شیری، میں تمہاری طرح یہ سوچ کر مام کو کسی قسم کا مارجن نہیں دے سکتی۔۔“
”مت دو، لیکن کسی انسان سے فرشتوں والی توقعات بھی مت لگایا کرو۔۔۔“ شہرزاد کے لہجے میں گہری سنجیدگی در آئی۔
اسی وقت ملازمہ حواس باختہ سٹنگ روم میں داخل ہوئی، دونوں بہنوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا جو شدید بوکھلاہٹ کا شکار تھی۔
”کیا ہوا رضیہ۔۔۔؟“ شہرزاد نے پریشانی سے پوچھا۔
”شیری بی بی، بڑی بیگم صاحبہ نے خودکشی کر لی، ان کے کمرے سے خون بہہ رہا ہے۔۔۔“
ملازمہ کی بات پر دونوں بہنوں کا دماغ بھک کر کے اڑا۔ وہ سراسیمگی کی کیفیت میں ٹینا بیگم کے کمرے کی طرف بھاگیں۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

فرح بخاری

عشق بہ سحر یا

اوائل مارچ کی وہ ایک بادلوں بھری صبح تھی جب کھیتوں میں کام کرتے مزمل نے ہاتھ کا چھجا بنا کر اوپر نگاہ کی، وہ اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ آیا یہ بادل پانی سے بھرے ہوئے ہیں یا یوں ہی بنابر سے گزر جائیں گے۔ خواہش اور دعا بارش کے ہونے کی تھی۔ آج کھیتوں کو پانی ملنے کی باری تھی اور نہر میں پانی بہت کم تھا۔ بارش ہونے کی صورت میں انہیں کافی سہولت اور آرام مل جاتا۔ کام کا بوجھ گھٹ جاتا تو وہ آنے والے کل کی تیاری اچھے طریقے سے کرسکتا تھا۔ ورنہ کام سے وہ گھبرانے والا ہرگز نہیں تھا۔ ایسا ہوتا تو باپ کا قرضہ اتارنے کے لیے ملک یار محمد کا مزارع بننا بھی قبول نہ کرتا۔ اس کے آئے دن کے طعنے ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیتا کہ کون سا اس نے خود قرض لیا تھا۔

لیکن ابا کی موت کے بعد رقم کے بدلے جب ان کی بارہ ایکڑ زمین ملک یار کے قبضے میں چلی گئی تو مزمل کی غیرت پر—— تازیانہ پڑا۔ تب اپنی زمینیں ملک یار سے چھڑانے اور مرحوم باپ کی روح کو سکون پہنچانے کی خاطر اس نے ملک یار کی خدمت گاری قبول کرلی۔

وہ اس کی زمینوں پر عرصہ ڈھائی سال سے کام کر رہا تھا۔ ملک یار خود تیس ایکڑ کا مالک تھا۔ اب کسی عام مزارع کو جہاں تیس ایکڑ کے بدلے ایک سو پچاس بوری گندم مل رہی تھی ...... مزمل وہی کام بلا معاوضہ کر رہا تھا۔ قریباً ڈھائی سال کے عرصے میں یہ گندم کی تیسری فصل تھی اور اس دوران دو مرتبہ تین تین ماہ والی فصلیں بھی کاشت کی گئی تھیں۔ مزمل اپنے باپ کا اسی فیصد قرضہ چکانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ باقی کی رقم کے لیے گندم کی کٹائی کے بعد ایک تین ماہ کی مشقت اور تھی۔

پانی سے بھرے بادل مزید گہرے اور کالے ہو گئے تھے۔ مارچ کے مہینے میں ہی گندم سبز رنگ سے پیلے کی طرف مائل ہوتی تھی۔ پیلاہٹ کی طرف جانے سے پہلے اگر ایک اچھی بارش میسر آجاتی تو فصلوں کے حق میں بہت فائدہ بخش تھی۔ خشک نالے کے سرے پر بیٹھتے ہوئے اس نے سر پر لپٹا سفید کپڑا اتار کر پہلے چہرا اور پھر بازو صاف کیے۔ آستینیں اوپر تک چڑھاتے وہ اپنے بازوؤں کی مچھلیاں دیکھ کر مسکرا دیا۔

چند سال پہلے نہر میں نہانے والے اپنے دوستوں کے مذاق کا وہ خوب نشانہ بنتا تھا۔ قمیص اتار کر وہ نہر کنارے آتو بیٹھتا لیکن پانی میں اترنے کی کبھی خود میں ہمت نہیں پائی۔ دوستوں نے دھکے دیے، منتیں کیں پر مزمل نے تیرنا نہ سیکھا۔ تب ہی اس کے سوکھے سڑے وجود کو نشانہ بناتے، وہ اس کے بازوؤں کو کانے (سرکنڈے) کہا کرتے۔ تازا اور بالی تو اسے اپنے چکنے بازوؤں کی مچھلیاں دکھا کر اور بھی تاؤ دلاتے۔ پر اب ڈھائی سال کی محنت

مکمل ناول





بازوؤں کی مچھلیوں اور بھرپور کسرتی بدن کی صورت اس کے سامنے تھی۔

سچ ہے کہ محنت ہمیشہ آپ کو صرف دیتی ہے، لیتی کچھ بھی نہیں۔ اس کی اماں، آپا اور بیٹا اس دن بہت روئیں جب کٹائی اور تھریشر کے بعد باقی مزدور اپنا حصہ وصول کر کے اپنے بیوی بچوں کے پاس چلے جاتے اور مزمل اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے تھکاوٹ اتارنے کے لیے سیدھا لیٹ جاتا۔ بینا اس کے تلوؤں پر تیل کی مالش کرتی، ساتھ ساتھ روتی بھی جاتی۔

''روتی کیوں ہے کملی ...... جتنا بوجھ سر کتا جائے گا اتنا ہمیں ہی فائدہ ہوگا، بس ایک مرتبہ اپنے بارہ ایکڑ چھڑا لوں، تو یہی ڈھائی تین سال کا تجربہ کام آئے گا۔ پھر جب اپنی زمین پر محنت کروں گا تب کھل کا رنگ دیکھنا۔ سارے دکھ درد دور ہو جائیں گے۔ میں تو دعا دیتا ہوں ملک یار محمد کو...... ڈھائی سال پہلے مجھے بیلچا تک اٹھانا نہیں آتا تھا اور آج اس کی مہربانی سے اکیلا کافی ہوں اپنی زمین کو سونا بنانے کے لیے ...... چل بس رونا بند کر...... ناشکری اللہ کو سخت ناپسند ہے۔'' وہ نرمی سے بہن کو سمجھاتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ رکھتا تو وہ روتے میں مسکرا دیتی۔

''مزمل ......!'' رحمت علی نے دور سے ہانک لگائی۔ ...... ''آ، یار کھانا کھالیں۔''

'' ہوں!'' وہ بادلوں پر ایک نظر جماتا اس کی طرف چل پڑا۔

''کیا کہتا ہے موسم ......؟'' اس نے کھانے کی پوٹلی کھولتے رحمت علی کو دیکھا۔

''لگتا تو ہے کہ برسیں گے۔'' درخت کے سائے تلے بیٹھے رحمت نے پل بھر کو نظر اٹھائی۔

''کل تک ٹل جائیں۔'' وہ معلوم نہیں کیوں مسکرانے لگا تھا۔

''کیوں؟'' رحمت علی کا ہاتھ رکا۔ ''کل کیا کام ہے؟''

''بلوٹ شریف جانا ہے۔ میلے کی دوسری اتوار ہے ناں۔''

''اوئے، تُو نہیں گیا ابھی تک۔'' رحمت کو حیرت ہوئی۔ ''میں تو پچھلی اتوار کو ہو بھی آیا۔''

''ہر اتوار کو جاتا ہوں بلکہ وقت ملے تو درمیان میں بھی چکر لگا آتا ہوں۔'' مزمل میٹھی مسکان لبوں پر سجائے معنی خیزی سے گویا ہوا۔

''واہ...... تو تو بہت بڑا مرید ہے پیر شاہ عیسیٰ کا۔''

''ہوں۔'' وہ مسکراتے ہوئے بنا لمبا تبصرہ کیے کھانے پر جھک گیا۔ میلے کی اتواروں پر جانے کی وجہ وہ رحمت کو بتانے سے معذور تھا۔

''وجہ......'' جو غالباً خواہش کے دائرے سے نکل کر اب کچھ کچھ حسرت میں تبدیل ہو چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

''خدا کے لیے برسنا مت۔'' بھینسوں کے آگے بے دلی سے چارہ ڈال کر وہ کوئی تیسری مرتبہ بادلوں سے مخاطب ہوئی۔ انداز البتہ اس بار قدرے ملتجی سا تھا۔

''منہ ہی منہ میں کیا بڑبڑائے جا رہی ہو؟'' معظمہ نے گیلے دوپٹے کو زور سے جھٹک کر تار پر لٹکایا۔

''بات سن۔'' اچانک ایک خیال نے امیرہ کو پرجوش کیا تو وہ چارے کی چنگیر وہیں نیچے رکھ کر معظمہ کی طرف آئی۔ ''بارش تیز ہو گئی تو نانی جانے سے روکے گی تو نہیں......؟''

''آج کی تو خیر ہے۔ دعا کرو کل صبح بارش نہ ہو۔'' معظمہ کے لہجے میں بھی ہلکی سی فکرمندی تھی۔

''نانی خود بھی ساتھ جائے گی کیا......؟'' امیرہ کے ہر ہر انداز سے کل کے پروگرام کے لیے بے چینی جھلک رہی تھی۔

''بئی سنڑ (اور سنو) نانی کیوں نہ ویسی۔ (نانی کیوں نہیں جائے گی) قریب لیٹی نانی اماں اپنا ذکر خیر سن کر باقاعدہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

''ہائے اللہ!'' امیرہ نے گھبرا کر زبان دانتوں میں دبائی۔ وہ تو جاگ بھی رہی تھیں اور اسے بغور سن بھی رہی تھی۔

''یہاں آ......'' اب کے ذرا نرمی سے بلایا گیا۔

وہ دھیرے دھیرے چلتی قریب آئی۔ معظمہ بھی کپڑوں کے کام سے فارغ ہو گئی تھی۔ بان کی چوکی گھسیٹ کر ان کی چارپائی کے نزدیک آ بیٹھی، دوسری امیرہ کے لیے کھسکائی۔

''پہلے کبھی گئی ہے میلے......؟'' وہ اب غور سے امیرہ کو دیکھ رہی تھیں۔

''چھوٹی تھی تو بہت جاتی تھی۔ پر پچھلے کافی سالوں سے بالکل نہیں گئی۔''

''اور جانتی ہو...... میں نے کبھی کوئی سال چھوڑا نہیں۔'' انہوں نے فخر سے ابرو چڑھائے۔ اور یاد رکھ...... مرتے دم تک چھوڑیں گی بھی نہیں۔'' ذرا فاصلے پر موجود نصرت مامی نے چٹکلہ چھوڑنے والے انداز میں ہنس کر کہا۔ وہ کوئلہ والے چولہے پر سالن بھون رہی تھیں۔

''چھوڑے گی تو پیر شاہ عیسیٰ کے مرید جن رات رات بھر اس کی چارپائی جھنجوڑیں گے۔'' کمرے سے نکلتی شمع بھابی نے بھی ہنستے ہوئے اپنا حصہ ڈالا۔

امیرہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے کبھی ان کے جملوں پر غور کرتی کبھی دوپٹے میں منہ دیے، ہل ہل کر ہنستی نانی کو دیکھتی۔ شمع ان کی باتوں میں حصہ لینے کے لیے خود بھی دوسری چارپائی پر بیٹھ گئی۔

''بتاؤ ناں نانی...... میری سمجھ میں کوئی بات نہیں آ رہی۔'' امیرہ نے منہ بنایا۔ وہ صرف چھ ماہ پہلے یہاں نانی کے پاس آئی تھی۔ اس سے پہلے وہ دادی کے پاس رنگ پور میں رہا کرتی تھی۔

''بتاتی ہوں۔'' وہ اب ہنسی پر قابو پا چکی تھیں۔ ''میں کندیاں سے یہاں آئی تھی بیاہ کر...... پیر شاہ عیسیٰ کے تو نام سے بھی واقف نہیں تھی۔ میری شادی کو ابھی کچھ ہی ماہ ہوئے تھے۔ تیری ماں اس وقت میرے پیٹ میں تھی۔ جب گدھا گاڑی پر تیرا نانا مجھے ڈھکی سے کندیاں لے جا رہا تھا۔ راستے میں بلوٹ شریف آیا تو مجھے کہنے لگا کہ پیر کی زیارت کو جائے گی؟ اب میں تو پیکے (میکے) پہنچنے کی جلدی میں تھی۔ ہاتھ لہرا کر صاف انکار کر دیا۔ لو پھر...... اب جو آگے روانہ ہوئے تو میں (بمشکل) ایک کلومیٹر بھی نہ پہنچے کہ اچانک گدھا گاڑی الٹ گئی...... پر ایسے الٹی کہ نہ تو تیرے نانا کو آنچ آئی اور نہ ہی گدھا ٹس سے مس ہوا۔ ایک بس میں تھی جو لڑھکتے لڑھکتے دور کھیتوں میں جا گری۔ لگتا تھا جیسے کسی طاقتور ہاتھ نے دھکا دے کر پھینکا ہو۔ نانا تیرا چیختا ہوا پیچھے بھاگا۔ جیسے تیسے سنبھال کر واپس لے آیا۔ اور اب کے بنا کچھ کہے پوچھے گدھا گاڑی واپس موڑ کر پیر کے آستانے پر لے آیا۔ بس سونہڑی...... اوڈیں تے آج دا ڈیں (وہ دن اور آج کا دن) انکار کی جرات نہیں پائی خود میں۔'' وہ کانوں کو ہاتھ لگا کر معافی مانگنے لگیں۔

''جرات تو پائی بھی دادی۔'' معظمہ نے ہنس کر کچھ یاد دلایا۔ ''پر سبق بھی خوب پایا۔''

''چپ تھی۔'' (دفع ہو) نانی نے ہاتھ کا پنجہ دکھا کر بے چاری پہ لعنت بھیجی جو اسی طرح ہنسے جا رہی تھی بلکہ نصرت مامی اور شمع بھابی بھی قہقہہ مار کر ہنس

''ہیں!!'' امیرہ پیر شاہ عیسیٰ کے متعلق بس اتنا ہی جانتی تھی کہ چیت کے مہینے میں میلہ بلوٹ خوب دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ بچپن کے دو، چار میلے اسے دھندلے دھندلے سے یاد تھے۔ حالانکہ جب تک وہ دادی کے پاس تھی، بلوٹ شریف سے زیادہ دور تو نہیں تھی۔ اس کا گاؤں رنگ پور، بلوٹ شریف سے یہی کوئی بیس، بیس کلومیٹر کی دوری پر تھا جبکہ میلہ بلوٹ پر تو دور دراز سے ہزاروں لوگ شرکت کرنے

آیا کرتے تھے، تیس بتیس کلومیٹر کیا چیز تھے۔ لیکن معاملہ دراصل کچھ اور تھا۔

اس کی دادی ایک تو ہر وقت بیمار رہتی تھیں۔ دوسرے گھر میں رہنے والے دو عدد سوتیلے بیٹوں پر ہرگز بھروسا نہیں کرتی تھیں۔ سگے بیٹے یعنی امیرہ کے باپ کے مرنے پر اسے مجبوراً ان سوتیلے بیٹوں کے پاس رہنا پڑ گیا تو مارے باندھے ان کے گھر آ تو گئیں لیکن اپنا رویہ ہمیشہ بڑا محتاط اور لیے دیے رکھا۔

یہ دو عدد سوتیلے چچا بمع اپنی بیویوں اور بچوں کے ہر سال بڑے اہتمام سے میلے میں شرکت کرنے جاتے لیکن دادی نے کبھی امیرہ کو ان کے ساتھ نہیں بھیجا۔ ویسے بھی امیرہ تو سایہ تھی اپنی دادی کا، وہ گھر پر اسی کا خیال رکھتیں، اور کبھی اس بات کا برا نہ مانتی کہ دادی کی اپنے معاملات میں بھرپور احتیاط پسندی سے خوب واقف تھی۔ البتہ ایک کسک ہمیشہ اندر ہی اندر ضرور محسوس کی۔ وہ کسک جس نے نو سال کی عمر سے آج تک چین نہیں لینے دیا تھا۔ جب تک رنگ پور میں رہی، کسک بھی پیاز کی پرتوں جیسی اندر کہیں آخری تہوں میں چھپی رہی۔ لیکن یہاں ڈھکی آنے کے بعد عرصہ چھ ماہ سے کسک نے اپنی ساری تہیں اتار ڈالی تھیں۔

شروع دن سے جب بھی قدم گھر سے نکالے کسی کو ڈھونڈ لینے، دیکھ لینے کی آس میں ہی نکالے، پر کیسے جانتی وہ کسک کہ جسے بچپن میں کبھی دیکھا تھا۔ آج قریب سے گزر بھی جاتا تو اسے خبر کیسی ہوتی۔ آتے جاتے اجنبی چہروں کو پڑھتے، نگاہیں ایک سانولے، کمزور سے لڑکے کو تلاش کرتی رہتیں۔ ہمیشہ سے ایک خوش فہمی امیرہ کے دامن سے لپٹی رہی کہ وہ اسے پہچان لے گی۔ بس یونہی، خواہ مخواہ۔

اور اب میلہ بلوٹ کے لیے بھی، یہی امید کی ڈور اسے کھینچے جا رہی تھی اس بے مہر کو نہ سہی...... اس کے چند ایک گھر والوں سے تو شکل کی حد تک ضرور واقف تھی۔ سوچا کوئی نہ کوئی ان میں سے دکھائی دے گیا تو دشمن جاں کو بھی کسی نہ کسی طرح دیکھ ہی لے گی۔

''اچھا اب باتوں میں لگائے رکھے گی کیا۔'' نانی نے زور سے ٹہوکا دیا تو خیالوں میں کھوئی امیرہ چوکی سے نیچے جا گری۔

''چل کہیں بارش نہ شروع ہو جائے...... کل صبح تو پھر میلے جانا ہے مجھے، صبح سویرے نہ بلڈ چڑھ جائے۔ (بلڈ پریشر)۔''

''لیکن نانی، مجھے لگتا ہے بارش تو بس ہونے ہی والی ہے۔'' اس نے جان چھڑانے والے انداز میں کہہ کر آسمان کی طرف دیکھا۔

''نہیں آندی بارش...... چل جل (نہیں آتی بارش، چلو جاؤ)'' وہ ان سنی کر کے اٹھ گئی۔ ناچار امیرہ بھی منہ بناتی ساتھ چل پڑی۔ بلڈ پریشر کی گولی تو وہ پہاڑپور کے ڈاکٹر سے لکھوا لائی تھیں۔ لیکن بنا بلڈ پریشر کی جانچ کروائے کھاتی نہ تھیں۔ ادھر کی چھوٹی ڈسپنسری سے اسی لیے کبھی کبھار آلہ لگوانے چلی جاتیں۔ ایک دو بار بنا جانچ کروائے یونہی گولی پھانک لی تو حالت ہی بگڑ گئی۔

امیرہ نے شکر پڑھا کہ رش یہاں زیادہ نہیں تھا ڈاکٹر صاحب ابھی نہیں آئے تھے۔ کمپاؤڈر موجود تھا اس نے فوراً ہی بلڈ پریشر چیک کر کے گولی کھانے کا مشورہ دیا اور واپس بھیج دیا۔ امیرہ نانی کا ہاتھ پکڑ کر باہر آئی تو کسی سے ٹکر ہوتے ہوتے بچی۔ نانی انجان شخص کے لیے گالیوں کا اسٹاک کھولنے ہی والی تھیں کہ نظر اس کے چہرے پر پڑی۔

''ارے، تو تو رجب ہے ناں اپنی رشیدہ کا بیٹا۔'' بوڑھے لب یکلخت مسکراہٹ بکھیرنے لگے۔ رجب میاں بھی بھلے پہچان پائے یا نہیں، سعادت مندی دکھاتے ہوئے سر آگے جھکا دیا۔

''جیتا رہ۔'' نانی نے فٹ سے نرمی کا ہاتھ پھیر کر بال بگاڑے۔

''کیسی ہے تیری اماں اور پڑھائی پوری کر لی تو نے؟ پکا واپس آ گیا کیا......؟'' نانی نے حسب

عادت سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ امیرہ کو تو ہنسی آئی ہی وہ بھی مسکرانے لگا۔

''جی پکا ہی واپس آیا ہوں اور اماں بھی ٹھیک ہیں۔''

''اچھا اچھا، ماں کو سلام کہنا میرا۔ میں جمال کی ماں ہوں، فیاض کی دادی۔ تیرے ساتھ ہی پڑھتا تھا ناں؟'' نانی کو خیال آیا۔

''جی جی بالکل، اسکول میں ساتھ پڑھتا تھا۔ کیا کر رہا ہے آج کل۔ کب سے ملنا نہیں ہوا۔'' خوش اخلاق تو وہ بھی کم نہیں تھا۔ بنا کوئی عجلت دکھائے تسلی سے حال احوال بانٹنے لگا۔

''پہلے تو زمینیں دیکھتا تھا باپ کے ساتھ۔ شادی کے بعد آٹے کی چکی کھول لی ہے۔ بلکہ میں نے پیسہ لگایا سارا۔ ایک ہی پوتا ہے میرا، اپنا کھائے کمائے مجھے تو خوشی ہو گی۔'' نانی ذرا زیادہ ہی پھیلنے لگی تھیں۔

امیرہ نے بازو سے پکڑ کر قدم آگے بڑھائے۔

''اب چلو نانی۔''

''کسی دن چکر لگاؤں گی تیرے گھر۔'' ناچار آگے بڑھتے ہوئے وہ یاد دہانی کرانے لگیں ''رشیدہ کے ساتھ کمیٹی ڈالی ہوئی ہے میں نے...... اماں سے کہنا مجھے ذرا جلدی باری دے۔'' موقع محل کی تاک میں رہنے والی نانی نے لگے ہاتھوں مدعا بھی پیش کر دیا۔

''اف یہ نانی......'' امیرہ نے سخت شرمندگی سے منہ دوسری جانب پھیرا۔ ''سر راہ بھی مطلب نکلوانے سے باز نہیں آتیں۔'' رجب آگے بڑھ گیا تو وہ تاؤ کھاتی مڑی۔

''اب یہ کمیٹی کا ذکر کرنے کا کون سا موقع تھا نانی۔'' وہ بری طرح غصہ کھا گئی۔

کیسا پڑھا لکھا، سوبر سا لڑکا تھا۔ کتنا برا اثر چھوڑ دیا نانی نے، ہمیشہ ایسا ہی کرتی ہیں۔ جہاں فائدہ نظر آیا۔ بلا لحاظ کود پڑتی ہیں۔ سڑک پر چڑھتے امیرہ نے یونہی پلٹ کر دیکھا۔ وہ ابھی تک ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔ نظریں چار ہوئیں تو مسکرا کر رخ پھیر گیا۔ امیرہ فوراً گھبرا کر سیدھی ہوئی۔ وہ تو نانی کی بات پر خواہ مخواہ اس کا ردعمل دیکھنے کو مڑی تھی۔ پر جانے وہ کیا دیکھ رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں سخت ندامت محسوس کرتی آگے بڑھ گئی۔

''شریف لڑکیاں راستہ چلتے گردن نہیں موڑا کرتیں، دیکھنے والا غلط مطلب نکالتا ہے۔'' مرحومہ دادی کی نصیحت کانوں میں گونجی تو اس نے تصور میں خود پر لعنت بھیجی۔

☆☆☆

مارچ کی وہ دوسری اتوار تھی۔ یوں تو میلہ بلوٹ پورا ایک مہینہ چلتا تھا لیکن چار ''اتوارین'' میلے کی رونقوں میں چار چاند لگا دیا کرتیں۔ رش بھی عام دنوں سے زیادہ ہوتا۔ لگتا گاؤں کے گاؤں امڈے چلے آ رہے ہیں۔

امیرہ نے چند گنے چنے ریشمی کپڑوں میں سے اپنا پسندیدہ پیلا جوڑا منتخب کیا جس پر کہیں کہیں کاسنی پھول بنے تھے۔ ساتھ میں پیلے بارڈر والا بڑا سا کاسنی دوپٹہ تھا۔ آنکھوں میں کاجل کی گہری لکیر لگا کر اس نے الٹی مانگ نکالی اور پیچھے سادہ کالا پراندہ ڈال لیا کہ باوجود خواہش رکھنے کے وہ آج تک رنگین پراندہ خرید نہیں سکی تھی۔

وہ سب ڈھکی سے عام مسافر ڈالسوں کے ذریعے بلوٹ شریف پہنچے تھے۔ سڑک سے اتر کر درگاہ تک جانے کے راستے میں حقیقتاً تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ یہ اونچا نیچا پتھریلا راستہ تنگ تو تھا ہی...... دشوار گزار بھی خوب تھا۔ درگاہ کے آس پاس کی جگہ البتہ کافی کشادہ تھی۔ پیر شاہ عیسیٰ کے دربار کو جاتا راستہ قدرے اونچائی پر تھا۔ دربار کے پیچھے ویران، سنسان ٹیلے اور جھاڑیاں تھیں جبکہ ان سے بھی پیچھے اونچی پہاڑیاں۔ کھلی جگہ پہ آ کر باوجود رش کے بہرحال سکون کا سانس ضرور نصیب ہوا تھا۔ کچھ دیر ستا کر بالآخر مرکزی آستانہ پیر شاہ عیسیٰ کا رخ کیا گیا۔

امیرہ بڑی دلچسپی سے ان رونقوں کو دیکھتی آگے بڑھ رہی تھی۔ بھڑکیلے کپڑوں، زیوروں اور میک اپ سے سجی خواتین کے شور میں سے گزرتے وہ دربار کے اندر داخل ہوئے تو رش اس قدر زیادہ تھا کہ آنے اور جانے والوں کے لیے باقاعدہ باریاں لگی ہوئی تھیں۔ اجمل ماموں اور فیاض نے ان سے کہا کہ وہ لوگ چاہیں تو کہیں سائے وغیرہ کے نیچے آرام سے ڈیڑھ دو گھنٹہ ستا لیں۔ وہ دونوں اب ان سے الگ ہو رہے تھے۔ دو گھنٹے بعد یہیں دوبارہ جمع ہونے کا کہہ کر گھومنے پھرنے نکل گئے۔ امیرہ اور معظمہ نے شوخ نگاہوں کے تبادلے میں چپکے چپکے کچھ طے کیا۔ دونوں نے اپنا جمع شدہ کل سرمایہ میلے کے رنگ برنگے اسٹالز پر خرچ کرنے کا فیصلہ کیا اور نانی وغیرہ کے لیے کسی پرسکون سائے کی تلاش کرنے لگیں۔ امیرہ اور معظمہ نے جلد ہی ایک سایہ دار جگہ تلاش کر کے نانی، مامی، شمع بھابھی اور عفیرہ کو وہاں چھوڑا اور اسٹالز کی طرف دوڑ گئیں۔

رنگ برنگی چوڑیاں اور پراندے ابھی تک امیرہ کی آنکھوں میں پھر رہے تھے جو آتے وقت اس نے راستے کے شروع والے عارضی اسٹالز پر دیکھے تھے۔ اپریل کے آخر میں مامی کے خاندان میں دو شادیاں تھیں۔ جس میں شرکت کی تیاری وہ آج سے شروع کرنا چاہتی تھی۔ امیرہ کو اپنے دو ان سلے جوڑوں کو مدنظر رکھتے ہوئے میچنگ چوڑیاں اور پراندے خریدنے تھے۔ چوڑیوں کے اسٹال پر نقلی جیولری بھی تھی لیکن معظمہ اور اس کا ذاتی خیال تھا کہ جیولری کافی ہلکی ہے۔ لہذا فیاض سے کہہ کر شہر سے منگوائیں گے۔ کانچ کی چوڑیاں البتہ کافی دیدہ زیب تھیں۔ پھر کپڑوں سے میچنگ بھی تھیں۔ دونوں نے اپنے لیے دو، دو سیٹ پیک کروا لیے۔ امیرہ رقم دے کر پلٹی تو معظمہ کہیں نظر نہیں آئی۔ وہ ابھی آس پاس نظریں ہی دوڑا رہی تھی جب اس نے اونچی آواز میں پکارا۔

"امیرہ......!! او امیرہ۔" معظمہ کی چہکتی آواز سامنے کے اسٹال سے سنائی دی تھی۔ وہ مسکرا کر ہاتھ ہلاتے ہوئے اس طرف بڑھ گئی۔ عین اسی وقت ساتھ والے اسٹال سے کوئی اور بھی بے طرح چونک کر پلٹا تھا۔ سیاہ چشمہ اٹھانے کے لیے بڑھتے اس کے ہاتھ وہیں رک گئے۔ توجہ باقی ہر جانب سے ہٹ کر اس پیلے اور کاسنی دوپٹے والی گوری لمبی لڑکی پر مرکوز ہو گئی۔

"ارے واہ...... شیشوں والا پراندہ!! یہ تو بہت پیارا ہے۔" سبز رنگ کا وہ پراندہ معظمہ کی سبز چوڑیوں کے ساتھ بالکل میچ کر رہا تھا اور یہی دکھانے کے لیے اس نے چہک کر امیرہ کو صدا لگائی تھی۔

"بھرا! کوئی نیلا پراندہ ہے؟" اس نے لفافے میں سے اپنا چوڑیوں کا سیٹ نکال کر سامنے کیا۔

"بی بی...... یہ سارے لٹکے ہوئے ہیں۔ دیکھ لو۔" وہ مصروف انداز میں کہہ کر دوسرے گاہک کی طرف متوجہ ہو گیا۔

اس نے اشتیاق بھری نظر لٹکے ہوئے پراندوں پر ڈالی لیکن نگاہیں بے ساختہ اس آسمانی کپڑوں والے لڑکے سے ٹکرائیں جو پراندوں کے پیچھے قدرے اوٹ میں کھڑا خوب اپنائیت سے مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔ امیرہ نے بے یقینی سے اپنے آس پاس دیکھا پر اسٹال پہ جھکی معظمہ سمیت کسی کو بھی اس کی جانب متوجہ نہ پا کر دوبارہ حیرت سے اس طرف دیکھا۔ اس نے انگلی امیرہ کی طرف کر کے "تم" کا اشارہ کیا اور بشاشت سے مسکرایا۔ امیرہ کے تو پیروں تلے سے زمین کھسکنے لگی۔ گھبرا کر معظمہ کا بازو پکڑا۔

"چلو عزمی، اس کے پاس بہت رش ہے۔ آگے دیکھتے ہیں۔" اپنے پراندے کی قیمت وہ ادا کر چکی تھی۔ امیرہ نے زبردستی اسے اپنے ساتھ کھینچا۔

"بھرا کوئی نیلی سگی ڈکھا۔" (بھائی کوئی نیلا پراندہ دکھاؤ)۔ معظمہ نے چوڑیاں اس کے ہاتھ سے لے کر خود ہی آگے کر دیں۔ امیرہ اسٹال کا باقی سامان دیکھنے لگی کہ ذرا دور آسمانی کپڑوں کی جھلک

سی دکھائی دی۔ اس نے بے ساختہ نظر اٹھائی تو لٹکتے باریک دوپٹوں کے پیچھے وہ پھر — کھڑا دکھائی دیا۔ ان کے پیچھے پیچھے وہ بھی یہاں چلا آیا تھا۔

"ہائے اللہ۔" امیرہ نے حقیقی پریشانی سے تھوک نگلا۔ یہ تو پیچھے ہی پڑ گیا ہے۔

"یہ دیکھ امیرہ! یہ تو میرے والے سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔ شیشے تو اب پرانا فیشن ہو گیا۔ یہ چاندی جیسے گھنگھرو دیکھ۔" معظمہ نے ناقدانہ جائزہ لیتے ہوئے پراندہ اس کی جانب بڑھایا۔ امیرہ نے نہ چاہتے ہوئے بھی ہاتھ میں لے لیا۔ بات واقعی دل کو لگتی تھی۔ شیشوں والے کی نسبت یہ پراندہ کہیں زیادہ خوب صورت تھا۔ دکان دار منتظر نظروں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا کر رقم نکالی۔ اسے اگر چھوڑ دیتی تو گھر جا کر خوب پچھتاتی۔

"اور بھی کچھ لو نا......" کان کے بہت قریب اجنبی سرگوشی ابھری تو وہ اچھل کر دور ہوئی۔ دھواں دھواں چہرے سے نظر گھمائی تو وہ آنکھوں میں سمجھ نہ آنے والی معنی خیزی لیے مسکرا کر اسے دیکھ رہا تھا۔ دونوں کے درمیان لہراتے رنگ برنگے دوپٹے لٹک رہے تھے۔ اس نے پاس کھڑی معظمہ کا ہاتھ مضبوطی سے تھاما اور پوری دوسری طرف گھوم گئی۔

"چچ...... چلو معظمہ۔"

"ارے...... وہ پراندہ۔"

"لے لیا ہے...... چلو۔" وہ تقریباً بھاگی۔

"پر مجھے بھی لینا ہے، وہ دوسرا جامنی والا۔" معظمہ رکنے لگی۔

"چلو بالکل۔" امیرہ سرخ انگارہ چہرا لیے آگے بڑھنے لگی۔ "کوئی لوفر ہمارے پیچھے لگ گیا ہے۔"

"ہیں۔" معظمہ کی سٹی گم ہوئی۔ فوراً مڑ کر پیچھے دیکھا "کون، کہاں......؟"

"وہیں...... اسٹال پر۔" امیرہ نے دوپٹوں کے پیچھے نظر دوڑائی۔ لیکن اب وہ وہاں نہیں تھا۔

"تم چھوڑو اسے۔" وہ جھنجلا گئی۔

"چلو واپس چلتے ہیں۔ وہ شاید کافی دیر سے ہمارے پیچھے ہے۔ پہلے ہنس ہنس کر دیکھ رہا تھا۔ ابھی بولنے کی کوشش بھی کی۔" وہ بتانے کے ساتھ ساتھ ہجوم کو چیرتی آگے بڑھنے لگی۔

"ارے تو رکو نا...... اماں اور دادی تو یہاں سے بہت دور ہیں۔ ہم مزل بھائی کو بتاتے ہیں۔ وہ یہیں ہیں۔" روانی سے بولتی ہوئی معظمہ کی زبان کو بریک لگی۔

"مز......ل۔" امیرہ سب بھول بھال پھٹی آنکھوں سے معظمہ کو دیکھنے لگی۔ "مزل یہاں ہے۔ تت، تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں، کہاں ہے؟" وہ زور زور سے اس کے کندھے پر مکے مارتی دائیں بائیں دیکھنے لگی۔ مزل کے علاوہ ہر بات بھول گئی تھی۔ ہر حقیقت بے معنی ہو گئی تھی۔

"کچھ دیر پہلے دیکھا تھا۔" معظمہ پھیکی ہنسی ہنستے ہوئے شرمندہ نظر آ رہی تھی۔

امیرہ نے آنکھیں چندھیا کر سخت خفگی سے اسے گھورا۔ "مجھے کیوں نہیں بتایا؟"

"ارے بس خواہ مخواہ ہی سوچ میں پڑ گئی کہ بتانا ہے یا نہیں۔ دادی بھی اتنا چڑتی ہیں ان سے۔ پھر میں نے سنا تھا کہ تم سب کے برسوں سے ان لوگوں سے تعلقات خراب ہیں۔" معظمہ معذرت خواہانہ انداز میں صفائی دینے لگی۔

"اچھا ٹھیک ہے۔" اس کا موڈ ہنوز خراب تھا۔

"پر اب تم ہی اسے ڈھونڈ کر دو گی...... تمہیں پتا بھی ہے، برسوں سے اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے ترس رہی ہوں۔ تم نہیں جانتیں معظمہ۔" لہجہ ایک دم بھر آیا اور پلکیں نم ہو گئیں۔ معظمہ بھی گھبرا گئی۔

وہ تو دیوانی تھی بالکل...... نہ اسے لوفر لڑکا یاد رہا تھا نہ جگہ اور ماحول کا خیال...... معظمہ کو اس کی پچھلے روز کی بے چینی یاد آئی۔ یعنی وہ اسی موہوم سی امید پر آج کے میلے میں آئی تھی اور امید۔ واقعی پورا ہونے کو تھی۔ اُف توبہ کیا بھول ہو گئی تھی اس سے......

"اچھا آؤ...... ڈھونڈتے ہیں۔" معظمہ نے

اس کا بازو تھاما۔ جو بے تابی سے انگلیاں چٹخاتے یوں ایک ایک کا چہرا دیکھ رہی تھی جیسے پہچان ہی تو جائے گی۔ اس لیے بھیڑ کے درمیان میں سے ہوتے وہ دونوں مزید آگے بڑھ کر آخری اسٹال تک دیکھ آئیں لیکن مزمل دکھائی نہیں دیا۔

"چلو واپسی کے راستے میں دیکھتے ہیں۔ شاید وہ دربار کی طرف گیا ہو۔" معظمہ بدستور اس کا ہاتھ تھامے ہوئے تھی۔ اسٹالز کے خاتمے پر اب وہ ایسی جگہ آ گئے تھے۔ جہاں سے دایاں کشادہ راستہ دربار کو اور بایاں کھلا راستہ اونچے نیچے ناہموار میدان کی طرف جاتا تھا جہاں کچے پکے کچھ کمرے بھی بنے ہوئے تھے۔ بہت ساری گاڑیاں اور ڈاٹسنیں بھی کھڑی تھیں۔

"دربار کی طرف دیکھتے ہیں۔" امیرہ نے مشورہ دیا لیکن معظمہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ دائیں جانب والے درختوں کے نیچے اس نے کسی کو دیکھا اور دو قدم مزید آگے جا کر آواز لگائی۔

"مزمل بھائی......" اور ان کی طرف پیٹھ کیے چار لڑکوں کے گروپ میں سے ایک نے مڑ کر دیکھا۔

"کل ......لوفر لڑکا۔" امیرہ کی تعجب سے آنکھیں پھیلیں۔

آسمانی شلوار قمیص میں وہی معنی خیز مسکراہٹ چہرے پر سجائے وہ اس کے سامنے موجود تھا۔ معظمہ اور امیرہ کو دیکھ کر دوستوں سے معذرت کرتا ہوا اکیلا ان کی طرف بڑھا۔

"مجھے ڈھونڈتی ہوئی آئی ہو......؟" انداز میں اچھی خاصی حیرت تھی۔ "پہلے تو دیکھ کر نظریں چرا گئی تھیں......ہوں؟" وہ پیار بھرا استفسار کر رہا تھا۔ مخاطب ابھی بھی معظمہ ہی تھی۔ مارے شرمندگی کے جس نے منہ سے جواب بھی نکالا تو کیا۔

"امیرہ نے کہا اس لیے۔"

"کیا کہا "امیرہ" نے ......" مسکراتے لبوں سے اس نے بطور خاص زور دے کر امیرہ کہا......شوخ نگاہوں نے فرصت سے اس کے چہرے کا احاطہ کیا۔ جس پر وہ سخت نروس ہوئی۔

دل کی پہلے کیا کم عجیب حالت تھی......اس کا منگیتر، اس کی محبت، بقول دادی، دنیا میں اس کا واحد سہارا، اس کے سامنے تھا۔ پہچان لینے کے سارے دعوے ہی خاک ہو گئے، وہ تو اسے آوارہ لوفر لڑکا سمجھ بیٹھی تھی۔ جو اتنی دیر سے یوں ہی نہیں اس کے پیچھے پیچھے تھا......معظمہ کے ساتھ ہونے کی وجہ سے وہ بھی اسے پہچان چکا تھا نہ صرف پہچان بلکہ......

گھبرا کر پلکیں گرائے جانے وہ کہاں پہنچی ہوئی تھی، جب معظمہ کی چیخ بلند ہوئی۔

"ابا......فیاض بھائی، ہائے اللہ۔" اور اکیلی ہی ایک سمت کو بھاگ کھڑی ہوئی۔ امیرہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ دونوں کہاں ہیں۔ بس جلدی سے دوپٹا درست کرنے کی کوشش میں لگ گئی کہ شاید اس طرح ان کی نگاہوں سے چھپ جائے۔

مزمل نے البتہ انہیں دیکھ لیا تھا۔ وہ دربار کی سمت سے آ رہے تھے اور زیادہ امکان یہی تھا کہ اس جگہ پہنچتے ہی بازار کی طرف مڑتے......اور وہ دونوں احمق تو موڑ پر ہی کھڑے تھے۔ صورت حال کافی سنگین تھی۔ وہ اگر اکیلا کسی سمت کو نکل بھی جاتا تو امیرہ کو لازمی جھاڑ پڑتی، اس طرح سر راہ کھڑے ہونے پر، اس کے ہوشیار ذہن نے تیزی سے حساب کتاب کیا......ابھی بھی وہ دونوں کچھ فاصلے پر تھے اور درمیان میں کافی سارے لوگ بھی تھے۔ بہر حال فاصلہ تیزی سے کم ہو رہا تھا۔

اس نے دل میں کچھ طے کیا اور امیرہ کی کلائی تھام کر تیز قدموں سے سامنے والے اونچے ٹیلے کا رخ کیا۔ جہاں بہت ساری گاڑیاں کھڑی تھیں اور چند ایک کچی عمارتیں بھی تھیں۔ انداز تقریباً بھاگنے جیسا تھا۔ وہ دونوں گاڑیوں کے پیچھے آئے تو امیرہ نے مڑ کر دیکھا۔ ماموں اور فیاض بھی ادھر ہی آ رہے تھے۔

انہوں نے ہمیں دیکھ لیا ہے شاید......وہ بھی ادھر ہی آ رہے ہیں۔" امیرہ نے گھبرا کر مزمل کو اطلاع دی۔ بنا تبصرہ کیے اور مڑے اس نے قدم تیز کیے اور اسے لیے کچے کوٹھوں کی پشت پر آ گیا۔

"اس سے آگے کہیں نہیں جا سکتے، اب اللہ مالک ہے۔" پھولی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے اس نے رومال سے ماتھے کا پسینہ صاف کیا۔ امیرہ نے ذرا دیر رک کر کچھ سوچا پھر اوٹ سے جھانکا......دونوں ایک ڈاٹسن کے ساتھ کھڑے کسی آدمی سے بات کر رہے تھے۔ آدمی نے موبائل نکال کر کسی سے بات کی، پھر آف کر کے جانے ماموں اور فیاض سے کیا کہا، وہ دونوں اس آدمی سے ہاتھ ملا کر واپس مڑ گئے۔

"اف......" سکون سے آنکھیں موند کر اس نے دیوار سے سر ٹکایا۔

"اپنے کسی کام سے آئے تھے۔ ہمیں نہیں دیکھا۔" وہ آنکھیں بند کیے خود کلامی کر رہی تھی جب مزمل نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا۔ پلکیں اٹھائیں تو مزمل کی پُرشوق نگاہوں کو خود پر مرکوز پایا۔ حالت سکون میں آتے ہی انداز بھی بدل گیا۔ وہ ہاتھ چھڑا کر اپنے آپ میں سمٹ گئی۔ دیکھنے کا اشتیاق اپنی جگہ پر ایسی صورت حال کا تو گمان بھی نہیں کیا تھا۔

"برسوں تمہارا انتظار کیا ہے امیرہ......یقین نہیں آ رہا یہ تم ہو۔ خدا کی قسم، مجھے تو یہ ایک خواب لگ رہا ہے۔" عجیب دھیما دھیما سا لہجہ تھا۔

توبہ کیسے بولتا ہے۔ سیدھی سیدھی باتیں کیوں نہیں کرتا۔ وہ الجھ کر دوسری جانب دیکھنے لگی۔ دل کم بخت بھی قابو میں نہیں آ رہا تھا۔

"تم بھی کچھ بولو امیرہ......"

"چچ، چلیں......معظمہ ڈھونڈتی ہو گی۔" اس کا سر پورا جھک گیا۔

"تم مجھے کیوں ڈھونڈ رہی تھیں؟" وہ تو جیسے کچھ سُن ہی نہیں رہا تھا۔

"وہ...... میں نے معظمہ سے کہا کہ کوئی لڑکا ہمارا پیچھا کر رہا ہے۔"

"لوفر لڑکا۔" مزمل کے فوری اضافے نے اس کا چہرا گلابی کر دیا۔ ہنسی بھی آ گئی۔

"میں اسے لے کر واپس جانے لگی تب اس نے بتایا کہ آپ بھی یہاں ہیں۔"

"تو تم نے اسے تکے مارے کہ بتایا کیوں نہیں؟"

"یہ بھی دیکھ لیا تھا......" وہ بری طرح کھسیا گئی۔ "اچھا اب جاؤ۔"

"پھر کب ملیں گے امیرہ۔" جانے کا سن کر وہ ایک دم گھبرا گیا۔ "چھ ماہ سے تم وہاں ڈھکی میں ہو......میرے اتنے قریب، جانے کتنے چکر کاٹے تمہاری گلی کے......کبھی فیاض یا تمہارا ماما دیکھ لیتے تو ایسے گھورتے، جیسے گلی بھی ان کی جاگیر ہو اور تم بھی۔ میں تو ترس گیا تھا تمہیں ایک نظر دیکھ لینے کو......اور میرا دل کہتا تھا کہ تم بھی سوچتی ہو گی میرے بارے میں......بولو ناں امیرہ......ڈھکی میں کیسے ملو گی اور کب؟"

"امیرہ......او امیرہ۔" معظمہ دور سے پکارتی چلی آ رہی تھی۔ بے تابی سے سوال کرتے مزمل کو امیرہ نے ایک نظر دیکھا تو اس نے بے بسی سے کندھے اچکا دیے کہ ظاہر ہے اس عارضی ملن کا انجام تو بہر حال جدائی تھی۔ امیرہ بنا کچھ کہے ہی معظمہ کی طرف بڑھ گئی۔ دل و دماغ میں البتہ خیالات کا محشر بپا تھا۔ پندرہ بیس قدم دور جانے پر اس نے مڑ کر دیکھا۔ مزمل سینے پر ہاتھ باندھے، دیوار سے کاندھا ٹکائے ابھی بھی وہیں کھڑا تھا۔ وہ معظمہ کا ہاتھ چھڑا کر بھاگتی ہوئی واپس آ گئی۔

"کل پچھلے پہر چار بجے......اوپر نہری آر بی سی کے کنارے۔"

"کل......؟" وہ بے ساختہ ہنسا۔ بے یقینی الگ تھی۔ امیرہ نے مسکراتے ہوئے سر اثبات میں ہلایا۔

"لیکن ڈھکی موڑ سے گزر جانے کے بعد بھلوانی والے روڈ پر آنا تو پھر اوپر چڑھنا، اس طرف کوئی نہیں ہوتا۔"

"بہتر جناب ...... اور کچھ۔" وہ ذرا سا جھکا، نئی راہ سوجھ جانے پر دونوں ہی بے ساختہ خوش تھے۔

"اور ......؟" اس نے لبوں پہ انگلی بجا کر شوخی سے کچھ سوچا اور پھر اس کے ہاتھ سے رومال چھین کر لہراتی ہوئی واپس بھاگ گئی۔

"ارے ......" مزمل خالی ہاتھ لیے اس کی حرکت پہ غور کرتا رہ گیا۔

"نشانیاں لیتی ہے ...... چور کہیں کی۔" چمکتی، نثار ہونے والی نظروں سے وہ اس دل لوٹنے والی کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

☆☆☆

وہ خوش تھی، بہت خوش۔ برسوں کا انتظار کچھ یوں ختم ہوا تھا کہ جھولی اور تک خوشیوں سے بھر گئی تھی۔ وہ مزمل کی محض ایک جھلک دیکھ لینا چاہتی تھی پر اللہ پاک نے ملوا بھی دیا تھا۔ بلکہ جو خود بھی اس سے ملنے کو بے چین و بے قرار آج تک صرف اسی کو چاہے جا رہا تھا۔

"ہاں دادی صحیح کہتی تھی، تم ہی ہو میرا واحد سہارا، میری محبت، میرا سب کچھ۔" وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر کچے صحن میں گرتے بارش کے موٹے موٹے قطروں سے کھیلنے لگی۔

"او ...... اندر مرے سیتی۔" (اندر مر کم نصیب) نانی ماتھا پیٹتے اسے کمرے میں بلانے لگی اور امیرہ کے بھیگے وجود پر چھایا سارا طلسم ہی جیسے ٹوٹ گیا۔ برستی بارش میں مزمل کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے وہ کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر دوڑتی جا رہی تھی۔ پر یہ نانی ہونہہ، اس نے دوپٹہ کمر سے نکال کر زور سے نچوڑا اور جھٹک کر کندھوں پر پھیلاتی بجائے نانی کے پاس جانے کے کونے والے چھوٹے کمرے میں آ گئی۔ یوں تو یہ اس کا اور نانی کا ہی کمرا تھا پر نانی صاحبہ فی الوقت فیاض اور شمع کے کمرے میں بیٹھی چائے کی چسکیاں لے رہی تھی۔

"نہیں ہوں میں بے سیتی۔ (بدنصیب) اوپر والے نے کھول دی ہے ساری بندش، اب مجھ جیسی سیتیوں والی (خوش نصیب) ہو گی کوئی۔ دادی زندہ ہوتی تو بتاتی اسے ...... استغفار ...... ایسے بھی کوئی گالیاں دیتا ہے۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ سگی اماسات (سگی خالہ زاد) ہیں دونوں، کہاں میری دادی، ایسی نرم مزاج، میٹھا بولنے والی، سمجھ دار اور دھیمی۔"

وہ انجانے میں ایک بار پھر نانی اور دادی کا موازنہ کرنے بیٹھ گئی تھی۔ بلکہ پچھلے چھ مہینوں میں، جب سے نانی کو نیا نیا جاننا شروع کیا تھا' یہ گستاخی اس سے اکثر ہی سرزد ہو جاتی تھی۔ دادی کے ساتھ امیرہ نے زندگی گزاری تھی۔ ماں تو بچپن میں گزر گئی تھی۔ رنگ پور میں وہ اپنے ابا اور دادی کے ساتھ رہتی تھی جنہوں نے اسے ماں بن کر پالا تھا۔ پھر کچھ سال پہلے جب ابا کا انتقال ہو گیا تو دادی اسے ساتھ لیے مجبوراً سوتیلے بیٹوں کے پاس چلی گئیں۔ وہاں گزارے دن اگرچہ کچھ ایسے خوشگوار نہیں تھے پر دادی کے محبت بھرے ساتھ نے امیرہ کو کبھی فکر مند نہیں ہونے دیا تھا۔ ایسی پیار لٹانے والی، نرم خو دادی کے ہوتے اسے ضرورت ہی کیا تھی فکر کرنے کی ...... ہاں پر دادی کبھی کبھار وہمی ہو جاتیں۔ خوب شگون نکالتیں باتوں سے، بے دھیانی میں بھی منہ سے برا کلمہ نہ نکالتی نہ نکالنے دیتیں۔ سہیلیاں ایک دوسرے کو ہنسی مذاق میں پاگل بھی کہہ دیتیں تو وہ فوراً ٹوکتیں۔

"نہ میڈی دھی ...... منہ سے ہمیشہ اچھی بات نکالتے ہیں، پتا نہیں کون سا ویلا سنیج (قبولیت کی گھڑی) کا ہو۔"

"ارے دادی۔ پاگل تو سب سے چھوٹی اور معمولی گالی ہے۔"

"انسان کو پاگل ہوتے کیا ٹائم لگتا ہے۔ اللہ ایسا برا وقت کسی پر نہ لائے جب وہ اپنے ہوش حواس کھو بیٹھے ...... نہ کہا کر۔" وہ مصر تھی اسے باز رکھنے پر اور ایک یہ نانی اماں تھیں۔ کتنی آسانی سے کہہ دیا ...... اندر مر۔ اس کی دادی کبھی بھی مرنے کا لفظ منہ سے ادا نہیں کیا کرتی تھی (یعنی پھر وہی سنیج کا ویلا، قبولیت

کی گھڑی) امیرہ دادی کا مذاق اڑا کر کہتی کہ اصل میں دادی آپ موت سے بہت ڈرتی ہیں اور وہ ہنس کر ٹال جاتی۔ ایک بار وہ قرآن پاک کا سبق لے کر گھر لوٹی تو دادی اداس' پریشان منہ لٹکائے بیٹھی تھی۔ امیرہ نے وجہ پوچھی تو کہنے لگی۔

"ارے وہ مرغیوں والی ہاجرہ ماسی، شودی، "او" تھی گئی ہے۔" (بے چاری "وہ" ہو گئی ہے)

"اوہ" تھی گئی ہے؟" امیرہ کچھ کچھ سمجھ تو گئی پھر بھی انجان بن کر پوچھا۔

"ہاں اللہ۔" دادی نے تنگ آ کر ماتھے پہ ہاتھ مارا ...... "بیمار تھی غریب' بس آج صبح "وہ" ہو گئی۔"

"اف دادی، تو بتاؤ نا' مر گئی ہاجرہ ماسی۔"

"اچھا چپ کر ...... بس نام نہ لے۔ بخشی تھیوے ہاجرہ۔" (اللہ بخش دے ہاجرہ کو)' وہ بات ٹالتی وہاں سے اٹھ گئی اور امیرہ مسکراتے ہوئے اپنی معصوم سی دادی کو دیکھتی رہی۔ اس سیدھی سادی دادی کے سارے خدشے بنا کہے ہی امیرہ جان لیتی تھی۔ وہ بے چاری سوچ سوچ کر ہول رہی تھیں کہ دو روز پہلے بخشو کمہار مر گیا، آج ہاجرہ ...... موت نے کہیں اس کے گاؤں کا منہ تو نہیں دیکھ لیا۔ اپنے گھر خاندان کی سلامتی کی دعائیں مانگیں اب وہ موت کا لفظ بھی اپنے منہ سے نکالنا نہیں چاہتی تھیں کہ کہیں دروازے کے باہر کھڑی قضا سن نہ لے۔ جمعرات کا زردہ بھی اس نے کبھی دادی کو کھاتے نہیں دیکھا کہ اندر ڈالتے ہی کہیں بلاوا نہ آ جائے۔ عجیب تھیں اس کی دادی، بزدل، وہمی حد سے زیادہ محتاط، پر بہت اچھی بہت پیار کرنے والی۔

اور ایک یہ تھی اس کی ماسات (خالہ زاد) اف تو یہ منہ بھر بھر کر گالیاں نکالنا، مستقبل کے ہولناک نقشے کھینچنا۔ غیبت، چغلی، تنقید خاصہ تھا اس کا۔

ہاں بس ایک امیرہ کو چھوڑ کر' امیرہ سے وہ واقعی بہت پیار کرتی تھی۔ بھلے دادی سے اس کی نانی کی کبھی نہیں بنی، پر مرتے وقت صاف الفاظ میں امیرہ کو وصیت کر گئی تھیں کہ میرے بعد ایک بھی دن یہاں سوتیلے چچا کے پاس نہ رہنا اور نہ ہی کسی اور کی باتوں میں آنا۔ تیری نانی کھلا بجا (جوتا، لعنت) بھی دکھائے تب بھی ڈھیٹوں کی طرح اس کے در پر پڑی رہنا۔ کیونکہ مزمل سے شادی تک ایک وہی تیری سچی خیر خواہ ہے۔ وہاں تو محفوظ رہے گی۔" امیرہ نے بھی بلاچوں چراں اس کا کہنا مانا۔

پھر نانی نے بھی بنا کسی کے کہے سمجھائے اپنا فرض خوب جانا تھا۔ ابھی تو امیرہ نے اسے دادی کی وصیت سے آگاہ بھی نہیں کیا تھا کہ قل خوانی کے بعد انہوں نے خود ہی امیرہ کو سامان باندھ کر اپنے ساتھ چلنے کی ہدایت کی تھی۔ وہ بھی مطمئن ہو گئی کہ کھلوں بجوں (جوتوں لعنتوں) کی نوبت نہیں آئی تھی۔

☆☆☆

"کپڑے دھونے جا رہی ہوں۔ لاؤ اسے بھی دھو دوں۔" امیرہ نجانے کتنی دیر سے نیلا رومال ہاتھوں میں پکڑے کھوئی کھوئی سی بیٹھی تھی۔ معظمہ کی آواز پر چونکی۔

"کہاں جا رہی ہو تم؟" اس نے تو سنا ہی نہیں تھا۔

"کپڑے دھونے جا رہی ہوں۔ لاؤ اسے بھی دھو دوں۔" وہ دبی دبی مسکراہٹ لیے اسے واقعی چھیڑ رہی تھی۔

"چل کملی ...... نشانیاں بھی کبھی دھوئی جاتی ہیں۔" وہ مسکرا کر رومال کو سونگھنے لگی۔ "ابھی ابھی تو اس کی خوشبو سے مانوس ہونا سیکھا ہے۔"

"دادی نے دیکھا ناں ...... تو رومال سمیت ناک بھی قینچی سے کاٹ ڈالیں گی۔"

"چھوڑ ناں دادی کو ...... اور۔" وہ چونکی۔ "یہ اس وقت تم کپڑے دھونے کیوں جا رہی ہو۔ سبق لینے نہیں چلنا کیا؟"

"سبق لینے تو پانچ بجے جاتے ہیں ناں۔" معظمہ نے تعجب سے گھڑی کی طرف دیکھا۔ "ابھی تو پونے چار ہیں۔"

"میں نے اسے یہی ٹائم دیا تھا۔ پانچ بجے تو

کتنے لوگ نکل آتے ہیں باہر۔"
"ارے پر بی بی جی۔" معظمہ قدرے متفکر ہوئی۔
"توبہ ہے معظمہ! کچھ نہیں کہتی تیری بی بی جی۔ کہنا کہیں جانا ہے پانچ بجے۔" وہ فی الفور اٹھ کھڑی ہوئی۔
"لیکن میری تیاری۔" وہ کپڑے ایک طرف رکھ کر اپنے آپ کو دیکھنے لگی۔
"تمہیں ضرورت نہیں ہے تیار ہونے کی اور میں تیار ہوں۔ بس چادر اوڑھ۔" اس نے کہتے ساتھ ہی اپنے گرد کالی چادر لپیٹ لی۔
معظمہ پچھلے دو ماہ سے ادھر ملوانہ کی طرف ایک بی بی جی سے قرآن پاک سیکھ رہی تھی۔ امیرہ تو اس کے اکیلے پن کی وجہ سے یوں ہی ساتھ جایا کرتی تھی بلکہ معظمہ میں قرآن پڑھنے کی تحریک بھی امیرہ کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔
امیرہ خود تو بچپن میں قرآن پاک ختم کر چکی تھی اور پچھلے چھ ماہ کے دوران یعنی جب سے وہ ڈھکی آئی تھی' نہ صرف صبح سویرے خود قرآن پاک کی تلاوت کیا کرتی بلکہ آس پڑوس میں ختم قرآن کی کوئی تقریب منعقد ہوتی تو وہاں بھی جا کر پڑھ آتی۔ کبھی چٹ پر کوئی بچی لکھ کر آ رہی ہے کہ امیرہ باجی سولہ، سترہ اور اٹھارہ نمبر کے سپارے پڑھ دیں تو کبھی پڑوس والی مریم بھابھی اوپر سے جھانک کر کہتی کہ امیرہ یہ فلاں فلاں سپارے پڑھ دو۔ نصرت مامی یہ سب دیکھتیں اور خوب ہی کوسنے سناتیں معظمہ کو...... جو عمر میں تو تین، چار ماہ بڑی ہی تھی اس سے، پر اب تک جسے قاعدہ بھی پڑھنا نہیں آتا تھا۔ شروع شروع میں تو امیرہ ہی کی ڈیوٹی لگی کہ اس کو باقاعدگی سے قرآن کا سبق دیا کرے لیکن باقاعدگی معظمہ بی بی میں نام کو نہ تھی، چار دن بھی آرام سے تنگ کر نہ پڑھ پائیں۔ تب اجمل ماموں نے بی بی جی کا پتا کروایا۔ کہنے کو دوسرا گاؤں تھا پر فاصلہ مشکل سے آدھا کوس تھا۔
اپنے گاؤں سے نکل کر وہ دونوں مرکزی سڑک پر آ گئیں۔ سڑک کے ایک جانب ان کا گاؤں اور روڈ کے ساتھ ساتھ چلتی راجباہ (ذیلی نہر) اور دوسری طرف گاؤں ملوانہ تھا پر آج امیرہ کی منزل کچھ اور تھی۔ اس نے گاؤں کے کچے راستے پر جاتی معظمہ کو ہاتھ لہرا کر خدا حافظ کہا اور سڑک کے کنارے کنارے چلتی جلد ہی ڈھکی موڑ یعنی ٹی (T) تک آ گئی۔ یہاں سے اس نے پہلے بایاں ہاتھ لیا اور چھوٹے روڈ پر آ گئی، پھر کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد اوپر ٹیلے پر چڑھنے لگی۔ سہ پہر چار بجے کے قریب یہاں دور دور تک کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ اوپر پہنچی تو گہری، کشادہ سی آر بی سی نہر اور اس کی پشت پر کھڑی اونچی پہاڑیوں کے دور تک پھیلے اس خوب صورت منظر میں کوئی اور بھی شدت سے اس کی آمد کا منتظر تھا۔ وہ اضطراری کیفیت میں چھوٹی چھوٹی کنکریاں نہر میں پھینک رہا تھا۔ امیرہ پہ نظر پڑی تو بے تابی سے بھاگ کر اس کے قریب آیا۔
"اکیلی آئی ہو......؟" وہ مسکرا کر اسے دیکھ رہا تھا، حیران بھی تھا۔ "اچھا آؤ' وہاں نہر کے ساتھ بیٹھتے ہیں۔" آس پاس پہ ایک تیز نگاہ ڈالتا وہ دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔
"معظمہ ادھر ملوانہ میں بی بی صیب کے پاس قرآن پڑھنے آتی ہے۔ میں بھی روز آتی ہوں اس کے ساتھ، ابھی اسے وہیں چھوڑا ہے۔"
"اچھا واہ، پھر تو یقینی روز مل سکتے ہیں۔" وہ نہر کنارے کی گھاس پر باقاعدہ چوکڑی مار کر بیٹھ گیا۔
"جی بالکل نہیں" امیرہ نے فوراً اس کا خیال رد کیا۔ "میں تو آج کے لیے بھی یہ سوچ کر ہلکان ہو رہی ہوں کہ اگر کسی نے دیکھ لیا تو۔"
"اللہ نہ کرے...... اچھی بات نکالتے ہیں منہ سے۔" اس نے بڑی نرم خوئی سے خفگی دکھائی۔ امیرہ نے حیران ہو کر اس کا چہرہ دیکھا جو اپنے برجستہ جملے کی وجہ سے اسے دادی کی یاد دلا گیا تھا۔
"میں ہوں ناں تمہارے ساتھ، چھوڑ دو ہر فکر۔" وہ اب پہلی بھرپور نظر اس کے چہرے پر ڈال کر اس کی پریشانی زائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"یا کہیں سارا ڈر اسی بات کا تو نہیں کہ "میں" ساتھ ہوں۔" اس کے شوخ جملے اس کی اندرونی خوشی کے غماز تھے۔ امیرہ بھی ہنس پڑی پھر سرنفی میں ہلا دیا۔
"ہوں۔" مزمل نے اپنے دونوں ہاتھ ایک دوسرے میں پھنسا کر فرصت سے اسے دیکھا۔ تیکھی ناک، کتابی چہرہ، چھوٹے چھوٹے گلابی ہونٹ، نفاست سے تراشی ہوئی خمیدہ بھنویں، چمکتی پیشانی پر بکھرے بھورے بال...... کتنی مرتبہ خیالوں میں اس کا پیکر تراشا تھا، ہزاروں مرتبہ ان نقوش کو جوڑ کر ایک شبیہ بنانے کی کوشش کی تھی...... پر کبھی کوئی نقش واضح ہو کر نہ ابھر سکا۔ سارے تصور دھندلے ہی رہے، سب ہی تصویریں نامکمل...... امیرہ نے شفاف شہد سی نگاہ اس کی طرف اٹھائی۔
"کیسا لگ رہا ہے امیرہ......؟"
"بس کوئی دیکھ نہ لے باقی تو......"
"اونہوں۔" مزمل نے رسان سے ٹوکا۔ "وہ سب نہیں چندا، برسوں بعد ہمارے ملنے کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔" اب کے اس نے سادگی سے وضاحت کی۔...... خوش تو ہو نا؟
"ہوں۔" وہ ہلکا سا مسکرائی۔ "بہت خوش ہوں۔"
"کیا سوچتی تھیں میرے بارے میں' دیکھنے میں کیسا ہوگا مزمل۔"
"زیادہ نہیں سوچا۔" وہ کچھ سوچ کر کھلکھلائی۔
"کیونکہ ایک بات تو طے تھی کہ سانولا سا ایک لڑکا ہے جسے آس پڑوس میں کہیں ڈھونڈنا ہے۔ مشکل ذرا آسان ہو جاتی تھی یہ سوچ کر۔" امیرہ پوری طرح شرارت پر آمادہ ہوئی۔ مارچ کی ٹھنڈی خوشگوار ہوا ہولے ہولے چل رہی تھی اور وہ بکھرے بالوں والے اپنے سانولے سلونے کو دیکھ کر دنیا کی ہر فکر بھولنے لگی تھی۔
"رعایت کیوں دے رہی ہو۔ صاف صاف کالا بھی کہہ سکتی ہو۔" وہ طنز نہیں کر رہا تھا' اپنے گہرے رنگ کا آپ ہی مذاق اڑا رہا تھا۔ "گوروں میں سے سانولا اور سانولوں میں سے کالا چھانٹی کرنے جاؤ تو تلاش آسان ہو جاتی ہے۔"
"ہاں۔" امیرہ نے مسکراہٹ چھپا کر تائید کی۔
"بات تو سچ ہے، پر یہ بھی تو سوچ "گوری" کہ کتنا اہم ہوگا وہ کالا جسے دنیا بھر کے سارے گورے سارے سانولے چھوڑ کر ڈھونڈا جاتا ہے۔ اور جب وہ مل جاتا ہے تو ہر دکھ' ہر غم بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔"
"واہ بھئی، ہماری گوری چٹی شہزادی تو پوری شاعری کرتی ہے۔"
"پر تمہیں شاید بالکل شاعری نہیں آتی۔" امیرہ نے بے ساختہ ہی میٹھا سا طنز کر ڈالا۔ کچھ تو وہ بھی بولتا اس کے بارے میں۔ دل ہی دل میں سوچا۔
"کسی کو "باتوں" پہ رکھنے میں بچت بڑی ہے۔" وہ دلآویزی سے مسکرایا۔ "پر میری امیرہ کی یہ شان نہیں...... آزمائش شرط ہے۔"
"اللہ نہ کرے کبھی کوئی آزمائش آئے۔" اسے جھرجھری آ گئی۔
"آزمائش تو شروع دن سے لکھی تھی نصیب میں، سامنا کرنے کا وقت شاید اب آیا ہے۔" اس نے سنجیدہ سا ہو کر سامنے پہاڑی پر نظریں جمائیں۔
"ایسا کیا ہے امیرہ میں، جو تم نے اتنا انتظار کیا مزمل؟" وہ اس کی دیوانگی پر خوش تھی تو حیران بھی کم نہ تھی۔ نو سالہ منگیتر کے بارے میں تندہی سے سوچتے ہوئے دس سال گزار دینا سراسر تعجب خیز تھا۔
"اور یہی بات میں تم سے پوچھوں تو......؟"
"میں۔" وہ لاجواب سی ہو کر اسے تکنے لگی۔
"میں تو......"
"چلو مجھ سے سنو۔" وہ خود ہی اسے رعایت دینے پر آمادہ ہو گیا۔
"منگنی میرے لیے زندگی کا بہت اہم' بہت سنجیدہ واقعہ تھا، اپنی عمر' اپنی سمجھ کے مطابق مجھے خوشی بھی تھی، فخر بھی تھا۔ تم سے منسوب ہونے اور تمہارے نام سے میرے اندر پیدا ہونے والی اپنائیت کے احساس نے اول روز سے مجھے بہت خوشی' بہت سکون

بخشا...... معلوم نہیں کیوں، پر ہواؤں میں اڑتا تھا یہ سوچ کر کہ اب میں منگنی شدہ ہوں۔ دل کبھی ایک دن بھی تمہاری یاد سے غافل نہیں ہوا۔ جب بھی رنگ پور گیا دن بھر میں کئی کئی چکر تمہارے محلے کے لگائے۔ تمہیں دیکھنا چاہتا تھا' تم سے ملنا چاہتا تھا۔ تمہیں کھوجنے تمہاری ایک جھلک دیکھ لینے میں بذات خود اتنی کشش تھی کہ تم سے دستبردار ہونے کا خیال بھی ایک بار بھی چھو کر نہیں گزرا۔"

"اور بعد کے حالات۔" دھڑ دھڑ کرتے دل پر قابو پاتے بالآخر وہ اس موضوع کی طرف آئی جو برسوں سے گلے کی پھانس تھی۔

"تمہارے سامنے ہیں امیرہ۔" بے ساختہ مزمل نے ایک سرد آہ کھینچی۔

"جن حالات نے آٹھ سال کی اونچی دیوار کھڑی کر دی ہمارے بیچ، وہ کم سنجیدہ تو نہیں تھے۔"

"ہاں کم سنجیدہ تو نہیں تھے۔" کچے کوٹھے میں بان کی چارپائی پر لیٹے، چھت کے آڑے ٹیڑھے شہتیر گنتے، وہ پوری رات امیرہ کی آنکھوں میں کٹنے والی تھی۔ کرب سے لب چباتے اس نے تھک کر کروٹ بدلی تو گرم گرم آنسوؤں کی لکیر سی بہہ کر تکیے میں جذب ہو گئی۔

اس کے اور مزمل کے حالات جو کہ ابا اور دادی کی بدولت کچھ ایسے بگڑے تھے کہ سدھار کے بارے میں کچھ بھی کہنا مشکل تھا...... اور حالات میں آنے والے اس بگاڑ کی وجہ تھی "نشاط پروین۔" مزمل کی سانولی اور پرکشش سی بہن، جس سے امیرہ زندگی میں صرف ایک ہی بار ملی تھی۔ منگنی کے دن نو سال کی بچی کے سر پر نہایت روکھے انداز میں ہاتھ رکھ کر پچاس کا نوٹ تھمانے والی' اس کے نصیب سے اسی قدر جڑی ہو گی امیرہ نے سوچا نہیں تھا۔

نشاط، مزمل کی بڑی بہن تھی۔ تیرہ سالہ مزمل کی منگنی کے وقت نہ صرف وہ شادی شدہ تھی بلکہ امیرہ کی عمر کی اس کی ایک بیٹی بھی تھی۔ منگنی کے بعد امیرہ کی اپنی ہونے والی ساس اور نندوں سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ لوگ رنگ پور میں رہتے تھے اور مزمل کے والدین ڈھکی میں، لیکن میل جول نہ ہونے کی اصل وجہ یہ نہیں تھی۔ دادی نے امیرہ کو تب ہی بتا دیا تھا کہ اس کا رشتہ خالصتاً مزمل کے ابا اور اس کے ابا کے ایماء پر ہوا ہے۔ مزمل کی ماں اور بہنوں نے مارے باندھے ہی اس رشتے کو قبول کیا تھا۔

مزمل کے ابا اور اس کے ابا آپس میں ملویر، پھوپھیر تھے (ماموں زاد، پھپھوزاد) اور آپس میں گہرے دوست بھی۔ امیرہ کے ابا عنایت حسین کی رنگ پور میں کھجوروں کی دکان تھی اور یہ کھجوریں وہ ڈھکی سے خرید کر لایا کرتا تھا۔ مزمل کے ابا سے وہیں ڈھکی میں ملاقات ہوتی تھی۔ آنے والے دو سالوں میں حالات کچھ یوں آگے بڑھے کہ اس گھر کی عورتوں میں سے تو کبھی امیرہ کے ہاں کوئی نہیں آیا پر مزمل کے ابا غلام عباس کبھی کبھار رنگ پور ان کے ہاں آ جایا کرتے تھے، دو، تین مرتبہ مزمل بھی ان کے ساتھ تھا۔ مزمل نے اس سے بات تو کبھی نہیں کی البتہ چپکے چپکے دیکھ ضرور لیا کرتا تھا۔ امیرہ نے آخری مرتبہ جب مزمل کو دیکھا وہ خود گیارہ سال کی تھی اور مزمل پندرہ سال کا تھا۔

یہی سال تھا جب نشاط کی زندگی ایک بہت بڑے طوفان سے دوچار ہوئی۔ اس کے جواں سال شوہر کو کسی نے کاروباری دشمنی میں جان سے مار ڈالا۔ جوان اور خوب صورت نشاط بیوہ ہو کر تین بچوں سمیت اپنے والدین کے گھر آ گئی۔ ان سب کے لیے یقیناً بہت ہی دکھ کی گھڑی تھی...... امیرہ کی دادی اور ابا نے بھی غم کے اس موقع پر ان سب کا برابر کا ساتھ دیا۔ بہر حال وقت تو ہوتا ہی آ کر گزر جانے کے لیے ہے، نشاط بھی قسمت کے لکھے کو قبول کر کے بہر حال صبر کر گئی مگر زندگی میں آنے والی ایک رات نے اس کے صبر کی لاج نہ رکھی ابراہیم، نشاط کے مرحوم شوہر ناصر کا جگری یار تھا۔ دونوں گھرانوں کا آپس میں پرانا میل جول تھا۔ ناصر کے قتل کے بعد

ابراہیم اور اس کی بیوی فرخندہ نے نشاط سے ملنا جلنا نہ صرف قائم رکھا بلکہ اس میں قدرے زیادتی بھی آئی۔ غالباً مطمح نظر یہی رہا ہو گا کہ مرحوم دوست کی بیوہ اور اس کے بچوں کی خبر گیری فرض اور ثواب سمجھ کر کرتے رہنا چاہیے۔

فرخندہ کا نواں مہینہ چل رہا تھا۔ اس رات ہلکا ہلکا درد قدرے تیز ہوا تو دونوں میاں بیوی کو لگا کہ وقت پورا ہو گیا ہے۔ ابراہیم دائی کو بلانے دوڑا لیکن اس کے گھر پر تالا پڑا تھا۔ وہ فوراً مزمل کے ابا کے گھر پہنچا۔ صورت حال سن کر نشاط ساتھ چلنے کو تیار ہو گئی۔ کسی کو بھی خیال نہیں آیا کہ کلثوم چاچی یا اور کوئی نہیں تو مزمل کو ہی ساتھ بھیج دیا جاتا لیکن بہر حال اس بات کا ہوش آنے تک معاملہ ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ دونوں فرخندہ کے پاس آئے تو وہ پھر سے نارمل حالت میں بیٹھی تھی۔ نشاط نے بھی کیفیت اور علامتیں دیکھ کر اندازہ لگایا کہ ابھی وقت نہیں ہے۔ وہ بس کچھ دیر اس کے پاس بیٹھی رہی پھر واپسی کا ارادہ کیا۔ آدھی رات سے کچھ اوپر کا عمل تھا جب گاؤں کی سنسان، ویران راہوں سے گزرتے ابراہیم اور نشاط کو کھجوروں کے باغ کی رکھوالی کرتے فضل داد اور اس کے دو ساتھیوں نے دیکھ لیا۔

اور پھر مفروضوں کی بنیاد پر جو کہانی ان تینوں نے تیار کی' اس کا لب لباب ہرگز نشاط اور ابراہیم کے حق میں اچھا نہ تھا۔ صبح کی نماز کے بعد ایک عام سا منظر پورے ایک قصے کی صورت لوگوں کی زبان پر تھا۔ مزید قسمت کی ستم ظریفی یہ ہوئی کہ امیرہ کے ابا عنایت حسین اس رات ڈھکی میں اپنے ایک اور عزیز کے ہاں مقیم تھے۔ نمازیوں میں سے کئی ایک نے جب غیرت اور جوش میں آ کر ایک گروہ ترتیب دیا جو گاؤں میں پھیلنے اور بڑھنے والی کھلم کھلا فحاشی کے خلاف اچانک متحد اور مستعد ہو گیا تھا تو اس گروہ کا ایک فرد عنایت حسین بھی تھا۔

صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ہی اس گروہ نے غلام عباس کے گھر پر دھاوا بول دیا۔ ابراہیم کو بھی پکڑ کر کٹہرے میں لایا گیا۔ سولہ سالہ مزمل کے غم و غصے کا یہ حال تھا کہ سیدھے جا کر اس نے بہن کی گردن پکڑی۔ بعید نہیں تھا کہ جان سے مار دیتا...... پر نشاط نے فوراً ہی قرآن پاک سر پہ رکھ کر اپنی سچائی کی گواہی دی اور مزمل کا سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ فیصلہ کرنا سہل ہو گیا۔ بہن کی حمایت میں اب وہ پوری برادری کے خلاف چٹان کی طرح ڈٹ کر کھڑا ہو سکتا تھا۔

غلام رسول البتہ بہت کمزور دل واقع ہوا، برادری کے اس دلیرانہ اقدام نے اس کے حوصلے کچھ ایسے پست کر دیے کہ محض ایک ہفتہ ہی وہ غریب اسے سہہ پایا اور آٹھویں رات چپکے سے دل میں درد اٹھا اور وہ دنیا کے دکھوں سے ہمیشہ کے لیے آزاد ہو گیا۔ برادری کے چند ایک گھرانے تو شرمندگی لیے واپس بھی لوٹ آئے، پر بہت سوں نے ہٹ دھرمی ترک نہ کی، ان میں ایک عنایت حسین بھی تھا۔ حالانکہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ اس کی ہٹ دھرمی نہیں بلکہ حد سے بڑھا ہوا پچھتاوا تھا جس نے اسے دوست کی بے جان مری ہوئی آنکھوں سے آنکھیں چار کرنے کے قابل بھی نہ چھوڑا۔

جس رات عنایت حسین دل میں یہ ارادہ کر کے سویا کہ صبح سویرے وہ ڈھکی جا کر غلام رسول سے معافی مانگے گا اسی رات وہ دل کا دورہ پڑنے سے اللہ کو پیارا ہو گیا...... ادھر اپنی بدنصیبی پر ہکا بکا عنایت حسین خود کو جنازے میں شرکت کے قابل بھی نہ بنا سکا۔ آپس کا میل جول گویا ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ پر نہ ختم ہو سکا تو مزمل اور امیرہ کا رشتہ جسے بڑے چاؤ سے دو دوستوں نے طے کیا تھا۔ اب معلوم نہیں کہ اس رشتے کو توڑنے کی کبھی نوبت نہ آ سکی یا ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی۔

پھر بہت سال بعد جب امیرہ حالات و واقعات کو سمجھنے کے قابل ہوئی تو اپنے ابا کی کم فہمی اور سستی پر شدت سے افسوس کرتی۔ بھلے چاچا غلام رسول مر گئے تھے پر پیچھے ان کا جوان بیٹا اور بیوی تو تھے جن کے پاس

جا کر وہ اپنے رویے کی معافی مانگ سکتے تھے۔ دوست کی موت پر افسوس کر سکتے تھے۔ لیکن بہرحال اب یہ سب سوچنے کا کیا فائدہ تھا کہ اب تو اس کا ابا بھی دنیا میں نہیں رہا تھا۔ دادی سے بھی اس نے بارہا کہا کہ کم از کم وہ چلی جائیں معافی تلافی کرنے، پر وہ آہ بھر کر کہتیں۔

''اب بہت دیر ہو گئی ہے۔''

''تو میرا کیا ہو گا دادی۔'' امیرہ کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ ''ایک طرف تو کہتی ہو بھری دنیا میں مزمل تمہارا واحد سہارا ہے، دوسری طرف سارے کام خود خراب کیے بیٹھی ہو۔''

''اللہ خیر کریسی (اللہ بہتر کرے گا)'' وہ دھیمے سے کہہ کر کسی گہری سوچ میں غرق ہو جاتیں اور امیرہ کے تصور میں اس سانولے کی خود پر جمی گہری سیاہ آنکھیں در آتیں جنہیں خیالوں میں تو وہ ہمیشہ ہی اپنے اوپر مرکوز پاتی پر حقیقت میں جو اس سے بہت دور ہو گئی تھیں صرف اس کے ابا کی ایک غلطی کی بدولت۔

اور آج......

ماتھے پر بازو رکھ کر سیدھی لیٹی امیرہ نے اپنی بھیگی غلافی آنکھیں روشن دان سے آتی صبح کی ہلکی روشنی پر جمائیں۔

''آج ایسے موقع پر مزمل دوبارہ اس کی زندگی میں شامل ہوا تھا جب نہ ابا رہا تھا نہ دادی۔ جانے حالات کون سا رخ اختیار کرنے والے تھے۔ اس سانولے سجن کی گہری سیاہ آنکھوں میں تو آج بھی بہت اپنائیت تھی۔ دونوں کے دلوں میں آج بھی وہی محبت تھی۔

''محبت ... جوندی کے پانی جیسی تھی اور وہ دونوں اسی ندی کے الگ الگ کناروں کے دو پھول تھے جو ان ہی لہروں کی سیرابی سے کھلے تھے...... پر جن کا مقدر، شاخ سے ٹوٹنے کے بعد لکھا ہوتا ہے، کبھی اپنے آپ ٹوٹ کر پانی میں جا گریں تو لہروں کے سینے پر بہتے بہتے کہیں ایک ہو جائیں۔ ورنہ کوئی توڑ کے کسی ایک لڑی میں پرو دے تو تب...... پر ٹوٹنا تو مقدر ہے۔

مزمل سے ان تمام حالات پر امیرہ کی تفصیلی بات ہوئی تھی۔ حالانکہ وہ دانستہ اس موضوع سے کترا رہی تھی۔ میلہ بلوٹ والی پہلی ملاقات کے بعد تو ویسے بھی وہ خوب ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ مزمل کی اپنے لیے دیوانگی دیکھ کر لگا تھا کوئی مسئلہ، مسئلہ ہی نہیں رہا' سارے دکھ درد اڑن چھو ہو گئے ہیں پر حقیقت قدرے تلخ تھی جس کا احساس دوسری ملاقات میں ہو پایا۔

مزمل کے شکوے جوں کے توں تھے۔ باوجود اس کے ابا اور دادی کی وفات کے اس کا گھرانہ ان سب سے اول روز کی طرح خائف تھا۔ امیرہ کو خصوصی رعایت دینے کی وجہ البتہ یہی تھی کہ اس کا ان معاملات سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ اس کی معصومیت اور کم عمری اسے بے قصور ثابت کرنے کے لیے کافی تھی اور مزمل کی اس کے لیے محبت اس رعایت کے علاوہ تھی۔ لیکن ساری رعایتیں' ساری مہربانیاں صرف مزمل کی طرف سے تھیں۔

اس دوسری ملاقات نے یہ بھی واضح کر دیا کہ کلثوم چاچی اور نشاط وغیرہ ایسا کوئی نرم گوشہ نہیں محسوس نہیں کرتیں۔ امیرہ اور مزمل کے دل کی تسلی کے لیے البتہ چھوٹی سی امید کی کرن اس پورے معاملے میں ایک ہی تھی اور وہ یہ کہ امیرہ اب اپنی ننھیال میں تھی۔

نانی برکت اور ماموں اجمل کے پاس، جن کا نشاط والے قصے میں کبھی کوئی منفی کردار نہیں رہا تھا۔ دونوں گھرانوں کے آپس میں اچھے تعلقات تھے، ایک بس نانی اور کلثوم چاچی کو چھوڑ کر...... جن کے کچھ الگ ہی جھیڑے (جھگڑے) تھے مشکل تھا کہ ان کی کبھی آپس میں بن پاتی۔ امیرہ تو بنا کسی سے پوچھے ہی ان جھیڑوں کی نوعیت سمجھ سکتی تھی۔ اس کی نانی تو تھیں ہی تنک چڑھی، بدمزاج بلکہ بدزبان خاتون' ہونے والی ساس بھی دوبدو لڑنے میں ہرگز کسی سے کم نہ تھیں امیرہ کو دادی کی کہی کب کی ایک

بات یاد آ گئی۔ ایک روز بڑی تشویش سے کہنے لگیں۔

''دعا کر مزمل اپنی ماں پر نہ گیا ہو۔ کیسے گزارا کرے گی اس جھڑکل (جھگڑالو) عورت سے۔

''ہائے اللہ کرے یہ اپنی ماں پہ نہ گیا ہو۔'' اسے سچ مچ جھرجھری آ گئی۔

''جاگ جا امیرہ...... صبح ہو گئی۔'' نانی نے بنا آنکھیں کھولے ہی اس کا کندھا ہلایا۔ تو وہ ان کی بے خبری پر مسکرا دی۔ جاگنے کے لیے پہلے سونا ضروری ہے اور اسے ساری رات نیند ہی کہاں آئی تھی۔

☆☆☆

''راستہ تو معلوم ہے نا نانی؟'' پتا نہیں کن راستوں پر چلتی جا رہی تھیں۔ گاؤں کی گلیاں تو کب کی ختم بھی ہو گئی تھیں۔ اب تو سامنے کھلے کھیت اور ایک ہی کچا راستہ تھا۔ اگلی آبادی کھیتوں کے پار کافی دور دکھائی دے رہی تھی۔ امیرہ نے معظمہ کی طرف دیکھ کر سوالیہ انداز میں ابرو اٹھائے۔ عفیرہ کو کمر پر اٹھائے وہ بے چاری بھی پسینہ پسینہ ہو رہی تھی۔ لاعلمی سے کندھے اچکا کر وہ بھی بس تقلید کیے جا رہی تھی۔

فیاض اور شمع کی چار سالہ عفیرہ ہفتے بھر سے سست اور نڈھال پڑی تھی۔ بھوک بالکل ختم ہو گئی تھی اور اب تو آنکھیں بھی پیلی ہلدی ہونے لگی تھیں۔ پڑوس والی میراں ماسی نے سب سے پہلے یرقان کا خدشہ ظاہر کیا اور دم رکھنے والی خیراں بی بی کے بارے میں بھی اسی نے بتایا۔ نانی بھی خیراں ماسی کو اچھی طرح جانتی تھی۔ فوراً برقع سر پہ جما کر امیرہ اور معظمہ کو بھی ساتھ لگایا تا کہ عفیرہ کو دونوں باری باری اٹھا سکیں۔ شمع کا اپنا تو ساتواں مہینہ چل رہا تھا، وہ اتنی دور چل کر جانے کی حالت میں نہیں تھی۔

''تھوڑا سا اور چلنا ہے بھیڑی چھوریاں (بڑی لڑکیاں)''

''استغفار۔'' امیرہ نے تاسف سے سر ہلایا۔ نانی کو مخاطب کرنے کا مطلب گالیوں کی پٹاری کھلوانا تھا۔ دائیں بائیں کے کھیتوں کے درمیان وہ کافی چوڑی کچی سڑک تھی۔ ذرا آگے کھیت میں اتر کر ایک ٹریکٹر کھڑا تھا۔ دو مرد اس میں بھاری بھرکم ریپئر فٹ کر رہے تھے۔ تیسرا ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا کسی کسی وقت اسے آن کر رہا تھا۔ اوپر بیٹھے آدمی کی ان کی طرف پیٹھ تھی۔ امیرہ نے یہ سارا منظر بے دھیانی سے دیکھ کر توجہ ہٹائی پر معظمہ نے اچانک ہی بڑے زور سے اسے کہنی ماری۔ امیرہ نے بازو سہلاتے ہوئے خاصی بدمزاجی سے اسے گھورا جو ابرو کے اشارے سے بار بار ٹریکٹر کی طرف دھیان دلا رہی تھی۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے امیرہ نے دوبارہ ادھر دیکھا۔

ٹریکٹر پر بیٹھا وہ تیسرا آدمی کوئی اور نہیں اس کا اپنا مزمل تھا۔ اب وہ بھی نہ صرف اسے دیکھ چکا تھا بلکہ کام سے اس کی توجہ مکمل طور پر ہٹ چکی تھی۔ اس کی نانی کی وجہ سے مزمل نے بڑی مشکل سے اپنی مسکراہٹ دبائی تھی پر شوخ نگاہیں اس پر جمانے سے خود کو باز نہیں رکھ پا رہا تھا۔ امیرہ نے البتہ ہنسی چھپانے کی زحمت بھی نہیں کی کہ وہ تو پہلے ہی نانی کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ فرصت سے اسے دیکھتے چلے جانا، کتنا خوب صورت کام تھا۔ مزمل البتہ اس کی نانی کے خیال سے قدرے گھبرایا گھبرایا سا کبھی تو نظر ہٹا لیتا، پھر اگلے ہی پل دل سے مجبور ہو کر دوبارہ اسے دیکھنے لگ جاتا۔

ہلکے سرمئی ملگجے سے کپڑے پسینے میں بھیگ کر جسم سے چپک گئے تھے۔ آستینیں اس نے اوپر تک چڑھا رکھی تھیں۔ سانولے بازو پسینے میں یوں تر تھے جیسے ابھی پانی میں ڈبو کر نکالے ہوں۔ اس کا تو اپریل میں یہ حال تھا۔ اف یہ کھیتوں کی محنت۔ وہ بڑی قدر دانی اور محبت سے اسے دیکھتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ تو یہ ہیں مزمل کے کھیت......؟

''ہونہہ...... فقیر مویا۔'' نانی آگے بڑھتے ہی شروع ہو گئی۔ ''ساری زندگی قرض چکاتے رہیں گے شودے پی سیتے (بے چارے بدنصیب)''

''کیا بڑبڑا رہی ہو نانی ...... اب کسے گالیاں دے رہی ہو۔'' اس نے انجان بننے کی ایکٹنگ کی۔

”تُو نے دیکھا تو نہیں ادھر...... مزمل تھا وہ۔“ نانی اب مڑ کر تفتیش کر رہی تھی۔

”ہوگا...... مجھے کیا پتا...... پر تم گالیاں کیوں دے رہی ہو۔“ وہ نانی کے ہم قدم ہوئی۔

”گالیاں کہاں دے رہی ہوں، سچ ہی تو بتا رہی ہوں...... لوگوں کا قرض چکاتے زندگی گزر جائے گی ان کی...... اپنی زمین تو بنجر ویران پڑی ہے، ملک یار کی زمین پر کام کر کے قرض چکا رہا ہے۔

اینڈے ہتھ اچ مٹی کٹّے آسی (اس کے ہاتھ میں خاک کچھ آئے گا) ہمیشہ مانگتے رہیں شالا (اللہ کرے) ہونہہ۔“

”توبہ ہے نانی...... کیوں بھر بھر کے بددعائیں دے رہی ہو۔“ امیرہ کے ننھے سے دل پر شدید چوٹ پڑی، مزمل کے حالات سن کر۔

☆☆☆

”پہلا دم کر دیتی ہوں۔ بچی کو ٹھنڈے شربت اور تازے پھل کھلاؤ، بار بار نہلاؤ اسے اور یہ رتے پیلے کپڑے فوراً جا کر بدلو، صرف ہلکے رنگوں کے اور سفید کپڑے پہناؤ۔“ ماسی خیراں دم کر کے اپنا علم و فضل بھی خوب جھاڑ رہی تھی۔ کام تو مشکل سے پندرہ منٹ میں ختم ہو گیا پر یہ نانی کی باتیں...... اگلے پچھلے حال احوال جو کھول کر بیٹھیں، ایک بار تو ماسی خیراں کو بھی چکر آ گیا۔

امیرہ کی الگ ”پیچھے“ میں جان اٹکی تھی۔ معظمہ کو اشارہ کیا تو وہ جو پہلے ہی تنگ آئی بیٹھی تھی جھٹ چپکے سے اس نے عفیرہ کو چٹکی کاٹی۔ اس نے اچانک گلا پھاڑا تو نانی —— حواس باختہ ہوئیں۔ فوراً برقع چپلیں سنبھال کر اٹھ کھڑی ہوئیں، بیمار پڑپوتی بلاوجہ کیوں چیخی، الٰہی خیر...... امیرہ نے ہنسی چھپانے کے لیے منہ پھیر لیا۔ معظمہ کا شارٹ کٹ تو کافی کارآمد ثابت ہوا تھا۔

واپسی کا سفر شروع ہوا اور دل کی پکڑ دھکڑ عجیب طوفان مچانے لگی۔ اتنی دیر لگا دی تھی۔ نانی نے اب اللہ جانے مزمل وہاں تھا بھی یا نہیں...... وہ جان بوجھ کر نانی کے پیچھے چل رہی تھی۔ ملک یار کے کھیت نظر آنے لگ گئے تھے لیکن اب وہاں نہ ٹریکٹر تھا نہ آدمی...... پر ہاں شش شاید امیرہ کے خشک گلے میں کچھ پھنسنے لگا۔

لہلہاتی گندم کے پیچھے پگڈنڈی پر ملگجے سرمئی کپڑوں کی جھلک...... انہیں قریب آتے دیکھ کر اس نے بیلچا اٹھا کر خشک نالے میں کھدائی شروع کر دی تھی۔ بڑا چالاک ہے امیرہ ہنستے ہوئے اس کی عقل کو داد دینے لگی۔ نانی پھر ہنکارے بھرتی آگے بڑھ گئیں۔ امیرہ تو مسلسل دیکھ ہی اسے رہی تھی۔ بیلچا رکھ کر اب وہ اشارے سے کوئی بات سمجھا رہا تھا۔ جانے کیا کہہ رہا تھا' وہ ہاتھ ہلا کر استفسار کرنے لگی تب اس نے انگلیوں سے چار کا اشارہ کیا تو بات امیرہ کی سمجھ میں آ گئی۔ اس سے پہلے یقیناً وہ اوپر چڑھائی اور بڑی نہر کا اشارہ کر رہا تھا۔ مطمئن انداز میں ہاتھ ہلا کر اس نے مزمل کو تسلی دی کہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی ہے۔ تین ہفتے پہلے ہونے والی ملاقات میں آئندہ کے لیے کچھ بھی طے کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی، دور سے آتی کچھ عورتوں کو دیکھ کر مزمل نے فوراً اسے وہاں سے چلے جانے کو کہہ دیا تھا۔

☆☆☆

”مجھے بھی نشانی چاہیے امیرہ...... خود تو رومال لے کر بھاگ گئیں اس دن ہوں؟“ وہ اس کے سامنے کھڑا پھر اس کا دل لوٹ رہا تھا۔

پچھلی ملاقات والی سنجیدگی کی تو جھلک بھی نظر نہیں آتی تھی۔ پچھلے روز کے اچانک سامنے نے شوقِ ملاقات اور بھی بڑھا دیا تھا۔ دونوں آج بھی سابقہ جگہ پر بیٹھے تھے' امیرہ البتہ پہلے کی نسبت آج زیادہ گھبرائی ہوئی تھی۔ مزمل کی دیوانگی اسے مجبور تو کر دیتی تھی پر وہ ایسی سرِراہ کی ملاقاتوں میں ہرگز سکون محسوس نہیں کرتی تھی۔ دادی کی تربیت، ان کی، تمیں، نصیحتیں یاد آتیں تو صاف لگتا کہ قدم گمراہی کی جانب بڑھ رہے ہیں لیکن دوسری طرف مزمل تھا۔ اس کی

بچپن کی محبت، پہلی اور بلاشبہ آخری بھی...... اس کا واحد سہارا' منزل، مستقبل۔

”چپ کیوں ہو امیرہ......“ وہ اچانک بے کل سا ہو گیا۔ دودھ میں بھیگی چاندنی سا چمکتا چہرہ آج کیسا اترا اترا الگ رہا تھا۔ ”کیا بات ہے مجھ سے کوئی خطا ہو گئی کیا، کیوں اتنی پریشان ہو؟“

”یہ سب ٹھیک نہیں ہے مزمل۔“ اس نے پلکیں اٹھائیں تو گرم گرم آنسو گال پہ پھسل آیا۔ مزمل اس کی بھیگی آنکھیں دیکھ کر اور بھی بے چین ہو گیا۔

”رو کیوں رہی ہو امیرہ...... بتاؤ ناں، کیا ٹھیک نہیں ہے؟“ وہ ذرا کی ذرا آس پاس بھی دیکھ لیتا۔

”یہی مزمل۔“ اس نے بھی اردگرد کی طرف اشارہ کیا۔ ”ہم بدنام ہو جائیں گے، مجھے اس طرح راستوں میں نہیں ملنا...... تم چاچی کو ہمارے گھر بھیجو ناں...... ورنہ یوں تو یوں تو......“ وہ سسک کر رو پڑی۔ مزمل نے دھیرے سے اس کے ہاتھ پر تھپکی دی۔

”میں سمجھ رہا ہوں۔ امیرہ!“ وہ لب چباتے ہوئے خاصا بے بس دکھائی دے رہا تھا۔

”ایسا میں بھی کب چاہتا ہوں، آتے جاتے راستوں میں ملنا ہمیں ہرگز زیب نہیں دیتا پر میں کیا کروں؟“

”اپنی اماں کو مناؤ ناں...... کیا تم نہیں چاہتے میں تمہارے گھر آؤں۔ ہمیشہ کے لیے۔“ وہ کسی آس پر اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ ”میں تھک چکی ہوں مزمل...... مجھے ٹھکانہ چاہیے...... تمہارا نام چاہیے' ایک گھر چاہیے' میرا اپنا گھر، صرف تمہارے ساتھ۔“ نم لہجے میں اپنی مجبوریاں اسے بتاتے ہوئے وہ ہرگز خود کو چھوٹا محسوس نہیں کر رہی تھی۔ جانے کیوں' پر ایک مان سا تھا اس رشتے پر جس میں برسوں پہلے ان کے بڑوں نے انہیں باندھا تھا۔ اس رشتے کی بدولت اپنا نصیب بننے والے مزمل سے یہی باتیں اس نے برسوں خوابوں اور خیالوں میں کہی تھیں۔ اسے یقین تھا کہ ایک وہی ہے جو کوئی راہ نکال سکتا ہے۔ ایک وہی ہے جو اس کی ہر مجبوری سمجھ سکتا ہے۔

”میں کچھ کروں گا امیرہ...... ضرور کروں گا۔ بس تم دوبارہ روؤ گی نہیں اور اب جاؤ تم' میں اپنی وجہ سے تمہاری پریشانیاں کبھی نہیں بڑھاؤں گا۔“ وہ پیچھے کو ہٹنے لگا۔

”اور ہاں...... تمہیں بھی اپنی نانی کو سمجھانا ہو گا۔ رشتہ خالص نیت سے کرنا ہے تو سارے جھگڑے، سارے اختلافات بھلا کر انہیں بھی آگے بڑھنا ہو گا۔ میں صرف اپنی طرف کی ذمہ داری اٹھا سکتا ہوں امیرہ۔ تمہارے گھر والوں کو سمجھانے کا کام خود تمہیں کرنا ہے۔“ وہ حیران کن حد تک سنجیدہ ہو رہا تھا۔ اب معلوم نہیں سنجیدہ تھا یا خفا...... امیرہ بھی اسے سمجھ نہیں پاتی تھی۔

پوروں پر اس کے آنسو چنتے وہ اچانک سارا بار اس کے کندھوں پر ڈال دیتا تھا۔ وہ کتنے غرور سے اسے سارے مرحلوں، ساری کٹھنائیوں کو پار کرنے کا کہہ رہی تھی۔ صرف یہ سوچ کر کہ اس کی محبت میں ہر رکاوٹ، ہر دیوار وہ خوشی خوشی پھلانگ جائے گا لیکن وہ سمجھا رہا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

”نشانی۔“ اگلی بار پہ ادھار رہی امیرہ...... آخر میں مسکرا کر یاد دلاتے وہ سیلوٹ کے انداز میں خدا حافظ کہتا وہ واپسی کے لیے مڑ گیا۔ اور وہ بھی تھکے تھکے قدموں سے نیچے اترنے لگی۔

”سب ہی کچھ مجھے کرنا ہے مزمل، تو تم پر میرا غرور کیا ہوا؟ کب آؤ گے ایسے روپ میں سامنے کہ لگے ”تم“ نہ ہوتے تو صرف ڈوبنا مقدر ہو جاتا۔

☆☆☆

”پہلے چائے پی لے مزمل...... یہ کام بہت ضروری ہے کیا......؟“ کلثوم تو اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے بھی دیکھ نہیں پاتی تھی۔ محنت کے کام میں جتا دیکھ کر تو اس کا دل ہی ہولنے لگتا تھا۔

”ضروری ہے اماں...... یہ ساری چارپائیاں ہی ٹھیک ہونے والی ہیں۔ دیکھتی نہیں، بیٹھتے ساتھ

ہی بندہ کھوہ میں جا لگتا ہے۔" وہ اپنا ایک پیر چارپائی کے پائے پر جمائے دونوں ہاتھوں سے بائینتی کی رسی کھینچ کر بان کو سخت کر رہا تھا...... اپریل آتے ہی موسم میں یک لخت تبدیلی آئی تھی...... چند دن تو ڈھیٹوں کی طرح اندر سوتے رہے، پھر گھٹن محسوس ہونے لگی تو باہر نکلنا ہی پڑا اور اب اپریل کا وسط آتے آتے موسم کافی ملا جلا سا ہو گیا۔ کچے صحن میں بینا نے چھڑکاؤ کیا اور مزمل نے چارپائیاں باہر نکال کر ڈنڈے والا پنکھا بھی ہلکے سروں میں اسٹارٹ کر دیا۔

"اماں تم کسی کمیٹی کی بات کر رہی تھیں۔" ہاتھ سے دبا کر مزمل نے بان کی سختی چیک کی پھر بینا سے کپ لے کر آرام سے اسی چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"ہاں کمیٹی تو رشیدہ بھابی ہی ڈالتی ہے۔ وہی رجب کی اماں۔" کلثوم اپنا چائے کا کپ لے کر چولہے سے اٹھ آئی۔ "پر کہہ رہی تھی اس مرتبہ قرعے والی نہیں ہے۔"

"قرعے والی نہیں ہے تو سنبھالے گی کیسے......؟"

مزمل کو اچنبھا ہوا۔ بنا قرعے کے تو یہاں صرف جھگڑے ہی چلتے رہنے تھے۔

"کہہ رہی تھی پہلے ہی سب کو نمبر دے دے گی۔"

"تو آخری نمبروں کے لیے تیار کون ہوگا۔ مجھے تو اپنی موٹر سائیکل لینی ہے۔ وہ بھی جلدی' تم پتا نہیں کیا سوچے بیٹھی ہو۔" مزمل نے صاف صاف مدعا بیان کیا۔

"تیری شادی کا سوچے بیٹھی تھی میں تو۔" کلثوم نے مسکرا کر اس کے ماتھے پر آئے بال درست کیے...... مزمل نے ٹھٹھک کر ماں کو دیکھا۔

"شادی......؟ پر ابھی تو ملک یار کی تین ماہ والی آخری فصل رہتی ہے نا...... اس کے بعد مجھے اپنی زمین سنبھالنی ہے۔"

"ارے ہو جائے گی وہ بھی...... تین ماہ والی فصل تو چٹکیوں میں نمٹ جاتی ہے۔ اب دیکھو ناں، نذیراں خود بات ڈال گئی ہے۔" کلثوم نے قدرے محتاط آغاز لیا پھر بھی مزمل کی پیشانی پہ فوراً بل پڑے۔

"کیا مطلب......؟"

"لبنیٰ کی بات کر رہی ہوں۔ کیسی معصوم اور پیاری ہے۔ پھر پہل بھی تو خود کر رہے ہیں۔ اتنی چاہ ہے۔"

"کوئی بھی پہل کرے تم پگھل جاؤ گی...... یہ بھی بھول جاؤ گی کہ میرا پہلے سے رشتہ طے ہے...... شیر و شکر ہو کر خود ہی بڑھاوا دیتی ہو اگلوں کو سر پر سوار ہونے کا، پھر کہتی ہو پہل انہوں نے کی۔" سخت بدمزہ ہو کر مزمل نے چائے بھی چھوڑ دی۔

"پورے چھ تولے سونا چڑھائے گی بیٹی کو۔" کلثوم نے ہمت نہیں ہاری۔

"بیٹی کو چڑھائے گی ناں۔" وہ غصے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"پھر اپنا زیور وہ آتے جاتے پہنے گی بھی خود اور صندوقوں' الماریوں میں تم سے چھپا کر تالے میں بھی رکھے گی...... پھر رال ٹپکانے کا فائدہ۔"

"یہ لو...... ایسے بھی کوئی سوچتا ہے۔" کلثوم نے تعجب سے انگلی ناک پہ دھری۔

"بس اماں......" اس نے ہاتھ اٹھایا۔ "میری شادی وہیں ہوگی جہاں ابا نے طے کی تھی۔ چھ ماہ سے امیرہ یہاں ڈھکی میں ہے۔ ایک بار بھی تمہیں وہاں جانے کا خیال نہیں آیا۔ آپس کی لڑائیاں تم جانو یا برکت ماسی...... امیرہ اور میرا ان سے کچھ لینا دینا نہیں۔ پہل بھی تمہیں ہی کرنی ہوگی۔"

"نہ مزمل۔" کلثوم بھی ایک دم برے ہوئی...... "اوکل دی چھیر (وہ کل کی لڑکی) میں کیوں پہل کروں......؟"

"ہونے والی بہو بھی ہے۔ جانا تو پڑے گا۔"

مزمل نے دو ٹوک انداز اپنایا تو کلثوم کو اور پتنگے لگے۔

"ناں تو میرے اور برکت ماسی کے جھگڑے تو خوب یاد دلا رہا ہے مجھے...... اور جو کچھ اس کے باپ اور دادی نے کیا ہمارے ساتھ وہ تو بھول گیا۔"

"ہاں...... بھول گیا۔" وہ جاتے جاتے پہلے رکا پھر مڑ کر حتمی انداز میں ماں کی آنکھوں میں دیکھا۔ "...... بھول گیا اماں! کیونکہ وہ دونوں اب اس دنیا میں نہیں رہے اور امیرہ چھوٹی سی بچی تھی اس وقت۔"

"ایسی ہی بھولی بچی ہے تیری امیرہ تو چھ ماہ سے اسے کیوں توفیق نہیں ہوئی ادھر آنے کی...... رشتے میں چاچی لگتی ہوں، بڑی ہوں، وہی آ جاتی ملنے۔ دیکھ مزمل!" اب کے کلثوم نے انگلی اٹھا کر تنبیہ کی۔ "پہل تو ماسی برکت کو کرنی پڑے گی۔ وہ یہاں آئے گی تو سوچوں گی۔ ورنہ تم بھی بھول جاؤ۔" اور اس بار مزمل بھی بنا کچھ کہے باہر نکل گیا۔ جانتا تھا آخر میں یہی سننا پڑے گا کیونکہ بہرحال کچھ معاملوں میں وہ بھی بے بس تھا۔

"ہونہہ...... امیرہ کو بیاہ کر لاتی ہے میری جوتی۔ اوتری نکھتری (ایک اکیلی) پتا نہیں کیا گل کھلا کر آئی ہوگی ادھر رنگ پور میں۔"

"تو کیا کرے گی اماں...... بھرا تو اڑ گیا ہے بات پہ۔" بینا کو جان لینے کا تجسس ہوا۔ ماں کے تیور اس لمحے کچھ الگ ہی لگے۔

"نشاط ہے نا۔" کلثوم کی آنکھیں کچھ سوچ کر چمکنے لگیں۔ "وہی سمجھا سکتی ہے اسے۔" بیٹی کی صلاحیتوں پر خوب ہی بھروسا تھا کلثوم کو۔ نشاط کا دماغ بھی کیسے کیسے حل ڈھونڈ کر لاتا تھا۔ اس کے مشوروں پر عمل کرنے والا کبھی مار نہیں کھاتا تھا۔

☆☆☆

"آرام آ رہا ہے دادی......؟" معظمہ نے آنکھوں پہ ہاتھ رکھ کر سکون سے لیٹی برکت بی بی سے سوال کیا۔

کونے والے کچے کمرے کے آگے دو چارپائیاں ڈال کر چھوٹا پنکھا لگا کر وہ اور امیرہ بڑے صحن سے قدرے ہٹ کر الگ سوتی تھیں۔ کسی کسی رات معظمہ بھی چارپائی یہاں کھینچ لاتی تھی۔ ایک دوسرے کو کہاں کہاں کے قصے سنا کر وہ اور امیرہ جانے رات کے کس پہر گہری نیند میں چلی جاتیں۔ فی الحال وہ برکت بی بی کی ایک ایک ٹانگ سنبھالے خدمت گزاری اور فرمانبرداری کے سارے ریکارڈ توڑنے پر تلی تھی۔ ان کے آپس کے مقابلے کا فائدہ اٹھا کر برکت بی بی خوب سکون محسوس کر رہی تھیں۔ ان دونوں کی زبان کو البتہ ایک لمحے کو آرام نہیں ملا تھا۔ موجودہ بحث کا موضوع ان کی عمر تھی۔ امیرہ کہتی کہ وہ بڑی ہے جبکہ معظمہ کا اصرار تھا کہ وہ بڑی ہے۔

"مجھ سے پوچھ لو کملیوں...... مجھ سے زیادہ کسے پتا ہے۔" کافی خوشگوار موڈ میں نانی نے بازو آنکھوں سے ہٹا کر دونوں کو دیکھا۔

"سچ نانی ہمیں تو خیال ہی نہیں آیا۔ بتاؤ ناں کون بڑا ہے۔"

"دونوں ہی گرمیوں کی پیدائش ہو، زیادہ فرق نہیں ہے۔ میں تو ان دنوں ڈھکی اور رنگ پور کے درمیان بھاگی پھرتی تھی۔" وہ یاد کر کے ہنسیں۔ "تیری ماں نویں مہینے میں فالسے کھاتی تھی اور وہ تو یہاں جیٹھ کے مہینے میں آ جاتے ہیں...... ہاڑ آ جائے تو نظر ہی کہیں نہیں آتے اور امیرہ کی ماں تازی پنڈ (کھجور) کی شوقین تھی۔ اب پنڈیں تو یہاں ساون میں اترتی ہیں۔ یہی کوئی آٹھویں مہینے میں۔ اس حساب سے معظمہ بڑی ہے تم سے۔ بس دو، اڑھائی مہینے۔"

"لیکن دادی، آپ لوگوں نے امیرہ کی بچپن میں کیوں بات طے کر دی تھی۔" معظمہ نے آنکھ دبا کر اس کا پسندیدہ موضوع چھیڑ دیا۔

"بھاگے (آگ لگے) میں نے کب کی تھی منگنی شگنی۔ اسی کے پیو (باپ) کو شوق چڑھا تھا۔ اب یہ کوئی لوگ ہیں رشتہ کرنے جوگے۔ ہونہہ۔" نانی نے اپنی دھن میں دل کے پھپھولے پھوڑے اور امیرہ کی پلکیں خوامخواہ نم ہو گئیں۔ محبوب کے حوالے سے جانے کان کیا کیا سننا چاہتے تھے اور ملتا کیا تھا سننے کو۔

"کیسے لوگ ہیں نانی......؟" امیرہ نے امید کا دامن نہیں چھوڑا۔ وہاں اس کا دل اٹکا تھا، سانسیں تھمتی تھیں۔ ختم ہو جائیں یہ بچارتیں بھی اب۔

"ہائے نہ پچھ (نہ پوچھو) جہان کی منافق ہے یہ کلثوم...... منہ دیکھے کی یاریاں ہیں اس کی۔ ملنے پر ایسا رخ دے گی جیسے۔ ایک ہمارے ہی لیے تو تڑپ

رہی تھی۔ وہ ماکھی (شہد) ٹپکے گی زبان سے، اگلا تو گھل گھل کر پانی ہو جائے۔ مگر ایک نمبر کی گنڈھ کپ (گرہ کاٹنے والی) ہے۔ شک بھی نہ ہونے دے گی کہ اندر کتنا بغض بھرا ہے اس کے۔" نانی کے بے لاگ تبصروں سے امیرہ کا رواں رواں کانپ گیا۔ مزمل کا ایک ایک دل لبھاتا انداز آنکھوں میں پھر گیا۔ منہ دیکھے کی مٹھاس، بے چینی کا اظہار، جدائیوں کے قصے۔

"بچے بھی ایسے ہیں کیا؟" معظمہ نے امیرہ کے پیلے ہلدی چہرے کی تحریر پڑھ کر جھٹ سے پوچھا۔

"ہائے بیا" (ہاں تو اور کیا) نانی نے فی الفور تائید کی۔" ڈرامے باز ہیں سارے کے سارے۔ دھیندرے (رونا دھونا) کرنے میں اس نشاط کا مقابلہ کوئی نہیں۔ اور وہ چھوٹی بینا، چتری (چالاک) جہانوں کی، اوپر سے ایک ہی لال (بیٹا) مز......"

"بس بس نانی....!" امیرہ تو برسنے کو تیار، باقاعدہ منہ میں دوپٹا دبالیا۔ نانی نے آنکھوں پہ بازو نہ رکھا ہوتا تو خوب ہی حیران ہوتیں، اس انوکھے منظر پر......امیرہ آہستہ سے اٹھ کر اپنے بستر پر جالیٹی۔ منہ بھی دوسری طرف پھیرلیا۔ معظمہ صاف سمجھ گئی کہ چپکے چپکے رونے کا شغل جاری ہے۔

"جانے کیسے لوگوں میں منگنی کر دی ابا نے۔ خوامخواہ دل میں محبت کی چنگاری سلگا دی، اوپر سے ملاقاتیں بھی کر بیٹھی تیری پاگل دھی (بیٹی) وہ اپنی حالت پہ خود ہی ترس کھاتی تکیہ بھگوتی رہی۔ میں اب کبھی نہیں ملوں گی اس سے......آگ لگے ایسی محبت کو کہیں کا نہیں رکھے گا۔ یہ......بجن بے پرواہ۔ ہائے ربا۔ یہ فیاض بھائی! کا ریڈیو۔ ایسی درد بھری رات میں احمد نواز چھینہ لگا دیا۔

میڈا انکیا لاڈ ڈھولنا (میرے بچپن کا محبوب)
میکوں کنڈیاں اچ ماہیا رول ناں (مجھے کانٹوں میں مت برباد کرو میرے محبوب)

آہ مزمل کیسی بے درد ہے تمہاری یاد بھی۔ خود سے کیے وعدے بھی وفا کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اپنی بے بسی پہ آپ ہی سسک کر رو دی۔

☆☆☆

ملک یار کی زمینوں میں مونگ کاشت ہو چکی تو مزمل نے سکھ کا سانس لیا۔ پندرہ بیس دنوں کی جان توڑ محنت نے تو عرق ہی نکال دیا تھا۔ گندم کی کٹائی اور تھریشر کے فوراً بعد پہلے زمین کی تیاری کی پھر بیج ڈال کر ہل چلائے......اور اس کے بعد کیارے وغیرہ بنالیے۔ اور اب تو نہری پانی سے پندرھویں دن کا پانی بھی پلوا دیا تھا۔ خادم اور سجاد کو اس نے زمین کی راکھی پر لگایا کہ اب اسے اگلے اور سب سے اہم مشن کی طرف متوجہ ہونا تھا۔ اس کی ذاتی زمین جو سالوں سے ملک یار کے قبضے میں بنجر ویران پڑی تھی۔ اب محض چند مہینوں میں اس کے پاس واپس آنے والی تھی۔ اکتوبر میں مزمل نے اپنی زمین پر گندم کاشت کرنی تھی لیکن اس کے لیے زمین کو پہلے نرم اور زرخیز کرنا تھا۔

ملک یار نے بھی اجازت دے دی تھی۔ مزمل کا ارادہ تھا کہ گندم سے پہلے وہ برسیم کی گھاس اگا کر زمین کو کاشت کاری کے قابل بنالے۔ گزشتہ ڈھائی برسوں میں بھلے اس نے ایک دانے جتنی بھی کمائی نہیں کی تھی پر تجربے کی مار خوب جھیلی تھی۔ مزمل کے لیے اپنی ذاتی زمین پر بوائی کا تصور ہی ایسا جی خوش کرنے والا تھا کہ وہ ابھی سے اپنے اندر عجیب سا جوش اور ولولہ سا محسوس کرنے لگا۔

ملک یار نے اجازت دی اور مزمل نے اگلے روز سے ہی کام کا آغاز کر دیا تھا۔ کچے کی زمین تھی، قدرتی نرم اور زرخیز، ذرا سی محنت سے رنگ ہی اور نکل آیا۔ باری کا پانی بھی ملنے لگا۔ اب باری تھی یہاں والے گھر پر دھیان دینے کی......اسی زمین پر اس کے ابا نے آدھے کنال جتنی جگہ کو چار دیواری کے احاطے میں لا کر اندر ایک کچا کوٹھا اور ڈھیر سارے درخت لگا دیے تھے۔ گزرے سالوں میں اس کا یہ چھوٹا سا گھر بھی خوب بے توجہی کا شکار ہوا

تھا۔ سوائے درختوں کے جنہیں مزمل نے آخری مرتبہ اپنے قد جتنا اونچا دیکھا تھا' اب تناور درخت بن چکے تھے۔ مزمل نے گھر کی خود ہی صفائی ستھرائی کر کے نجھی بستر ڈال کر جگہ کو نیا نکور کر دیا......

آج پندرہ دن بعد زمین سے گھاس کا بوٹا پھوٹ چکا تھا۔ دور دور تک ہلکی نرم سبزے کی تہہ دکھائی دینے لگی تھی۔

خوشی سے مزمل کا دل دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ ظہر کی اذان ہوئی تو مزمل نے وہیں احاطے کے نلکے سے وضو کر کے اپنی زمین پر پہلی نماز ادا کر ڈالی۔ اپنی کامیابی اور رزق کی ڈھیروں ڈھیر دعائیں مانگتے اس کی پلکیں نم ہو گئیں۔ اماں، نشاط اور بینا نے کہا تھا کہ سبزہ نکل آئے تو وہ بھی اپنی زمین کا چکر لگائیں گی۔ اب اگر پانچ چھ روز بعد وہ انہیں آنے کو کہے تو سبزے کی تہہ مزید گہری اور لمبی ہو چکی ہو گی۔

اور اس کے بعد......مزمل کے لب بے ساختہ کسی خیال سے مسکائے۔ اپنی شہزادی کو بھی تو دکھانی ہیں اس کی زمینیں۔ وہ بھی تو برسوں سے خواب دیکھ رہی ہے اپنے گھر' اپنے ٹھکانے کے......کتنا خوش ہو گی وہ میری محنت دیکھ کر' اپنا گھر اور رقبہ دیکھ کر' شادی کے بعد اسے یہیں رکھوں گا۔ وہ تصور میں بہت دور نکل گیا۔

کچے کوٹھے کی جگہ اب وہاں دو پکے کمرے، چھوٹا سا برآمدہ، سفید چونے کا لیپ، اونچی دیواریں، بے شمار پھول، سبزہ اور نئے نکور گھر میں بجی سنوری رنگین پراندہ ہلاتی اس کی دلہن' بڑا ہی خوش کن خیال تھا پر تھا تو خیال ہی......مزمل کا دل اچانک ہی اسے دیکھ لینے کو بے تاب ہو گیا۔ غالباً ایک ماہ بیت گیا تھا اس سے ملے ہوئے۔ تب اپنی مجبوریوں پر، اس کی بے بسی پر روتی ہوئی، کتنی اداس اور غم زدہ لگ رہی تھی وہ۔ جانے اب کیسی ہو گی۔ کہیں ناراض ہی نہ ہو۔ وہ تو اماں کو اس کے گھر بھیجنے کی بات پر زور دے رہا تھا اور یہاں مہینہ بھر ہونے کو آیا' اس نے پلٹ کر اس کی خبر تک نہیں لی تھی۔ سوچتی ہو گی' بھاگ گیا ہوں۔ اب کون بتائے اسے میری مجبوریاں کہ ساری محنت اسی کے لیے تو کر رہا ہوں۔

خیر بتانا تو پڑے گا۔ ایک شرارتی خیال کے سوجھتے ہی وہ شوخی سے لب دبا کر مسکرانے لگا۔ ایک بار یہاں آئے تو سہی میری سوہنی، سارے گلے شکوے مٹا دوں گا پر وہ رولی بسورتی' آئے گی بھی یا نہیں۔ ایک لحظے کو متفکر ہو کر مزمل نے سر کھجایا پھر جلد ہی اپنی عارضی کیفیت پر قابو پا کے بشاشت سے مسکرا دیا۔

رو پیٹ کے ہی سہی کہنا تو میرا مان ہی لیتی ہے۔ اپنا گھر دیکھنے کے لیے تو خوشی خوشی چلی آئے گی۔ پر بلاؤں کیسے؟ وہ غور و فکر کرتا نیم کے نیچے رکھی چارپائی کی طرف بڑھ گیا۔ سر کے نیچے بازوؤں کا تکیہ بنا کر نیم دراز اب وہ سہانے سپنوں کے ذخیرے میں سے کچھ نیا' کچھ بہت ہی پیارا سا آئیڈیا نکالنے لگا۔

☆☆☆

نانی اور مامی نصرت رنگ پور گئی تھیں اپنی ایک عزیز کی عیادت کو۔ نانی نے اسے بھی ساتھ چلنے کو کہا لیکن اس نے انکار کر دیا۔ اب رنگ پور جانا اچھا نہیں لگتا تھا، وہاں تھا ہی کون جس کے لیے بھاگی بھاگی جاتی۔ البتہ اب نانی کے پیچھے دماغ کی بتیاں خوب خوب جل رہی تھیں۔ مزمل کی بہت دن پہلے کی بات یاد آنے لگی، وہ چاہتا تھا کہ پہل ان کی طرف سے ہو۔ اب نانی کو منانا تو بہت ہی مشکل کام تھا۔ کیوں نہ اس کی غیر موجودگی میں وہ خود کسی بہانے ایک بار ان کے گھر ہو آتی۔

آخر کو کلثوم چاچی اس سے بڑی تھیں۔ ہونے والی ساس تھیں۔ کیا تھا جو ایک بار وہ خود ان کے ہاں ہو آتی۔ بھلے کسی بہانے سے سہی اور بھلا ہو معظمہ کا کہ بہانہ بھی کافی معقول مل گیا تھا۔ فیاض کی بیوی شمع اپنے کپڑوں' چادروں پر کڑھائی وغیرہ کے سارے کام بینا سے کروائی تھی۔ حتیٰ کہ دو چادریں ابھی بھی بینا کے پاس تھیں۔ امیرہ نے اسی شام معظمہ کو تیار

کیا۔ شمع خود تو اب کہیں بھی آنے جانے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ اس لیے ان دونوں کو بھیجنے پر فوراً رضامند ہو گئی۔ البتہ یہ وعدہ اس سے امیرہ نے پہلے ہی لے لیا کہ وہ نانی سے اس کا ذکر نہیں کرے گی...... اور وہ بنا کوئی تبصرہ کیے صرف ہنس دی۔ تھوڑا تھوڑا جاننے لگی تھی اس کی مجبوریوں کو۔ امیرہ نے فیروزی سوٹ پہن کر جلدی سے کاجل، کنگھی کی اور معظمہ کے ساتھ نکل پڑی۔ جانے جب سے مزمل ملا تھا وہ اس کے معاملے میں اتنی نڈر کیسے ہو گئی تھی۔ اسے دیکھ لینے کا جنون ہر مصلحت پر حاوی ہو جاتا اور اب تو معاملہ اسے ہمیشہ کے لیے پانے کا تھا۔

کلثوم چاچی ایک بار تو ہکا بکا منہ کھولے اسے دیکھتی رہ گئیں۔ وہ تو امیرہ اور اس کی نانی کے پہل نہ کرنے کو اپنا سب سے بڑا ہتھیار سمجھ رہی تھی۔ پچھلے دنوں اسی طعنے نے تو مزمل کو بھی چپ کروا دیا تھا۔ پھر اچانک امیرہ کا آدھمکنا...... پہلا شکر کا کلمہ کلثوم نے یہ پڑھا کہ مزمل گھر پر نہیں تھا۔ اور اب کسی طرح جلد از جلد اس بلا کو اپنے سر سے ٹالنا تھا تاکہ مزمل کو اس کی آمد کی خبر نہ ہو...... اور جلدی کیسے بھیجنا تھا، یہ بھی کلثوم اچھی طرح جانتی تھی۔ خوش اخلاقی کے جوہر باقی دنیا کے لیے سنبھال کر رکھتے ہوئے ایک طنزیہ مسکراہٹ لبوں پر سجائی۔

”خیر تو ہے امیرہ...... آج یہاں کا راستہ کیسے بھول گئیں۔“ مارے باندھے مصافحہ بھی کیا۔

”چاچی، وہ بینا سے چادریں لی تھیں شمع بھابھی کی۔“ اس نے بلاوجہ صفائی دی۔

”ہاں تو یوں کہو ناں...... اپنے کام سے آئی ہو۔“

”نہیں نہیں چاچی......“ امیرہ گھبرا گئی۔ ”میں تو کب سے ملنے آنا چاہ رہی تھی، بس وہ نانی کی طبیعت ذرا ٹھیک نہیں رہتی۔“ کلثوم چاچی کی دبنگ شخصیت کے سامنے وہ خود کو کافی بے بس محسوس کر رہی تھی۔

”ہاں ظاہر ہے۔“ وہ استہزائیہ ہنسی۔ ”نانی کی حالت دیکھ کر سوچتی ہوگی اب اس کے بعد کون سا تیرا گھر ہے جہاں تجھے کوئی رکھے گا۔“ وہ بھی کلثوم تھی۔ کیسے کسی ایک بھی جملے کو ضائع جانے دیتی۔

”مزمل نے پچھلے دنوں صاف صاف اس کی سائیڈ نہ لی ہوتی تو شاید بخش بھی دیتی۔ لیکن اب تو بڑا ضروری ہو گیا تھا امیرہ کا دماغ صاف کرنا۔ دوسری طرف وہ اس اچنبھے میں بھی تھی کہ ہر طرف سے ماحول بنانے کی اس سازش کے پیچھے کس کا ہاتھ تھا۔ کون راہیں ہموار کر رہا تھا' ان بھولے بسرے گرد آلود راستوں کی۔

امیرہ شدید بے عزتی کے احساس سے چپ چاپ سر جھکائے تقریباً رو دینے والی ہو گئی تھی۔ نانی تو کہتی تھیں کلثوم منہ پر ایسے ملتی ہے جیسے اس سے زیادہ خوش اخلاق کوئی نہیں، ملنے کی تڑپ بھی یوں ظاہر کرتی ہے مانو ایک ہمارا ہی انتظار کر رہی تھی۔ لیکن اس کے معاملے میں تو وہ منافقت سے کام لینا بھی گوارا نہیں کر رہی تھی۔ سیدھے سیدھے الفاظ کے طمانچے کھا کر بھی ہمت تھی امیرہ کی جو بیٹھی ہی رہی۔

”کاش کہیں سے مزمل آ جائے' اس نے چاچی کے چھوٹے سے گھر پر امید کی نگاہ دوڑائی۔ دو کمرے سامنے کے رخ پر تھے۔ ایک تیسرا پکا کمرا داہنے کونے میں شاید نیا بنا ہوا تھا۔ اسی داہنی دیوار کے ساتھ ساتھ تین درخت، نلکا اور انتہائی کونے میں کنواں تھا۔ بائیں ہاتھ پر ایک بڑا چھپر تھا جس کے نیچے بکریاں بندھی تھیں اور دو چار پائیاں رکھی تھیں۔

”مزمل اپنی زمین پر ہوتا ہے۔“ اس کی سوچ پڑھتی کلثوم چاچی نے جملہ جوڑا تو وہ شرمندہ سی نیچے دیکھنے لگی۔ بینا اور معظمہ دوسری چارپائی پر چادروں کی بابت کوئی بات کرنے میں مصروف تھیں۔

”ایک دن کہہ رہا تھا۔ ہم نہیں معاف کر سکتے عنایت چاچا کی زیادتیاں۔ جو آدمی دھی (بیٹی) کا رشتہ کر کے بیٹھا ہو، وہ کیا اس طرح الزام لگانے دروازے پر آ جاتا ہے۔ تمہارے سگے باپ نے اس وقت تمہارے مستقبل کے بارے میں نہیں سوچا تو ہم سے بھی کوئی توقع نہ رکھنا امیرہ...... مزمل نے یوں بھی لٹنی پہ ہاتھ رکھ دیا ہے۔ بچپن سے ساتھ کھیلتے ہوئے بڑے ہوئے ہیں۔ خوب سوہنڑی نکل آئی ہے بھتیجی میری...... پہلی فصل کٹنے پر ہم شادی بھی کر دیں گے۔“

کلثوم چاچی نے طنز اور معنی خیزی ترک کر کے صاف صاف اس کی غلط فہمیاں دور کیں تاکہ نہ تو وہ کسی بھول میں رہے، نہ امید لگائے اور امید تو امیرہ کی ٹوٹ ہی گئی تھی۔ یہاں نہ آنے کی صورت میں تو پھر بھی آس بندھی رہتی۔ پر مزمل کا کہنا مان کر یہاں آنا تو ڈور ٹوٹنے کے مترادف ثابت ہوا تھا۔ اب جانے مزمل چاہتا یہی تھا یا بالکل ہی انجان تھا اپنی ماں کے خیالات سے۔

”کام ہو گیا بینا......“ کلثوم چاچی نے کڑک آواز میں پکار کر اب جانے کا اشارہ بھی دے دیا۔ امیرہ گھبرا کر خود ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ بینا نے ایک چادر لفافے میں ڈال کر معظمہ کی طرف بڑھائی۔

”اچھا چاچی......“ امیرہ نے ہاتھ آگے کیا جسے ہاتھوں میں لے کر کلثوم نے امیرہ کی آنکھوں میں دیکھا۔ ”شمع سے کہنا، دوسری چادر ہم خود ہی بھجوا دیں گے۔“

”جی......“ وہ اثبات میں سر ہلا کر آنسو پیتی رخ موڑ گئی۔ لیکن آنسو چھپاتے ہوئے گھر تک پہنچنا بے حد مشکل تھا۔ بوھڑ (برگد) آئی تو وہ اس کے نیچے ہی بیٹھ گئی۔

”بس کرو امیرہ۔ کوئی آ جائے گا...... گھر چلو...... دیکھو کچھ آدمی بھی آ رہے ہیں۔“ اس نے بمشکل امیرہ کو چلنے پر راضی کیا اور جیسے تیسے گھر تک لے ہی آئی، بلکہ آتے ہی اسے اس کے کمرے میں گھسا دیا۔ ایسی سرخ، متورم آنکھیں دیکھ کر تو لازمی شمع سوال کرتی۔ خود بھی سخت پشیمان تھی، اسے ساتھ لے جا کر دادی سے چوری کی جرات کی اور نتیجہ......؟

☆☆☆

نانی اور ماسی رنگ پور سے لوٹ آئی تھیں۔ تب تک دونوں خود کو سنبھال چکی تھیں۔ اب تو نانی کو آئے بھی تین روز ہو گئے تھے۔

”سنو...... آج مزمل ملا تھا۔“ رات کو دونوں سونے کے لیے لیٹیں تو خاموشی میں معظمہ کی سرگوشی نے گویا زلزلے کی طرح اسے ہلایا۔ وہ باقاعدہ سوتے سے اٹھ بیٹھی۔

”کیا...... کیا؟“

”چپ پاگل۔“ معظمہ نے گھرک کر بازو سے کھینچتے ہوئے اسے دوبارہ لٹایا۔ ”آہستہ بول کملی، اور بات سن پوری۔“ گردن اچکا کے اس نے ایک نظر دادی کو بھی دیکھا۔ کروٹ دوسری جانب کیے وہ گہری نیند میں لگ رہی تھیں۔

”آج تو بی بی صیب کے گھر نہیں گئی نا...... میں سبق لے کر وہاں سے نکلی تو روڈ سے تھوڑا آگے وہ میری ہی راہ دیکھ رہا تھا۔ بلکہ میری کیا، تیرے لیے کھڑا تھا۔“

”ہاں پر میں نے تو منع کیا تھا کہ آئندہ نہیں ملیں گے۔“ وہ سرگوشی سے بھی کم آواز میں بولی۔

”وہی نا...... ادھر نہر کی طرف وہ بھی نہیں ملنا چاہتا۔ تیرے لیے پیغام بھیجا ہے۔ کہتا ہے کل دوپہر کو امیرہ مجھ سے ملنے میری زمینوں پر آئے۔“

”زمینوں پر......“ اس کی آنکھیں نکل آئیں۔ وہ تو اور بھی کھلی جگہ ہے اور......“

”ارے پاگل...... وہ نہیں۔“ معظمہ نے اس کے ہاتھ پہ تھپڑ مارا۔ ”وہ تو ملک یار محمد کی زمینیں تھیں۔ کل وہ تمہیں اپنی زمین پر بلا رہا ہے۔“

”اس کی زمین...... پر میں نے کب دیکھی ہوئی ہے۔“ وہ بدستور غائب دماغ تھی۔

”ہاں، ہاں معلوم ہے۔ اس کی زمین ہے بھی وہاں سے ذرا دور...... اس لیے وہ کہہ رہا تھا کہ امیرہ اس روز والی جگہ پر آ جائے، جہاں وہ ٹریکٹر پر بیٹھا تھا۔ وہ تو یاد ہے نا۔ بس وہاں تک چلی جانا۔ وہ تمہارے انتظار میں کھڑا ہوگا۔ وہی خود تمہیں لے جائے گا، جہاں جانا ہوگا۔“

”اور تم؟“

”میں تو بی بی صیب کے پاس جاؤں گی۔ گھر

سے اکٹھے نکلیں گے۔ تم بس جلدی واپسی کرنا اور میرے ساتھ ہی گھر آنا۔"

"وہ مجھے کیوں بلا رہا ہے معظمہ؟ مجھے جانا چاہیے کیا۔ کلثوم چاچی کو پتا نہ چل جائے۔" امیرہ اتنی بڑی خبر سن کر بھی ڈھیلی سی تھی۔ بے یقین بھی تھی، پریشان بھی خالی خالی آنکھوں میں خوشی کی جگہ تفکر کے ڈورے لہرا رہے تھے۔

"شاید اسے پتا چل گیا ہے کہ اس روز ہم اس کے گھر گئے تھے۔"

"مجھے نہیں لگتا کہ چاچی مزمل کو خبر ہونے دے گی۔ بہرحال ملنے پر یہ بھی پتا چل جائے گا۔ اسے بھی بتاؤ اس کی اماں کی باتیں۔"

"میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا معظمہ...... دل بڑا بھاری سا ہو رہا ہے۔ وہ کیوں بلا لیتا ہے مجھے اکیلے میں...... دل بڑا ڈرتا ہے ایسی باتوں سے......"

"اچھا سوچ لو...... آج کی پوری رات اور اگلا دن پڑا ہے، غور کرنے کے لیے جیسا تمہارا دل چاہے۔" معظمہ اس کے بھاری دل پر مزید بوجھ ڈال کر مڑے سے رخ موڑ گئی۔ امیرہ نے سیدھے ہوتے ہوئے تاروں بھرے آسمان پر نظر ڈالی۔ چاند بھی چودھویں کے قریب تھا۔ ایک درد بھری مسکراہٹ امیرہ کے لبوں پر ٹھہر گئی۔ کہیں تو وہ بھی دیکھتا ہوگا اس چاند کو۔

"امیرہ کی کمزوریوں سے واقف ہونا مزمل...... اسی لیے خود بھی ہر وعدہ توڑ دیتے ہو، مجھے بھی توڑنے پر مجبور کر دیتے ہو۔ جانتے ہونا محبت میں کیے وعدے توڑنا سب سے حسین جرم ہے۔" وہ بڑے جلدی ہار مان کر مسکرائی۔

تائی، دادی سے متعلق سب ہی تلخی بھری باتیں دھواں بن کر اڑ گئیں۔ یاد رہ گئیں تو بس اس کی پیار بھری سرگوشیاں، میٹھی مسکراہٹ اور صرف محبت۔ آج کی پوری رات اور کل کا سارا دن بھی خرچ کر دیتی سوچنے میں، فیصلہ تب بھی یہ ہی ہونا تھا۔ چمکتے چاند ستاروں کی ساری روشنی آنکھوں میں بھر کر اس نے مسکراتے ہوئے پلکیں موند لیں۔

☆☆☆

چار کچی گلیوں کے بعد مسجد اور اس کے پیچھے کھجوروں کا گھنا باغ، باغ کے بعد آگے دور تک کشادہ کھیت...... آس پاس پہ نظر ڈال کر تیز قدموں سے چلتی وہ جلد ہی ملک یار کے کھیتوں تک پہنچ گئی۔ موسم کچھ گرد آلود سا ہو رہا تھا۔ آندھی کی یہ کوئی دھیمی قسم تھی۔ ہلکی ہلکی مٹی کی تہ پھیل کر جیسے پورے ماحول میں ٹھہر سی گئی تھی۔ سامنے ایک کچا کمرا تھا اور تھوڑے فاصلے پر کھیتوں میں بھوسے کے چار اونچے گول ڈھیر جن کی اوپری سطح پر گارے کا لیپ کر کے اسے جما دیا گیا تھا۔ دل میں بے چینی کی لہریں سی اٹھنے لگیں۔ مزمل کو ہونا تو یہیں چاہیے تھا۔ وہ پیچھے مڑ کر دیکھ رہی تھی، جب کوئی پاس آ کر کھانسا۔

"ہاں......" وہ چونک کر پلٹی۔ مزمل شاید اس کچے والے کمرے سے نکلا تھا۔ بس ہلکا سا مسکرایا۔ انداز میں عجلت تھی۔

"میں تم سے کافی آگے رہوں گا۔ تم اپنی رفتار دھیمی رکھنا۔ بس دور سے دیکھنے پر کسی کو ایسا محسوس نہ ہو کہ ہم ساتھ ہیں...... آؤ۔" وہ جلدی سے سمجھا کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا دانستہ اس سے آگے نکل گیا۔ لیکن بہرحال نظروں سے اوجھل ہونے کا امکان کم تھا کہ آگے کی ساری کھلی جگہ میں کہیں کھیت، کہیں پر اسوکی خودرو جھاڑیاں، درخت اور اونچے نیچے ناہموار راستے تھے۔ ایک آبادی پیچھے رہ گئی تھی، دوسری بہت دور دکھائی دیتی تھی۔

آگے چلتے مزمل پر اس نے پہلی دھیان کی نظر ڈالی۔ آج وہ پچھلی بار ہر دفعہ سے زیادہ تر و تازہ، خوش اور پرجوش نظر آ رہا تھا۔ تیز نسواری شلوار قمیص میں وہ خوب توجہ سے تیار ہوا لگ رہا تھا۔ چال میں تیزی تو تھی، لیکن بھرپور اعتماد کے ساتھ...... ساری سستی، سارا ڈھیلا پن تو ایک اسی کے وجود سے چپکا تھا۔ کچھ کچھ غصہ اور ناراضی بھی تھی مزمل سے...... دل میں آتے کئی دوسرے بے ترتیب خیالات میں سے ایک یہ بھی تھا

کہ کیوں وہ ہر بار اس کے بلانے پر دوڑی چلی آتی ہے۔ کیوں نہ اسے کچھ سمجھا پاتی ہے، نہ اپنے دل کو......

"لیکن بس...... یہ آخری بار ہے مزمل......" اس کی چوڑی پشت کو دیکھتے امیرہ نے عزم مصمم کیا۔ اس آخری بار کے بعد شاید تقدیر ہمارا حتمی فیصلہ لکھ دے۔ ہوسکتا ہے دائمی جدائی یا ہوسکتا ہے بے بنیاد کے کئی نئے تنازعوں میں ہمارا ملن۔ پر یہ تو طے ہے مزمل کہ آج کے بعد امیرہ بے بس نہیں ہوگی۔ نہ ہی کمزور پڑے گی۔ پر یہ سب بھی شاید سوچنے کی باتیں تھیں۔ اب وہ اس کے سامنے کھڑا اس کی موجودگی سے خوش، اس کی دید سے سرشار، اسے شوخ نگاہوں سے دیکھے جا رہا تھا۔ ایسے لمحے جن میں امیرہ سب بھولنے لگتی تھی۔

"ناراض ہونا؟" مسکراتی آنکھوں سے وہ اس کا دل پڑھ رہا تھا۔ امیرہ کی پلکیں نم ہونے لگیں۔ جواباً محض نفی میں سر ہلا پائی۔

"تو اتنی چپ کیوں ہو۔ یہاں آنے سے گھبرا رہی تھیں، ہوں؟" وہ سوال کر کے خود ہی جواب بھی دے رہا تھا۔ امیرہ نے جھکی پلکوں کے ساتھ سر اثبات میں ہلایا۔

"میں سمجھ سکتا ہوں امیرہ...... لیکن یہ میرا گھر ہے، میرا اپنا گھر، میری زمین، جسے برسوں بعد غیروں کے قبضے سے چھڑا پانے میں کامیاب ہوا ہوں۔ تمہیں بھی اسے اپنا سمجھ کر دکھانا چاہتا تھا۔ اپنی خوشی میں تمہیں شامل کرنا چاہتا تھا۔ ہر ڈر نکال دو دل سے، تم محفوظ ہو اس چار دیواری میں۔" صحن کے بیچوں بیچ اس کے سامنے کھڑا بنا کچھ کہے وہ اس کے من کی کتاب پڑھ رہا تھا۔

امیرہ کے سارے بوجھ ایک ایک کر کے سرکنے لگے۔ اس وقت وہ جس کے ساتھ تھی اس سے دور ہونے پر کبھی خوش نہیں رہی تھی۔ ہمہ وقت جو خیالوں پر چھایا رہتا تھا۔ اب آنکھوں کے سامنے تھا۔ جذبات پہ پڑی برف بھی دھیرے دھیرے پگھلنے لگی۔

"کچھ کہو امیرہ۔" مزمل نے سادگی سے اس کا ہاتھ تھاما، تو وہ بری طرح سٹ گئی۔ مزمل پہ وہ بھروسا کرتی تھی اور چاہتی تھی کہ یہ بھروسا قائم رہے، بلکہ ایسی کچھ توقع وہ مزمل سے بھی کرتی تھی کہ یہاں تک اس کے اکیلے چلے آنے کے فیصلے کو مزمل اس کی بے باکانہ جرات تصور نہ کرے۔ اسے پتا ہو کہ "امیرہ" کیا ہے۔ اور یقیناً اسے پتا تھا کہ امیرہ کیا ہے، تب ہی غیر محسوس انداز میں ہاتھ چھوڑ بھی دیا۔

"آؤ...... وہاں بیٹھتے ہیں۔" تھوڑے فاصلے پر نیم کے نیچے چارپائی بچھی تھی۔ وہ اس کی طرف بڑھ گیا۔ صحن کا واحد کچا کمرا بند ہی پڑا تھا۔ اسے کھولنے یا اس کی طرف بڑھنے کی مزمل نے کوشش بھی نہیں کی تھی۔ ویسے بھی گرمیوں کی سہ پہر تھی۔ درختوں تلے بیٹھنے کا وقت تھا۔ وہ قدرے سکون محسوس کرتی اس کے پیچھے چل پڑی۔

"آج تو سب سے پہلے نشانی لوں گا امیرہ...... ہر بار جلدی میں بھاگنا پڑ جاتا ہے۔" چارپائی پر آرام دہ حالت میں بیٹھ کر اس نے ہتھیلیاں پیچھے کر کے جمائیں۔

"کہیں یہاں سے نہ بھاگنا پڑ جائے۔" وہ پہلی مرتبہ مسکرائی، بلکہ زبان کھولی اور پائنتی کی طرف خود بھی ٹک گئی۔

"اونہوں۔" مزمل نے خفگی سے ٹوکا۔ "منہ سے ہمیشہ اچھی بات نکالتے ہیں۔" امیرہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ مزمل کے جملے نے بے ساختہ دادی کی یاد دلا دی تھی۔ وہ منہ کھولتے کھولتے رہ گئی کہ دادی کا ذکر پھر کہیں باتوں کو سنجیدگی کی طرف نہ لے جائے۔ مزمل کا اچھا بھلا موڈ غارت ہو جائے گا۔

"تمہارا گھر اور زمین بہت خوب صورت ہے مزمل۔" اس نے بات بدلی۔

"یہاں رہو گی امیرہ...... میرے ساتھ؟"

"یہاں......" وہ حیران ہوئی، پھر مسکرائی "اور چاچی کلثوم؟"

''وہ گھر پر ٹھیک ہے۔'' مزل بھی ہنسنے لگا۔

''پر پکا کوٹھا تو ادھر بنا رکھا ہے تم نے...... وہ کیا لبنیٰ کے لیے ہے......'' ذہن میں چاچی کے جملے کی یاد تازہ ہوئی تو امیرہ شوخی سے کھلکھلائی۔

''لبنیٰ؟'' وہ ایک دم کھٹکا اور حسین گہری نگاہیں امیرہ پر جما ئیں۔ ''تمہیں کیسے پتا؟''

''کیسے پتا؟'' حیران ہونے کی باری امیرہ کی تھی۔ تو مطلب واقعی دونوں کے بیچ کچھ ہے۔ وہ خواہ مخواہ اسے چاچی کی بڑھک سمجھ رہی تھی۔ تو پھر وہ اسے کیوں ڈھونڈ رہا تھا۔ امیرہ الجھنے لگی۔

''بتاؤ نا مزل۔ یہ لبنیٰ کا کیا معاملہ ہے۔''

''لو...... مجھے تو تم بتا رہی ہو اس کے بارے میں۔'' وہ ہونٹ دبا کر ہنسنے لگا۔

''ہاں، لیکن تم نے کہا مجھے کیسے پتا؟ یعنی بات تو ہے۔ بتاؤ نا مزل تمہارے رشتے کی بات چل رہی ہے ادھر۔'' وہ بے ساختہ اس کا بازو تھام بیٹھی 'جانے کون کم بخت تھی یہ لبنیٰ...... اپنی اتنے برسوں کی دوری جی بھر کے کھلنے لگی۔ کوئی اور نزدیکی کا فائدہ اٹھا گئی تھی۔'' پیاری بھی ہے بقول چاچی۔''

''تم نے کیوں نہیں پوچھی پوری بات۔ اس بتانے والے سے۔'' وہ جان بوجھ کر کھینچ رہا تھا۔

''نہیں پوچھ سکتی تھی۔'' امیرہ کی آنکھوں میں رعب داب والی چاچی کی تصویر گھوم گئی۔

''میری بات پہ یقین کرو گی؟'' وہ اب ایک ہاتھ کنارے پر رکھے اس کی طرف رخ موڑے بیٹھا تھا۔

''ہاں...... ضرور کروں گی، بس تم سچ سچ بتانا۔''

''اور وہ نشانی۔'' مزل نے سر کھجایا۔ ''وہ بات تو ادھوری ہی رہ گئی۔''

''توبہ ہے تم سے...... بتاؤ کیا چاہیے؟'' اس نے منہ پھلایا۔

''اب مجھے کیا پتا، یہ تو تم سوچو۔'' لبوں پہ ہنوز میٹھی ہنسی کھیل رہی تھی۔

امیرہ نے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ کوئی چھلا، انگوٹھی، چوڑی، کچھ بھی نہیں تھا۔ بالوں میں ہاتھ پھیرا، کوئی پن، کلپ بھی نہیں تھا، وہ آج بھی سادہ کالا پراندہ باندھے ہوئے تھے۔ نہ رومال، نہ چنی، اس نے گلے پہ ہاتھ مارا۔ چنی تو ہے نا، کچھ سوچ کر امیرہ نے جامنی لان کے دوپٹے کا پلو ہاتھ میں لیا۔ بالشت بھر جتنی جگہ چھوڑ کر کنارے کو پہلے دانتوں سے کترا، پھر دونوں ہاتھوں سے مفلر جتنی پٹی چوڑائی رخ پر پھاڑ کے الگ کر دی۔

''اسے......'' سامنے درختوں پر نظریں جمائے اس کی حرکت سے انجان مزل نے چونک کر امیرہ کو دیکھا۔

''یہ کیا، کیا امیرہ؟'' وہ آنکھیں پھیلائے حیرت سے پھٹے دوپٹے کو دیکھ رہا تھا، جبکہ وہ بے فکری سے ہنستے ہوئے مفلر نما جامنی پٹی اس کی کلائی پر باندھنے لگی۔

''یہ لو...... رکھو اپنے پاس۔''

''پاگل ہو امیرہ۔'' آنکھوں میں سخت ناراضی لیے وہ خراب موڈ کے ساتھ اسے دیکھ رہا تھا۔'' دوپٹا بھی کوئی پھاڑنے کی چیز ہے۔ عورت کی عزت، اس کا پردہ ہے یہ۔'' جانے اس کا چہرا کیوں سرخ ہو گیا تھا۔ امیرہ ابھی تک لاپروائی سے مسکرا رہی تھی۔

''کیا ہو گیا مزل...... کپڑا ہی تو ہے۔''

''صرف کپڑا نہیں ہے امیرہ...... دوپٹے کے تار تار ہونے کا مطلب سمجھتی ہو۔'' وہ غصے سے اٹھ گیا۔

یہ تو سچ مچ بڑا وہمی ہے۔ بالکل دادی کی طرح، امیرہ پہلی مرتبہ قدرے تشویش محسوس کرتے ہوئے اس کے پیچھے آ گئی۔

''اچھا معاف کر دو بابا، بے دھیانی میں ایسا ہو گیا۔''

''میری ہی غلطی ہے، مجھے نشانی کے لیے اتنا زور نہیں دینا چاہیے تھا۔'' اس کا لہجہ قدرے دھیما ہوا، لیکن انداز میں بدستور وہی سنجیدگی تھی۔

''تمہارا دل تو بالکل چڑیا جیسا ہے۔ وہمی بھی

بڑے ہو۔'' اس کے گلابی، نازک ہونٹ ناراضی کے اسٹائل میں اوپر کو چڑھ گئے۔ ''سچ کہا ہے کسی نے، جہاں دو انسانوں کی عادتیں ایک دوسرے سے ملتی ہوں، وہاں آپس میں ان کی بالکل نہیں بنتی۔ میری دادی تمہیں پسند نہیں تھی نا۔ پر عادتیں تمہاری بالکل ویسی ہیں۔''

''یہ غلط ہے کہ مجھے وہ ناپسند تھیں۔'' مزل نے نفی میں سر ہلایا۔

''مجھے ان سے صرف ایک ہی اختلاف تھا کہ اگر وہ اتنی احتیاط پسند تھیں تو الزام لگاتے وقت بھی محتاط رہتیں۔''

''نہیں مزل۔'' امیرہ بھی سنجیدہ ہوئی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی بہر حال دونوں کے بیچ پھر وہی موضوع آ گیا۔

''الزام لگانے کا قصور صرف ابا کے کھاتے میں جاتا ہے۔ وہ بھی تقدیر کی خرابی تھی کہ اس رات وہ ڈھکی میں تھے۔ صبح سویرے لوگوں نے اکٹھا کیا اور انہیں کچھ بھی سوچنے سمجھنے کا موقع نہیں ملا۔ جہاں تک دادی کی بات ہے۔ ان کا ماننا صرف اتنا تھا کہ نشاط بیوہ تھی۔ اسے میل جول، راہ و رسم میں بہت احتیاط سے کام لینا چاہیے تھا۔ عورت پر انگلی اٹھتے دیر کہاں لگتی ہے۔ پھر وہ بیوہ اور جوان ہو تو ہر قدم پھونک پھونک کر اٹھانا پڑتا ہے۔'' وہ روانی میں بولتی جا رہی تھی اور مزل عجیب کھوئی کھوئی نظروں سے اسے دیکھے جا رہا تھا۔

امیرہ ان نظروں کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھی۔ گھبرا کر ایک دم ہی چپ ہو گئی۔ مزل سر جھٹک کر خیالوں سے باہر آیا۔ ایک طویل سرد آہ بھر کر جیسے خود کو زمانہ حال میں حاضر کیا۔ امیرہ نے بھی دھیان بٹانے کی کوشش کی۔

''میرے پاس اور کچھ تھا نہیں مزل۔ بس اسی لیے دوپٹا......''

''کوئی بات نہیں۔'' اس نے کلائی پہ بندھا جامنی کپڑا اتار کر چارپائی کے کونے پر رکھا۔

''جانتی ہو میں نے کیا سوچا تھا۔'' اس نے امیرہ کو شانوں سے تھام کر اپنے مقابل کھڑا کیا۔ پھر ہاتھ اس کی گردن کے پیچھے لے جا کر اس کا پراندہ سامنے کیا۔ سادہ کالے پراندے کا گچھا ہاتھ میں لے کر لمبے لمبے تین دھاگے توڑ لیے۔ اس کی پوری توجہ اپنے کام کی طرف تھی۔ امیرہ مسکراتے ہوئے کبھی اس کی جھکی غلافی پلکوں کو دیکھتی، کبھی اس کے ہاتھوں کو۔

''پکڑو۔''

''ہوں۔'' وہ گڑبڑا کر چونکی۔

''جیسے تم چٹیا بناتی ہو نا۔ وہ کیا کہتے ہیں، بل دے کر۔''

''مینڈھی گوندھنا۔'' امیرہ سمجھ کر مسکرائی اور اس کے ہاتھ سے دھاگے لے کر پہلے ایک سرا باندھا، پھر مزل کے ہاتھ میں وہ سرا دے کر تین موٹے دھاگوں سے مینڈھی گوندھ لی۔

''ہاں یہ ہی۔'' مزل خوشی سے مسکرایا۔ ''اب اسے میری کلائی پر باندھ دو۔ ہمیشہ میرے ساتھ رہے گا۔''

''ہاں اور کالے دھاگے کی وجہ سے نظر بھی نہیں لگے گی۔'' وہ مسکرا کر اس کی کلائی پر باندھنے لگی۔

''ایسے کالے رنگ پہ کیا خاک کسی کی نظر لگنی ہے۔'' وہ خود ہی اپنا مذاق اڑانے لگا، لیکن امیرہ نے سخت خفگی سے منہ پھلایا۔

''خود کو کالا مت کہا کرو مزل۔ ویسے بھی کالی نہیں، سانولی رنگت ہے تمہاری...... پھر اتنی محنت بھی تو کرتے ہو دھوپ میں...... بچپن میں تھوڑی نا ایسی تھی۔''

''اچھا...... اتنا یاد ہے۔'' وہ اس کی آنکھوں میں بھری محبت کو بہت محبت سے دیکھ رہا تھا۔ امیرہ شرما کر مسکائی۔

''دو چار ہی تو ملاقاتیں تھیں۔ بھولنا کیا ہے۔''

''میں بہت خوش قسمت ہوں امیرہ۔'' وہ دو قدم اور اس کے قریب آیا۔

”بچ...... چلتی ہوں مزمل۔ معظمہ راہ دیکھتی ہوگی۔“ وہ گھبرا کر رخ موڑ گئی۔

”اتنی جلدی۔“ وہ کلائی تھام کر اسے روکنے لگا۔

”وہاں تک پہنچتے وقت لگ جائے گا۔“ امیرہ بولی۔

”پھر کب آؤ گی۔“ وہ ابھی تک اس کی کلائی تھامے ہوئے تھا۔

”نہیں مزمل...... اب دوبارہ نہیں۔“ کلائی چھڑا کر اس نے سختی سے سرنفی میں ہلایا۔ ”اس محبت کی منزل میں ملاقاتیں نہیں ہیں۔ تمہیں کچھ سوچنا ہوگا ہمارے بارے میں۔“

”سوچنے کی ضرورت نہیں ہے امیرہ۔ یہ طے ہے کہ تم صرف میری ہو اور تمہیں میرے ہی گھر آنا ہے۔“ وہ ازحد سنجیدہ تھا، لیکن امیرہ چاہ کر بھی خوش نہیں ہو پائی۔

”چاچی کو تمہارے لیے لبنیٰ پسند ہے۔ مجھے وہ کبھی قبول نہیں کرے گی۔“

”اف یہ لبنیٰ!“ مزمل نے چڑ کر ماتھے پہ ہاتھ مارا۔ ”کس نے بتا دیا تمہیں لبنیٰ کے بارے میں۔“

”بس سنا ہے کسی سے۔“ وہ دانستہ بات کو ٹال گئی۔

”بھئی وہ میرے مامے کی بیٹی ہے۔ شاید کچھ دلچسپی بھی رکھتی ہو۔ پر میرا کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ مجھے صرف میری امیرہ چاہیے۔“

”پر کیسے مزمل، اور کب؟“ حقیقت حال دیکھتے ہوئے کافی بے یقین تھی وہ۔

”بہت جلد، ان شاء اللہ۔“ مزمل نے ایک جذب سے پلکیں موندیں۔

”میں جاؤں اب۔“ وہ بھی قدرے اطمینان سے مسکرائی۔

”اکٹھے چلتے ہیں۔ اس بار تم آگے رہنا۔ آبادی قریب آنے پر میں راستہ بدل جاؤں گا۔“ تالا، چابیاں سنبھال کر مزمل نے اسے چلنے کا اشارہ کیا۔ دونوں آگے پیچھے جیب میں ڈالتے اس کے پیچھے بڑھا۔ کھیت اور پکی سڑک کے درمیان چھوٹا نالا تھا۔ امیرہ چھلانگ لگا کر کچے راستے پر چڑھی۔ لیکن اچانک کسی احساس نے بے ساختہ پلٹنے پر مجبور کیا۔ دس، بارہ قدم پیچھے اسی کچے راستے پر پراسو کی بڑی جھاڑی کے قریب ایک موٹر سائیکل کھڑی تھی۔ اور اس کے ساتھ بیٹھا شخص جو اسے ٹھیک کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ......

”اف اللہ۔“ امیرہ لبوں پہ ہاتھ رکھ کر پلٹی۔ وہ رشیدہ ماسی کا بیٹا رجب تھا۔ اس روز کلینک میں ٹکرانے کے بعد سے جو خاموش نظروں سے اسے تکتا رہتا تھا۔ امیرہ گھبراہٹ سے تھوک نگلتی تیز قدموں سے آگے بڑھتی گئی۔ دل ایسا پریشان ہوا کہ ایک بار بھی مڑ کر مزمل کو نہیں دیکھا۔ کچی پکی گلیوں سے ہوتی جلد ہی وہ راجباہ کے کنارے پہنچی، لیکن زیادہ آگے جانے کی نوبت نہیں آئی، کیونکہ معظمہ خود ہی سامنے سے آ رہی تھی۔ دھڑ دھڑ کرتا دل لیے وہ چپ چاپ اس کے ساتھ واپسی کے سفر پر روانہ ہوگئی۔ آنے والے لمحوں میں اس کے لیے کیا لکھا تھا۔ وہ ہرگز اندازہ نہیں لگا سکتی تھی۔

☆☆☆

”بات تو صاف ہے مزمل۔“ نشاط خربوزے سامنے لگائے چھری لہرا کر بات کرتی، خوب ہی پرجوش لگ رہی تھی۔

”ماں، بہنوں کو ناراض کر کے رشتہ کرنا ہے تو ابھی لے آؤ اس امیرہ کو۔ پھر ہم سے کوئی واسطہ، تعلق نہ رکھنا۔ جہاں آٹھ سال ہوئے آدھے گاؤں سے مر، جی ختم ہے، تم سے بھی سہی۔ ایک ایک کر کے سب چھوڑ جانا۔“ وہ چھری تھال میں پھینک کر دوپٹے میں منہ دے کر پھپک پھپک کر رو دی۔

”ارے تو کیوں کرتی ہو مر، جی ختم۔“ مزمل نے تیوری چڑھائی۔ ”ابا نے طے کیا تھا میرا رشتہ اسی کو نبھا رہا ہوں۔ کون سا کسی کو بھگا لانے کی بات کی ہے جو مرن جوگیا ہوئی بیٹھی ہو۔“

”یہ ہی بات تو میری سمجھ میں نہیں آتی۔“ کلثوم نے بھی انٹری ماری۔ ”جنہوں نے رشتہ طے کیا تھا وہ تو رہے نہیں دنیا میں۔ انسان جنید ے بے بخت (ہم زندہ بدبخت) ایک بھی نہیں چاہتا رشتہ کرنا، تو ہٹا کیوں نہیں دیتے اس عذاب کو ہمارے سر سے۔ پتا نہیں کیا رکھا ہے اس نحوست ماری امیرہ میں۔ منہ متھا ہی سونہڑا ہوتا تو بات تھی۔“ کلثوم نے فرانٹے سے جھوٹ گھڑا اور مزمل کچھ بولنے کی چاہ میں بلبلا کر رہ گیا۔ اس کی خوب صورتی دیکھ کر تو وہ اپنی قسمت پہ رشک کرتا تھا۔

”تو ٹھیک ہے، ایک بار دکھا دو مجھے بھی۔ پسند نہ آئی تو توڑ دیں گے رشتہ بھی۔“ ایسے جھوٹوں کے ساتھ چلنے کا یہ ہی ایک راستہ تھا۔ مقابلے کا تہیہ کرتے ہوئے وہ بھی میدان میں اتر آیا۔

”تو سن۔“ نشاط نے غضب ناک انداز اپناتے ہوئے مزمل کو دیکھا اور چارپائی گھسیٹ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”میں آج جا رہی ہوں تمہارے گھر سے اور بنا کسی ناراضی اور جھگڑے کے۔ اب اگر تو مان لیتا ہے ہم سب کا فیصلہ۔ تو کل واپس آ جاتی ہوں۔ لیکن جو تجھے منظور ہے منگنی توڑنا اور اسی امیرہ کو لانا ہے اس گھر میں، تو یاد رکھ مزمل! آج کی گئی دوبارہ جیتے جی نہیں دیکھے گا مجھے اس در پہ۔“ اس نے باقاعدہ چادر جمائی سر پر اور بارہ سال کے توفیق کا ہاتھ کھینچا۔ یہ ہی نہیں بلکہ بنا سلام دعا کے دروازہ بھی پار کر گئی۔

کلثوم نے دبی دبی مسکراہٹ سے بینا کو دیکھ کر گویا اپنی فتح کا اشارہ دیا۔ بینا بھی ہنسی چھپانے کے لیے اندر چلی گئی۔ وہ لبنیٰ کی پکی سہیلی، ایک اسی کو ہی بھابھی بنا کر لانا چاہتی تھی۔ کلثوم جانتی تھی یہ آخری چال کسی قیمت پر ناکام نہیں جائے گی۔ بہنوں سے وفا نبھانے کی عادت تو گھٹی میں ڈالی تھی اس نے۔ اب جس بہن کی خاطر خاندان، برادری سے سالوں کے جھگڑے مول لیے بیٹھا تھا۔ آخر میں آ کر اسی کو چھوڑ دیتا، وہ بھی ایک لڑکی کی خاطر...... یہ تو ممکن ہی نہیں تھا۔ یہ ہی خاندان، برادری جس سے آٹھ برس ہوئے مر، جی ختم کیے بیٹھا تھا۔ طعنے مار مار کر مزمل کا سینہ چھلنی کر دیتے۔

مزمل ایک تھکی تھکی سی آہ بھر کر دروازے سے باہر نکل گیا۔ بہت آسان لگ رہا تھا ماں اور بہنوں کو منانا، امیرہ کو دلہن بنا کر گھر لانا، اس کرموں والی کے ساتھ آنے والی زندگی کا محبت بھرا حسین سفر گزارنا، پر سب خواب و خیال ہوگیا۔ بیوہ ماں، بیوہ بہن کا بھرے جہان میں ایک اکیلا سہارا، کیسے چھوڑ دے انہیں بے یار و مددگار؟ آسان نہیں ہے امیرہ۔ بالکل آسان نہیں ہے۔ وہ نفی میں سر ہلاتا آج ہر دن سے زیادہ مایوس زیادہ دل گرفتہ سا گھر سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

ہاڑ نے تو خوب ہی رنگ جمایا تھا۔ آگ برساتا سورج سویرے ہوتے ہی ماتھے میں گھسا آتا تھا۔

”اللہ جانے لوگ بنا موسم شوسم دیکھے شادیاں کیوں رکھ لیتے ہیں۔“ مامی نصرت سامان باندھنے کے ساتھ ساتھ منہ میں بڑبڑا بھی رہی تھیں۔

”روٹی بچیندین وڑیں (کھانا بچاتے ہیں ارے)“ نانی منہ پہ دوپٹا رکھ کے ہنسنے لگیں۔ مامی کا بھی قہقہہ چھوٹا۔

”دور کا بیاہ ہوتا تو اللہ قسم میں بھی بالکل نہ جاتی۔“ سخت برا منہ بناتے، چادر سر پہ جمائی۔ معظمہ کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔ فیاض پہلے ہی عفیرہ کو بازو پہ اٹھائے باہر نکل گیا تھا۔ شمع بھی اپنے کمرے سے تیار ہو کر نکلی۔

”کہنا اپنی چاچی سے...... کھانا تو بچا لیا۔ مٹھائی بھیجنے میں کنجوسی نہ کرے۔“ نانی اپنا ندیدا پن دکھانے سے باز نہیں آئیں۔ امیرہ افسوس سے سر ہلاتی باہر نکل گئی۔ مامی کے دو پتریروں (چچازادوں) کی ایک ساتھ شادی تھی۔ ہونی تو اپریل میں تھی، پر بقول نانی کھانا بچانے کے لیے سخت گرمی کا انتخاب کیا گیا۔ مامی، ماما اور فیاض نے گرمی دیکھتے ہوئے ہی ایک فنکشن میں شرکت کا فیصلہ کیا تھا۔ بال بچوں سمیت وہ سب کندیاں روانہ ہوگئے۔ اب اگلی دوپہر تک امیرہ نری بوریت کا شکار ہوتی۔ نانی نہیں گئی تھیں اور امیرہ کو تو ظاہر ہے ان ہی کے ساتھ رہنا تھا۔

''تندور تو آج جلانا نہیں تھا، اب دو بندوں کی روٹی کے لیے کیا ایندھن ضائع کرنا۔ امیرہ نے تین روٹیوں کا آٹا گوندھ کر ذرا دیر یکجا ہونے کو رکھ دیا۔ دو دنوں کی سبزی فیاض لے کر دے گیا تھا۔ روٹیاں پکانے کے بعد اس نے بینک (انگاروں کی حدت) پر کچالو تلنے کے لیے چڑھا دیے۔ دو گلاس لسی بنا کر پسینہ پونچھتی اندر کمرے میں آ بیٹھی۔ ارادہ یہ ہی تھا کہ پہلے نہا کر کپڑے بدلے گی اور پھر کھانا کھائے گی۔ بجلی تو آج صبح سے ہی غائب تھی۔ ہاتھ کا پنکھا چلاتے نانی کی کلائی درد کرنے لگی تھی۔ منہ سے واپڈا کے لیے ''خیر کے کلمے'' البتہ روانی سے جاری تھے۔ اس نے کوئی تیسری مرتبہ دوپٹے کے پلو سے اپنی سفید کشادہ پیشانی صاف کی جب نانی نے پیار سے آواز دی۔

''روٹی کھانے کے بعد ایک کام تو کر دے امیرہ۔''

''کام......؟'' وہ بری طرح تھکی۔ ''کام تو ابھی نپٹا کر بیٹھی ہوں نانی اور قسم سے بڑی تھکی بیٹھی ہوں۔''

''او نہ کملی...... گھر کے کام تھوڑی بتا رہی ہوں۔ تجھے تو بس رشیدہ تک جانا ہے۔ کمیٹی کی بات کرنے۔''

''کمیٹی۔'' امیرہ کے ماتھے پر بل پڑے۔ ''کہیں قسط کے پیسے تو نہیں خرچ کر دیے۔'' اسے پہلا شک یہ ہی گزرا۔

''نئیں بھیڑی۔ اٹھارہ تاریخ کو کون سی کمیٹی۔ اس مہینے کی قسط تو چار تاریخ کو تیرے ساتھ ہی دے آئی تھی۔''

''تو پھر کیا کام ہے۔''

''دھیان سے میری بات سن اور دیکھ خبردار جو معظمہ کو بھی بھنک پڑنے دی۔'' نانی کا انداز اچانک مشکوک ہوا۔ امیرہ کا پنکھا چلاتا ہاتھ بے ساختہ تھما۔

''مجھے نا جولائی والی کمیٹی چاہیے۔ اب کمیٹی تو اگلی کلثوم کی ہے۔ اپنا تیرے مزمل کی ماں کی۔''

''کلثوم چاچی کی؟'' امیرہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔ کلثوم چاچی کی کمیٹی پر نانی کی نظر ہونا۔ کچھ اچھے آثار نہیں تھے۔

''گھبراتی کیوں ہے کملی۔ کمیٹی کی وڈیری (انچارج) تو رشیدہ ہے نا۔ وہ خود بات کرے گی کلثوم سے...... بلکہ بات سن۔'' ہونٹوں پہ انگلی رکھ کر ذرا دیر کو نانی نے کچھ سوچا۔ ''میں تو کہتی ہوں سیدھی کلثوم کے پاس ہی چلی جا۔ پہل بھی ہو جائے گی تیری اور کام بھی بن جائے گا۔''

''کیسی باتیں کرتی ہو نانی۔'' کلثوم چاچی کے ہاتھوں ہوئی بے عزتی تصور کر کے امیرہ کو چکر ہی آ گیا۔ نانی کی مفاد پرست طبیعت پر بھی خوب خون کھولا۔

''جس وقت جانا تھا، تب تو نام نہیں لیا اور اب......'' اسے اچانک کچھ خیال آیا۔ ''کمیٹی کا کرنا کیا ہے نانی؟''

''اڑی (ارے) وہ شمع ہے نا۔ شادی پر جاتے ہوئے میرے ذمے لگا گئی ہے۔ فیاض نے چکی میں گندم ڈلوانی ہے۔ مال ختم ہو گیا ہے شودے (بے چارے) کا۔ ادھر تیری مامی تلی بیٹھی ہے کمیٹی لینے کے لیے۔ کہتی ہے سونا سستا ہوا پڑا ہے۔ معظمہ کا ایک تولے سونا لینا ہے۔''

''تو بھر جائی اور فیاض بھرا خود کیوں بات نہیں کرتے مامی سے؟''

''بس تو چھوڑ نا اندر کی باتیں۔ جلدی سے روٹی کھلا اور پھر ہوا میری دھی۔ اب یہ تیری مرضی کہ کلثوم سے بات کرتی ہے یا پھر رشیدہ سے۔''

''تو تم خود کیوں نہیں جاتیں۔ پچھلے پہرا کٹھے چلیں گے۔''

''ہائے نہ۔'' نانی نے فوراً ہاتھ نفی میں ہلائے۔ ''مجھ سے تو دونوں سو طرح کے سوال کریں گی اور میں کملی سیانڑیں۔ چھڑ جاؤں تو اگلے پچھلے قصے کھول بیٹھتی ہوں۔''

''اچھا...... پہلے نہا تو لوں۔ اتنی گرمی میں کہاں ہمت ہو گی کہیں جانے کی۔'' وہ سالن دیکھنے باہر نکل گئی۔

اور اب تپتی دوپہر میں دوراہے پر کھڑی بری طرح مخمصے کا شکار تھی۔ کلثوم چاچی کے گھر جائے یا رشیدہ چاچی کے۔ کلثوم چاچی کے ہاں جانے کا خوب صورت موقع تھا۔ ایسی بھری دوپہر میں تو مزمل بھی گھر پر ہوگا۔ اس کی موجودگی میں تو چاچی بھی زیادہ بے عزتی نہیں کر پائے گی۔ لیکن اگر اس کا لحاظ بھی نہ کیا چاچی نے تو...... تو کیسی سبکی ہو گی مزمل کے سامنے، کیا اوقات رہ جائے گی اس کی نظر میں۔

کیا کروں؟ برگد کے سائے تلے کھڑی وہ سامنے جاتے دوراہے کو دیکھ رہی تھی اور اس کے دو راستوں کو دیکھتی امیرہ ''دوراہے'' کے اصل مفہوم و معنی سے قطعی طور پر انجان' ہرگز یہ تصور نہیں کر سکتی تھی کہ زندگی حقیقتاً اسے ایک عذاب ناک دوراہے پر کھڑا کرنے والی ہے۔ شاید چند ہی لمحوں میں اور بس پھر حتمی فیصلے پر پہنچ کر ایک راستے کو حسرت سے دیکھتی وہ دوسرے پر چل پڑی۔

رجب نے مندی مندی آنکھوں سے دروازہ کھولا تو امیرہ سخت شرمندہ ہو گئی۔ بھلا یہ بھی کوئی وقت ہے کسی کے ہاں جانے کا...... نانی بھی نا ہوا کے گھوڑے پر سوار رہتی ہے۔ اوپر سے پہلا سامنا بھی رجب سے ہو گیا۔ دل میں تو یہ دعا کرتی ہوئی آئی تھی کہ رجب گھر پر موجود ہی نہ ہو۔ ابھی ہفتہ بھر پہلے ہی تو رجب نے اسے مزمل کے ساتھ دیکھا تھا۔ اب پتا نہیں کس کس کو بتا دیا تھا اس نے۔

''چاچی ہیں گھر پر......'' امیرہ نے براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھنے سے گریز کیا۔

''ہوں۔'' وہ قدرے سائیڈ پر ہو گیا۔ امیرہ جھجکتی ہوئی اندر داخل ہو گئی۔ چاچی نے گھر نیا بنوالیا تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح دل ہی دل میں مرعوب ہوتی لمبی ڈیوڑھی سے نکل کر صحن میں آ گئی۔ سامنے دو کمرے تھے۔ وہ کچھ دیر سوچتی رہی، پھر بجائے آگے بڑھنے کے وہیں سے آواز لگائی۔

''چاچی...... رضوانہ......'' اور جواب نہ پا کر آواز کو کھنکھار کر قدرے اونچا کیا۔

''چاچی رشیدہ!''

''نہیں ہے، گھر پر۔'' پیچھے سے رجب کی پرسکون آواز سنائی دی۔ امیرہ متعجب سی مڑی۔ نیند میں سویا سویا رجب تو پوری طرح بے دار نظر آ رہا تھا۔ ہاتھ سینے پر باندھے وہ اسے مسکرا کر یوں دیکھ رہا تھا جیسے پرانی شناسائی ہو اس سے...... امیرہ نے پہلی مرتبہ کچھ عجیب سی سنسنی وجود میں دوڑتی محسوس کی۔ لیکن فوراً ہی اسے اپنا واہم اور شک گردانتے ہوئے سنبھل کر لہجہ سنجیدہ کیا۔

''چاچی نہیں ہیں تو عابدہ یا رضوانہ کو بلا دیں۔''

''وہ بھی نہیں ہیں۔'' معنی خیز مسکراہٹ لبوں میں دبائے وہ چند قدم آگے آیا۔ انہونی کی گھنٹی اندر کہیں بجی اور امیرہ نے جلدی سے قدم دوبارہ ڈیوڑھی کی طرف بڑھائے۔ رجب سے کتراتے ہوئے دانستہ ہی دیوار کی طرف سے ہو کر نکلنا چاہا، لیکن کمال اطمینان تھا رجب کا۔ بنا کسی بوکھلاہٹ یا عجلت میں آئے سہولت سے اس کا بازو دبوچ کر اپنی جانب کھینچا۔

''اتنی بھی جلدی کیا ہے۔ کچھ دیر ہمارے ساتھ بھی بیٹھو۔ دو چار میٹھی باتیں کریں گے۔'' امیرہ اس کی بکواس پر دھیان دینے کے بجائے کانپتے ہاتھوں سے مسلسل خود کو چھڑانے میں لگی تھی۔

''دور ہٹو رجب، چھوڑ دو مجھے......'' وہ چیخنے کے ساتھ ساتھ اپنا پورا زور بھی لگا رہی تھی۔ بالآخر خود کو اس کے چنگل سے چھڑوانے میں کامیاب ہو گئی۔ پھر اسی تیزی سے باہر کی طرف دوڑ بھی لگا دی، لیکن رجب نے اس بار پہلے سے بڑھ کر پھرتی سے اسے جا لیا اور کھینچتے ہوئے اندر کمرے میں لا پٹخا۔ اس نے زور، زور سے چیختے ہوئے مدد کے لیے پکارنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن کمرے میں لاتے ہی رجب نے دروازے کی چٹخنی چڑھا دی تھی۔ گھبراہٹ کا پسینہ گردن سے پونچھتی امیرہ نے کسی خوف زدہ ہرنی کی

طرح اپنے شکاری پر ایک امید کی نگاہ ڈالی۔ اور آخری کوشش کے طور پر اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

"خدا کے لیے مجھے جانے دو...... تمہیں اللہ کا واسطہ، اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ، مجھے ہاتھ مت لگانا۔"

کیوں...... رجب نے ایک پیر پلنگ کے کنارے پر جما کر اس پر اپنی کہنی ٹکائی اور شوخ نگاہوں سے امیرہ کو دیکھا۔ لبوں پہ بدستور ایک مکروہ سی ہنسی کھیل رہی تھی۔ "مزل کہیں کا مہاراجہ ہے کیا۔ اس سے چوری چھپے ملنے میں تو کوئی عار نہیں ہے تمہیں، آج ہم سے بھی مل لو۔ چلو ایک بار ہی سہی۔" اس کے قطعی انداز اور لہجے کی خباثت نے امیرہ کی جان تک نچوڑ لی۔ بولنے کی ہمت بھی جواب دینے لگی۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھانے لگا۔ پیش آنے والے وقت کے بھیانک تصور سے ٹانگوں پر لرزہ طاری ہونے لگا۔ کسی غیبی امداد کے لیے بے ساختہ دل سے دعا نکلی کہ رجب سے اب اچھائی کی توقع عبث تھی۔

"تجھے تو میں اچھی اور شریف لڑکی سمجھ رہا تھا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ تو، تو ہے۔" اس نے بلا لحاظ ایک غلط لفظ استعمال کر کے امیرہ کا دل لہولہان کر دیا۔ دھواں دھواں آنکھوں سے پانی بہہ نکلا۔

"میں ایسی ویسی نہیں ہوں بھرا...... خدا کے لیے مجھ پر ترس کھاؤ، میں منگ ہوں مزل کی۔ ہماری شادی ہونے والی ہے۔ مجھے جانے دو۔" امیرہ نے انتہائی بے بسی محسوس کر کے چہرا اپنے ہاتھوں پر گرایا۔

"چھوڑ بھی دیں گے۔ جلدی کیا ہے۔" مسکراہٹ لبوں پر سجائے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر وہ امیرہ کی جانب بڑھنے لگا۔ امیرہ نے ہمت نہ ہارنے کا عزم کرتے ہوئے لمحے بھر کو کچھ سوچا اور پھر آگے بڑھتے رجب کے سینے پر دونوں ہاتھوں سے زوردار دھکا دیتے ہوئے اسے پلنگ پر گرا دیا اور پلک جھپکتے میں دروازے تک آ گئی۔ لیکن کاش......

کاش کہ رجب نے دروازے کی چٹخنی نہ چڑھائی ہوتی تو وہ آندھی طوفان کی طرح کمرے تو کیا گھر سے بھی باہر نکل جاتی، لیکن یہ ہی چٹخنی گرانے کا دورانیہ بہت کافی ثابت ہوا رجب کے لیے۔ امیرہ کے لحظے بھر کو رکنے کے عمل نے رجب کے اندر بجلی سی بھر دی۔ لپک کر اس نے دروازے میں ہی امیرہ کو کسی بھیڑیے کی طرح دبوچ لیا۔

☆☆☆

لکڑی کا خستہ پرانا دروازہ ایک زوردار آواز کے ساتھ کھلا۔ لوہے کی لٹکتی زنجیر دیر تک دائیں بائیں جھولتی رہی۔ نانی نے چونک کر سر اٹھایا۔ نیم کے سائے تلے ہاتھ کا پنکھا جھلتے وہ امیرہ کا ہی انتظار کر رہی تھیں۔ صحن کے بیچوں بیچ تپتی دھوپ میں کسی غیر مرئی نقطے کو تکتے وہ یوں کھڑی تھی گویا میلے میں گم شدہ بچہ تھک ہار کر بالآخر خود کو بھیڑ کے حوالے کر دیتا ہے۔

"آ گئیں؟" نانی نے مسکرا کر پوچھ تو لیا، لیکن صاف لگا کہ آ کر بھی وہ ابھی آئی نہیں ہے۔ سر پر دوپٹا تو دھرا تھا، پر برے طریقے سے الجھے بال ماتھے سے جھلک کر کچھ الگ ہی کہانی سنا رہے تھے اور پھر اچانک اس خیال کے بے دار ہوتے ہی کہ ہاں وہ اپنے گھر پہنچ چکی ہے وہیں زمین پر گھٹنے گرانے کے سے انداز میں نکالی دھوپ میں ہی بیٹھ گئی۔

"ونئر کملی (ارے پاگل)" نانی پنکھا پھینک کر اس کی طرف بھاگیں۔ "کیا ہوا، ادھر کیوں بیٹھ گئیں، اٹھ شاباش۔" دل میں آئے خدشات کو اپنی ہی تھپکیوں سے سُلاتی وہ اسے بازو سے کھڑا کرنے لگیں۔ جیسے تیسے اسے بازوؤں میں بھر کر چارپائی تک لے آئیں۔ نلکے سے ہی کٹورا پانی کا بھر کر منہ سے لگایا۔

"یا الٰہی خیر۔" برکت کی نگاہ شال کی جانب پڑی اور پانی کا کٹورا ہاتھ سے چھوٹ گرا۔ جانے کیسی پیلی گلابی گرد کا غبار سا اٹھ رہا تھا ادھر سے۔ پر شاید نہیں۔ برکت کی لرزتی نگاہ امیرہ کے آر پار ہوئی۔

کچھ طوفان بلا کے بھاری ہوتے ہیں۔

"کے تھیئے میڈی دھی" (کیا ہوا میری بچی) نانی نے لرزتا ہاتھ امیرہ کے کندھے پر رکھا۔ سر پر رقص کرتی آندھی بھی اس کے انداز میں تبدیلی لانے میں ناکام رہی۔

"بول نا امیرہ...... کلثوم کی طرف تو نہیں چلی گئی تھی۔ کیا کہہ دیا اس مرن جوگی نے۔ بتا امیرہ، وہیں گئی تھی نا۔" تکرار نے اپنی مرضی کا رخ اختیار کیا۔ کاش یہ ہی بات ہو...... کہ اس کی حالت دیکھتے تو یہ ہی غنیمت لگ رہا تھا۔

"مار دو نانی...... مجھے مار دو۔" امیرہ کے حلق سے دھاڑ سی بلند ہوئی، جس نے سائیں سائیں کرتی لال آندھی کے سینے میں شگاف کر دیا۔ دو تھپڑ اپنے منہ پہ رسید کر کے وہ ان ہی ہاتھوں میں چہرا چھپا کر بین کرنے لگی۔ جیسے دل پھٹ رہا ہو اور ضبط کا یارا نہ رہا ہو۔

"نہ ڈرا امیرہ...... کیا ہوا ہے تیرے ساتھ۔" برکت نے پلکوں پر آئی نمی کو ہتھیلی سے رگڑا۔ "کسی نے کچھ کہا؟ کک...... کون...... امیرہ۔" وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔

"رجب نانی؟...... وہ...... وہ۔" امیرہ کے گلے میں گانٹھیں سی پڑنے لگیں۔ "وہ رجب تھا، اکیلا، پر اس نے مجھے نہیں بتایا۔ کچھ باقی نہیں بچا۔ سب ختم ہو گیا، مجھے مار دو نانی۔ میں جینا نہیں چاہتی۔" وہ پھر اپنا ماتھا پیٹنے لگی۔

"دفع...... کک...... کچھ نہیں بچا۔" برکت بی بی نے خود کو سنبھالا دینے کے لیے نلکے کی ہتھی کو تھاما۔ بے رحم آندھی کے تھپیڑوں نے سروں میں خاک ڈال کر رہی سہی کسر بھی پوری کر دی تھی۔

"میں...... میں بلا رہی تھی......" ہچکیوں کے درمیان بے ربط ٹکڑوں میں جانے وہ کیا بولے جا رہی تھی۔ "کبھی تمہیں آواز دیتی، کبھی رشیدہ چاچی، رضوانہ، عابدہ کو، سب کو پر کوئی نہیں آیا۔ کوئی وہاں نہیں تھا نانی۔ پر وہ تو تھا نا۔" مٹی اور آنسوؤں کی گدلی سی لکیر اس کے گال پر اتری۔ وہ اوپر آسمان کو دیکھ رہی تھی۔ "اللہ تو تھا نا۔ اس نے بھی میری مدد نہیں کی...... یا اللہ......" وہ اپنے سر پر تھپڑ مارتی اب دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔

"میرے اللہ...... ایسا کیوں کیا؟ کیوں؟"

گرمی کی حدت سے چہرا لال انگارہ ہو رہا تھا۔ اگر وہ امیرہ کو چپ نہ کرواتیں تو اس کی کوئی نس پھٹ جاتی تھی۔ برکت بی بی نے کھینچ کر اسے نلکے کے نیچے بٹھایا اور بنا سوچے تیز تیز چلانے لگیں۔ ٹھنڈا پانی امیرہ کے سر پر پڑنے لگا تھا۔ وہ اب گھٹنوں میں منہ دیے ہولے ہولے سسک رہی تھی۔ برکت اور تیزی سے نلکا چلاتی جاتیں۔

"مر نہ جائے میری دھی...... رحم کر مالک...... پردہ رکھ لے۔ پردہ رکھ لے مولا۔" وہ ہاتھ چلاتے اب نڈھال سی ہونے لگی تھیں۔

☆☆☆

"میں کل صبح ہی کلثوم کے گھر جاؤں گی۔ اپنا سفید دوپٹا اس کے پیروں میں ڈال دوں گی۔ اگلی پچھلی ساری معافیاں مانگ لوں گی۔ تیری دادی اور تیرے ابا کی غلطیوں کی معافی بھی میں ہی مانگوں گی۔ سب ٹھیک ہو جائے گا امیرہ...... دیکھنا کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہو گی اور اچھی طرح نپٹ جائے گا۔ بس کس طرح یہ معافی تلافی ہو گئی تو شادی کی تاریخ بھی فوراً ہی رکھوا دوں گی۔ بچڑی میڈی کڑی بڑی (بچی میری دلہن بنے گی۔) تے۔"

"بس کرو نانی...... مشکلیں کھڑی نہ کرو۔" آنسو پینے کی کوشش میں امیرہ نے پورا نچلا لب کاٹ ڈالا۔ "ابھی تو فیصلے آسان ہوئے ہیں۔" جیسے بیماری سے طویل جنگ لڑنے والے مریض پر اچانک موت آسان ہو جائے، ویسے ہی ایک عجیب کرب انگیز مسکراہٹ نے لبوں پہ ڈیرہ جمایا۔ تاروں بھرے آسمان کو تکتے دونوں کی نگاہیں آنے والے کل پر ٹکی تھیں۔

نانی اپنی جگہ بالکل درست تھیں کہ مصلحت کے

تخت چولا بدلنا ان کے لیے بہت آسان تھا۔ لیکن ٹھیک تو آج امیرہ بھی تھی۔ مزمل سے بے جا توقعات باندھتے ہوئے اس نے کبھی اس کی مشکلات کے بارے میں نہیں سوچا۔ امید باندھی تو بس ایک کہ وہی حالات کو حق میں کرنے کی راہیں ہموار کرے۔ توڑ دے ساری دیواریں، پھلانگ ڈالے ساری مشکلات...... محبت کے نام پر اگلے کو آزمائش میں ڈالنے سے زیادہ سہل اور کیا ہو سکتا تھا۔

آگے جانے اس کی بلا کہ کیسے ہوں گے یہ دریا عبور۔ یہ تو وہی جانے جس نے عشق کا دعوا کیا ہے۔ لیکن دراصل کتنا کٹھن ہے کسی کڑے فیصلے کی کسوٹی پر خود کو کھڑے پانا۔ پھر وہاں کھڑے ہو کر مشکل ترین فیصلے کرنا۔

آج فیصلوں کا اختیار امیرہ کے ہاتھ میں آیا تو اسے پتا چلا کہ عشق کا اصل امتحان دراصل کیا ہوتا ہے۔ محبوب کو مشکل میں ڈالنا کچھ اور ہے اور مشکل سے نکالنا...... امیرہ کے لیے اپنی جان نکال کر رکھ دینے جیسا تھا۔ پھر بھی وہ ثابت قدم تھی کہ "ہو چکے" نقصان کے بعد کوئی سودا اب گھاٹے کا نہ لگتا تھا۔

"چاچی کلثوم کے گھر جانے کی اب کوئی ضرورت نہیں ہے۔" اس کا برف لہجہ نانی کو بری طرح ڈرا گیا۔

"کیوں ضرورت نہیں ہے کملی...... بس بھول جا جو ہوا...... کسی کو اس معاملے کی کانوں کان خبر نہ ہو...... بس تو، تے اللہ۔ نانی نے انگلی اٹھائی۔ "اس پر چھوڑ دے انصاف کا معاملہ، اور پی جا اس حادثے کو۔"

"بس تو، میں، تے اللہ۔" امیرہ زخمی مسکراہٹ سے دہرائی کروٹ بدل گئی۔ "کوئی اور بھی تو ہے نانی...... تیرے، میرے اور اللہ کے سوا۔" اس کی نگاہوں میں ایک خوش شکل، خوش لباس شہری کا مکروہ چہرا گھوم گیا اور وہ جانتی تھی کہ اب اسے کیا کرنا ہے۔

☆☆☆

"ہائے امیرہ...... اسے کیا ہوا؟" معظمہ پھٹا ہوا جامنی دوپٹا ہاتھوں پہ پھیلائے حیرت سے کھڑی تھی۔

"یہ تو نیا نکور تھا بالکل۔"

"میں بھی تو ایسی تھی۔" خالی خالی آنکھوں سے وہ کھلے جامنی دوپٹے کو حسرت سے دیکھے گئی۔ نہ جانے کیسے پلکوں کے گوشے بھیگ گئے۔ رندھے گلے اور نم آواز پر قابو پانا بھی مشکل ہو گیا تو چہرا ہاتھوں میں دے کر رو پڑی۔ معظمہ حیران سی دوپٹا چھوڑ کر اس کے قریب آئی۔

"کیا ہوا امیرہ۔ رو کیوں رہی ہے۔ ارے پاگل، کوئی چنی کے لیے روتا ہے ایسے۔" معظمہ بھی انجانے میں کیسے کیسے کھرنڈ چھیل رہی تھی۔

"دوپٹے کے تار تار ہونے کا مطلب سمجھتی ہو؟" کانوں میں مزمل کے ناراض لہجے کی بازگشت سنائی دینے لگی۔ امیرہ روتے ہوئے کمرہ چھوڑ گئی۔ معظمہ کے سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا اس کے پاس۔ لیکن دروازے سے نکلتے ہی اسے ٹھٹک کر رک جانا پڑا۔ نانی برقع سر پہ جمائے ڈیوڑھی کی طرف جا رہی تھیں۔ انداز میں مشکوک سی عجلت دیکھ کر امیرہ پل میں معاملے کی تہ تک پہنچ گئی۔ ہتھیلی سے آنکھیں رگڑ کر فوراً نانی کو جا لیا۔

"کہاں جا رہی ہو؟" وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر ان کے سامنے آئی۔

"وہ...... میں۔" برکت بی بی بری طرح بوکھلا گئیں۔ "یہیں کمیٹی کا پتا کرنے۔" گھبراہٹ پہ قابو پا کر فوراً بہانہ گھڑا۔

"میں سب جانتی ہوں نانی۔" وہ پانی بھری آنکھوں میں عجیب چٹانوں کی سی سختی لیے کھڑی تھی۔ "تمہیں سب کمیٹیاں بھول گئی ہیں۔ اس خسارے کی راہ میں کوئی کمیٹی نہیں آتی۔ واپس چلو نانی۔"

"جانے دے امیرہ...... تجھے اللہ کا واسطہ...... نہ روک۔" وہ بھی ضد پہ اڑ کر سائیڈ سے نکلنے لگیں۔

"اگر تم باہر گئیں نانی، تو پیچھے میں سب کو بتا دوں گی۔"

"چپ او تری۔" نانی نے تڑپ کر ہاتھ اس کے منہ پر رکھا۔ تب ہی دروازے سے فیاض گھر میں داخل ہوا۔ ایسی شدید گرمی میں دونوں ڈیوڑھی میں کھڑی تھیں۔ اس نے تعجب سے باری باری دونوں کی صورت دیکھی۔

"خیر تو ہے۔ یہاں کیوں کھڑی ہو دونوں؟"

"دیکھو نا فیاض بھرا۔ تتی (گرم) دوپہر میں پتا نہیں کس سے ملنے جا رہی ہیں۔"

"اندر چلو دادی۔ بے ہوش ہو کے موئی (مری) پڑی ہو گی کہیں۔" فیاض نے پلٹ کر باقاعدہ دروازے کی کنڈی لگا دی۔ امیرہ نے چبھتی نگاہوں سے نانی کو دیکھا اور بنا کچھ کہے برقع ان کے سر سے اتار کر بغل میں دبا لیا۔

"مار میکسی میکوں" (مجھے مار ڈالے گی یہ) وہ تھکے قدموں سے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ اپنے مشن کو کسی اور وقت پر کر لینے کی سوچ لیے اور سوچ تو امیرہ نے بھی پڑھ لی تھی نانی کی۔ تب ہی دل میں کچھ طے کر کے خود بھی کمرے میں داخل ہو گئی۔

☆☆☆

رشیدہ چاچی کے گھر میں ایک ہی مرد تھا (وہی نامرد) اور رات کے ایسے پہر اصولاً اسے ہی دروازے پر آنا چاہیے تھا۔ امیرہ نے سوچ لیا کہ دستک دے کر اوٹ میں چھپ جائے گی اگر رجب کے علاوہ کوئی اور دروازے پر آیا تو خود کو ظاہر نہیں کرے گی۔ پر قسمت نے یاوری کی اور دروازے کے پار سے رجب کی آواز سنائی دی۔ بزدل نے دروازہ کھولنے کی ہمت نہیں کی تھی۔ ڈرپوک کہیں کا۔

"دروازہ کھولو رجب...... میں امیرہ ہوں۔" وہ بالکل نزدیک آ کر بولی۔

"کک...... کیوں...... کیوں آئی ہو اس وقت۔" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد رجب کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

"تم سے ضروری بات کرنی ہے۔ اگر دروازہ نہ کھولا تو صبح تک بجاتی رہوں گی۔ پھر یاد رکھو کہ تمہاری اماں دروازے پر آئی تو مجھے اسی کو وجہ بتانی پڑے گی۔ اب ظاہر ہے یہ تو تم چاہو گے نہیں۔" امیرہ نے اس بار قدرے اعتماد سے وضاحت کی، لیکن آگے سے مکمل خاموشی چھا گئی۔

یقیناً وہ کسی حساب کتاب میں مصروف تھا۔ پھر چند لمحوں بعد دروازہ بھی کھل گیا۔ رجب بجائے اس کے گھبرائی نظروں سے اس کے پیچھے دیکھ رہا تھا کہ کہیں وہ گاؤں بھر کو ساتھ تو نہیں اٹھا لائی، لیکن اسے اکیلے پا کر اعتماد بھی خود بخود بحال ہو گیا۔ آواز بھی قدرے بارعب سی نکالی۔

"کیا مصیبت ہے...... یہ کون سا وقت ہے کسی کے گھر آنے کا۔" وہ اب تلخی سے بات کرتے کڑی نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔

"بات کرنی ہے تم سے......"

"پاگل ہو تم...... ابھی کیا بات کرنی ہے۔" وہ اب مڑ کر گھر کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"ہاں۔ ابھی کرنی ہے۔ صبح آئی تو تمہارے لیے مشکل ہو جائے گی۔ چاہو تو واپس جا کر چاچی سے کہہ دو کہ باہر دوست آئے ہیں، ضروری کام ہے۔ میں وہاں درخت کے نیچے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔" امیرہ حتمی انداز میں کہتے نیچے اتر گئی۔ رجب سخت کوفت کے عالم میں واپس مڑا اور تھوڑی ہی دیر میں جز بز ہوتا اس کے نزدیک آیا۔

"بولو...... کیا کہنا ہے اور دیکھو مجھے دھمکانے کی بالکل کوشش مت کرنا۔ میں صاف مکر جاؤں گا۔"

"مجھ سے شادی کر لو......" نم آنکھوں میں کرب کی لہریں سی کروٹیں رہی تھیں...... لیکن رجب جیسے عقل کے اندھوں کو کہاں کچھ دکھائی دیتا ہے۔

"واٹ؟......" گھٹی گھٹی سی چیخ بے ساختہ اس کے حلق سے نکلی۔ آنکھیں باہر کو نکالے وہ یوں امیرہ کو گھور رہا تھا جیسے اس سے بڑی انہونی کوئی نہ ہو۔

"میں پاک دامن تھی رجب۔" آنسوؤں کو پیچھے دھکیلنے کی کوشش میں اس کا بھرایا لہجہ ٹوٹ ٹوٹ

گیا۔ رجب جوش میں کچھ بولتے بولتے ایک دم چپ ہوگیا۔ کچھ بے ربط جملوں کے پیچھے کی داستان اتنی جامع اتنی مکمل ہوتی ہے کہ اسے جواب کی ضرورت نہیں ہوتی۔

’’ساری عمر میں عزت سے تمہارے گھر گزاردوں گی، بس ایک بار کسی طرح اپنی اماں کو منا کر ہمارے گھر بھیج دو......ہم......‘‘

’’اور اگر میں ایسا نہ کروں تو......‘‘ وہ اب خود کو جھٹکے سے نکال چکا تھا۔

’’تو میں اپنی جان دے دوں گی۔‘‘ بنا لمحہ ضائع کیے امیرہ نے اپنی زخمی نگاہ اس بے رحم شیطان کی جانب اٹھائی۔

’’لیکن یاد رکھو رجب......تمہیں گاؤں بھر میں بدنام کرنے کے بعد ہی دنیا سے جاؤں گی......تم ہی دیتے رہنا پیچھے زمانے کو صفائیاں۔‘‘

امیرہ نے حتمی لہجے میں فیصلہ سنایا تو رجب مکروہ سی ہنسی ہنس دیا۔ اس نے طے کرلیا تھا کہ صبح ہوتے ہی پہلی بس سے وہ شہر چلا جائے گا، لیکن تقدیر اس کے ارادوں پر مسکرا رہی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ اب کبھی شہر نہیں جا پائے گا۔

☆☆☆

ملک یار کی زمینوں کو پانی پورا نہیں مل رہا تھا اور یہ تیسری مرتبہ تھی۔ اب یا تو پانی پیچھے کہیں چوری ہو رہا تھا یا نہر میں شگاف پڑنے سے پانی کا راستہ بدل گیا تھا اور یہی کھوج لگانے کے لیے مزمل اور رحمت نے رات کا انتخاب کیا تاکہ پانی نہر میں رواں ہوجائے تب پیچھے سے چیک کرتے ہوئے آیا جائے اور پتا تو فوراً ہی چل گیا تھا۔ پانی چوری کا واقعی مسئلہ نہیں تھا۔ پچھلی سیلابی بارش کی وجہ سے کچی نہر کے بند ٹوٹ گئے تھے۔ سارا پانی بنجر میدانوں کی نذر ہوکر بے کار ضائع ہو رہا تھا۔

تین گھنٹوں کی سخت محنت کے بعد بالآخر دونوں نے نہری راستہ دوبارہ رواں کردیا تھا اور اب رقبے کا چکر لگا کر انہوں نے گھر کی راہ لی تو رات آدھی سے کچھ زیادہ بیت چکی تھی۔ ٹارچ صرف مزمل کے پاس تھی اور اس کا گھر بھی بعد میں آتا تھا۔ اس نے رحمت کو پہلے اس کے گھر چھوڑنے کا ارادہ کیا۔ دونوں نے ہی ہاتھوں میں ڈنڈے سنبھال رکھے تھے۔ گاؤں کے ماحول میں رات کے وقت یہ لازمی ہتھیار تھا۔ کتے تو خیر بھونکتے ہی تھے رات بھر...... ویرانوں میں اچانک سانپ وغیرہ بھی نکل آیا کرتے تھے۔ پراسکو کی جھاڑیاں یہاں وہاں ہر جگہ پھیلی تھیں۔ ٹارچ کی تیز روشنی کچے راستوں پر ڈالتے اس نے رحمت کو پہلے اس کے گھر چھوڑا اور نسبتاً مختصر راستے کا انتخاب کرتے ہوئے برگد والی گلی میں داخل ہوا۔ احتیاطاً دور تک ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ گلی خالی پڑی تھی۔

اور ایسا مزمل کو پہلی نظر میں لگا کیونکہ روشنی پڑتے ہی اچانک سفید کپڑوں میں ملبوس ایک لڑکا درخت کے نیچے سے نکل کر مخالف سمت کو بھاگا اور ایک گھر میں داخل ہوگیا۔ مزمل اس کارروائی کے دوران کافی آگے تک آچکا تھا۔ لڑکے کو اس نے پہچان لیا تھا۔ وہ کمیٹی والی رشیدہ ماسی کا بیٹا رجب تھا......حیران نظریں پلٹ کر درخت تک آئیں جس کے نیچے وہ کھڑا تھا اور یقیناً اکیلا نہیں تھا......وہاں کوئی اور بھی تھا بلکہ......کالی چادر کا کونا لہرایا۔ بلکہ ...بھی‘‘۔ اور وہ جو کوئی بھی تھی اس نے ڈرنے یا بھاگنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ گھبراہٹ کا ایک ردعمل شاید یہ بھی ہے۔

مزمل نے سیدھے کالی چادر والی کے چہرے پر روشنی ڈالی جس نے عجلت میں اسی وقت چہرا چھپانے کی شعوری سی کوشش کی، لیکن ٹارچ کی روشنی تب تک اس کے چہرے پر پڑ چکی تھی۔ اس وقت تک امیرہ کو بھی ہرگز یہ اندازہ نہ تھا کہ گلی میں اچانک داخل ہونے والا وہ شخص کوئی اور نہیں بلکہ مزمل ہے۔

’’ا......م......میرہ......‘‘ وہ بھاگ کر اس کے

نزدیک آیا۔ حیران حیران نظروں سے سر سے پیر تک اسے دیکھتا جاتا اور سوچتا جاتا کہ رات کے اس پہر وہ یہاں کھڑی کیا کررہی ہے۔

’’تت......تم یہاں کیا کررہی ہو......اس وقت......اور......‘‘ اس نے سوال کرتے مڑ کر رشیدہ چاچی کے گھر کی طرف دیکھا۔ ’’اور......رجب......؟‘‘

امیرہ نے تب تک بڑی مشکل سے خود کو سنبھال کر سانسوں کا ردھم ہموار کیا۔ ایک قیامت آچکی تھی، شاید دوسری کا سامنا تھا......لیکن نہیں......ذہن نے بڑی سرعت سے کام شروع کردیا...... امیرہ نفع نقصان کے حساب کتاب سے بڑی جلد باہر نکل آئی۔

کام تو مزید آسان ہوگیا تھا۔ جسے اپنے ہاتھوں کھونے کا ارادہ کرچکی تھی۔ اسے خود سے بدگمان کرنے کا اس سے بہترین موقع بھلا پھر کیسے ملتا۔ چلو اچھا ہے مزمل کے لیے بھی ایک بے وفا کو بھلانا آسان ہوجائے گا۔ اس نے بھرپور اعتماد سے سر اٹھایا۔ کانٹوں بھری راہ کا انتخاب تو کرہی چکی تھی۔ اب تو بس ننگے پاؤں پہلا قدم اٹھانا تھا۔ خود کو لہولہان کرکے آگے بڑھنے کی پہلی منزل شاید آن پہنچی تھی۔

’’مجھے رجب سے کچھ کام تھا۔‘‘ اس نے سرد بے تاثر نگاہ مزمل کی طرف اٹھائی۔

’’رجب سے کیا کام تھا؟ وہ بھی اتنی رات کو......‘‘ مزمل بے یقینی سے اس کا چہرا تک رہا تھا۔ ’’گھر میں سب خیر تو ہے ناں......تیری نانی ٹھیک ہے......؟‘‘ وہ جانے کیا سوچ رہا تھا بہرحال ایسا کچھ نہیں سوچ رہا تھا جو اس لمحے امیرہ چاہ رہی تھی یا شاید کوئی بھی دیکھنے والا سوچتا۔ اب معلوم نہیں وہ سیدھا بہت تھا یا......یا پھر اس پر اعتبار......امیرہ نے اس کا شک ابھارنے کی کوشش میں انداز بدلا۔

’’میں وجہ نہیں بتا سکتی مزمل......مجھے جانے دو۔‘‘ لہجے میں گھبراہٹ ظاہر کرتے ہوئے نظریں چرا کر اس نے سائیڈ سے نکلنا چاہا تب وہ صحیح معنوں میں چونکا۔

’’رکو امیرہ......‘‘ مزمل نے کلائی پکڑ کر اسے روکا۔ ’’کیا نہیں بتا سکتیں؟‘‘

’’جانے دو مزمل، چھوڑو مجھے......‘‘ اس نے لہجہ انتہائی حد تک سنجیدہ کیا، لیکن گم صم خالی نظروں سے اسے تکتا مزمل اب کچھ اور سوچ رہا تھا۔

’’چلو میرے ساتھ......‘‘ اس نے جھٹکے سے امیرہ کا ہاتھ کھینچا اور واپس اسی راستے پر چل پڑا جہاں سے آیا تھا۔ دو گلیاں گزرتے ہی کھلی جگہ آگئی۔ دائیں جانب گھر تھے اور بائیں طرف کھیتوں کا طویل سلسلہ......وہ بدستور اسے کھینچے چلا جارہا تھا اور جوں ہی ملک یار کی زمین آئی، وہ اسے لیے کھیتوں میں گھس گیا اور پگڈنڈیوں سے گزرتا ہوا رقبے کے بیچوں بیچ موجود ٹیوب ویل تک لے آیا۔ یہاں آس پاس بے شمار درخت تھے۔ رات کے اس پہر یہاں کسی کے آنے کا قطعاً کوئی امکان نہیں تھا۔ مزمل نے دھکا دینے کے انداز میں اسے منڈیر پر بٹھایا۔

’’اب بتاؤ......کیوں تھیں تم رجب کے ساتھ......وہ بھی آدھی رات کو......بولو امیرہ......‘‘ اب کی بار مزمل نے صحیح استفسار کیا۔ امیرہ نے ڈھٹائی سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

’’ہم شادی کررہے ہیں۔ بہت جلد۔‘‘

’’یہ کیا بکواس ہے؟‘‘ وہ بے یقینی سے چلایا۔

’’یہی سچ ہے مزمل......وہ مجھ سے پیار کرتا ہے اور اب میرا دل بھی بدل رہا ہے۔ وہ پڑھا لکھا ہے، دولت مند ہے، پھر رشتہ لانا چاہتا ہے تمہاری طرح وعدوں پر نہیں لٹکائے گا......تم......‘‘ اس نے منہ پھیرا

’’تم بھول جاؤ مجھے اور جانے دو مجھے......میں نہیں چاہتی کوئی اس وقت مجھے تمہارے ساتھ دیکھے۔‘‘

’’کب سے چل رہا ہے یہ سب......؟‘‘ غیر متوقع طور پر مزمل نے انتہائی تحمل کا مظاہرہ کیا۔

’’وہ......میں......کمیٹی کی قسط دینے چاچی رشیدہ کے گھر جاتی تھی ناں......تو وہیں پر ملنا ہوتا

تھا۔ وہ...... وہ بہت پیار کرتا ہے مجھ سے......'' امیرہ نے بڑی مشکل سے اپنے آنسو پیے۔

''غلط کہہ رہی ہو امیرہ......'' مزمل نے بازو سے پکڑ کر اسے اپنے مقابل کھڑا کیا۔ ''ادھر میری آنکھوں میں دیکھو...... مجھے یقین نہیں آرہا اس کہانی پر...... مجھے سچ سننا ہے امیرہ۔ صرف سچ...... کہیں تم مجھ سے بدلہ تو نہیں لے رہیں۔ دیکھو میں ہر قصور کی تلافی کرنے کو تیار ہوں۔ ہر حال میں اپنے گھر والوں کو مناؤں گا۔ کبھی شکایت نہیں کروں گا تمہاری مرحومہ دادی کی، نہ نانی کی۔ بس صرف تم اور میں...... پھر ہم مل کر......''

''بس کرو مزمل...... بس کرو......'' امیرہ کے لیے خود کو روکنا مشکل ہوگیا۔ وہ تو پیر پکڑنے کو تیار تھا۔ امیرہ ہچکیوں سے رونے لگی۔

''اب کچھ مت کہو مزمل! میں بہت آگے جا چکی ہوں۔ کبھی تمہاری نہیں ہوسکتی...... مجھے صرف اسی سے شادی کرنی ہے۔'' وہ دونوں ہاتھوں میں چہرا چھپائے بین کررہی تھی۔

''وہ تم سے شادی نہیں کرے گا۔ امیرہ......'' مزمل کی ٹھنڈی ٹھار آواز نے میزائل توڑا تھا۔ امیرہ کے حواسوں پر...... وہ رونا بھول کر اسے دیکھے گئی۔

''کک۔ کیوں نہیں کرے گا۔ اسے کرنی ہوگی مجھ سے شادی۔ ورنہ......''

''وہ بہت عیاش لڑکا ہے...... بے شمار سہیلیاں ہیں اس کی، کبھی کسی ایک کا ہو کر نہیں رہ سکتا۔''

''ایسا نہیں ہوسکتا۔ وہ ضرور کرے گا مجھ سے شادی۔ ورنہ میں اپنی جان دے دوں گی۔'' وہ بے تحاشا روتی وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی، لیکن مزمل نے جلد ہی اسے جالیا۔ امیرہ کا جنونی انداز اب اس کا دماغ خراب کرنے لگا تھا۔ دماغ پہ دھواں سا چڑھنے لگا۔ ایک بار پھر اس کا رخ اپنی جانب موڑا، لیکن وہ رکنے کو تیار نہیں تھی۔ مسلسل ہاتھ چھڑانے کے درپے تھی۔ مزمل کی کنپٹیاں سلگنے لگیں۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ اور دو طمانچے اس کی گال پر جڑ دیے۔

''ہوا کیا ہے تمہارے ساتھ...... بولو امیرہ...... کیا کہا ہے رجب نے تمہیں۔ جواب دو...... جواب دو......'' وہ اسے شانوں سے پکڑ کر ہلا رہا تھا۔ ''بولو ورنہ گردن دبا کر یہیں گاڑ دوں گا۔''

''ہاں...... دبا دو میری گردن......'' وہ زور سے چلّائی۔ ''لے لو میری جان۔ مار ڈالو مجھے...... مار ڈالو مزمل...... میں جینا نہیں چاہتی۔ نہیں جینا چاہتی۔'' وہ اور زیادہ شدت سے چلانے لگی۔

''سچ سچ بتاؤ امیرہ۔ کیا ہوا ہے۔ خدا کے لیے میری جان مت نکالو۔ بولو امیرہ...... بولو......''

''تو سنو......'' وہ الٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگی۔

''جس دوپٹے کے پھٹنے پر تم خفا ہورہے تھے...... ہو چکا وہ تار تار...... اس عزت کے دشمن نے کچھ نہیں چھوڑا...... لٹ چکی تمہاری امیرہ...... نہیں رہی تمہارے قابل...... نہیں رہی مزمل...... نہیں رہی امیرہ......'' وہ روتے روتے وہیں زمین پر بیٹھ گئی اور مزمل تو جوابًا کچھ بھی بولنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ وہ ہی بولتی چلی گئی۔ شروع سے آخر تک حرف حرف اسے سب سچ بتادیا۔

''رات کے اندھیرے میں آج یہاں اس کی منّت کرنے آئی تھی کہ وہ مجھے اپنے گھر کی عزت بنالے...... میں اب تمہارا سامنا بھی کرنا نہیں چاہتی تھی مزمل...... ہمارے بیچ سب ختم ہو چکا...... سب بکھر گیا۔ اب کوئی خواب ان آنکھوں میں سج نہیں سکتا۔ کوئی آرزو پوری نہیں ہوسکتی، کوئی بھی نہیں۔'' تواتر سے روتے، اپنی بے بسی بیان کرتے، وہ ابھی تک وہیں زمین پر بیٹھی تھی۔

''اٹھو......!'' مزمل کی سرد آواز بلا کی مایوس کن اور بجھی بجھی سی تھی۔

''گھر جاؤ اپنے......'' وہ یقینا تھا تو وہیں قریب ہی، لیکن بہت دور ہو چکا تھا شاید...... امیرہ کو اپنا لٹا پٹا وجود خود ہی سمیٹ کر اٹھ کھڑا ہونا پڑا۔ کچھ دیر پہلے

شانوں سے تھام کر حق جتاتے انداز میں اسے مقابل کھڑا کرنے والا ''اب'' اسے چھونے کا روادار بھی نظر نہیں آتا تھا۔ وہ چادر لپیٹتی آگے بڑھی تو مزمل اس سے پہلے ہی لمبے لمبے ڈگ بھرتا آگے بڑھ گیا۔ نہ اس نے امیرہ پر نظر ڈالی نہ ہی ایک بار بھی مڑ کر دیکھا۔ سنسان راہوں پر رات کی تاریکی میں اکیلی نکلنے والی آپ ہی جانے کہ اسے کہاں جانا ہے۔ وہ تو آبادی کے کچے مکانات آتے ہی اپنے گھر کے راستے کو مڑ گیا تھا۔

دوراہے پر کھڑی امیرہ آج مخمصے کا شکار تو نہ تھی کہ کسی طرف کو جائے البتہ اس بے مہر کی پشت کو دیکھتے ہوئے حیران ضرور تھی۔ جس سے خود ہی ناتا توڑا تھا یہ سوچ کر کہ اب وہ اپنے آپ کو اس کے قابل نہیں سمجھتی تھی۔ اس کی یک لخت بے رخی پر افسردہ ضرور ہوگئی تھی۔

کچھ امیدیں یہ دیوانہ خوش فہم دل بلاوجہ بڑے غرور سے باندھ لیا کرتا ہے۔ پھر جب وہ امید ٹوٹتی ہے تو تھوڑا سا کسی گوشے سے خود بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ ٹوٹا دل لیے وہ بھی افسردہ سی اپنے گھر کی راہ پر مڑ گئی۔

ایویں جلدی چھوڑ کے ٹرپے ہو
اساں اجڑے ہیں کوئی موئے تاں نہیں
(ایسے جلدی ہمیں چھوڑ کر چل پڑے ہو، ہم برباد ضرور ہوئے ہیں، لیکن ابھی مرے تو نہیں)

☆☆☆

کارواں سست راہبر خاموش
کیسے گزرے گا یہ سفر خاموش
چڑھتے دریا کا ڈر نہیں یارو
میں ہوں ساحل کو دیکھ کر خاموش

باوجود دو نفوس کی موجودگی کے کمرے کی فضا میں عجیب وحشت ناک سا سناٹا چھایا تھا۔ سکوت اور گہری چپ جب وجود کا احاطہ کرلیتی ہے تو انسان خود سے ہمکلام ہوتے بھی ڈرتا ہے۔ وہ دونوں ہاتھوں کو مٹھی کے انداز میں ایک دوسرے میں پھنسائے کھوڑی کے نیچے رکھے بان کے موڑھے پر یوں بیٹھا تھا کہ دونوں کہنیاں گھٹنوں پر ٹکا رکھی تھیں۔ ویران آنکھوں میں بے چینی سی تیرتی تھی۔ لب ایک دوسرے میں پیوست گویا مدتوں نہ بولنے کی قسم کھائے ہوئے تھے۔ جانے کس غصے کی شدت کا اظہار تھا کہ دانتوں پر دانت زور سے جمائے تو کنپٹیوں پر سبز پتلی لکیر سی ابھر کر اس کے اندرونی خلفشار کا اظہار کرنے لگی۔ خاموشی اتنی تکلیف دہ تھی کہ امیرہ کو اپنی چوڑی کی ہلکی سی کھنک بھی نرا انتشار اور خرابہ محسوس ہورہی تھی۔

''اتار دو......'' تیسری بار کی ہلکی کھنک پر بنا نظریں اٹھائے اس نے پھولے نتھنوں سے آرڈر دیا۔ امیرہ نے کپکپاتی انگلیوں سے ڈھیلے ڈھالے کانچ کے سیٹ کو کلائی سے نکال کر قریبی میز پر رکھ دیا۔ آنکھیں شدت سے برسنا چاہتی تھیں، پر وہ بنا روئے بنا کچھ کہے یہیں اسی کمرے میں دفن ہوجانا چاہتی تھی۔

معظمہ نے اسے پائل بھی پہنائی تھی۔ ذرا سا پیر ہلاتی تو اس کی آواز کی وحشت شاید کانوں کے پردے چاک کردیتی۔ اس نے دھیرے سے ہک کو چٹکیوں میں لے کر پائل کو پیر سے آزاد کرلیا اور دونوں پاؤں آہستہ سے پیچھے کو سمیٹ لیے۔ دوپٹے کے اندر ہی بالیاں، ہار، ٹیکا بھی جسم سے جدا کرکے بے آواز طریقے سے پرس میں ڈال دیے۔

کمرے کی درد بھری خاموشی میں وہ ایک سسکی کی آواز ابھری تھی۔ انگلی سے انگوٹھی اتارتی امیرہ کا ہاتھ وہیں تھم گیا۔ گھونگھٹ کے اندر سے بے ساختہ نظر اٹھی۔ وہ دونوں ہاتھوں میں چہرا دیے ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ لمحے شاید اختیار کی حدوں سے دور نکل گئے تھے۔ بے اختیاری نے ضبط گریہ کے بندھن توڑ دیے۔ اس کی سسکیوں میں اضافہ ہوا۔ امیرہ تڑپ کر اس کے قدموں میں آئی۔ ہاتھ بے ساختہ اس کے گھٹنوں پہ رکھنا چاہا، لیکن پھر بیچ راستے میں

واپس کھینچ لیا۔ کپکپاتے ہونٹ دانتوں میں بھینچے وہ اپنے آنسو اپنے اندر گرانے لگی۔

”تجھے تو عمر بھر رونا تھا بدبخت امیرہ، کیوں اسے بھی اپنے آنسوؤں کا حصے دار بنا ڈالا۔ کہہ دیتیں معاملات کو حد تک پہنچانے والوں کو کہ نفع کا یہ سودا نہیں ہے مجھے منظور۔“ اپنے آپ کو دل ہی دل میں کوستی وہ دھواں دھواں برستی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔ سرخ چہرے اور بھیگی گلابی آنکھوں کو جو بار بار آستینوں سے رگڑتا جا رہا تھا۔

”کیوں کرلیا اتنا بھاری فیصلہ......“ امیرہ نے تاسف سے پیشانی پہ ہاتھ مارا۔

”کیوں کیا خود پر یہ ظلم، کیوں مزمل...... کیوں......؟“

”نہ کرتا......“ وہ شدت سے نفی میں سر ہلاتے اپنے آنسو صاف کرنے لگا۔ ”کبھی نہ کرتا کہ اس فیصلے کی نسبت مرنا کہیں آسان تھا امیرہ...... کاش کہ میں مرجاتا۔“ وہ ہتھیلی پر ماتھا جمائے نیچے فرش کو دیکھ رہا تھا۔ آنسو ابھی بھی اس کی آنکھوں سے گرتے جا رہے تھے۔

”تو کیوں مسلط کیا یہ عذاب اپنے سر پر...... میں مرن جوگی آپ کافی تھی اس بار کو اٹھانے کے لیے......“ وہ ساتھ ساتھ رولی بھی جا رہی تھی۔ ”میں ہرگز تمہیں اس آگ میں جھونکنا نہیں چاہتی تھی۔“ گزرے چند دنوں میں امیرہ نے ایک دن بھی اس حقیقت کو تسلیم نہیں کیا کہ وہ مزمل سے شادی کرنے والی ہے، اس کی بیوی بننے والی ہے۔ خود پر گزرے حادثے نے جذبات پر برف کی ایسی سل رکھ دی تھی کہ اب وہ صرف حقیقت کے چشمے سے حالات کو دیکھ اور پرکھ رہی تھی اور اس چشمے سے نظر آنے والے منظر میں مزمل کہیں فٹ نہیں بیٹھتا تھا۔ اس کی محبت اس کا معشوق کیوں سہے درد۔ اپنی ذات پر کیوں اٹھائے ایک ایسی تکلیف کا بار جو اس کی تھی ہی نہیں۔

”وجہ نہیں سننا چاہو گی اس آگ میں کودنے کی ہے“ مزمل کی مبہم ہنسی بھی اب انتہا کی کھوکھلی اور بے جان لگتی تھی۔ امیرہ نے خالی خالی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”یہ صرف میری آزمائش تھی مزمل اور میں اکیلی اس میں پوری اتر سکتی تھی۔ رجب مجھ سے شادی کے لیے تیار نہ ہوتا تو زندگی تنہا کاٹ دیتی اور یہ کوئی انہونی بات تو نہ ہوتی۔“

”یوں تو میں بھی اکیلا رہ جاتا، پھر تنہا تنہا درد سہنے سے اچھا نہیں تھا کہ مل کر بانٹ لیتے اس درد کو۔“

”سچ کہو مزمل...... کیا یہ بانٹنے سے کم ہونے والا درد ہے۔“ امیرہ کے لہجے میں محسوس کی جانے والی آنچ تھی۔

”نہیں......“ مزمل نے تائید میں دیر نہیں لگائی۔ ”پل پل سوئی کی طرح چبھنے والا درد زہر قاتل ہوتا ہے...... جان نچوڑ لینے والا، ایسے درد کو سہا نہیں جاتا اس سے نجات حاصل کی جاتی ہے۔“

”نجات......“ امیرہ استہزائیہ ہنسی۔ ”پھر تو مر جانے دیتے مجھے۔“

”مر کر بھی دیکھ لیا امیرہ......“ مزمل نے بے ساختہ ایک گہری سرد آہ کھینچی۔

”نجات“ کچھ اور چیز ہے۔“ چھت کے شہتیر کو ایک ٹک دیکھتے، دونوں ہاتھ پشت پر باندھے وہ پھر رو پڑنے کو تیار تھا۔ نزلے جیسی آواز بری طرح رندھ گئی۔ جانے اس لمحے ایسا کیا سوچا مزمل نے کہ نمکین پانی گال بھگوتا گردن تک اتر آیا۔ مرد روتے اچھے نہیں لگتے، وہ بھی بے ساختہ رخ موڑ گیا۔ امیرہ اپنی جگہ چھوڑ کر اس کی پشت پر آگئی۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ امیرہ نے سننے کے لیے خود کو تیار کیا۔

”اس رات تم سے الگ ہو کر گھر پہنچا تو حالات بہت خراب تھے۔ نہیں جانتا کہ گھر بھی کیسے پہنچا۔ سب سو رہے تھے اور میں...... انگاروں پہ چل رہا تھا۔ اندر باہر آگ تھی۔ دل و دماغ میں عجیب ڈرا دینے والی آندھیاں چل رہی تھیں۔ رجب کو ختم کر دینے کا

خیال ہر چیز پر حاوی تھا اور پھر اسے مار دینے کے بعد خود کو ختم کرنا کہ ”جینا“ اب بہت کٹھن، بہت تکلیف دہ تھا۔ کیونکہ زندہ انسان اس وقت رہنا چاہتا ہے جب کسی آس، کسی امید کا سہارا حاصل ہو لیکن جب سارے راستے بند ہو جائیں تو جینا محال ہو جاتا ہے۔ تب سانسوں کا بار اٹھایا نہیں جاتا۔“ سرخ ناک کو آستین سے رگڑتا وہ اپنے آنسوؤں کو باہر آنے سے روکنے کی بے سودی کوشش کر رہا تھا۔

بے قراری سے صحن میں ٹہلتے جانے کب گھر والوں کنویں کی منڈیر پر جا بیٹھا۔ کھلی آنکھوں سے اپنی موت کا منظر شاید زندگی میں پہلی بار تب تصور کیا تھا۔ میں پانی سے سخت خوف زدہ ہوں امیرہ...... نہ ہی مجھے تیرنا آتا ہے۔ بس ایک چھلانگ کافی تھی دکھوں سے آزاد ہونے کے لیے اور اس ایک چھلانگ کے بعد کا منظر تصور کرنا بڑا ہی تسکین پہنچانے والا تھا۔ میں نے ایسا بے رحمانہ سکون اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں کیا۔

لوگ مردہ مزمل کو کنویں سے باہر نکال رہے تھے۔ ماں اور بہنوں کے بین بلند ہونے لگے۔ خبر آگ کی طرح ہر طرف پھیل گئی اور غسل، کفن دے کر جنازہ اٹھایا گیا۔ ہر غم، ہر فکر، پروں سے جھاڑ کر روح اوپر کہیں پرواز کر گئی۔ خیالوں میں کسی نقطے کو تکتا وہ قطرہ قطرہ امیرہ کی جان نچوڑ رہا تھا۔ ایک ہاتھ سینے، ایک منہ پہ دھرے وہ پھٹی آنکھوں سے اس دیوانے کو دیکھ رہی تھی جو نجانے کیا طے کیے بیٹھا تھا۔

”لیکن جانتی ہو امیرہ......“ مزمل کی بھیگی آواز ڈوبنے سی لگی۔ ”ہواؤں سے دور اوپر آسمان میں اڑتا روح کا پرندہ...... وہ ابھی بھی بے سکون تھا۔ ”نجات“...... وہ تو مر کر بھی نہیں ملی تھی۔ روح کا پرندہ، نہ وہ آزاد تھا نہ خوش اور روح کا گلا کیسے گھونٹتے ہیں امیرہ...... میں نہیں جانتا، نہیں جانتا۔“ وہ پھر سسک اٹھا۔

امیرہ مرے قدموں سے خود کو گھسیٹتی اس کے نزدیک آگئی۔ جس کے آنسو آرے کی طرح اس کا جگر کاٹ رہے تھے۔ نزدیک آنے پر وہ سمجھ ہی نہیں پائی کہ اسے تسلی کیسے دے...... وہ نہ چاہ کر بھی شجر ممنوعہ تھی۔ اپنے لتھڑے ہاتھ کی تسلی بھی جس کے کاندھے پر رکھ نہیں سکتی تھی۔ ایک بار پھر خود کو چند قدم پر روک لیا۔

”روح نے گھٹن اور بے چینی محسوس کرتے ہوئے نیچے آکر دیکھا۔ تو جانتی ہو کیا دیکھا......“ وہ تیرتے پانیوں سے بھری آنکھیں اس پر جمائے وہ سوال کر رہا تھا۔ وہ روتے ہوئے نفی میں سر ہلانے لگی۔

”روح نے نیچے نظر ڈالی تو ہر طرف رجب ہی رجب تھے، جو بے بس امیرہ کے جسم کو نوچ رہے تھے، اس کے آنچل کو تار تار کر رہے تھے پر وہاں...... وہاں کوئی مزمل نہیں تھا...... کیونکہ مزمل نے تو فرار کی راہ چن کر امیرہ کو خود ہی رجب جیسے کتوں کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ میں بھی بھگوڑا تھا امیرہ...... جو تم سے بھاگ رہا تھا، اپنے آپ سے بھاگ رہا تھا“۔ وہ ہاتھوں میں چہرا دے کر رونے لگا۔

”تم بھگوڑے نہیں ہو سکتے مزمل، میں جانتی ہوں۔“ امیرہ کی آواز بھی بھیگ گئی ”بھاگنا تو میں چاہتی تھی، اپنی نحوست کے سایوں سے بچانا چاہتی تھی تمہیں...... شکر پڑھ رہی تھی کہ تمہارے گھر والے شدت سے میرے خلاف ہیں، قدرت نے ان کی بھی راہیں سہل کر دیں، لیکن تم نے مزمل......“ وہ ایک نقطے پہ آکر یک لخت رکی۔

”تم نے یہ کیسے کیا مزمل...... ؟ پھر ایسے حالات میں......“

”نہیں خیر......“ مزمل نے ہتھیلیوں سے رگڑ کر اپنی آنکھیں اور چہرا صاف کیا۔

”یہ سب تو انہیں نہیں معلوم اور نہ ہونا چاہیے۔ ہاں انہیں راضی کرنے کا معاملہ البتہ کافی ٹیڑھا اور عجیب رہا۔“ وہ بڑی تکلیف سے مسکرایا۔

”کبھی کبھی مخالف پارٹی اپنی ہی کسی چال سے ہمیں ایسی راہ سجھا جاتی ہے کہ ہم دل ہی دل میں چپکے

سے اس کے شکر گزار ہو جاتے ہیں۔ میری بہن نشاط ابھی کچھ دن پہلے ہی بڑے دھواں دار انداز میں تمہاری مخالفت کر کے گئی تھی، بلکہ باقاعدہ ناراض ہو کر..... کہ اگر میں نے اپنا فیصلہ نہ بدلا تو وہ بھی میرے گھر میں پاؤں نہیں رکھے گی اور وہ دھن کی بڑی پکی ہے۔ ایک بار جو کہہ دے پھر رویے میں لچک لانا ناممکن ہے اور حالانکہ گیا تو میں بھی اپنا مقدمہ لڑنے تھا۔ ارادہ اپنی بات منوا کر اپنا مقدمہ جیتنے کا تھا، لیکن آپا کی دھمکی نے بری طرح بے بس کر دیا۔ مجھے صاف لگ رہا تھا کہ اب کوئی راہ باقی نہیں بچی۔ تمہیں بھی آگاہ کرنے والا تھا اس فیصلے سے کہ قسمت نے ایک زور دار طمانچہ میرے منہ پر مارا، جس کے بعد کسی فرار کی گنجائش باقی نہ رہی۔"

"حالانکہ تمہارے لیے اب زیادہ آسان تھا دوسری راہ چن کر پیچھے ہٹ جانا۔" وہ جب سے حیران تھی اس کے رویے پر، اب ممنون بھی ہونے لگی۔

"نہیں چن سکتا تھا دوسری راہ۔" وہ بان کا موڑھا گھسیٹ کر پلنگ کے نزدیک لے آیا اور اس پر بیٹھتے ہوئے امیرہ کو بھی سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

دل پر پڑے بوجھ دھیرے دھیرے سرکنے لگے تو وہ خود کو بہت آسودہ، بہت ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔ دھند چھٹ رہی تھی اور یوں چھٹ رہی تھی کہ پیچھے کے منظر پردہ فاش کر دینے کی حد تک صاف اور واضح ہونے لگے تھے۔ امیرہ منتظر اور پرتجسس تھی، یہ جاننے کے لیے کہ ایسی خاردار، پتھریلی راہوں کو ہموار کرنے کے پیچھے کیا تحریک کارفرما ہو سکتی تھی۔

"خیر میں تمہیں نشاط کے بارے میں بتا رہا تھا۔ میرے دماغ نے کہا کہ اگر وہ دھمکی کی راہ اختیار کر سکتی ہے تو پھر میں کیوں نہیں..... جس کنویں کی منڈیر پر پہلی رات بیٹھا اپنی موت کا حقیقی منظر تصور کر رہا تھا۔ اگلی شام اسی کنویں کو دھمکی کے لیے استعمال کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے میں منڈیر پر چڑھ گیا اور صاف صاف اماں سے کہہ دیا کہ اگر امیرہ سے شادی منظور نہیں تو ابھی کنویں میں چھلانگ لگا کر مر جاؤں گا اور اماں اسے میری دھمکی ہی سمجھتے ہوئے ادھر ادھر کی ہانکنے لگی۔ تب بنا کچھ کہے سنے میں نے چھلانگ لگا دی۔"

"ہاہ....." امیرہ نے بے ساختہ منہ پہ ہاتھ رکھا۔ "تمہیں تیرنا کہاں آتا ہے مزمل؟"

"اب آتا ہے....." وہ مسکرا رہا تھا۔ "بنا سوچے تو میں نے بھی چھلانگ نہیں لگائی تھی۔ اپنے ہاتھوں اپنی جان لینے کا تو اب کسی قیمت پر کوئی ارادہ نہیں تھا۔ امیرہ کا سر ڈھانپنے کے لیے زندہ رہنا تو بہت ضروری تھا۔ دھمکی دینے کا منصوبہ تو ذہن میں بنا ہی لیا تھا۔ اسی روز صبح سویرے ہی چھوٹی نہر کی طرف نکل گیا۔ سہ پہر تک کا وقت وہاں نہاتے لڑکوں سے تیرا کی سیکھتے گزارا اور پھر شام کو منصوبے پر عمل بھی کر ڈالا۔ میں جانتا تھا کہ محض کنویں کی منڈیر پر چڑھ کر اعلان کر دینے سے تو یہ لوگ ماننے والے ہیں نہیں..... چھلانگ کی نوبت تو ہر حال میں آئے گی۔ بس پھر تو چیخ پکار مچ گئی۔ ڈول والی رسی نیچے پھینک کر اماں نے اسی وقت ہار مان لی اور میں بھی رسی تھامے اوپر آ گیا۔"

"لیکن تم نے کیوں کیا یہ سب....." پلنگ کے کنارے بیٹھی بغور اسے سنتی امیرہ کی حیرت ہنوز برقرار تھی۔

"یوں ہی تو نہیں کیا ہو گا نا۔" اس نے ایک سرد آہ بھری۔ "اوپر والے کے ترازو میں کوئی جھول نہیں ہے امیرہ! ہم گناہ گار یوں ہی شکووں کے گٹھڑ اٹھائے پھرتے ہیں۔ تمہارے ساتھ جو ہوا اس کا بدلہ اللہ نے رجب سے لے لیا۔ سانپ کے زہر نے اس کے خبیث چہرے کو اور مکروہ کر دیا تھا اور پھر....." وہ کہتے کہتے رکا۔

"دراصل تمہارے ساتھ کچھ ہوا ہی نہیں۔ جو ہوا میری وجہ سے میرے ساتھ ہوا بس ہوش آنے تک بہت دیر ہو چکی تھی۔"

رجب کے انجام سے اسے یک گونہ سکون محسوس ہوا۔

"ایسی کیا بات ہے مزمل.....؟ وہ پریشان نہیں تھی، بس متجسس تھی کہ پریشانی تو اب کوئی بھی بڑی نہیں لگتی تھی۔

"تمہاری دادی ٹھیک تھی امیرہ..... بیوہ عورت کو خوب سوچ سمجھ کر میل جول رکھنے چاہئیں۔ جس روز میرے دروازے پر برادری کے لوگ نشاط پر الزام تراشی کرنے آئے، میں نے غیرت مندی کے ریکارڈ توڑتے ہوئے ایک ایک کو بے عزت کر کے گھر سے نہ صرف نکالا بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قطع تعلق بھی کر لیا۔ تب میں بھی یہی سمجھتا تھا کہ نشاط پر لگے الزام بے بنیاد ہیں کیونکہ اس نے کلام پاک پر ہاتھ رکھ کر اپنے سچے ہونے کی قسم کھائی تھی۔

میں نے قسم کی وجہ سے خاندان بھر سے ٹکر لی اور اپنے اقدام پر خود کو خوب داد بھی دی کہ اس سے بہترین قدم اور کوئی ہو نہیں سکتا تھا، لیکن اس بائیکاٹ کے صرف ایک ہفتے بعد میں نے اور ابا نے ایسا کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ برادری کی باتوں پر ہمیں بھی یقین کرنا پڑا۔ ابا کمزور اعصاب کے مالک تھے، سہ نہیں پائے۔ عین ساتویں دن ان کی موت واقع ہو جانے سے معاملے کی نوعیت مزید گمبھیر ہو گئی۔ خاندان والوں میں سے کئی ایک شرمندگی اور پچھتاوے کا بوجھ لیے واپس لوٹ آئے اور جو نہیں آئے ان کے سامنے میری ناک اونچی ہو گئی کہ غیرت مند باپ اپنی بیٹی پر جھوٹے الزام برداشت نہ کر پایا۔ میں نے نشاط کی حقیقت کی طرف سے دانستہ آنکھیں بند کر لیں جیسے وہ ایک وہم سے زیادہ حیثیت نہ رکھتا ہو۔

بہن کی ڈھال بن کر اول روز سے جو ٹکر برادری سے لی اس پر جوں کا توں قائم رہنا چاہتا تھا۔ خود کو دھوکا دینا نری جہالت ہے، لیکن آسان بھی ہے۔ آٹھ سال میں نے بھی حفاظت کی ہے بہن کی بدچلنی کی، جھوٹی قسم کی، برادری سے بلا جواز بائیکاٹ کی..... ناک اونچی رکھنے کے جنون میں جھوٹ سچ کی پہچان بھی کھو دی تھی میں نے، خود کو دھوکا دیتے میں اس جھوٹ کا اتنا عادی ہو گیا کہ اب یہ مجھے سچ لگنے لگا تھا، لیکن بہرحال یہ جھوٹ تھا اور..... یہی سچ ہے امیرہ۔" وہ تلخی سے مسکرایا۔

"جھوٹی قسم میری بہن نے کھائی تھی اور عذاب مجھے بھگتنا پڑا کیونکہ میں بھی تو اب قسم شریک ہو چکا تھا۔ آٹھ سالوں میں ایک بار بھی ازالے کا نہیں سوچا، نہ روٹھے ہوؤں کو منایا نہ بہن کو اس کی اصلیت جتائی خود کو دھوکا دینے کی جس راہ پر میں چل پڑا تھا وہ میری عادت میری ذات کا حصہ بن چکی تھی۔"

"لیکن تم کیسے کہہ سکتے ہو مزمل کہ یہ اسی کیے کی سزا ہے۔ اور....."

"یہ جاننا کون سا مشکل ہے۔" مزمل نے فی الفور اس کا جملہ قطع کیا۔

"احساس کا دل میں پیدا ہونا، ندامت، ملامت، ضمیر کی آٹھ برسوں سے گہری نیند میں سوئی آواز کا یک لخت بیدار ہونا..... یہی تو ثبوت ہے۔ وہی میں ہوں، لیکن بالکل بدلی ہوئی سوچ کے ساتھ اور کیا جاننا باقی رہ جاتا ہے۔ شاید میرے مالک کو میری کوئی خوبی پسند آئی ہو گی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ میں اتنی بڑی غلطی کا بوجھ کندھوں پر اٹھائے قبر میں اتر دوں۔"

"اور زندگی مزمل.....؟" امیرہ کے بے ساختہ سوال میں عجیب سا ڈر تھا۔ مزمل نے محض خاموشی سے دیکھنے پر اکتفا کیا۔

"زندگی اس "باخبری" کے ساتھ کیسے گزرے گی..... بے خبری کو یوں ہی تو نعمت نہیں کہا گیا۔"

"یہ باخبری نہیں ہے، اسے آنکھیں کھلنا کہتے ہیں۔ اللہ کی مصلحتوں کو ہم کبھی سمجھ نہیں سکتے امیرہ۔ وہ سب کا مالک وہ تو خوب پردہ رکھنے والا ہے اور جب وہ نہیں رکھتا پردہ تب وہ حقیقت کسی حکمت سے خالی نہیں ہوتی، تمہیں لگتا ہے میں اس "باخبری" کے

ساتھ کیسے خوش رہ پاؤں گا۔"

"ہاں، مشکل ہے۔" اس نے ایک سرد آہ بھری۔

"لیکن امیرہ، ہمارے اردگرد بے شمار ایسی بے رحم حقیقتیں موجود ہیں جن میں سے کئی ایک کو جانتے ہوئے، انہیں دیکھتے ہوئے نہ صرف ہم انہیں جھیل رہے ہیں بلکہ بہت آسانی سے انہیں اپنی زندگیوں میں شامل کر چکے ہیں اور کئی سچائیاں ایسی ہیں کہ ہمارے آس پاس موجود تو ہیں لیکن ہماری نظر سے پوشیدہ ہیں، پر وہ سچائیاں اتنی تلخ اتنی مکروہ ہیں کہ اگر ان پر پڑے پردے اٹھ جائیں تو ہمارا ایک دوسرے سے نظریں ملانا بھی ناممکن ہو جائے۔

جہاں تک بات ہے زندگی گزارنے کی۔" وہ موڑھے سے اٹھ کر امیرہ کے سامنے پلنگ پر سہولت سے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور وہ بے ساختہ ہی اپنے آپ میں سمٹ گئی۔

"جس رشتے اور حیثیت سے تم اس گھر میں آئی ہو، اس حساب سے مجھ پر کچھ حقوق، کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں، جن کا پورا کرنا میرے لیے بہت ضروری ہے، لیکن نہیں امیرہ...... نہ حق نہ کوئی فرض......" اٹل لہجے میں کہتے ہوئے مزمل نے امیرہ کی آنکھوں میں دیکھا جس کی سانسیں تھمنے لگی تھیں اس کے انداز پر، جانے کیا کہنے والا تھا۔

امیرہ نے گھبرا کر آنکھیں میچ لیں۔ تب پہلی بار اپنے شانوں پر اس نے مزمل کے نرم ہاتھوں کا لمس محسوس کیا۔ اس حادثے کے بارے میں جان لینے اور اس نئے رشتے میں بندھ جانے کے بعد مزمل نے اسے اب چھوا تھا۔ وہ کپکپاتے ہونٹوں اور نم آنکھوں کو بھینچ کر ضبط کی کوشش کر رہی تھی۔ مزمل نے آہستہ سے اس کی ٹھوڑی کو قدرے اونچا کیا تو امیرہ نے اپنی پلکیں دھیرے سے کھولیں، لیکن نظر اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہ کر سکی۔

"نہ یہ حق کی جگہ ہے نہ فرض کی...... یہ امیرہ اور مزمل کی محبت ہے جو تمام حقوق و فرائض پر آج بھی بھاری ہے۔ فرض سمجھ کر تمہارا مقام پہچاننے کی نوبت تب آتی جب یہ دل محبت سے خالی ہو چکا ہوتا۔"

امیرہ نے جھجکتے ہوئے نگاہ اوپر اٹھائی۔ مزمل کی نرم مسکراہٹ اس کے لبوں کا ساتھ نہیں چھوڑ رہی تھی۔ اپنی سوئی سوئی نگاہ اس نے امیرہ کے حسین چہرے پر ڈالتے ہوئے اس کی دونوں کلائیاں اپنے ہاتھوں میں لیں اور سائیڈ میز سے چوڑیوں کا سیٹ ہاتھ میں لے کر دھیرے دھیرے پہنانے لگا۔ بہت احتیاط سے پہلے نہ صرف چوڑیاں بلکہ اس کے پیروں میں پائل بھی دوبارہ پہنا دی۔ امیرہ کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے۔

"بس ایک بات یاد رکھو امیرہ...... اس رات کی باتیں اس ایک رات تک محدود رہیں گی۔ آنے والی صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ہی امیرہ اور مزمل کی جس نئی زندگی کا آغاز ہوگا۔ اس میں دوبارہ کبھی یہ موضوع نہیں آنا چاہیے۔ کیونکہ تکلیف سے چھٹکارے کا ایک حل یہ بھی ہے کہ اس پر کم سے کم سوچا اور بولا جائے۔ تم بھی وعدہ کرو کہ ہمارے درمیان پھر کبھی یہ موضوع نہیں آئے گا۔"

"ہوں......" امیرہ نے جھکی پلکوں کے ساتھ سر اقرار میں ہلا کر عہد کیا اور مزمل نے ہاتھوں میں پکڑے اس کے ہاتھوں کو اپنے لبوں سے لگایا۔

"میں زیادہ پڑھا لکھا نہیں ہوں امیرہ...... گاؤں کے ہائی اسکول سے بمشکل میٹرک کر پایا تھا، لیکن بدچلن اور باکردار عورت کا فرق سمجھنے کے لیے پڑھا لکھا ہونا ضروری نہیں ہے۔ میری امیرہ نیک، شریف اور باکردار ہے، اس سے بڑھ کر مزمل کے لیے کیا ہو سکتا ہے۔ ہوں......؟" نرمی کے ساتھ اس نے امیرہ کو اپنے ساتھ لگایا!

امیرہ نے بھی سکون سے پلکیں موند کر سب سپرد خدا کر دیا کہ یقیناً اسی خدا نے تو مسیحا کے روپ میں مزمل کو اس کی زندگی، اس کے نصیب میں شامل کیا تھا۔ اس یقین کے آگے ہر خوف، ہر ڈر بے معنی تھا۔ وہ اس کے سانولے چہرے کی پرنور تابناکی کو اپنی شہد جیسی نگاہوں میں جذب کرتی اس کے پیچھے چل پڑی۔

☆

نیر فہیم خان

چھن سے آؤ ساون بن کے

رات گہری سیاہ اور خاموش تھی، جیسے کئی راز چھپائے بیٹھی ہو، چاہے جانے کے باوجود بتا نہ پائے۔ ہولے ہولے بہتی کسی سبک سی ندیا کی مانند، ستارے اس کے ہم راز تھے، وہ بھی سکوت کے ساتھ دمکتے تھے۔ چاند نہ جانے کس دیس کے سفر پر تھا۔ گہری سیاہ رات کے آنچل تلے زمین پر بنے مکانات ننھے دیوں سے ٹمٹماتے تھے۔ ان ہی مکانوں میں سے ایک دو منزلہ مکان اختر صاحب کا تھا جن کی عزت محلے میں ضرب المثل تھی۔ نہایت شریف، سمجھ دار اور سلجھے ہوئے۔ ان کے مکان کی بالائی منزل کے کمرے میں اچانک مدھم سی جھنجھناہٹ ابھری۔ وہاں لیٹا وجود جیسے منتظر ہی تھا۔ سیل فون کی دمکتی اسکرین پر آنے والا نام لبوں کو مسکراہٹ بخش گیا۔ بہت آہستگی سے ہیلو کہا گیا۔

"کتنا ستاتی ہو تم؟" دوسری جانب سے شکوہ کیا گیا؟

"کیوں؟ کیا ہوا؟" مدھم سی سرگوشی ابھری۔

"رات کے اس پہر جب نیند سے بری حالت ہو اور تمام دنیا مزے سے سو رہی ہو، تب تمہاری آواز سننے کو ملتی ہے۔"

"میرے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتے۔" آواز میں مان تھا۔ دوسری طرف جیسے فوراً ہتھیار ڈال دیے گئے تھے۔

"تمہارے لیے ہی تو سب کچھ کرتا ہوں۔ نیند سے بے زار، نچھروں سے جنگ لڑ لڑ کر تمہاری آواز سننے کا انتظار کرتا ہوں اور جب تمہاری مدھر آواز کانوں میں رس گھولتی ہے تو ساری کوفت بھول جاتا ہوں۔" لہجے میں محبت کی شدت تھی اور آواز میں

جادو بھرا خمار۔ مخاطب تو جیسے ہواؤں میں اُڑان بھرنے لگا۔

''سچ۔'' اشتیاق سا اشتیاق تھا۔

''تمہاری قسم۔'' حسب منشا جواب تھا۔

''یار تھوڑا جلدی بات کرلیا کرو نا۔ ذرا سی دیر میں صبح ہوجاتی ہے۔ تم سے بات کرنے کے باوجود تشنگی رہ جاتی ہے۔''

''نہیں کرسکتی نا۔ آپ تو جانتے ہیں۔ ابو جلدی سونے لیٹ جاتے ہیں۔ میں جب تک کام نپٹاتی ہوں۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ تہجد کے لیے اٹھ جاتے ہیں اور قرآن پاک پڑھتے ہیں۔ اس کے بعد آرام کے لیے جاتے ہیں تو مجھے موقع ملتا ہے۔ اسی ٹائم کو غنیمت سمجھیے۔ ورنہ بالکل بھی بات نہیں ہوسکے گی۔ گھر میں کسی کو بھی موبائل کا پتا نہیں ہے۔ وہ تو شکر ہے میرا کمرہ کوئی شیئر نہیں کرتا، ورنہ تو بات کرنا ناممکن ہی ہوجاتا۔''

''جانتا ہوں۔ مگر یہ دل بھی تو مانے نا۔''

باتوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا۔ تارے خاموشی سے یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے۔ رات آہستہ آہستہ بہہ رہی تھی۔ اسی خاموشی اور بھید بھرے سکوت کے ساتھ......

☆☆☆

''کیا ہوگیا ہے اس لڑکی کو' فجر کا وقت ختم ہونے والا ہے اور یہ ابھی تک سوئی ہوئی ہے۔'' امی نے اس کے کمرے کا بند دروازہ بے حد کوفت سے دیکھا۔

''اریبہ...... اریبہ!'' انہوں نے غصے میں آواز دی اور ساتھ دروازہ بھی بجایا۔

''جی امی۔'' نیند سے بھری آواز نے ان کا خون کھولا دیا۔

''دروازہ کھولو۔'' ان کا جلال عروج پر پہنچ گیا۔

اریبہ کی آنکھیں جھٹ کھلیں۔ پہلی فرصت میں فون کو بند کرکے الماری میں چھپایا اور دوپٹا سنبھالتی دروازے کی طرف بڑھی۔

''ٹائم دیکھ رہی ہو، فجر قضا کردی تم نے۔ میں دیکھ رہی ہوں، آج کل نماز بہت قضا ہورہی ہے تمہاری۔'' امی نے دروازہ کھلتے ہی بلاتکلف جھاڑا تھا۔

''پتا نہیں امی کیا ہوا۔ آنکھ ہی نہیں کھلی۔'' وہ شرم سار ہوئی۔ دل ہی دل میں پشیمان کہ ریان سے باتوں کے چکر میں راتیں کالی ہورہی تھیں۔

''آنکھ کھلے نہ کھلے۔ کان کھول کر سن لو۔ کل سے کوئی نماز قضا نہیں ہونی چاہیے۔ اب اٹھو...... بیس منٹ بعد نماز پڑھ کر قرآن پاک پڑھو۔ دوبارہ سوتا نہ دیکھوں۔'' وہ تنبیہ کرکے چلی گئیں۔ اریبہ شکر ادا کرتی غسل خانے کی جانب بڑھ گئی۔

☆☆☆

''حیا!'' اریبہ نے آواز دی۔

''اوہ! اریبہ' جلدی کرو، آج بہت دیر ہوگئی ہے۔'' حیا نے مڑ کر اسے تیز قدموں سے آتے دیکھا تو لمحہ بھر کے لیے رکی۔ وہ ہانپتی کانپتی اس کے قریب پہنچ گئی۔

''اکیلی جارہی تھیں، تمہیں پتا ہے کہ میں تمہارے ساتھ ہی جاتی ہوں۔'' وہ پھولی سانسوں کے ساتھ شکوہ کناں ہوئی۔

''سوری! میرا آج بہت اہم ٹیسٹ ہے اور میں جلدی میں تھی۔ تم نے کل بھی چھٹی کی تھی۔ میں نے سوچا کہ شاید آج بھی کرلو۔''

''ہاں یار! میری غلطی ہے، مجھے کل تمہیں بتانا چاہیے تھا کہ مجھے بھی جانا ہے۔'' اس نے فوراً غلطی تسلیم کی۔

حیا نے غور سے اسے دیکھا۔ اس کا خوب صورت چہرہ نقاب میں چھپا تھا۔ ڈارک براؤن آنکھیں اپنی تمام تر خوب صورتی کے ساتھ نقاب میں دمک رہی تھی۔

''اریبہ! تم بہت جلد اپنی غلطی تسلیم کرلیتی ہو، تمہاری یہ بات مجھے بہت پسند ہے۔'' حیا مسکرائی۔

''تھینک یو! مجھے لگتا ہے بحث کرنے کے بجائے یا اپنی غلطی کا ملبہ دوسروں پر ڈالنے کے بجائے یہ سوچنا چاہیے کہ آپ نے کہاں غلطی کی ہے۔ اس سے دل میں بدگمانی پیدا نہیں ہوتی۔'' اس نے نرمی سے کہا۔

''گڈ...... ارے وہ دیکھو رکشا کھڑا ہے، چلو جلدی کرو۔'' حیا نے قدموں کی رفتار تیز کی۔ اریبہ نے بھی اس کی تقلید کی۔

☆☆☆

''ریان کہاں جارہے ہو؟'' امی کمرے میں آئیں تو وہ خود کو آئینے کے سامنے کھڑا تنقیدی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

''امی! دوستوں کے ساتھ گھومنے، پھرنے کا پروگرام ہے۔''

''کبھی گھر میں بھی ٹک جایا کرو۔ ہر وقت غائب رہتے ہو۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ اس نے تمہیں پر نہیں دیے، ورنہ تو زمین پر قدم ہی نہیں ٹکتے تمہارے۔'' وہ غصہ ہوئیں۔

''اوہو! میری پیاری ماں! گھومنے پھرنے دیں، چند دن تو ہیں میرے پاس، پھر یونی ورسٹی شروع ہوجائے گی۔'' اس نے انہیں کندھوں سے تھاما۔ وہ فوراً پگھل گئی تھیں۔

''بیٹا! کبھی ماں سے بھی بات کیا کرو۔ یا تو فون سے چپٹے رہتے ہو یا لیپ ٹاپ کو گود میں لیے بیٹھے رہتے ہو۔ ان مشینوں نے تو مجھ سے میرا بیٹا چھین لیا ہے۔'' ان کا لہجہ گلوگیر سا ہوا۔

''چلیں نہیں جاتا کہیں۔ آج آپ سے باتیں کرتا ہوں۔'' وہ برش پھینک کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔ امی اس کی فرماں برداری پر مسکرا دیں۔

ماؤں کے دل ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ذرا سی بات پر خوش ہوجاتی ہیں اور مسکرا دیتی ہیں۔ صرف ذرا سا مان کہ اولاد ان کی بات مانتی ہے۔

''اچھا ڈراما مت کرو۔ جاؤ، مگر جلدی آجانا، تمہاری عائشہ خالہ کی طبیعت خراب ہے، انہیں پوچھنے جانا ہے۔ کافی دنوں سے سوچ رہی ہوں کہ جاؤں، مگر اکیلے جانے کی ہمت نہیں ہوتی اور وہ تمہاری بہن حیا' وہ تو دنیا سے نرالی پڑھائی کرلی ہے، جب دیکھو موٹی موٹی کتابوں میں غرق۔ جھاڑ جھنکاڑ جمع کیے رکھتی ہے۔'' وہ بہت بےزار تھیں۔

''امی بوٹنی پڑھ رہی ہے۔ جھاڑ جھنکار کو جمع کرنا پڑھتا ہے۔'' وہ ہولے سے ہنسا۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لڑکیوں کی ایسی پڑھائی کا کیا فائدہ ہے جو آگے سسرال میں کام نہ آئے۔ وہ پھول پتیوں کے نام یاد کرکے کون سے جھنڈے گاڑے گی۔''

''امی...... پڑھائی کا مطلب سسرال میں جھنڈے گاڑنا نہیں ہے۔ خیر چھوڑیں۔ چلیں میں آپ کو خالہ کے گھر لے چلوں۔''

''رہنے دو، شام میں چلیں گے۔ تم اپنا پروگرام خراب مت کرو۔'' انہوں نے بے حد پیار سے اس کے ماتھے کو چوما۔ ''اللہ کے حوالے۔ زیادہ دیر مت لگانا۔''

''اوہو امی! محاذ پر نہیں جارہا۔''

''گھر سے باہر جانا بھی تو ایک محاذ ہی ہے آج کل۔ بس اللہ سب کو حفاظت میں رکھے۔'' وہ کہتی ہوئی کمرے سے نکل گئیں۔ وہ مسکراتا ہوا بال بنانے لگا۔

☆☆☆

''ارے دیکھو ہیرو صاحب آگئے۔'' دانش، سلمان اور روحیل بائیک پر سوار گلی میں تیار کھڑے تھے۔ ریان نے اپنی بائیک روکی۔

''کیا کٹ شٹ ہے یار۔'' سلمان کے لہجے میں ستائش تھی۔

''اپنا تو اسٹائل ہی الگ ہے۔'' اس نے کالر کھڑے کیے۔

''صدر بازار سے خریدی پینٹ شرٹ کے کیا اسٹائل ہوں گے۔'' روحیل کے لہجے میں کھوکن تھی۔

وہ خود کو بہت بڑا ہیرو سمجھتا تھا۔ ریان سے

فطری حسد تھا۔ ریان کے آنے سے اس کی شخصیت ماند ہو جاتی تھی۔ سلمان اور دانش اس کے قصیدے پڑھتے تھے۔ وہ اسمارٹ تھا، ذہین تھا، محلے میں اچھی حیثیت تھی۔

"اپنی اپنی پرسنالٹی کی بات ہے۔ کوئی صدر بازار کی خریدی پینٹ شرٹ میں بھی ہینڈسم لگتا ہے اور کسی پر امریکہ سے برآمد کی ہوئی پینٹ بھی کوئی اثر نہیں ڈالتی۔" ریان کی بات پر وہ دونوں قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔

روحیل کا پارہ چڑھ گیا۔ "مطلب کیا ہے تمہارا؟"

"ارے یار! کچھ مطلب نہیں۔ چلو دیر ہو رہی ہے۔" سلمان نے معاملے کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے دخل اندازی کی۔

"چل نا یار۔" اس نے روحیل کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

اسی وقت اریبہ عبایا میں ملبوس گھر سے نکلی، چھوٹا بھائی اس کے ساتھ تھا۔ وہ نگاہیں جھکائے آہستہ آہستہ قدموں سے چلتی قریب سے گزر گئی۔ ریان کی نظروں نے اس کا تعاقب کیا۔

"انگور کھٹے ہیں استاد!" روحیل کی نگاہوں سے یہ تعاقب چھپا نہ رہ سکا، وہ طنزیہ لہجے میں گویا ہوا۔

"روحیل منہ سنبھالو۔" سلمان چپ نہ رہ سکا۔ "اختر صاحب کی بیٹی ہے۔"

"میں نے کیا، کیا ہے، یہ تمہارا ہیرو ہی گھور رہا تھا۔" سلمان نے ملامتی نظر اس پر ڈالی۔

"چلنا ہے یا یہیں کھڑے رہنا ہے۔" دانش تنگ آکر بولا۔

"ہاں...... چلو نکلتے ہیں۔" وہ نظریں چراتا ہوا بائیک اڑا لے گیا۔

☆☆☆

"السلام علیکم!" نرم آواز میں اس نے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام بیٹی جیتی رہو۔" امی نے خوش دلی سے جواب دیا۔

"مجھے حیا سے ملنا تھا۔"

"وہ اپنے کمرے میں ہے، جاؤ مل لو۔" انہوں نے پیار سے کہا۔ وہ آہستہ سے چلتی حیا کے کمرے میں آگئی۔ حیا جرنلز بکھرائے ڈایا گرام بنانے میں مصروف تھی۔ اریبہ پر نظر پڑی تو حیران رہ گئی۔

"تم یہاں میرے گھر میں؟"

"ہاں بڑی مشکل سے اجازت لے کر آئی ہوں۔ میرا بہت سارا کام رہ گیا ہے۔ اسی لیے مجھے امی سے ضد کر کے آنا پڑا۔" وہ عبایا اتار کر صوفے پر رکھتے ہوئی بولی۔

"ہاں، تم نے اس ہفتے بھی تین چھٹیاں کی اور پریکٹیکل بھی نہیں کیے۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے اریبہ! آنکھوں کے گرد کتنے حلقے ہیں، کیا تم بیمار ہو۔" حیا نے اس کا بغور جائزہ لیا۔ اس کے لہجے میں ہمدردی تھی۔

"نہیں...... نہیں تو۔" وہ کچھ گڑبڑا سی گئی۔

"کوئی پریشانی تو نہیں ہے۔ جو تم مجھ سے شیئر نہیں کرنا چاہ رہی ہو۔"

"نہیں بھئی! تمہارا وہم ہے۔ کیوں اتنے سوالات کر رہی ہو، امی نے آدھے گھنٹے کی اجازت دی ہے۔ مجھے جلدی جلدی نوٹس اور پریکٹیکل جرنلز کی ڈایا گرام بتا دو، تاکہ میں گھر پر آرام سے مکمل کر لوں۔ نعمان باہر میرا انتظار کر رہا ہے۔" اس نے چھوٹے بھائی کا نام لیا۔

"اوہ! اچھا آؤ، میں بتاتی ہوں۔" وہ دونوں جرنلز پر جھک گئیں۔ امی چائے لیے کمرے میں آگئیں۔

"آنٹی! آپ نے کیوں زحمت کی، میں مہمان تھوڑی ہوں۔" وہ شرمندہ ہوئی۔

"اس میں زحمت کی کیا بات ہے۔ تم تو ہمارے لیے رحمت ہو اور رحمت کے لیے زحمت نہیں

کی جاتی۔ خوشی سے قبول کیا جاتا ہے۔" وہ ٹرے رکھ کر چلی گئیں۔

"تمہاری امی بہت سویٹ ہیں۔"

"بالکل تمہاری امی کی طرح۔"

"میری امی کی طرح۔" وہ ہولے سے ہنسی۔ "وہ تو بہت ڈانٹتی ہیں، ذرا سی غلطی پر۔"

"جی، تو میری امی بھی پھولوں کے ٹوکرے نہیں نچھاور کرتیں۔ وہ تو میری پڑھائی سے بھی نالاں رہتی ہیں کہ ہر وقت کتابوں میں سر دیے بیٹھی رہتی ہو۔ اب دوسری لڑکیوں کی طرح موبائل سے چپکی رہوں، تو نہ جانے کیا حشر کر دیں۔" اریبہ کے ہاتھ میں کپ لرز کر رہ گیا۔ چائے چھلک گئی۔ شکر تھا کہ ٹرے ہی میں گری۔

"س...... س...... سوری حیا۔"

"اٹس او کے یار۔"

"میں اب چلتی ہوں۔" وہ گرم چائے حلق سے اتار کر کھڑی ہو گئی۔ حلق جلنے لگا تھا۔

"حیا...... حیا......" ریان آواز دیتا کمرے میں داخل ہوا۔ اریبہ کے ہاتھ سے بیگ چھوٹ کر گر پڑا۔ سارا سامان بکھر کر رہ گیا۔ وہ پوری جان سے کانپ گئی۔

"کیا ہے بھائی، دستک تو دیا کرو، منہ اٹھائے آجاتے ہو۔" ریان کی عادت اسے بہت بری لگتی تھی، آج اور بھی کھلی۔

"میری فرینڈ آئی ہوئی ہے۔"

"سوری۔" وہ فوراً پلٹ کر نکل گیا۔

اریبہ کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ لرزنے لگے تھے۔ حیا نے سامان اٹھا کر اسے دیا۔ وہ جلدی سے عبایا پہن کر باہر نکل گئی۔ حیا کو اس کی حالت دیکھ کر شرمساری سی محسوس ہونے لگی تھی۔

☆☆☆

کمرے میں سناٹا تھا۔ اچانک بھن بھناہٹ کی سی آواز سے اس کی آنکھ کھلی۔ وہ چونک کر اٹھی، آواز کا ماخذ ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ نیند سے بھری آنکھوں اور سوئے سوئے دماغ نے کامیاب نہ ہونے دیا۔ قبل اس کے وہ دوبارہ سو جاتی۔ آواز دوبارہ ابھری۔ اب دماغ کچھ کچھ ہوش کی دنیا میں قدم رکھ چکا تھا۔ اس نے اپنا فون اٹھا کر دیکھا۔ وہ خاموش تھا۔ آواز کی سمت کا اندازہ ہونے لگا۔ صوفے کے نیچے چھوٹا سا سیاہ سیل فون تھا۔ لمحہ بھر میں کمرہ روشنی سے بھر گیا۔ جہاں سیاہ سیل فون ایک سوال کی طرح موجود تھا۔

"یہ کس کا ہے؟" اس نے حیرت سے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ کال آرہی تھی۔ نمبر دیکھ کر وہ چونک اٹھی۔ اس نے خاموشی سے کال ریسیو کر لی۔ گو کہ یہ غیر اخلاقی حرکت تھی، مگر تجسس ہر شے پر غالب آگیا تھا۔ وہی مخصوص مانوس آواز جو وہ ہزاروں، آوازوں

کی بازگشت میں بھی پہچان سکتی تھی۔ نہایت بے قرار تھی۔

"کیا بات ہے؟ فون کیوں نہیں اٹھا رہی تھیں۔ میں کب سے ٹرائی کر رہا ہوں۔" وہ شاکڈ ہوئی۔ کوئی شک باقی نہ رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے فون کی لائن کاٹ دی اور پیغام بھیجا۔

"میں ابھی بات نہیں کر سکتی۔" فوراً ہی ٹون ابھری۔ سامنے اوکے کا پیغام تھا۔ رات کا آخری پہر تھا اور وہ ساکت بیٹھی تھی۔ معاملہ اس کی سمجھ میں آ رہا تھا۔ مگر ایسا ممکن تھا۔ یہ دل ماننے سے انکاری تھا اور دماغ شل ہوجاتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

"بھائی!"

"ہوں، کہو، کیا بات ہے۔" وہ کالج کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ حیا کمرے میں آئی۔

"مجھے کچھ کہنا ہے، تم مائنڈ تو نہیں کرو گے؟"

"ایسی کیا بات ہے؟" وہ مصروف رہا۔

"کل میری دوست آئی تھی، تم کمرے میں آ گئے، اسے بہت برا لگا۔"

"سوری یار! مجھے اندازہ نہیں تھا۔ آئندہ خیال رکھوں گا۔" وہ فوراً غلطی مان گیا۔

"بالکل خیال رکھیے گا، وہ ایک شریف لڑکی ہے، نیک خاندان سے تعلق ہے۔ ہمارے گھرانے پر اعتماد ہے، اسی لیے وہ یہاں آ جاتی ہے۔ اگر اس کے گھر والوں میں سے کوئی دیکھ لیتا تو کتنا برا ہوتا۔" وہ بغور اس کا جائزہ لے رہی تھی۔

"ہوں۔" اس نے کوئی خاص تاثر نہ دیا۔

"اس کا بھائی بارہ سال کا ہے، مگر ہمارے گھر کے اندر نہیں آتا۔ خیال رکھتا ہے۔ وہ لوگ پردے کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ وہ آپ کے بارے میں غلط سوچ سکتی ہے کہ آپ جان بوجھ کر اندر آئے تھے۔ یہ بات میرے لیے کتنی تکلیف دہ ہے، آپ کو اندازہ نہیں ہے۔" وہ سوچ سمجھ کر جملے استعمال کر رہی تھی کہ اس کی الجھن کو سرا بھی مل جائے اور مخاطب کو شک بھی نہ ہو۔

"اوہو حیا! کہا نا، آئی ایم سوری، اس کو بھی میری طرف سے کہہ دینا۔ تم جانتی ہو، میں ایسا نظر باز نہیں کہ گھر پر آئی لڑکیوں کو تاڑتا پھروں۔ میں تو لمحہ بھر میں ہی باہر نکل گیا تھا۔ پھر وہ کیسے غلط سوچ سکتی ہے۔" وہ کچھ چڑ کر بولا۔

"سوچ سکتی ہے بھائی! میں ان کے گھر جاتی ہوں، کبھی بھی کسی مرد نے ایسی غلطی نہیں کی، اپنے گھر میں بھی دستک دے کر آتے ہیں۔ وہ ہمارے گھر آئی تو آپ سے سامنا ہوگیا۔ وہ کسی غیر مرد سے اس طرح میل ملاپ رکھنے والے لوگ نہیں ہیں اور نہ اریبہ ایسی ہے کہ وہ اس بات کو پسند کرے۔ اس کی نظر میں آپ کی حیثیت کتنی ماند پڑی ہوگی۔"

"تو میں کون سا بدکردار ہوں اور جن محترمہ کے قصیدے پڑھ رہی ہو۔ ان کی بات رہنے ہی دو تم۔ معمولی بات کو ایشو بنا لیا ہے، کہہ دیا سوری، اب کیا جان دے دوں۔" وہ بگڑ کر بولا اور کمرے سے نکل گیا۔ حیا اس کے جملے میں اٹک گئی تھی۔

"جن محترمہ کے قصیدے پڑھ رہی ہو ان کی بات رہنے ہی دو تم۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئی۔ الجھن کا سرا مل گیا تھا۔

☆☆☆

"السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام بیٹی، کیسی ہو۔"

"میں ٹھیک ہوں۔ اریبہ کہاں ہے؟"

"اریبہ اپنے کمرے میں ہے، کچھ طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"اچھا میں دیکھتی ہوں۔" وہ آہستہ سے کمرے میں داخل ہوئی۔ اریبہ بیڈ پر نیم دراز تھی۔ آنکھیں سرخ تھیں جیسے سو نہ سکی ہو۔ حیا کو دیکھ کر ایک سایہ سا چہرے پر لہرایا۔

"حیا تم!"

"ہاں میں...... کیسی ہو، آج کالج نہیں جانا۔"

"نہیں یار...... بس سر میں درد ہے۔ تم بھی نہیں جا رہی ہو۔"

"ہاں میرا موڈ نہیں ہے۔"

"حیرت ہے، تم موڈ کی تابع کب سے ہوگئیں۔"

جب سے تم نفس کی تابع ہوگئیں۔ اس نے دل میں سوچا، مگر کہا نہیں، بس لمحہ بھر کے لیے مسکرائی تھی۔

"میں تم سے سوری کرنے آئی تھی۔ کل بھائی اچانک آ گئے۔ تم گھبرا گئیں۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔ بھائی نے بھی سوری کہلوایا ہے۔" اریبہ کی پلکیں جھک گئیں۔

"کوئی بات نہیں، مجھے پتا ہے وہ جان بوجھ کر نہیں ہوا۔"

"پھر تم اتنی پریشان کیوں ہو، کوئی بات ہے کیا؟"

"نہیں یار، بس ایسے ہی۔" وہ پریشان ضرور تھی، مگر ظاہر نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔

"اصل میں ریان بھائی شوخ و شریر سے ہیں۔ اکثر میری فرینڈز سے مل کر مذاق بھی کر لیتے ہیں، مگر تمہارا معاملہ الگ ہے۔ اس لیے معذرت کی اور ویسے بھی آج کل وہ اپنی نئی گرل فرینڈ کے ساتھ باتیں کرتے ہیں، وہ بھی آدھی رات کو۔"

"گرل فرینڈ۔" اریبہ کے دل میں بہت زور سے یہ لفظ چبھا

"اور کیا، آدھی رات کو کسی لڑکے سے تو باتیں کرنے سے رہے۔"

"تمہیں کیسے پتا۔" اس کی آواز کپکپا گئی۔

"تمہیں تو پتا ہے، میں جلدی سو جاتی ہوں، رات کے آخری پہر اکثر میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ پھر میں پڑھائی کرتی ہوں، کبھی تہجد بھی پڑھ لیتی ہوں۔ بھائی کے کمرے کی کھڑکی صحن کی طرف کھلتی ہے۔ صحن میں کھڑے ہو تو آواز صاف آتی ہے۔ خصوصاً رات کے سناٹے میں' تو پتا چل گیا۔" وہ مزے سے بولی۔ اریبہ کے پسینے چھوٹ گئے۔

"ویسے میری سمجھ میں نہیں آتا اریبہ، کہ یہ لڑکیاں کیسے ماں، باپ کی آنکھوں میں دھول جھونک کر غیر مردوں سے رات کے اندھیرے میں راز و نیاز کرتی ہیں۔" وہ اب بغور دیکھ رہی تھی۔ "اور ریان بھائی جس سے فون پر عشق جھاڑتے ہیں۔ دوستوں میں بیٹھ کر اسی کی ریکارڈنگ سنتے اور سناتے ہیں۔"

"ریکارڈنگ؟" اریبہ کا دل بند ہونے لگا۔

"ہاں بھئی، آج ٹیکنالوجی کی ترقی کی باعث سب ممکن ہے۔ ساری کالز آٹومیٹک ریکارڈ ہو جاتی ہیں۔ اصل میں تمہیں کیا پتا، تم سیل فون استعمال نہیں کرتیں نا، تمہارے گھر پر تو پی ٹی وی کے دور کا یادگار فون سیٹ ہے جو سی ایل آئی بتا دے تو احسان مند ہونا چاہیے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" چہرے کا رنگ اُڑ گیا تھا۔ جسم جیسے مفلوج ہونے لگا تھا اور دماغ سن۔

"چھوڑو، میں بھی کیا باتیں لے کر بیٹھ گئی، تم بتاؤ کام کیا ہوئی کا۔" اس نے بات بدلی۔

"نہیں! تم فون کے بارے میں کچھ کہہ رہی تھیں، بتاؤ نا پلیز۔" لہجہ کپکپا رہا تھا۔ نگاہوں میں خوف تھا۔ حیا کو سمجھنے میں دیر نہ لگی۔

"بھئی فون سیٹ میں ایک آپشن ایسا ہوتا ہے جس سے تمام باتیں خود بہ خود ریکارڈ ہونے لگتی ہیں اور فون کرنے والے کو پتا بھی نہیں چلتا۔ پھر لڑکے بعد میں ان ہی کالز کا حوالہ دے کر لڑکیوں کو بلیک میل کرتے ہیں۔"

"اف میرے اللہ!" اریبہ کا سفید چہرہ کسی مردے کی مانند نظر آنے لگا۔ جیسے لمحے بھر میں روح کھینچ لی گئی ہو۔

"ظاہر ہے گناہ چھپتا نہیں ہے۔ پتا نہیں آج کل لڑکیوں نے لڑکوں سے بات کرنے کو اتنا ایزی کیوں لے لیا ہے کہ جیسے یہ کوئی گناہ کی بات ہی نہ ہو۔ ایسی گناہ گار لڑکیوں کو تو سخت سزا ملنی چاہیے۔"

"سزا" اریبہ تڑپ کر رہ گئی۔

"ہاں تو اور کیا؟" حیا نے تاک کر وار کیا تھا۔

• عورت کو ایسی تیز خوشبو لگا کر بازار میں نکلنے کی ممانعت

کی گئی ہے جو مردوں کو رغبت دلائے تو پھر کسی غیر مرد سے نرمی، ملائمت بھرے لہجے سے بات کرنا بھی تو گناہ ہے۔ اسی لیے تو عورت کو اجنبی مرد سے بات کرتے ہوئے لہجہ سخت رکھنے کی تاکید ہے، تاکہ وہ کسی خوش فہمی کا شکار نہ ہوں۔ پھر لڑکیاں کیوں معصوم بنتی ہیں، کیوں نہیں سمجھتیں کہ بات کرنا گناہ کی دعوت ہے۔ اسی سے برائیوں کا دروازہ کھلتا ہے۔

ریان بھائی بھی بہت غلط کر رہے ہیں۔ میں اس گناہ میں ان کا ساتھ نہیں دے سکتی اور ان کو سمجھا بھی نہیں سکتی مگر مجھے یہ خوف ہے کہ دھوکا اپنے مقام پر واپس آتا ہے۔ ان کے کیے کی سزا مجھے نہ بھگتنی پڑے۔ میں ان بہنوں میں سے نہیں ہوں جو اپنے بھائیوں کی غلطی کو شرارت کہہ کر نظر انداز کرتی ہیں۔ اپنی سہیلیوں کو ہاٹ کیک کی طرح بھائیوں کے سامنے باتوں کے چھوں میں پرو کر پیش کرتی ہیں۔ صنف نازک کی عزت کا خیال صنف نازک ہی نہ کرے تو اور کسی سے کیا توقع۔"

حیا چپ ہوئی تو اریبہ اس سے لپٹ گئی۔ اس کا وجود لرز رہا تھا۔ آنکھوں میں آنسو اور لبوں پر کپکپاہٹ تھی۔

"حیا...... میں غلطی پر ہوں۔ مجھے پتا ہے کہ تمہیں سب پتا چل گیا ہے۔ پلیز مجھے معاف کردو۔" وہ بری طرح رو رہی تھی۔ حیا ہولے ہولے تھپکتی رہی۔

"اریبہ! مجھے نہیں پتا کہ تم کس طرح بھائی کے ساتھ انوالو ہوئیں اور میں جاننا بھی نہیں چاہتی لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں کہ بھائی تم سے مخلص نہیں ہیں اور اس بات کا ثبوت یہ ہے۔" اس نے بیگ سے سیل فون نکالا اور آن کیا۔

"بھائی! اب آپ شادی کرلیں۔"

"کیوں بھئی! تمہیں اچانک میری شادی کرانے کا دورہ کیسے پڑ گیا۔"

"وہ اس لیے کہ آپ کو رات بھر جاگ کر باتیں کرنے کے بجائے آرام سے بات کرنے کا موقع مل جائے گا۔"

"تمہیں کیسے پتا۔" وہ چونک کر بولا۔

"بس میں بھی اسی گھر میں رہتی ہوں۔"

"اف! میری جاسوسی کی۔" ہلکے سے غصے بھری آواز ابھری۔

"نہیں جی! جاسوسی نہیں، خود بخود کانوں میں پڑی تھیں باتیں۔ تجسس نے ہوا دی تو آپ سے پوچھ رہی ہوں۔ کون ہے اور کیا آپ اس سے شادی کریں گے۔"

"شادی...... پاگل ہو گیا؟ یہ سب تو ٹائم پاس ہے۔"

اریبہ کے چہرے پر خون سمٹ آیا۔ اسے لگا کہ جیسے وہ ذلت کی اتھاہ گہرائیوں میں دھنستی جارہی ہے۔

"اچھا......" چلیں چھوڑیں۔ میری دوست اریبہ کے بارے میں کیا خیال ہے۔"

"کوئی خیال نہیں ہے۔"

"ارے واہ، اتنی اچھی، اتنی نیک ہے۔ ایسی لڑکی ڈھونڈے سے بھی نہ ملے گی۔ بہت شریف لڑکی ہے۔ جیسے اللہ کی نعمت۔"

"بس رہنے دو اللہ کی نعمت، بہت زیادہ سر نہیں چڑھاتیں، تم اسے۔"

"وہ ہے ہی اسی قابل۔"

"تمہاری وہ ہی قابل دوست میری گرل فرینڈ ہے، جس سے باتیں کرتے تم نے سنا تھا۔"

"نہیں۔" حیا کی آواز میں حیرانی ابھری۔

"جی ہاں! وہ ہی راتوں کو چھپ چھپ کر مجھ سے بات کرتی ہے۔"

"مجھے یقین نہیں آرہا۔"

"اچھا تو اب سنو۔" تھوڑی دیر کھڑ پڑ کی آوازوں کے بعد اریبہ کی آواز ابھری اور باتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اریبہ کی نگاہیں اس طرح جھکی تھیں جیسے کبھی نہ اٹھ پائیں گی۔

"اب کہو!" مردانہ آواز میں فاتحانہ رنگ نمایاں تھا۔

"آپ نے ریکارڈنگ کیوں کی۔"

"بس ایسے ہی، اب تم بتاؤ کہ میں ایسی لڑکی سے شادی کروں جو کسی لڑکے سے باتیں کرتی ہو۔ مجھے وہ اچھی لگی تھی۔ شادی کے بارے میں سوچ بھی لیتا اگر وہ مجھ سے فون پر دوستی نہ کرتی۔ بس اسی وجہ سے میرے دل میں اس کی عزت کم ہوگئی۔ ذرا سی کوشش پر بات چیت کے لیے راضی ہوگئی۔ تھوڑا ڈراما اور کیا تو ملنے پر بھی رضامند ہوجائے گی۔ ایسی لڑکی جس پر مجھے اعتبار نہ ہو۔ زندگی کا ساتھی نہیں بنا سکتا۔ ہاں ٹائم پاس کرنے کے لیے ٹھیک ہے۔"

"اگر وہ آپ سے بات نہ کرتی تو......"

"تو پھر سوچا جاسکتا تھا۔ مگر اب مشکل ہے۔"

"مگر بھائی! بات چیت پر رضامند بھی تو اس کو آپ نے ہی کیا تھا؟"

"ہاں، مگر...... انکار اس کا حق تھا۔ وہ کیوں میرے بلاوے پر راضی ہوئی۔ کل کو میں گھر سے بھاگ جانے پر راضی کروں گا تو کی ماں، باپ کو چھوڑ کر بھاگ جائے گی۔"

"بھائی یہ تو زیادتی ہے۔ پہلے باتوں سے پھسلا کر دوستی کرو اور پھر اسی بات کا طعنہ بنا کر چھوڑ دو۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔"

"کیوں لڑکیوں کے پاس عقل نہیں ہے کیا۔ غلط، صحیح کی سمجھ نہیں۔"

"اچھا پلیز، آپ یہ ریکارڈنگ ضائع کردیں، کسی نے سن لی تو اس کا امیج خراب ہوگا۔"

"جب اسے اپنے امیج کی پروا نہیں تو تم کیوں خدائی فوجدار بن رہی ہو۔" وہ چڑ سا گیا تھا۔

"میری دوست ہے۔ میں نہیں جانتی وہ کیسے اس جال میں پھنس گئی۔ مگر مجھے اس کی عزت عزیز ہے۔ پلیز۔"

"اوکے، لو خود ضائع کردو۔ میں کروں گا تو شک کرتی پھرو گی کہ ڈیلیٹ کی بھی ہے یا نہیں۔"

"تھینک یو۔" آواز آئی، بند ہوگئی۔ اریبہ کے آنسو مسلسل بہہ رہے تھے۔ اپنی ذلت پر، اپنے کردار پر اٹھتی انگلیوں پر، زندگی میں پہلی بار اس نے ریان سے دوستی کی تھی۔ یہ ہی سوچ کر کہ آئندہ یہ تعلق مضبوط رشتے میں بندھ جائے گا، مگر ہوا کیا......؟ وہ سب سراب تھا جواب اس کے دل کے لیے عذاب تھا۔ حیا نے اسے گلے لگالیا۔

"اریبہ! تم سے گناہ ضرور سرزد ہوا ہے۔ مگر تمہیں وقت پر حقیقت کا پتا چل گیا۔ شاید یہ تمہارے والدین کے اچھے اعمال کی بدولت ہے۔ اس بات کو اب یہیں ختم کردو۔ ہم یوں سمجھیں گے کہ یہ وقت ہماری زندگی میں آیا ہی نہیں تھا۔" وہ اسے ہولے ہولے تھپک رہی تھی۔ اور وہ اس کے گلے لگی روتی رہی۔

☆☆☆

رات اسی طرح سرد، خاموش تھی۔ آج چاند بھی آسمان پر جلوہ گر تھا۔ نرم مدھم روشنی سے سارا ماحول نہایا ہوا سا تھا۔ اختر صاحب کے گھر کی بالائی منزل پر چاندنی نے جھانک کر دیکھا۔ وہ سو رہی تھی۔ پرسکون اور میٹھی نیند، جیسے کسی شے پر گرد پڑ جائے اور اسے صاف کرکے رکھ دیا جائے تو وہ اور اچھی لگنے لگتی ہے۔ اس نے بھی اپنے وجود سے ایک برائی کی گرد جھاڑ دی تھی۔ اب اس کا وجود نیکی کی امید سے دمکنے لگا تھا۔ مسکراتی روشنی اس کا ماتھا چوم کر ماحول میں پھیل گئی۔ ماحول ساکت تھا۔ ہولے ہولے چلتی ہوا، نرم نرم روشنی، خوب صورت سماں تھا۔

مگر اب بھی کہیں کہیں چاند نہیں تھا۔ ستارے ٹمٹماتے تھے۔ سیل فون کی بھنبھناہٹ رات کی خوب صورتی کو داغ لگا رہی تھی۔ مدھم سرگوشیاں، دھیمی ہنسی کہیں نہ کہیں اب بھی موجود تھیں۔ رات اسی بھید بھری خاموشی کے ساتھ بہے جارہی تھی۔ جیسے کئی راز چھپائے بیٹھی ہو۔



تم مجھے کہیں رکھ کر بھول گئے ہو
کاغذ کے ڈھیر میں ایک وزیٹنگ کارڈ
کی طرح
مجھے رکھ کر بھول گئے ہو
گھر کے فرنیچر، قالین، دیواروں پر لگی
تصویروں کے ساتھ
تمہاری نظر مجھ پر سے بھی گزر جاتی ہے
کسی بینک میں کھولے مُختصر وقتی اکاؤنٹ
پڑھی ہوئی کتاب، اَدھ لکھی ڈائری
کی طرح
میں بھی کہیں موجود ہوں

شاید مجھے بھول جانا ہی بہتر ہے
تاش کی ہاری ہوئی بازی
شطرنج کی بساط پر کھائی ہوئی...
مات کی طرح

فاطمہ حسن

میں اپنا آپ کھو بیٹھا کئی راہوں کی مٹی میں
مجھے بانٹا گیا جب مختلف خطوں کی مٹی میں

پرانا دن نئے دن کو جنم دے کر ہی مرتا ہے
نئی سرسوں کا سونا ہے گئے برسوں کی مٹی میں

بڑے لمبے سفر کی گرد ہے میری کتابوں پر
کئی صدیوں کی سانسیں ہیں مرے حرفوں کی مٹی میں

نہ پودے سر اُٹھاتے ہیں، نہ اُن پر پھول آتے ہیں
عجب اک بے حسی کا زہر ہے گملوں کی مٹی میں

پرندے گوں ہر پیڑوں پہ آنے سے بھی ڈرتے ہیں
یہ کیسی سرسراہٹ ہے مرے باغوں کی مٹی میں

نشاد ناسک



جُنونِ عشق کی رسمِ عجیب، کیا کہنا
میں اُن سے دُور، وہ میرے قریب، کیا کہنا

یہ تیرگیٔ مسلسل میں ایک وقفۂ نور
یہ زندگی کا طلسم عجیب، کیا کہنا

ہزار قافلۂ زندگی کی تیرہ شبی
یہ روشنی سی اُفق کے قریب، کیا کہنا

لرز گئی تری لو میرے ڈگمگانے سے
چراغِ گوشۂ کوئے حبیب، کیا کہنا

عبیدامجد

جب دل کی رہ گزر پہ ترا نقشِ پا نہ تھا
جینے کی آرزو تھی مگر حوصلہ نہ تھا

کچھ لوگ شرمسار خدا جانے کیوں ہوئے
ان سے تو روحِ عصر ہمیں کچھ گلہ نہ تھا

سنسان دوپہر ہے، بڑا جی اُداس ہے
کہنے کو ساتھ ساتھ ہمارے زمانہ تھا

آندھی میں برگِ گُل کی زباں سے ادا ہوا
وہ راز جو کسی سے ابھی تک کہا نہ تھا

ادا جعفری

ادارہ

اس ماہ کی مسکراہٹیں

آسیب زدہ

ایک آدمی کو اپنی بیوی سے زیادہ دلچسپی نہ تھی مگر وہ ہر حال میں اس کے ساتھ رہ رہا تھا۔ ایک بار وہ کرائے کا مکان دیکھنے کے لیے بیوی کے ساتھ نکلا۔ انہیں ایک گھر اچھا لگا۔ اس گھر کا کرایہ کم تھا اور بنا ہوا بھی اچھا تھا۔

بیوی نے کہا۔ "تم اس میں نہیں رہ سکو گے، سنا ہے کہ مکان آسیب زدہ ہے، یہاں کوئی بدروح رہتی ہے۔"

وہ شخص مسکرایا اور کہا۔ "تم فکر نہ کرو، میں رہ لوں گا، آخر ایک زمانے سے تمہارے ساتھ بھی تو رہ رہا ہوں۔"

صائمہ...... کراچی

خوش قسمت

"صائمہ کی شادی ہو رہی ہے۔" ایک شخص نے اپنے دوست کو بتایا۔

"کون ہے وہ خوش قسمت جس سے صائمہ کی شادی ہو رہی ہے؟" دوست نے پوچھا۔

"شادی تو پتا نہیں کس سے ہو رہی ہے، مگر خوش قسمت میں ہوں، اس نے مجھ سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔" اس شخص نے مسکراتے ہوئے کہا۔

روبینہ...... کراچی

وضاحتی بیان

جج نے ملزمہ سے سوال کیا۔ "تمہارا کہنا ہے کہ تم نے شوہر کے سر پر کرسی دے ماری اور وہ ٹوٹ گئی۔"

"مگر میرا ارادہ ایسا نہ تھا۔" ملزمہ نے صفائی پیش کی۔

"یعنی تمہاری نیت حملہ کرنے کی نہیں تھی؟"

ملزمہ نے جواب دیا۔

"نہیں، میری نیت کرسی توڑنے کی نہیں تھی۔"

ریحانہ رشید وارثی...... ملتان

اطمینان

ایک صاحب ایک تحریر کا نمونہ لے کر اس کا تجزیہ کرانے تحریر شناس کے پاس پہنچے۔ تحریر کا تجزیہ کرنے کے بعد تحریر شناس بولا۔ "یہ الفاظ لکھنے والا شخص انتہائی تحمل مزاج، صابر، شائستہ اور بامروت ہے۔"

"بس بس ٹھیک ہے......!" وہ صاحب مطمئن ہو کر بولے۔ "دراصل میں جس محلے میں شفٹ ہوا ہوں، یہ وہاں کا ایک دکاندار ہے۔ میں اس سے ادھار سودا سلف لینا شروع کر رہا ہوں۔"

گھر کا بھیدی

کمپنی کے منیجر نے نوعمر چپراسی لڑکے پر برہم ہوتے ہوئے کہا۔ "ایک ماہ کے دوران تم نے آج تیسری مرتبہ جھوٹ بولا ہے۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے، کیا تمہیں معلوم ہے کہ ہماری کمپنی جھوٹے ملازمین کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہے؟"

"جی ہاں جناب!" لڑکے نے اثبات میں سر ہلایا۔ "میں نے تو اس کمپنی میں یہی دیکھا ہے کہ جب ملازمین جھوٹ بولنے میں ماہر ہو جاتے ہیں تو انہیں سیلز مین بنا کر کاؤنٹر پر کھڑا کر دیا جاتا ہے۔"

محبت نامہ

لڑکی اپنی سہیلی کو اپنے محبوب اور ہونے والے شوہر کا خط پڑھ کر سنا رہی تھی۔ "انہوں نے لکھا ہے کہ میں ہر وقت تمہارے پانچ فٹ تین انچ قد، تمہاری اٹھائیس انچ کمر، ڈیڑھ فٹ لمبی زلفوں، بادامی آنکھوں اور تمہارے بائیں پاؤں کی ہلکی سی لنگراہٹ کے بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔"

"یہ کچھ عجیب سا محبت نامہ نہیں ہے؟" سہیلی نے قدرے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

"نہیں! دراصل میرے منگیتر تھانے میں ہوتے ہیں اور "تلاش گمشدہ" کی رپورٹ اکثر وہی لکھتے ہیں۔" لڑکی نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

حیرت زدہ

ایک عورت نے نفسیاتی علاج کے ماہر ڈاکٹر سے کہا۔ "خدا کے واسطے میرے شوہر کو سدھارنے کے لیے کچھ کیجیے، وہ سارا سارا دن ایک بہت بڑا ڈھول بجاتے ہوئے گھومتے پھرتے ہیں۔"

ڈاکٹر بولا۔ "اسے خبط تو نہیں کہا جا سکتا، بالکل نارمل عادت ہے یہ۔ میں خود بھی کبھی کبھی ایک بڑا ڈھول بجاتا ہوں۔"

عورت نے حیران ہو کر پوچھا۔ "ڈھول کے اندر بیٹھ کر۔"

فرمائش

نئے نئے دولت مند ہونے والے ایک صاحب کی بیگم ایک سرجن کے پاس پہنچیں اور بولیں۔

"ڈاکٹر صاحب! میرا آپریشن کر دیجیے۔"

"مگر کس چیز کا آپریشن؟" سرجن نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کسی بھی چیز کا۔" خاتون نے لاپروائی سے کہا۔ "دراصل کسی مرض کے سلسلے میں اب تک میرا آپریشن نہیں ہوا ہے، اس کی وجہ سے مجھے بیگمات کے درمیان بیٹھ کر بات چیت کرنے میں مشکل پیش آتی ہے اور احساس کمتری سا ہونے لگتا ہے۔"

ستم ظریفی

آڈیٹوریم میں ایک مباحثہ میں "امن اور جنگ" پر بحث ہو رہی تھی۔ ایک مقرر نے جنگ کی حمایت میں بڑی زوردار تقریر کی لیکن تقریر اتنی خشک تھی کہ سامعین میں سے کوئی بھی سننے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس لیے اسے بھگانے کے لیے ہر طرف سے شور ہونے لگا۔ دل جلا مقرر نہایت ضبط کے بعد یہ کہہ کر اسٹیج سے چلا گیا۔ "جب اتنے چھوٹے سے ہال میں تھوڑی دیر کے لیے بھی امن برقرار نہیں رہ سکتا، تو اتنی بڑی دنیا جنگ کے بغیر کس طرح رہ سکتی ہے؟"

ہمدردی

ٹرین پلیٹ فارم سے نکل رہی تھی۔ ایک بھاری بھرکم صاحب بیگ اٹھائے، گرتے پڑتے اس کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ پلیٹ فارم کے آخر تک انہوں نے ٹرین کا تعاقب کیا لیکن ٹرین کی رفتار تیز ہوتی گئی، آخرکار تھک ہار کر وہ صاحب ہانپتے کانپتے اور پسینہ پونچھتے واپس آنے لگے۔

پلیٹ فارم پر کھڑے ایک صاحب نے اپنی دانست میں ان سے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے پوچھا۔ "ٹرین نکل گئی آپ کی؟"

"نہیں...... نہیں...... میں تو اسے یہاں سے بھگا رہا تھا۔"

موٹے آدمی نے جل کر جواب دیا۔

بیماری کی جڑ

دو نرسیں ایک مریض کے متعلق باتیں کر رہی تھیں۔ ایک نرس نے کہا۔ "میرے خیال میں سامنے لیٹے مریض کی بیوی اسے اچھا ہونے نہیں دے گی۔"

"کیوں کیا بات ہے؟" دوسری نرس نے اشتیاق سے پوچھا۔

"آج جب وہ آئی تو مریض سے حال احوال پوچھنے کے بجائے کہا، نئی سلک کی ساڑھی بڑی اچھی لگی ہے، اجازت ہو تو لے لوں۔"

شگفتہ شاہ

یادوں کے حوالے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے۔ ام المومنین ام سلمہؓ نے عرض کیا۔

"اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپ نے جو زہریلی بکری کا گوشت کھایا تھا، اس کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر سال تکلیف ہو جاتی ہے۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"مجھے اس کی وجہ سے جو مصیبت پہنچی ہے وہ تو اس وقت میری تقدیر میں لکھی جا چکی تھی جبکہ آدمؑ ابھی مٹی (کی شکل) میں تھے۔"

حضرت علیؓ کا زہد

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔

میں نے بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت فاطمہؓ سے شادی کی اور (تنگدستی کی وجہ سے یہ حال تھا کہ) میرے اور ان کے پاس مینڈھے کی کھال کے علاوہ اور کوئی بستر نہیں تھا۔ جس پر رات کو ہم سو جاتے تھے اور دن میں ہم اس پر پانی لادنے والے اونٹ کو چارہ کھلاتے تھے اور میرے پاس کوئی خادم بھی نہیں تھا۔

مرتبہ

خلیفہ ہارون الرشید نے عبداللہ بن مصعب سے پوچھا۔

"ابوبکرؓ اور عمرؓ کا مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جناب میں کیا تھا؟"

میں نے کہا۔ "جو مرتبہ ان دونوں کا ان کی وفات کے بعد ہوا، وہی مرتبہ ان کا ان کی زندگی میں تھا۔"

ہارون الرشید نے کہا۔ "تم نے میرے سوال کا جواب کافی دے دیا۔"

ہمارا مال ضرورت مندوں کے لیے وقف ہے

حاتم طائی کی سخاوت پوری دنیا میں مشہور ہے۔ ان ہی کے خاندان میں داؤد طائی ایک بہت بڑے بزرگ گزرے ہیں۔ یہ مسکینوں اور یتیموں کا بہت خیال رکھتے۔

ایک مرتبہ انہیں گوشت کھائے ہوئے بہت دن ہو گئے۔ گوشت کے وہ پہلے بھی شوقین تھے۔ اس لیے بازار سے گوشت منگایا اور ماما سے مزے دار گوشت بنوایا۔ جب گوشت سامنے آیا تو داؤد طائی نے ماما سے محلے کے کچھ یتیم بچوں کا حال پوچھا۔ ماما نے بتایا کہ ان کی حالت ٹھیک نہیں۔ وہ بہت غریبی اور بے کسی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ سننا تھا کہ داؤد طائی نے کھانے سے ہاتھ اٹھا لیا اور بولے۔

"جاؤ یہ گوشت ان یتیم بچوں کو دے دو، انہیں گوشت نصیب نہ ہوتا ہوگا۔"

ماما نے کہا۔ "آپ نے بھی تو بہت دنوں سے گوشت نہیں کھایا ہے، آج آپ ہی کھا لیجیے۔ ان بچوں کو کسی اور دن کھلا دیا جائے گا۔ آپ کی بھی تو کئی دن سے گوشت کھانے کو طبیعت کر رہی ہے۔"

داؤد طائی نے کہا۔ "نہیں میں نہیں کھاؤں گا، یہ گوشت تم لے جا کر بچوں ہی کو کھلا دو ان کا کھلایا ہوا اللہ کے پاس پہنچے گا اور ہمارا کھایا ہوا مٹی ہو جائے گا۔"

اور یہ کہہ کر پکا پکایا گوشت یتیم بچوں کو بھجوا دیا اور شدید خواہش کے باوجود نہ کھایا۔

درویش گورنر

صحابہ کرامؓ میں سب سے زیادہ احادیث نقل کرنے والے حضرت ابوہریرہؓ کو حضرت امیر معاویہؓ نے اپنے دور حکومت میں مدینہ منورہ کا گورنر مقرر کر دیا۔ مگر اتنے اعلیٰ منصب پر فائز ہونے کے بعد بھی پیغمبر اسلامؐ کے اس شاگرد رشید کے مزاج اور طرز زندگی میں کوئی فرق نہیں آیا اور نہ گورنری کے عہدے نے ان کی پاکیزہ روح میں نخوت کے کوئی آثار پیدا کیے۔

اپنی گورنری کے دوران ایک مرتبہ حضرت ابوہریرہؓ لکڑیوں کا ایک گٹھا اٹھائے مدینہ منورہ کے بازار سے جا رہے تھے۔ راستے میں حضرت ثعلبہ بن مالکؓ کے پاس سے ان کا گزر ہوا تو ان سے فرمایا۔

"اے ابن مالک! اپنے گورنر کے لیے راستہ وسیع کر دو۔"

انہوں نے کہا۔ "اللہ آپ پر رحم فرمائے، کیا یہ گزرگاہ آپ کے لیے کافی نہیں؟"

حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا۔ "خدا کے بندے! گورنر اور اس کی پیٹھ پہ لدے ہوئے ایندھن کے گٹھے کے لیے راستہ مطلوب ہے۔"

(حیات صحابہؓ کے درخشاں پہلو)

اللہ تعالیٰ کی رضا

کہتے ہیں ایک دفعہ نوشیرواں نے اپنے وزیر بزرجمہر کو جیل میں ڈال دیا اور کئی ماہ تک خبر نہ لی۔ ایک دن چند دوست اس سے جیل میں ملنے گئے تو اسے بالکل مسرور و مطمئن پایا۔ انہوں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگا۔

"مجھے یقین ہے کہ ہر کام اللہ کی مرضی سے ہوتا ہے۔ اس کی مرضی کبھی نہیں ٹل سکتی اور اس کا ہر کام مصلحت ہوتا ہے۔ خوشی اور غم دونوں ناپائیدار ہیں۔ اگر خوشی باقی نہیں رہی تو غم بھی نہیں رہے گا۔"

تربیت

ایک مشہور سائنس دان جس نے میڈیکل کے شعبے میں نمایاں کامیابی حاصل کی تھی۔ اس سے اس کی کامیابی کا راز پوچھا گیا تو اس نے کہا۔

"یہ سب اس کی ماں نے اسے سکھایا ہے۔ بچپن میں ایک بار وہ شربت کی بوتل فریج سے نکال رہا تھا۔ بوتل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گری اور ٹوٹ گئی۔ شربت پورے فرش پر پھیل گیا۔

جب اس کی ماں کچن سے آئی تو اس نے چیخنے چلانے کے بجائے اس سے کہا۔

"میں نے اتنا شربت زندگی میں نہیں دیکھا۔ یہ گر چکا ہے اب چاہو تو تم اس میں لوٹ پوٹ سکتے ہو۔"

اس نے ایسا ہی کیا۔

کچھ دیر بعد ماں نے کہا۔ "جب تم گندگی پھیلاؤ تو تمہیں اس کو صاف بھی کرنا چاہیے۔ اب تم اسفنج اور وائپر لے کر اسے صاف کرو۔"

ماں نے میرے ساتھ مل کر فرش صاف کیا۔ پھر مجھ سے کہا۔

"تم نے بوتل اٹھانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ اب ایک بار اور کوشش کرو۔ باہر جا کر بوتل میں پانی بھر دو اور اسے اٹھاؤ۔"

میں نے بوتل پانی سے بھر کر احتیاط سے اٹھائی اور ایک ہاتھ بوتل کے نیچے رکھ کر اسے کمرے میں لے گیا۔

پھر اس سائنس دان نے گہرا سانس لیا اور کہا۔

"یہ وہ لمحہ تھا جب میں نے سیکھا۔ غلطیوں سے خوف زدہ نہیں ہونا چاہیے۔ غلطیاں نئی باتیں سیکھنے کا موقع فراہم کرتی ہیں۔"

غذا

اردشیر بابکان (ایران کا بادشاہ) نے ایک حکیم سے پوچھا۔

"انسان کو دن بھر میں کتنی خوراک کھانی چاہیے؟"

حکیم نے کہا۔ "ڈیڑھ پاؤ۔"

بادشاہ نے کہا۔ "اتنی سی مقدار بھلا کیا طاقت دے گی۔"

حکیم نے کہا۔ "جہاں پناہ! انسان کی صحت کے لیے اسی قدر کافی ہے۔ جو شخص اس سے زیادہ کھاتا ہے وہ غذا کا بوجھ اٹھاتا ہے۔"

مسرت الطاف احمد۔ کراچی

سچی باتیں

☆ جاہلوں کا طریقہ ہے کہ جب ان کی دلیل مقابل

کے آگے نہیں چلتی تو وہ لڑنا شروع کر دیتے ہیں۔

☜ ایسے دوست سے دوری بہتر ہے جو تیرے دشمنوں کے ساتھ بیٹھتا ہو۔

☜ اچھی عادت کی نیک اور پارسا عورت اگر فقیر کے گھر بھی ہو تو اسے بادشاہ بنا دیتی ہے۔

☜ رزق کی کمی اور زیادتی دونوں ہی بُرائی کی طرف لے جاتی ہیں۔

(شیخ سعدیؒ)

ثمرہ، اقرا۔ کراچی

شرم و حیا

ہندو رام تاریخ کی مذہبی شخصیت ہیں۔ انہوں نے اپنے والد کا ایک وعدہ نبھانے کے لیے چودہ برس کا بن باس یعنی چودہ سال تک جنگلوں میں رہنے کے عمل کی ابتدا کی تو رام کی بیوی سیتا اور ان کا سوتیلا بھائی لکشمن بھی ان کے ساتھ ہو لیا۔

رام، سیتا اور لکشمن کو جنگلوں میں رہتے کئی سال ہو گئے۔ ایک دن لنکا کے بادشاہ راون نے سیتا کو جنگل میں دیکھا تو وہ سیتا کو اغوا کر کے سری لنکا لے گیا۔

اس موقع پر رام نے اپنے بھائی لکشمن سے کہا۔

"میں سیتا کو جنگل میں ڈھونڈتا ہوں تم بھی اپنی بھابی کو تلاش کرو۔"

لکشمن نے یہ سُن کر رام سے کہا: "میں نے آج تک بھابی کے صرف پاؤں دیکھے ہیں۔ آپ مجھے بتائیے کہ وہ چہرے مہرے اور حلیے سے کیسی لگتی ہیں تاکہ میں انہیں کہیں دیکھوں تو پہچان لوں۔"

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ صرف اسلام میں ہی نہیں دُنیا کے قدیم ترین مذہب ہندوازم میں بھی نامحرم مرد اور عورتوں کے درمیان حجاب رکھا جاتا تھا۔

بُرائی کی جڑ

ایک آدمی دن رات مخلوقِ خدا کو اذیت دینے کی تدبیریں سوچتا رہتا تھا۔ ایک دن اسے شرارت سُوجھی اس نے اپنے گھر کے سامنے راستے میں لمبے لمبے کانٹوں والی ایک جھاڑی لگا دی۔ چند دنوں کے اندر اندر یہ جھاڑی بڑھ گئی۔ ہر چند لوگ اس سے بچ بچا کر نکلتے لیکن پھر بھی کوئی نہ کوئی کانٹا پاؤں کو زخمی کر دیتا اور کسی نہ کسی کا دامن تار تار کر دیتا۔

لوگوں نے اس کو بہت ملامت کی۔

"تو نے اپنے گھر کے سامنے یہ جھاڑی کیوں اُگنے دی۔ اب تو تکلیف کی انتہا ہو چکی ہے، اسے اکھاڑ دے۔"

اس نے مسکرا کر نرمی سے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے، اکھاڑ دوں گا۔"

چند دن پھر اسی طرح گزر گئے۔ یہاں تک کہ اب جھاڑی نے آدھا راستہ گھیر لیا۔ لوگوں نے مجبور ہو کر حاکمِ وقت سے اس کی شکایت کی۔ اس نے فوراً اس شخص کو بلایا۔ اسے بُرا بھلا کہا پھر سختی سے حکم دیا۔

"ابھی جا کر جھاڑی اکھاڑ دے۔"

اس نے عرض کیا۔ "ابھی حکم کی تعمیل ہو جائے گی۔" وہ حاکمِ وقت سے وعدہ کر کے چلا گیا۔ اس نے جھاڑی پھر بھی نہ اکھاڑی۔ اگر کوئی اس کی اس طرف توجہ دلاتا تو کہہ دیتا۔

"آج فرصت نہیں کل یہ کام کر دوں گا۔"

اسی طرح کل کل پر ٹالنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک دن جھاڑی اتنی بڑھ گئی کہ اب اس کا ہٹانا آسان نہ رہا۔ یہ درخت مضبوط ہو گیا۔ اور اس کی جڑیں اتنی گہری ہو گئیں کہ پھر وہ ظالم اس کو اکھاڑنے سے عاجز ہو گیا۔ درخت جوان ہو گیا اور اس کو اکھاڑنے والا کمزور ہوتا گیا۔

سبق:۔ اسی طرح ہماری بُری عادتیں اور گناہ کے کام ہیں۔ ان کی اصلاح میں جس قدر دیر کی جائے گی، ان کی جڑیں مضبوط ہوتی چلی جائیں گی۔ بُرائی کو فوراً ختم کرنا چاہیے۔

سرورق کی شخصیت	
ماڈل	نیہا علی
میک اپ	روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی	موسیٰ رضا

خالدہ جیلانی

کھلتا کسی پہ کیوں میرے دل کا معاملہ

مدیحہ نبیل ______ نبیل شریف

ٹوٹ گیا تو کیا ہوا
دل کھلونا ہی تو ہے

رضوانہ شکیل ڈڈ ______ لودھراں

اس کو ہر رنگ سے چاہو محسن
اس کو ہر روپ بدلنے دینا

اقرا عزیز ______ گاؤں دریا خان جلبانی

اپنے بالوں کی سفیدی سے سہم جاتا ہوں
زندگی اب تیری رفتار سے ڈر لگتا ہے

سعدیہ نازلی دعا ______ کموال

ہم تو یوں بھی تیرے ہیں
ہم پر جادو ٹونا کیا
دل کو دل سے مطلب ہے
پیتل، چاندی، سونا کیا

فارحہ اقبال ______ کراچی

مباحثوں کا ماحصل فقط خلش، فقط خلل
سوال ہی سوال ہیں، جواب ایک بھی نہیں

تبسم عروج ______ ڈنگہ

تو نہیں ہار گیا ہے میرے بزدل دشمن
مجھ سے تنہا کے مقابل ترا لشکر نکلا

سحرش مصطفیٰ ______ میانوالی

سحر اور دوپہر اور شام اور شب
میں ان لفظوں کے معنی سوچتا ہوں

تبسم عروج ______ ڈنگہ

کیا بتائیں پیار کی بازی وفا کی راہ میں
کون جیتا کون ہارا، یہ کہانی پھر سہی

عظمیٰ ______ گوجرانوالہ

خدا نصیب کرے ان کو دائمی خوشیاں
عدم وہ لوگ جو ہم کو اداس رکھتے ہیں

عائشہ مرزا ______ فیصل آباد

وہ درد، وہ وفا، وہ محبت تمام شد
لے! دل میں ترے قرب کی حسرت تمام شد

سحر سہیل ______ کراچی

نہ تجھے مات ہوئی ہے نہ مجھے مات ہوئی ہے
اب کی بار دونوں چالیں بدل کر دیکھتے ہیں

فاکہہ سہیل ______ کراچی

کسی دیے کی طرح سے گزر رہی ہے زندگی
یہاں جلا کے رکھ دیا، وہاں بجھا کے رکھ دیا
وجود کی بساط پر بڑی عجیب مات تھی
یقین لٹا کے اُٹھ گئے، گماں بچا کے رکھ دیا

ثمرہ اقرا ______ کراچی

چاہتوں کی بساط پر محسن
دل بڑی مشکلوں سے ہارا ہے

کنیز فاطمہ ______ گوجرانوالہ

دل ناامید تو نہیں ناکام ہی تو ہے
لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے

عابدہ مغل ______ پھیر کنڈ مانسہرہ

مجھے یقین ہے کہ اب ہم کبھی نہ بچھڑیں گے
تمہیں گماں کہ ہم مل کے بھی پرائے ہیں

شبنم حنیف ______ لاہور

نہ دوستی نہ تکلف نہ دلبری نہ خلوص
کسی کا کوئی نہیں آج سب اکیلے ہیں

کوثر خالد ______ جڑانوالہ

جھوٹ کیوں بولیں فروغِ مصلحت کے نام پر
زندگی پیاری سہی لیکن ہمیں مرنا تو ہے





خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: shuaa@khawateendigest.com

آپ کے خط اور ان کے جواب لیے حاضر ہیں۔
آپ کی صحت' عافیت اور خوشیوں کے لیے دعائیں۔ اللہ تعالی آپ کو ہر تکلیف' پریشانی اور دکھ سے محفوظ رکھے۔ نیا سال آپ کے لیے خوشیوں اور خوش حالی کا سال ہو۔ آمین

پہلا خط کراچی سے ہاجرہ ریحان کا ہے، لکھتی ہیں
ستمبر کے شعاع میں میرا افسانہ "ہمدرد" شائع ہوا تھا جس کے لیے' چوک اعظم محترمہ ناظمہ زیدی صاحبہ نے یہ معلومات فراہم کیں کہ لندن میں دن کی روشنی کافی دیر تک رہتی ہے۔

میں یہ وضاحت دینا چاہتی ہوں کہ میں نے افسانے میں سردی کے دنوں کا تذکرہ کیا ہے اور لندن کی سردیوں میں دن بہت چھوٹے ہو جاتے ہیں۔ سورج کوئی سات یا سوا سات تک نکلتا ہے اور غروب پونے چار بجے ہو جاتا ہے۔ یہ سلسلہ نومبر سے شروع ہو جاتا ہے اور تقریبا جنوری کے اواخر تک رہتا ہے۔ بہرحال ناظمہ صاحبہ نے یہ بھی درست فرمایا کہ وہاں رمضانوں میں روزے لمبے ہوتے ہیں کیونکہ آج کل رمضان گرمیوں میں آ رہے ہیں اور گرمیوں میں لندن میں دن کافی لمبے ہو جاتے ہیں سورج صبح پونے پانچ بجے تک طلوع ہو جاتا ہے اور رات ساڑھے نو بجے تک غروب ہوتا ہے۔

ج۔ پیاری ہاجرہ! آپ کی وضاحت ہم ناظمہ زیدی اور دیگر قارئین تک پہنچا رہے ہیں۔ اگرچہ کہ ہم سمجھتے ہیں کہ افسانے میں بنیادی چیز کہانی کا آغاز، انجام، الفاظ کا مناسب انتخاب، کردار نگاری اور تحریر کا تاثر ہوتا ہے۔ اس طرح کی جزیات سے کسی کہانی کے تاثر پر بہت زیادہ فرق نہیں پڑتا۔

کراچی سے روبینہ شوکت شریک محفل ہیں
حمد اور نعت پڑھ کر دل کو سکون ملتا ہے۔ "پیارے نبی کی پیاری باتیں" پڑھ کر زندگی کے بہت سے مسائل حل کرنے میں مدد ملتی ہے۔
"تاریخ کے جھروکوں سے" ایک خوب صورت سلسلہ کیونکہ شادی سے پہلے تاریخی ناول بہت شوق سے پڑھتی تھی اس لیے یہ سلسلہ بہت پسند ہے۔ "جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے" یہ سلسلہ بہت بور کر دیتا ہے۔ معذرت کے ساتھ۔ "خواب شیشے کا" موسٹ فیورٹ ناول۔ عفت سحر صاحبہ نے سچ مچ اپنے سحر میں مبتلا کر رکھا ہے۔ صائمہ اکرم کا "شہزاد" بہت خوب صورت تحریر۔ صندل کی بے بسی پر دل بہت دکھی ہوا۔ خدا ایسے لوگوں کو غارت کرے۔

ج۔ پیاری روبینہ! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ نے تین چار خط لکھے اور ایک بھی خط شامل نہ ہو سکا۔ دس سال سے آپ ہمارے ساتھ ہیں۔ یہ جان کر دلی مسرت ہوئی۔ آپ کی تعریف ہم متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔

فضہ نور نے روہڑی سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں
حمد اور نعت سے مستفید ہوئی۔ بند حسن سمیع ثانی اور شبنم سے ملاقات اچھی رہی۔ دستک میں علی عباس اور صبا قمر کے بارے میں پڑھا۔ کتاب کہانی سمیرا حمید کا انداز

اور طرز تحریر واقعی شوق ہو تو ذوق خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ خواب شیشے کا عفت جی جس انداز میں کرداروں کو واضح کر رہی ہیں بہت زبردست ہے۔
اب آتے ہیں ٹاپ بیسٹ ناول پر' آسیہ رزاقی "تبدیلی آ گئی ہے" واقعی تبدیلی آ گئی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اب انسانوں کو بدلنے میں دیر نہیں لگتی جملوں سے بہت محظوظ ہوئے۔ ایسے لگ رہا تھا کہ کہانی نہیں حقیقت ہے' ویلڈن آسیہ جی۔ "بند ہونٹوں کی بات" وامق کا کردار بہت زبردست تھا۔ نانی کا کردار کافی انٹرسٹنگ تھا۔ کہانی سے موڈ کافی فریش ہو گیا۔ شعاع کے تمام سلسلے زبردست ہوتے ہیں۔ اس ماہ بھی تمام سلسلے اچھے تھے۔ آئینہ خانے میں واصفہ سہیل کی چٹ پٹی باتیں پڑھ کر مزہ آتا ہے۔ تاریخ کے جھروکوں میں تاریخ کی لازوال باتیں اور معلومات ملتی ہیں۔

ج۔ پیاری فضہ! خط شائع ہو یا نہ ہو مگر آپ ہمیں ہر ماہ خط ضرور لکھتی رہیں کیونکہ آپ نے ہر کہانی پر بہت اچھا اور تفصیلی تبصرہ کیا ہے۔ شعاع کی پسندیدگی کا جان کر دلی مسرت ہوئی۔ آپ کی تعریف آسیہ رزاقی اور دیگر مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔

ارم فاطمہ الیاس۔ فیصل آباد سے شرکت کر رہی ہیں، لکھا ہے
شعاع اور کرن میرے فیورٹ رسالے ہیں۔ میری کوئی بہن نہیں ہے۔ چار بھائی ہیں۔ یہ رسالے ہی میری دوست اور بہن ہے۔ ہمارے معاشرے میں رسالے پڑھنا برا سمجھا جاتا ہے، میں جوائنٹ فیملی سسٹم میں رہتی ہوں۔ خیر میرے بھائی اور ابو جی کچھ نہیں کہتے۔
آپ دعائیں بہت اچھی دیتی ہیں۔ پلیز میرے لیے بھی دعا کریں اور قارئین سے بھی گزارش ہے کہ دعا کریں میں کچھ ماہ سے بیمار ہوں۔

ج۔ پیاری ارم! اللہ تعالی آپ کو صحت و تندرستی سے نوازے۔ ہماری قارئین ہمیں بہت عزیز ہیں اور جو عزیز ہوں ان کے لیے دل دعا گو ہی رہتا ہے۔
رسالے پڑھنا کیوں برا سمجھا جاتا ہے۔ اس بات کا کیا جواب دیں جبکہ ان ہی رسالوں کی تحریریں جب ڈرامائی شکل میں ٹی وی پر دکھائی جاتی ہیں تو سب گھر والے ساتھ بیٹھ کر بڑے خشوع و خضوع سے دیکھتے ہیں۔ ویسے اب کافی تبدیلی آ گئی ہے۔ بہت سی قارئین لکھتی ہیں کہ باپ اور بھائی خود کتابیں، رسالے لا کر دیتے ہیں۔

گل ریحان چترال سے تشریف لائی ہیں، لکھتی ہیں
میں نویں کلاس میں تھی جب شعاع پڑھنا شروع کیا تھا اور اب میں ایم اے پارٹ ٹو کے ایگزام کی تیاری کر رہی ہوں۔ میں نے زندگی میں جو کچھ بھی سیکھا ہے آپ کے ہی ڈائجسٹوں سے سیکھا ہے۔ آپی مجھے بھی ناول وغیرہ لکھنے کا جنون کی حد تک شوق ہے لیکن میں یکسوئی سے کچھ لکھ نہیں سکتی۔ میری امی کو ہمیشہ مجھ سے یہی شکایت ہے کہ میں ہر ماہ یہ رسالے کیوں منگاتی ہوں۔ اس میں کیا ہوتا ہے۔ میرے ساتھ میرے کزن بھی آپ اور آپ کی ٹیم کو سلام کہہ رہے ہیں اور ہاں جوادی اور شبلی کو بھی ہم لوگ مس کر رہے ہیں۔

ج۔ پیاری گل! آپ کی امی کا اعتراض بجا ہے جب انہیں پتا ہی نہیں کہ ان رسالوں میں کیا ہوتا ہے تو وہ اعتراض تو کریں گی ناں۔ آپ انہیں ہر ماہ ایک دو چھوٹی چھوٹی کہانیاں پڑھ کر سنایا کریں۔ کچھ سلسلوں میں سے تحریریں پڑھ کر سنائیں۔ پھر دیکھیے گا کہ انہیں آپ سے بڑھ کر ان پرچوں کا انتظار ہو گا۔
جوادی اور شبلی کو تو ہم بھی بہت مس کرتے ہیں لیکن ہماری پیاری ثمروٹی وی کو پیاری ہو چکی ہیں۔ اب بتائیں کیا کریں۔؟
بشریٰ گوندل نے کافی عرصے سے ہمیں یاد نہیں کیا۔ اگر انہوں نے کچھ لکھا تو ضرور شائع کریں گے۔

کراچی سے انیلا طاہر نے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں
میں گزشتہ 20 سال سے شعاع اور خواتین کی قاری ہوں۔ شادی سے پہلے اپنی چچی سے لے کر پڑھتی تھی اور شادی کے بعد باقاعدگی سے پڑھتی ہوں۔ ہم ملتان سے تعلق رکھتے ہیں اب کراچی میں رہتے ہیں' ہزبینڈ کی جاب کی وجہ سے۔ شادی کے شروع میں میاں

جی جب رسالہ لا کر دیتے تھے تو میرے چہرے پہ جو الوہی خوشی ہوتی، کہتے اتنی خوشی تو ملتان سے فواد، جنید (میرے بھائی) میں سے بھی کوئی آ جاتا تو شاید نہ ہوتی جتنی رسالے دیکھ کر ہوئی۔ "شعاع کے ساتھ ساتھ" سلسلہ کیوں بند کر دیا آپ لوگوں نے۔ عمیرہ احمد، نمرہ احمد جس طرح ہماری روحانی تربیت کرتی ہیں قابل تحسین ہے۔

میرے والد ان رسالوں کے بہت خلاف تھے ان سے چھپ کر پڑھتی تھی ایک بار چھین کر پھینکا بھی تھا ابو نے۔ کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے کہ ابو نے واٹس ایپ پہ ایک کلپ بھیجا جو ڈرامہ سیریل شہزادت کا تھا اللہ سے عشق کے حوالے سے تب میں نے ان کو جواب دیا کہ یہ انہی رسالوں سے لی گئی اسٹوری ہے جن کے آپ خلاف تھے۔

اور کچھ شکایات بھی ہیں۔ وہ یہ کہ جو رائٹرز بہت مشکل اردو استعمال کرتی ہیں وہ پلیز اتنا لمبا چوڑا بات کو کھینچا نہ کریں اور کبھی کبھی آپ ایسی اسٹوریز بھی چھاپتے ہیں جو بلا جواز ہوتی ہیں بہت بوریت ہوتی ہے۔

ج۔ پیاری انیلا! ہماری کوشش تو یہی ہوتی ہے کہ شعاع میں ہر ماہ بہترین تحریریں شامل ہوں اگر آپ کو کچھ تحریریں پسند نہیں آتیں تو آپ ان تحریروں کی نشان دہی ضرور کریں تاکہ ہم آپ کی پسند ناپسند سے آگاہ ہو سکیں۔ شعاع کے ساتھ ساتھ سلسلہ بند نہیں کیا صفحات کی کمی کی وجہ سے شامل نہیں کر پاتے۔

فرحانہ مہناز نے گوجرہ سے لکھا ہے۔

کیسے ہوتے ہیں وہ خط جن کے جواب آتے ہیں پیارا سا ٹائٹل لے کر پیارے نبی کی پیاری باتیں ہمیشہ کی طرح ایمان افروز تھیں۔ خواب شیشے کا میرا موسٹ فیورٹ ناول ہے۔

شہزاد شروع میں زیادہ دلچسپ تھا جب سے دلشہوار کو چھچھوری بنا دیا۔ کچھ مزہ نہیں آتا اور پلیز ہمزاد کو ہادی نہ بنایئے گا۔ ثمرہ بخاری جی آپ کی کہانی پڑھنے کو تو ہم بہت بے چین تھے ۔۔۔ سادہ سی کہانی بہت پسند آئی۔ "تبدیلی آ گئی ہے" پیسے کے پیچھے پاگل رشتہ داروں کی زندگی میں تبدیلی آ گئی باقی رشتہ دار تو ویسے ہی تھے۔ سلویٰ جی سنہری دھوپ کو اب ختم کریں، ایمل رضا جی شگنوں والی شال بہت ہی زیادہ رنجیدہ کر دینے والی تھی۔

پیاری فرحانہ! شائع نہ ہونے کی مختلف وجوہات ہوتی ہیں کبھی خط تاخیر سے موصول ہوتے ہیں، کبھی صفحات کی کمی آڑے آتی ہے۔

آپ کے خط تو ہمیں موصول ہی نہیں ہوئے تو شامل کیسے کرتے۔

آپ کا خط شامل اشاعت ہے آپ کو اپنے سوال کا جواب مل گیا ہوگا، ایسے ہوتے ہیں وہ خط۔

مریحا نہ چوہدری نے مدو کے سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

شبنم ثانی اور سمیع ثانی کا بندھن خوبصورت لگا۔ دستک کا سلسلہ بھی اچھا لگا، جب تجھ سے ناتا میں بہن کا احوال دکھی کر گیا

ہاجرہ ریحان کی استانی کی ـــــ شروعات اچھی لگی کیونکہ ہم خود بھی اللہ کے فضل سے گورنمنٹ ہائی اسکول میں اردو کی استانی ہیں، یقین کریں سب سے زیادہ مزہ ثمرہ بخاری کی بند ہونٹوں کی بات پڑھ کر آیا، واثق کا کردار پڑھتی جاتی تھی اور اپنا بھانجا عمران تارڑ آنکھوں کے سامنے نظر آتا تھا ویسا ہی نٹ کھٹ ویسا ہی بات چیت کا انداز سدرہ حیات کا ناول بہترین ناول تھا۔ شاعری بھی اچھی تھی مگر امجد اسلام امجد کی نظم بہترین تھی۔

اور ہمیشہ کی طرح سب سے بھرپور سب سے دلچسپ سلسلہ "خط آپ کے" جسے ہم ایک مرتبہ نہیں کئی مرتبہ پڑھتے ہیں۔ کوثر خالد جڑانوالا بہت ہمت ہے آپ کی اگر داد نہ دوں تو ناانصافی ہوگی کہ آپ اتنی مصروفیت کے باوجود ٹائم نکال لیتی ہیں۔

اقراء ممتاز نے سرگودھا سے لکھا ہے

مسکراتی ہوئی ٹائٹل گرل اچھی لگی۔ شبنم ثانی اور سمیع ثانی سے ملاقات بیسٹ رہی۔

علی عباس بہت اچھے ایکٹر ہیں بہت دنوں بعد صبا قمر سے ملاقات کی، شہزاد بہت اچھا ناول جا رہا ہے، کچھ خواب ہیں ان آنکھوں میں قریال نے ثانیہ کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔

بند ہونٹوں کی بات کیا کمال اسٹوری تھی اگر ایسی مزاحیہ تحریر ہو تو سارے دن کی تھکن خود بخود اتر جاتی ہے۔ واقعی اگر گھر میں زیادہ افراد ہوں تو بہت مزا آتا ہے ہم بھی گھر میں زیادہ افراد رہتے ہیں۔ کزن کے ساتھ ہنسی مذاق لڑائی جھگڑے کرتے رہتے ہیں حاجرہ ریحان نے اردو کی استانی کا کیا نقشہ کھینچا ہے، ہلکی پھلکی تحریر رہی۔

پیاری اقراء! گھر میں زیادہ افراد ہوں تو واقعی بہت مزا آتا ہے لیکن اس وقت تک جب مزاج میں درگزر برداشت اور محبت ہو۔ اگر دلوں میں گنجائش نہ ہو تو لڑائیاں بھی جم کر ہوتی ہیں اور آپس کی لڑائیاں گھر تو کیا ملک بھی توڑ دیتی ہیں۔ مزاحیہ تحریریں ہمیں بھی بہت اچھی لگتی ہیں لیکن مزاح لکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں اسی لیے مزاح لکھنے والوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔

ملائکہ کوثر بسم اللہ پور سے شریک محفل ہیں لکھا ہے۔

ماڈل کا آنچل سے ڈھکا سر ہو تو شعاع اور بھی معتبر ہو جاتا ہے یہ دیہی علاقے کی بہنوں کا خیال ہے سب کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

پہلی شعاع کے اپنائیت بھرے الفاظ قلب میں حساسیت جگاتے ہیں ہمیشہ پیارے نبی کی باتیں دل کو انوکھا سرور بخشتی ہیں دستک دستک تو زیادہ تر ثمرہ ہی پڑھ کر مجھے سناتی ہے

صائمہ چوہدری کی شہزاد کی کہانی ثمرہ نے پہلے ہی پیش گوئی کر دی تھی رومیصہ کو اس لڑکے سے محبت ہو جائے گی۔ نومبر میں نعیمہ ناز کا تماشا بے حد پسند آیا۔ یہ نعیمہ ناز اب اپنے نام کے ساتھ سلطان کیوں نہیں لکھتیں، ایمل رضا بہت پسند ہیں اپنی سب تحریروں کے ساتھ، ان کی تحریروں میں روانی بے ساختگی ہوتی ہے۔

خط آپ کے میں آپ کے جواب زیست کا لطف دوبالا کرتے ہیں، پیاری صائمہ مشتاق سے محبت کے ساتھ عرض کرنا ہے کہ کہانیوں کا تو پتا نہیں میں اور میری بیٹی ثمرہ جو اپنے گھر کے مرکزی کردار ہیں۔ گرمیوں میں اچار کے چٹخارے لیتے ہیں سہ پہروں میں شعاع کے مزے لیتے ہیں سردیوں میں سنہری دھوپ میں بیٹھ کر کینو مالٹے کھاتے ہیں ہمارے کھیتوں میں گلاب کی خوشبوئیں ہر سو پھیلی ہیں۔ باغوں اور کھلیانوں میں جگنوؤں کے ڈیرے بھی ہیں جو دکھوں کی دھوپ میں امید بھری سکھوں والی چھاؤں مہیا کرتے ہیں اب یہ نہ سمجھ لینا کہ ہمیں دکھوں سے کوئی سروکار نہیں ہے زندگی دکھوں اور سکھوں سے ہی عبارت ہے۔ میرا نوعمر بیٹا جس کی سمجھ بڑھتی عمر کے ساتھ بڑھ نہیں پا رہی بیماری کی وجہ سے میرے شوہر پٹھوں کی تکلیف میں مبتلا ہیں، میرے ابو جو باہر کی سردی سے گھبرا کر میرے پاس آ گئے ہیں ان دیکھی بیماریاں انہوں نے خود کو لگا رکھی ہیں بڑھاپا چھوڑ کر۔ شور زیادہ بیماری کم یہاں درد، وہاں درد، اتنا شور کہ کبھی تو میری ہمت جواب دینے لگتی ہے، بہنوں سے بھی دعا کی درخواست ہے۔

پیاری ملائکہ! آپ نے صحیح لکھا ہے، زندگی میں دکھ اور سکھ ساتھ ساتھ چلتے ہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ دکھ زیادہ ہیں، سکھ کم ہیں جو بظاہر خوش نظر آتے ہیں ان کی زندگیوں میں جھانک کر دیکھیں تو پتا چلتا ہے کہ وہ کن محرومیوں اور دکھوں کا شکار ہیں زندگی صبر اور شکر کے سہارے گزر جاتی ہے ورنہ انسان تو بڑا کمزور ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ صبر نہ دے تو ایک دن نہ رہ سکے آپ جس آزمائش کا شکار ہیں، اندازہ لگایا جا سکتا ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو ہمت اور حوصلہ عطا فرمائے اور والد صاحب کو کامل شفا دے۔ آمین

پیاری ثمرہ کے لیے دعائیں جو آپ کو کہانیاں پڑھ کر سنانے کا صبر آزما فریضہ انجام دیتی ہے۔

نعیمہ ناز تو اپنے نام کے ساتھ سلطان لکھتی ہیں یہ ہماری ہی کوتاہی ہے کہ ہم ہر بار بھول جاتے ہیں اب خیال رکھیں گے۔ کہانیوں کے لیے معذرت خواہ ہیں۔

مسرت الطاف احمد کراچی سے لکھتی ہیں۔

دسمبر کا شمارہ ہاتھ میں آتے ہی بہ شدت سے یہ احساس ہوا کہ یہ سال بھی غم و خوشی کی ملی جلی کیفیات دے کر ہماری زندگی کا ماضی کا حصہ بن گیا ڈیرا آپی میں لگاتار دو مہینوں سے شامل اشاعت نہیں ہو سکی یہ جاتا سال اداسی

، دکھ و تکلیف دے گیا 20 اکتوبر کو دادی پھوپھیوں کے ہمراہ عمرہ کرنے کیا گئیں کہ یہاں دادا ابو بستر پر پڑ گئے۔ ان کی طبیعت اتنی بگڑ گئی کہ انہوں نے کھانا پینا ہی چھوڑ دیا پھر ان ہی دنوں انہیں ہارٹ اٹیک بھی ہوا۔ دادا کی طبیعت نے سارے خاندان کو ہی ہراساں کر دیا۔ ان کی بس یہی خواہش تھی دادی سے کسی بھی طرح ان کی ملاقات ہو جائے 16 دن تک ہاسپٹلائز رہے۔ ہر وقت دادی کو یاد کرتے رہے 8 نومبر کی ٹھٹرتی، خاموش اور اداس شام میرے پیارے دادا ابو ہم سے منہ موڑ کر ابدی نیند سو گئے ڈیڈ باڈی کو تین دن تک رکھا گیا تاکہ دادی دیدار کر سکیں وہ مہربان ہستی سب کو جوڑ کر رکھنے والے، وہ محبت بھرا وجود سب کے خیر خواہ میری ہر تحریر کو کتنا ذوق شوق سے پڑھتے آج ہم میں نہیں یہ سوچ کر دل میں ایک خالی پن سا محسوس ہوتا ہے، اللہ انہیں جنت نصیب کرے دسمبر کے شمارے میں افسانوں کی بھرمار دیکھ کر ایک آنکھ نہیں بھایا۔

دعا کا کردار کافی ڈرا سہا ہوا بزدل اور کمزور دکھایا گیا اس بار افسانے کچھ خاص پسند نہیں آئے۔

پیاری مسرت آپ کے دادا جان کی وفات کا جان کر بہت افسوس ہوا۔ خصوصاً یہ جان کر بہت دکھ ہوا کہ آپ کی دادی ان کے پاس نہیں تھیں اور وہ ان کو آخر تک یاد کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے۔ آمین

دعا جن حالات سے گزر رہی ہے کوئی بھی لڑکی ہوتی تو کمزور اور بزدل ہو جاتی۔ والدین نہیں۔ گھر نہیں۔ واحد پناہ گاہ ماموں کا گھر۔ جہاں اس کی وجہ سے بھائی نے دوسرے بھائی پر گولی چلا دی۔ ماموں کے گھر والے اپاہج اور معذور انسان کے پتلے باندھ رہے تھے۔ وہ سہیلی کے گھر جس سے کوئی رشتہ نہیں پناہ لیے ہوئے ہے۔ تو کمزور تو ہو گی۔

ثوبیہ اشفاق نے عارف والا سے لکھا ہے

آج میں نے آسیہ رزاقی صاحبہ کی کہانی "تبدیلی آ گئی" پڑھی۔ یہ کہانی تو جیسے میری ہی تھی۔ کشین کے چچا چچی تھے۔ ہمارے تو تمام رشتہ دار ہی ایسے تھے۔ پہلے گھر پردادا، دادی نے قبضہ کیا پھر سعودیہ سے جو رقم آتی ابو کی وفات کے بعد اس سے ماموں نے اپنا گھر بنایا۔ ہم لوگوں کو آج تک باپ کا یا ماں کا گھر نصیب نہ ہو سکا۔

اب میری شادی کو 23 سال کا عرصہ ہو چکا ہے۔ مگر آج بھی حالات نہیں بدلے۔ چلو خیر

آج سے گیارہ سال قبل میرے دیور کی وفات ہو گئی تھی۔ یہ دو بھائی ہی تھے ایک بہن تھی۔

دیور کی بیوی میری سگی پھوپھی کی بیٹی تھی۔ اس کو اپنے گھر میں سیٹ کیا' نیچے کا پورشن اسے سیٹ کر کے دیا۔ اوپر میں رہ رہی تھی۔ پھر خرچ کے لیے رقم مقرر کروائی۔ کچھ میری نند نے دینا شروع کیا۔ دو سال کے بعد اس نے کہا کہ میرا گزارا نہیں ہوتا اور اس نے پارلر کا کام سیکھنا شروع کیا۔ میرے میاں نے اسے پارلر بنا کر دے دیا۔ جب وہ اچھی طرح سیٹ ہو گئی تو مجھ سے لڑائی جھگڑا شروع کر دیا۔ جائے نماز پر بیٹھ کر ہم لوگوں کو بددعائیں دیتی ہے۔ اسی لیے جب میں نے آسیہ رزاقی کی کہانی پڑھی تو مجھ سے اپنے آنسو کنٹرول نہ ہو سکے۔

خیر یہ سب تو زندگی کا حصہ ہے۔ میں ایک دکاندار ہوں۔ "النساء لیڈی سنٹر" میری شاپ ہے۔ میں وہاں بھی شعاع اور خواتین رکھتی ہوں۔ ایک سال سے میں دکان چلا رہی ہوں اتنی دنیا سے ملی ہوں۔ ہر بندہ ہی دکھی ہے۔ سائرہ کی ہر کہانی میں ایک سبق ہوتا ہے جو وہ بہت آرام سے ہم تک پہنچا دیتی ہیں۔ نمرہ احمد وہ ہستی ہے جس نے مجھے قرآن پاک کو گہرائی سے پڑھنے کا سبق دیا۔ شکریہ "نمرہ"

سمیرا حمید کا "یارم" پڑھ کر مزا تو آیا مگر سمیرا بہت مشکل اردو استعمال کرتی ہیں۔

ج: پیاری ثوبیہ! آپ کے حالات جان کر دکھ تو ہوا لیکن یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ بہت باہمت ہیں۔ اپنی شاپ چلا رہی ہیں اور دنیا کو سمجھتی ہیں۔ حقیقت یہی ہے کہ دنیا میں بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جنہیں کوئی غم نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی تمام پریشانیاں دور کرے۔ آمین۔

روبینہ امجد نے جھنگ سے لکھا ہے

واؤ اس بار ماڈل پیاری ہے، بڑی سوہنی لگدی میتوں۔ حمد نعت کو پڑھ کر پیارے نبی کی باتیں پڑھیں۔ سمیع ثانی کی فیملی سے مل کر چھلانگ لگائی آگے بڑھنے کے لیے تو علی عباس سے ملاقات ہوگئی جو کہ اچھی لگی۔ باتوں سے خوشبو آئے۔ خط آپ کے کوثر خالد اللہ پاک آپ کو صحت کامل عطا فرمائے اور ہمت بھی اور آپ پلیز آئندہ بھی خط لکھیے گا شعاع میں، میں تقریباً دو ماہ سے بہت پریشان ہوں میری بیٹی ام مریم کلاس ٹو میں پڑھتی ہے پہلے بہت شوق سے اسکول جاتی تھی کچھ ماہ سے بلکہ دو ماہ سے تو روزانہ ڈانٹ پڑتی ہے۔ وہ بہت بری طرح رو رو کر بتاتی ہے کہ میڈم اسے گھٹنوں پر مارتی ہیں۔ پڑھنے کا بھی شوق ہے۔ پڑھتی بھی ہے دعا کریں ایسی ٹیچرز کو اللہ ہدایت دے۔

''آئینہ خانے میں'' آج کل ٹی وی نہ ہونے کی وجہ سے کچھ پتا نہیں تو اس میں کچھ کھٹی میٹھی نیوز مزہ دیتی ہیں۔ تاریخ کے جھروکوں سے پڑھ کر بہت اچھا لگتا ہے۔

ج: پیاری روبی! اللہ تعالیٰ ایسی ٹیچرز کو ہدایت دے۔ ہم تو یہ دعا ضرور کریں گے لیکن ساتھ ہی والدین کی ہدایت کے لیے بھی دعا کریں گے۔ آپ پہلی فرصت میں اپنی بیٹی کا اسکول تبدیل کر دیں۔ جھنگ میں یقیناً دوسرے اسکول بھی ہوں گے۔ اگر ام مریم وہاں بھی شکایت کرے تو سمجھ لیجیے گا کہ کوئی اور وجہ ہے جو وہ اسکول نہیں جانا چاہتی۔

ویسے یہ ہمارے لیے حیران کن بات ہے کیونکہ پرائیویٹ اسکولوں میں ٹیچرز کو بچوں پر تشدد کی بالکل اجازت نہیں ہوتی۔

عائشہ مرزا نے فیصل آباد سے لکھا ہے

مسکراتا ہوا سرورق مجھے تو بہت ہی پسند آیا۔

۔''استانی'' میں گورنمنٹ کی اردو کی استانی کے بارے میں سب کے خیالات جان کر میری نالج میں اک نیا اضافہ ہوا۔ کیونکہ ہماری تو اردو کی گورنمنٹ سکول کی استانی تو اتنی پیاری اور ڈیسنٹ تھیں اور نام میں کیا رکھا ہے۔ ''ٹیکنیکل آدمی'' ہاہاہا۔ رضیہ مہدی جی فی الحال ایسا کوئی ٹیکنیکل آدمی ہماری نظر میں تو نہیں ہے۔ ''سنہری ڈور اور جندر بھی'' اچھے تھے۔ اس دفعہ شاعری بہت اچھی تھی، ساری کی ساری۔ وہ جو پیاری سی مسکراہٹ کے ساتھ اک حسینہ سرورق پر موجود ہے اس کا نام کیا ہے بھئی؟ مجھے تو کہیں نہیں ملا۔

ج: پیاری عائشہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ سرورق کی حسینہ کا نام عالیہ خان ہے۔

کنیز فاطمہ نے جڑانوالہ سے لکھا ہے

شعاع کی مصنفین قاری اور اس ادارے کو چلانے والے سب لوگ اپنے اپنے سے ہی لگتے ہیں کوثر خالد سے تو لگتا ہے ہماری پکی والی دوستی ہے اور ثمرہ جی جو گجرات والی ہیں ان کا خط نہ دیکھیں تو لگتا ہے خط آپ کے میں بہت سی کمی ہے۔

اس ماہ کے شعاع میں سمیرا حمید کی کتاب کہانی' واہ واہ زبردست' جی چاہتا ہے سمیرا جی کے ہاتھ چوم لوں۔ جب تجھ سے ناتا جوڑا میں ن۔م بہن کی کتھا پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ اللہ پاک اس بہن کی بیماری کو دور کرے اور ان کا سایہ ان کے بچوں کے سر پر ہمیشہ سلامت رکھے۔ آمین

ج: پیاری کنیز فاطمہ شعاع کی پسندیدگی اور تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ۔ معذرت کہ آپ کا تبصرہ مکمل شامل نہ کر سکے۔

ہمیں افسوس ہے کہ آپ کا افسانہ قابل اشاعت نہیں۔ آپ کچھ اور لکھیں۔

ماہم حمید نے میرپور خاص سے لکھا ہے

شہزاد، بے حد اچھی جا رہی ہے ''خواب شیشے کا'' کے بارے میں کیا کہوں ابھی پڑھنا شروع ہی کی تھی کہ ختم بھی ہو گئی، ایمل نے تو رلا ہی دیا سچ میں۔ آسیہ رزاقی نے بھی بہت اچھا لکھا۔ ''سنہری دھوپ'' کے بارے میں کیا کہوں دعا کو تو سب ہی استعمال کرتے ہیں اپنے مفاد کے لیے چاہے۔ اس کا ماموں ہو یا اس کی دوست کوئی سچا نہیں ہے آج کل کی دنیا میں۔ ثمرہ بخاری کچھ لکھیں اور وہ اچھا نہ ہو یہ تو ہو ہی نہیں سکتا اور ہاں سائرہ رضا کو یاد دلا دیں کہ ہمیں نوال اور اخفش سے دوبارہ ملا دیں سچ میں بے حد انتظار ہے نوال اور اخفش کی شادی کا احوال پڑھنے کا۔

ج: پیاری ماہم! طویل عرصے بعد آپ کا خط دیکھ کر بہت خوشی ہوئی شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

حنا سلیم اعوان، گاؤں اخون بانڈی تحصیل وضلع ہری پور ہزارہ سے شریک ہیں

سب سے پہلے تو بتاتی چلوں اپنی بے پناہ مصروفیات کا احوال، ماہ دولت نے ان دنوں قوم کے مستقبل کو سنوارنے کی ٹھان رکھی ہے۔ جی ہاں ایک پرائیویٹ اسکول میں استانی کے فرائض انجام دے رہے ہیں، اللہ کی مہربانی سے پیر سے شروع ہونے والی بارش جمعرات کے دن کہیں جا کر تھمی تو ہر طرف سبزہ اور ہریالی دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ اور بارش ہو اور ہمارے علاقے میں بجلی نہ بند ہو، بھئی یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اس بار بھی یہی ہوا۔ ہاں لیکن ایک فائدہ یہ ہوا کہ تمام گھر والوں کو مل بیٹھنے کا موقع مل گیا۔ ایک بات اور...... ماہ دولت کی ایم اے۔ اسلامیات کی بکس آ گئی ہیں۔ یہ میرے اللہ کا کرم ہی تو ہے کہ گھر بیٹھے اس نے مجھے ہمت اور حوصلہ عطا کیا۔

''کتاب کہانی'' میں سمیرا حمید نے بڑے اچھے پوائنٹ بتائے کہانی لکھنے کے حوالے سے۔ شکریہ سمیرا۔ شبنم ثانی اور سمیع ثانی سے ملاقات اچھی رہی۔ صبا قمر میری بہت پسندیدہ ہیں۔ بہت اچھا لگا انہیں دیکھ کر بھی اور پڑھ کر بھی۔ ان کا تفصیلی انٹرویو بھی دیں۔ علی عباس کو پڑھنا بھی کافی اچھا لگا۔ ''خواب شیشے کا'' سب سے پہلے پڑھا۔

سدرہ حیات نے نہایت خوش اسلوبی سے کہانی کا اختتام کیا ''شہزاد'' موسٹ فیورٹ ناول ہے۔ ''خط آپ کے'' امامہ ملک نے چنگی بانڈی سے خط لکھا۔ اچھا لگا بہت۔ ویسے چنگی بانڈی کو ربان بانڈی بھی کہا جاتا ہے۔

ج: پیاری حنا! بہت سی تحاریر۔ قارئین کے اصرار پر ہم دوبارہ شائع کرتے ہیں۔ بجلی اور بارش کا تو ہمیشہ سے بیر رہا ہے۔ ایک آتی ہے تو دوسری چلی جاتی ہے۔ چلیں ایک اچھی بات تو ہوئی سب کو ساتھ مل بیٹھنے کا موقع مل گیا۔ ورنہ کوئی نہ کوئی مصروفیت گھیرے رکھتی ہے۔

کراچی سے افشاں علی شریک محفل ہیں، لکھا ہے

شعاع سے وابستگی کا سفر تو سالوں پر محیط ہے مگر شعاع میں اپنی حاضری دینے کا یہ پہلا موقع ہے۔

کتاب کہانی سمیرا حمید کا سلسلہ منفرد ہے بہت اچھا ہے۔ اس منفرد سلسلے کے لیے سمیرا حمید آپی کو تہہ دل سے شکریہ کہنا چاہوں گی۔ ٹیکنیکل آدمی اچھوتا نام۔ اچھوتی کہانی کے دوران مسکراہٹ رینگتی رہی اور پڑھنے کے بعد آس پاس نظر دوڑائیں۔ ایمل رضا کے الفاظ دل کی تہہ تک اتر جاتے ہیں۔ قراۃ العین سکندر نے بھی محبت بھرا خوب صورت لفظوں میں پرو دیا افسانہ ہمیں دیا بند لبوں کی بات اک ہلکا پھلکا اچھا ناول تھا ''کچھ خواب ہیں'' اچھا اختتام تھا۔

ج: پیاری افشاں! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ آپ نے خط لکھا، بہت خوشی ہوئی۔ آپ کی تحریروں کے لیے شعاع کے صفحات حاضر ہیں۔ ہم ہر اچھی تحریر اور اچھے مصنف کی دل سے قدر کرتے ہیں۔ آپ لکھیں ہم ضرور جگہ دیں گے۔

ثوبیہ نور نے کشمیر گڑھ سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

کچھ عرصہ پہلے گرد و پیش میں جو گرد سی اڑی وہ پھر نہیں بیٹھی اور ہماری خوب صورت آنکھیں (ہم) اس دھند میں لالو لال ہوئی جاتی ہیں۔ گلے سے مترنم آواز کی جگہ بس گھوں گھوں سی نکلتی ہے اور ناک بند......

کہوں کس سے میں کہ ـــــ کیا ہے

شب غم بری بلا ہے

سنا ہے پہلی امتوں پر عذاب آئے تھے مچھر کے، پانی کے، قحط سالی کے تو یہ دھواں سا کیا تھا؟ اس دفعہ تو شعاع ہاتھ ہی آتے ہی تہیہ کر لیا کہ اس دفعہ تو ہر حال میں خط لکھنا ہے۔

شہزاد میں کچھ نئے موڑ تو آئے ہیں مگر ہیرو ابھی تک سامنے نہیں آیا...... کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے با ادب، ہر دل عزیز ہیرو (مشتاق) مچھیاں (بھینسیں)

چرایا کرتے تھے اب خیر سے ہیروئین کو چُرانے پر آ گئے ہیں۔ یہ کام تھوڑا آسان ہے۔

خواب شیشے کا میں نمیر اور موحد نے محسن گھیریوں میں ڈالا ہوا ہے میں نے کہا تا کہ بھینسیں چرانے کا مشغلہ ترک کر دیا ہے انہوں نے۔ ''استانی'' کا آغاز اچھا تھا 'پڑھ کر اش اش کر اٹھے (حالانکہ بغیر اش اش کیے بھی اٹھنے کی بار بار ضرورت پیش آ رہی ہے۔ سر میں عجیب دھمال سے پڑ رہے ہیں' بار بار منہ دھو کر انہیں سلانے کی کوشش) اردو پڑھانے والی استانیاں منہ تک دھو کر نہیں آتیں......اوہ مائی گاڈ، ریحانہ آپ میری اتنی خبر رکھتی ہیں۔ میرے منہ نہ دھونے کی خبر تو سب کو ہے مگر گورنمنٹ کی استانی بنے تو ابھی کچھ دن ہی ہوئے ہیں آپ کو خبر ہو گئی؟

ج: پیاری ثوبیہ! آپ کی آمد پر خوشی ہوئی ہم اور ہماری قارئین آپ کی کمی محسوس کر رہے تھے۔

جب سے انسانوں نے ان چیزوں سے دودھ بنانا شروع کر دیا ہے جن سے قدرت نے نہیں بنایا تھا۔ عاشقوں نے احتجاجاً بھینسیں چرانا بند کر دی ہیں۔ کیمیکل ملے دودھ کی عادی ہیروئین نے اصلی دودھ پی لیا اس کی تو صحت خراب ہو جائے گی۔

اور یہ پہلی بار پتا چلا کہ منہ دھونے سے دھمال رک جاتے ہیں۔ تب ہی دھمال والے صاحب اتنے میلے کچیلے ہوتے ہیں۔

اور یہ دھواں سا مودی صاحب (جنہیں ہم تو موذی کہتے ہیں) کی حرکتوں کی وجہ سے ہے۔ مشرقی پنجاب کے کارخانوں اور جلائی جانے والی فصلوں کا دھواں ہمارے پیارے پنجاب میں دھند کی صورت پھیلا ہے۔

حبا نور، عریبہ نور، سماویہ نور لکھتی ہیں

حمد و نعت ہمیشہ کی طرح بہت اعلیٰ...... ''جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے'' بہت اچھا سلسلہ ہے۔ سسرال میں زندگی کیسی کیسی ہو سکتی ہے۔ اس کی جھلکیاں ملتی رہتی ہیں۔ سب سے پہلے بات ہو جائے ''کتاب کہانی'' کی تو سمیرا حمید نے بہت بہت اچھا لکھا ہے۔

ج: پیاری نور سسٹرز! سستی آپ کا خاندانی ورثہ ہے۔ مگر آپ اس روایت سے بغاوت کر دیں اور ''شعاع کے ساتھ ساتھ'' ہمیں لکھ کر بھجوا دیں کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ بھی منیر نیازی کی طرح کہیں ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں والا۔ کہانیاں ابھی پڑھی نہیں لیکن آپ کے خط سے لگتا ہے کہ صلاحیت ضرور ہے آپ میں۔ آپ کے بنائے گلابوں نے بڑی دیر تک دل کو مہکایا بہت شکریہ۔

مخفل ہیں' لکھا ہے

میں بہت چھوٹی تھی، ایٹ کلاس میں جب عراق پہ امریکہ اور اس کے اتحادی نے حملہ کیا تھا۔ اس وقت میرے والد صاحب سعودی عرب میں مقیم تھے۔

میری پھپھو زاد ہمارے گھر آئی تو دھڑا دھڑ شعاع، خواتین اور دوسرے ڈائجسٹ آنے لگے۔ ان چھ ماہ میں ایسی لت لگی کے جنون کہیں یا پھر جن۔ آج تک مگر آج بھی یہ مشن ذرا خفیہ ہی ہے۔ بیچ میں زندگی کے نشیب و فراز نے رلایا بھی بہت غموں کی ان گھڑیوں میں اللہ تعالیٰ سے لو لگانے کے بعد۔ ان ڈائجسٹوں سے دل بہلاتی رہتی تھی۔

ڈائجسٹ کی تمام کہانیاں بے حد پسند آتی ہیں کوئی ایک کہانی یا افسانے کی ایک بات بھی غلط نہیں لگتی۔ کیونکہ میرے ساتھ کچھ ایسے ہی حالات پیش آئے۔

ج: پیاری انجم! آپ کے حالات جان کر بہت دکھ ہوا۔ اللہ تعالیٰ آپ کے لیے آسانیاں کرے۔ آپ دعا مانگتی رہیں۔ دعا سے تقدیر بھی بدل سکتی ہے۔ حالات بہتر ضرور ہوں گے ان شاءاللہ۔

آپ میں صلاحیت ہے۔ کہانیاں لکھ سکتی ہیں۔ مگر ان کہانیوں کے لیے معذرت۔

بقیہ ناتا جوڑا ہے

س۔ سسرال میں مقام؟

ج۔ افسوس کے ساتھ' میرا سسرال میں کوئی مقام نہیں۔ شادی کے پانچ سال بعد میں اپنی جٹھانی سے الگ ہو گئی تھی اور گوجرانوالہ کرائے کے مکان میں رہائش اختیار کی۔ دوسری بٹی کی پیدائش سے پہلے ڈیڑھ دو سال اسکول میں نوکری کی۔ جب بٹی پیدا ہوئی۔ اس کے بعد تقریباً'' دس سال تک بچوں کو ٹیوشن پڑھاتی رہی۔ اب صحت ٹھیک نہیں رہتی۔ آرتھرائٹس کا مسئلہ ہے۔ اس لیے اب صرف گھر کی دیکھ بھال مشکل سے کرتی ہوں۔ مگر بیٹیاں بہت ہاتھ بٹاتی ہیں۔ اللہ ان کے نصیب اچھے کرے۔ (آمین)

س۔ جوائنٹ فیملی سسٹم پسند ہے یا علیحدہ؟''

ج۔ جوائنٹ میں جھگڑے ہوتے ہیں۔ اگر ذہنی ہم آہنگی نہ ہو۔ اس لیے علیحدہ ہی ٹھیک ہے۔

س۔ شوہر سے تعلقات؟

ج۔ شوہر سے تعلقات کے بارے میں کیا لکھوں۔ ان کی اور میری عمر میں بہت فرق ہے۔ وہ میرے بزرگ لگتے ہیں۔ ان کی سوچ (قدامت پسند) ہے۔ میری سوچ شاید ابھی بھی میچور نہیں۔ بہرحال گزارہ کیا ہے۔ ان کو کسی چیز کا شوق نہیں۔ نہ دنیا میں ان کا کوئی دوست ہے۔ نہ ان کو گھومنے کا شوق ہے۔ نہ کسی بھی چیز کا۔

میں نے زندگی کے ساتھ جتنا سمجھوتہ کیا ہے۔ باقی بہنوں کو بھی یہی تلقین کروں گی کہ اپنا آپ ختم کر کے گھر بنتا ہے۔ ورنہ نہیں۔ اس لیے والدین سے درخواست کروں گی کہ بیٹیوں کی شادی کرتے وقت ان کا ہم عمر یا کم از کم تین چار سال بڑا جیون ساتھی تلاش کریں۔ تاکہ سوچ ملے اور زندگی اچھی گزرے۔

آخر میں بہنوں سے گزارش ہے۔ کہ میرے بچوں کے اچھے نصیب کے لیے دعا کریں (آمین)۔

آئیے جانیں

واصفہ سہیل



حیرت

اداکارہ میرا خبروں میں رہنے کے فن سے اس قدر آگاہ ہیں کہ اگر اس کا پچاس فیصد بھی وہ اداکاری کے بارے میں جانتیں تو صف اول کی اداکارہ ہوتیں۔ میرا کہتی ہیں کہ لوگ بتائیں کہ کیا وہ کوئی برا کام کر رہی ہیں (آہم آہم آہم......) لوگ سیلفیاں بھی بنواتے ہیں اور باتیں بھی کرتے ہیں میں اسی بارے میں اور کیا کہوں۔ (اب میں بولوں کہ نہ......) میرا نے ایک بار پھر شوبز سے مکمل کنارہ کشی کا اعلان کرتے ہوئے اپنی باقی کی زندگی فلاحی کاموں میں گزارنے کا فیصلہ کیا ہے۔ (میرا! کیا آپ کی عمر اتنی ہوگئی کہ......؟) اس بارے میں میرا نے بتایا کہ کچھ عرصے پہلے ان کی پھوپھی کینسر کی وجہ سے انتقال کر گئی ہیں جس کا میں نے بہت اثر لیا اور میں بہت خوف زدہ ہوگئی تھی۔ لہٰذا میں نے اپنا بھی کینسر کا ٹیسٹ کروایا ہے۔ کیوں کہ خواتین



اعزاز

زاہد احمد نے پاکستانی ڈراموں میں بہت جلد اپنا مقام بنالیا ہے۔ ان کے کریڈٹ پر بے شمار ڈرامے ہیں۔ سنا ہے کہ زاہد احمد کو انٹرنیشنل ڈیجیٹل پروڈکشن نے اپنے ایک بین الاقوامی پروجیکٹ میں کاسٹ کرلیا ہے۔ اس سلسلے میں زاہد احمد کا کہنا ہے کہ وہ اس پروڈکشن میں واحد پاکستانی ہیں۔ (ہیں تو......؟) اور ان کے ساتھ تمام کاسٹ بین الاقوامی ہے۔ یہ ایک ایکشن سے بھرپور رومانٹک سیریل ہوگی۔" (ویسے بھی آپ تو رومینس کے بادشاہ ہیں۔) شاید اس بنا پر انہیں کاسٹ بھی کیا گیا ہو۔ یاد رہے کہ اس سے پہلے نیٹ فلیکس پر مشہور پاکستانی ڈرامے ہم سفر، زندگی گلزار ہے۔ اور صدقے تمہارے وغیرہ دکھائے جاتے رہے ہیں۔ زاہد احمد کو ایک نئے اور اوریجنل خیال پر مبنی ڈرامے میں کاسٹ کیا گیا ہے۔



کے لیے یہ بیماری ایک خاموش قاتل ہے۔ (میرا! یہ آپ ہیں؟؟ یعنی اتنی سمجھ داری کی باتیں......اللہ اللہ!) میرا نے کہا کہ میری ایک فلم زیر تکمیل ہے جیسے ہی وہ مکمل ہوئی ہے۔ میں اپنی باقی کی زندگی فلاحی کاموں کے لیے وقف کردوں گی (اور اگر فلم......؟)

خرابی

باکسر عامر خان اور فریال مخدوم کا نام اب کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ان کی وجہ شہرت باکسنگ سے زیادہ ان کے لڑائی جھگڑے ہیں۔ لیکن اب ان کی صلح ہوگئی ہے۔ فریال مخدوم کہتی ہیں کہ انہیں پاکستان سے بہت محبت ہے۔ وہ ہر سال یہاں چھٹیاں منانے آتی ہیں۔ اس سال بھی اپنے سسرالیوں کے ساتھ پاکستان آئیں گی۔ پاکستان بہت خوب صورت ملک ہے اور وہاں کے لوگ بے حد پیار کرنے والے ہیں۔ (پھر کسی جھگڑتے کیوں ہو......؟) اسی وجہ سے میں نے اس بار بھی چھٹیاں پاکستان میں گزارنے کا فیصلہ کیا ہے۔ (رہی کہیں فیر کوئی پھڈا نہ ہوجائے) عامر سے اپنے جھگڑے کے متعلق انہوں نے کہا کہ وہ ایسے کسی سوال کا جواب نہیں دینا چاہتیں جس سے تعلقات میں دوبارہ خرابی پیدا ہو۔ (یعنی ...... کچھ تو ہے دل میں جو......؟)

اِدھر اُدھر سے

☆ عمران خان جتنا مجمع نواز شریف کو گھر بھیجنے کے لیے جمع کرتے رہے، اس کا نصف بھی عافیہ کو گھر لانے کے لیے جمع کر لیتے تو عافیہ گھر میں ہوتی، میڈیا صرف ڈالر دیکھتا ہے۔

(مظفر اعجاز......قلم رو)

☆ ماہرین کے مطابق نیند دماغ کے لیے بہت ضروری ہے۔ نیند میں بے قاعدگی اور کمی سے نہ صرف فالج کا خطرہ بڑھ جاتا ہے بلکہ فالج کے بعد دوبارہ صحت کی بحالی کا عمل بھی مشکل ہوجاتا ہے۔

☆ جمہوریت کے ساتھ ریاست کو بھی خطرہ لاحق ہوگیا ہے۔ اب اس آگ میں کوئی بھی جل سکتا ہے۔ اب نہ کوئی دفتر محفوظ ہے نہ کوئی گھر محفوظ ہے۔ نہ کوئی صاحب علم محفوظ ہے نہ کوئی صاحب خرد محفوظ ہے۔ سب سے زیادہ خطرے کی بات یہ ہے کہ اب نہ کوئی منظر محفوظ ہے نہ کوئی پس منظر محفوظ ہے۔

(عمار مسعود......آپ)

☆ مجھے اس وقت عالمی ادارے Guardian Live (گارجین لائیو) کی 16 نومبر 2016ء کی نشریاتی رپورٹ یاد آرہی ہے جس میں کہا گیا تھا کہ نواز شریف امریکن اسٹیبلشمنٹ اور بعض مقامی اداروں کی نظر میں گیارہ جرائم کے مرتکب ہوئے ہیں جس کی پاداش میں وہ 2017ء کے وسط میں جوڈیشل کو کے ذریعے اقتدار سے محروم کردیے جائیں گے۔ میں حیرت کی تصویر بنا ہوا ہوں کہ یہ رپورٹ حرف بہ حرف درست کیوں کر ثابت ہوئی۔ (الطاف حسن قریشی۔ روزنامہ جنگ)



امت الصبور



دنیا بھر میں سال نو کی تقریبات

دنیا کے مختلف ممالک میں سال نو کی تقریب منانے کے لیے بڑے انوکھے اور دلچسپ طریقے اختیار کیے جاتے ہیں۔

☆ جاپان میں 108 گھنٹیاں بجا کر 108 گناہ معاف کرائے جاتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ گھنٹیوں کی آوازیں سننے سے انسانی جسم میں 108 پراگندہ خیالات کا جڑ سے خاتمہ ہو جاتا ہے۔ کیوٹو کے شین مندر میں 74 ٹن وزنی ایک بڑا گھنٹہ لٹکا ہوا ہے۔ جاپانی لوگ اس گھنٹے کو بڑا متبرک خیال کرتے ہیں، اسی لیے ان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ نئے سال کے موقع پر اس کی آوازسنیں۔

☆ رومانیہ میں نئے سال کی آمد پر نوجوان اپنے دیہی علاقوں میں جا کر ڈرم بجاتے ہیں۔ اپنے بیل اور گائے کے گلوں میں بندھی گھنٹیاں بجاتے ہیں اور ہوا میں کوڑے لہراتے ہیں۔ ان کا یہ خیال ہے کہ اس طرح کرنے سے ان کی فصلیں اچھی ہوں گی اور ان کے ملک میں خوشی اور خوشحالی آئے گی۔

☆ چین کے لوگ نئے سال کی آمد کے موقع پر انگور کے 12 دانے پاس رکھ لیتے تھے اور رات کو 12 بجتے ہی وہ انگور اس طرح کھاتے ہیں کہ گھنٹے کی ہر ٹک ٹک پر ایک دانہ منہ میں ڈالتے جاتے ہیں۔ اس طرح 12 ٹک ٹک پر 12 انگور کھا کر نئے سال کو خوش آمدید کہتے ہیں۔

☆ اسکاٹ لینڈ کے بچے نئے سال سے پہلے والی شام کو اپنے گلی کوچوں میں گھومتے ہیں اور تمام گھروں سے جئی کے آٹے سے تیار کردہ کیک جمع کرتے ہیں۔ اسکاٹ باشندے اس بات کے آرزو مند ہوتے ہیں کہ کوئی سیاہ بالوں والا مہمان اس رات ان کی دہلیز پار کرے، چاہے وہ کسی بھی مذہب یا نسل سے تعلق رکھتا ہو۔ اس طرح ان کے گھروں میں سال بھر برکت ہوگی۔

☆ آرمینیا میں تمام لوگ رات 12 بجے آتش دان کے پاس بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔ اس رات ان کے پڑوسی ان کے آتش دان کی چمنیوں میں ٹوکریوں کو رسی کے ذریعے لٹکا کر انہیں نئے سال کے تحائف بھجواتے ہیں۔

☆ اٹلی کے شہر نیپلز کے لوگ نصف شب کو اپنے گھروں کی کھڑکیوں سے کھانے کی ڈشیں اور برتن باہر پھینک دیتے ہیں۔ انہیں اس بات کی کوئی فکر نہیں ہوتی کہ یہ برتن باہر سے گزرنے والے کسی شخص کے سر پر گریں گے اور اس کا کیا حشر ہوگا۔ ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ اس طرح کرنے سے وہ خوش قسمت بن جائیں گے۔

☆ ڈنمارک کے لوگ عجیب طریقے سے نئے سال کا استقبال کرتے ہیں۔ وہ رات بارہ بجے سے پہلے اپنی کرسیوں پر بالکل تیار ہو کر بیٹھ جاتے ہیں اور جیسے ہی گھنٹہ بارہ بجاتا ہے، وہ اپنی کرسیوں سے اچھل کر چھلانگ لگا دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہوتا ہے کہ وہ نئے سال میں داخل ہو گئے ہیں۔

☆ برازیل میں نئے سال کا استقبال بڑے انوکھے انداز سے کیا جاتا ہے۔ ریوڈی جنیرو کے لوگ نئے سال کی رات کو ٹھیک بارہ بجے سمندر میں چھلانگ لگا دیتے ہیں۔ اس شب ریوڈی جنیرو کے ساحلوں پر بڑا ہجوم ہوتا ہے۔ لوگ سفید لباس میں ملبوس ہوتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں پھولوں کے گلدستے، موم بتیاں، ٹافیاں، چاکلیٹ، سگار اور گنے کے شربت کی بوتلیں ہوتی ہیں۔ یہ تمام چیزیں وہ سمندر کی دیوی "لیمانجا" کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اب دیوی سال بھر ان کی حفاظت کرے گی اور ان کے لیے خوشیاں اور خوشحالی لائے گی۔

☆☆☆

الپ ارسلان

اسلام کی بڑی جنگوں میں یہ ایک عظیم جنگ تھی جو خلاط کے قریب الپ ارسلان اور قیصر روم کے لشکر کے درمیان لڑی گئی۔ سلطنت سلجوقی کے دوسرے فرمانروا الپ ارسلان اسلامی فوج کا جرنیل تھا۔

گھمسان کی جنگ ہوئی، رومی فوج درہم برہم ہو گئی۔ قیصر نے اپنی سی پوری کوشش کی لیکن وہ اپنی بکھری ہوئی فوج کو منظم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کے انتہائی وفادار سپاہی بھی اس کا ساتھ چھوڑ گئے یا مجاہدین کی تلواروں سے گھائل ہو کر گر پڑے، خود قیصر کو بھی زخم آئے۔ اور اس کا گھوڑا بھی مارا گیا تو وہ میدان چھوڑ کر بھاگنے لگا۔ اس موقع پر ایک غلام نے کمند پھینکی اور قیصر کو گرفتار کر لیا اور لا کر اسلامی لشکر کے حوالے کر دیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ خود اس غلام کو علم نہ تھا کہ اس نے کسے گرفتار کیا ہے۔

قیصر کو جب اسلامی لشکر کے سپاہیوں نے قید کیا تو اسے کسی نے نہیں پہچانا تھا۔ اسے دوسرے عام قیدیوں کے ساتھ بند کر دیا گیا تھا۔ صبح ہونے پر الپ ارسلان کے سامنے تمام قیدیوں کو پیش کیا گیا۔ اس موقع پر ان سلجوقی سفیروں نے جو رومی دربار میں جا چکے تھے۔ قیصر کو پہچان لیا۔ جنگی قیدیوں میں رومی جنرل باسیلاسیوس بھی شامل تھا۔ اس نے بڑھ کر قیصر کی قدم بوسی کی۔ اسی طرح یہ راز فاش ہو گیا۔

الپ ارسلان نے اس موقع پر دنیا کی اتنی بڑی مملکت کے شہنشاہ کے ساتھ جو شریفانہ اور مہذبانہ سلوک کیا وہ مثالی ہے۔ کچھ دیر پہلے ہی قیصر روم لاکھوں کی فوج لے کر مسلمانوں کی بستیوں کو اجاڑنے کے درپے تھا اور اسلامی علاقوں پہ حکومت کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔

اس قیصر نے الپ ارسلان کی طرف سے جنگ نہ کرنے کی پیشکش کو متکبرانہ انداز میں ٹھکرا دیا تھا۔ یہی قیصر تھا جس کے رعب و دبدبے سے روم کے لوگ کانپتے تھے، آج وہی قیصر ذلیل و رسوا ہو کر، درماندگی کے عالم میں سر جھکائے، اسلامی حکومت کے سربراہ کے سامنے کھڑا تھا۔

الپ ارسلان نے اپنے بدترین دشمن سے عزت کا جو برتاؤ کیا، اس کی تعریف سخت متعصب یورپی مورخین تک نے کی ہے۔ الپ ارسلان اپنی نشست سے اٹھا چند قدم آگے بڑھا۔ اس نے قیصر سے مصافحہ کیا اسے عزت سے اپنے پاس بٹھایا اور یقین دلایا کہ اس کا احترام کیا جائے گا۔ سات دن تک فتح کا جشن منایا گیا۔ اس دوران میں الپ ارسلان کی ہدایت پر قیصر اور اس کی فوج کے کئی جرنیلوں کو ایک شاندار خیمے میں ٹھہرایا گیا۔ وہ روز دو وقت قیصر کے پاس آتا اور اسے اپنے ساتھ کھانا کھلاتا آٹھویں دن الپ ارسلان نے قیصر سے گفتگو کرتے ہوئے پوچھا۔

"آپ اب مجھ سے کس سلوک کی توقع رکھتے ہیں۔"

قیصر نے کہا۔ "اگر آپ ظالم ہیں تو مجھے قتل کر دیں گے۔ متکبر ہیں تو پوری اسلامی مملکت میں میری تشہیر کریں گے یا عمر بھر کے لیے زنداں میں ڈال دیں گے۔ اور بعید امکان اس کا بھی ہے کہ تاوان لے کر معاف کر دیں گے۔"

الپ ارسلان کے چہرے پر مسکراہٹ کھلنے لگی۔ اس نے پوچھا۔ "اگر آپ کو اس جنگ میں فتح حاصل ہوتی اور میں اس حالت میں آپ کے پاس قیدی بن کر آتا تو آپ میرے ساتھ کیسا سلوک

کرتے؟"

قیصر نے بے ساختہ کہا۔"بدترین سلوک جو میرے بس میں ہوتا۔" ایک مورخ کے مطابق قیصر نے کہا۔"میں آپ کو بہت سے کوڑے لگواتا۔"

الپ ارسلان نے کہا۔"اب مجھے آپ کی ذہنیت کا حال معلوم ہوگیا، کیوں نہ میں بھی آپ کے ساتھ یہی سلوک کروں؟"

قیصر نے کہا۔"آپ نے میری ذہنیت کا انجام بھی تو دیکھ لیا۔"

الپ ارسلان ہنس پڑا پھر اس نے کہا۔"میں دین حق کا پیروکار ہوں، اسلام امن وسلامتی کا پیام دیتا ہے۔ جو سلوک آپ میرے ساتھ کرنا چاہتے تھے، وہ میں آپ کے ساتھ نہیں کروں گا۔"

الپ ارسلان نے قیصر سے معاہدہ کے بعد اسے قیمتی خلعتیں پیش کیں، قیصر اس سلوک سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے رخصت ہوتے وقت بغداد کی طرف سر جھکا کر تین سلام کیے، گویا وہ خلافت بغداد کی اطاعت کا اظہار کر رہا ہو۔

قطب مینار

قطب الدین ایبک کی یاد دلانے والی چیزوں میں سے ایک اہم شے دہلی کا قطب مینار ہے۔ ماہرین نے اس مینار کو دنیا بھر میں اس نوعیت کی حسین ترین عمارتوں میں سے ایک قرار دیا ہے۔ سنگ سرخ کا دو سو اڑتیس فٹ بلند یہ مینار موجودہ دہلی سے تقریباً گیارہ میل دور، پرانے شہر کے کھنڈروں میں آج بھی قائم ہے۔ اور آٹھ سو برس سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے باوجود آج بھی صحیح سلامت ہے۔ دنیا بھر سے لوگ اس نادر مینار کو دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔

یہ عظیم یادگار جامع مسجد قوت الاسلام کی عمارت سے تقریباً ایک سو ساٹھ فٹ کے فاصلے پر مسجد کے بیرونی جنوبی صحن کے جنوب مشرقی گوشے میں ہے۔ اس مینار پر چڑھ کر موذن اذان دیا کرتے تھے۔

مینار کی پانچ منزلیں ہیں۔ اور اوپر کی منزل کے سوا ہر منزل پر آگے کو نکلے ہوئے چھجے ہیں۔ جن کے نیچے قرآنی آیات خوب صورتی سے کندہ کی گئی ہیں۔

خیال ہے کہ مینار کی بنیادی دو منزلیں قطب الدین نے بنوائی تھیں۔ پھر دوسری اور تیسری شمس الدین التمش نے 1225ء 661ھ میں تعمیر کروائیں۔ اس کے بعد جب فیروز شاہ کے عہد میں مینار پر بجلی گری تو 1328ء میں فیروز شاہ نے اس کی مرمت کروائی اور پانچویں منزل کا اضافہ کر دیا۔

بعض مورخین کا کہنا ہے کہ قطب مینار کا نام حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی ولی اللہ کے نام پر ہے۔ جن کا شمس الدین التمش بہت احترام کرتے تھے۔ خواجہ بختیار کاکی کا انتقال 1235ء میں دہلی میں ہوا۔ انہیں مینار کے قریب ہی سپرد خاک کیا گیا۔

قطب الدین ایبک ہی کے عہد میں ایک جدید طرز کا محل قصر سفید کے نام سے پتھورا کے قلعہ میں تعمیر کیا گیا تھا۔ بعد میں یہ محل اجاڑ اور ویران ہوگیا۔

جواب

1944ء میں گاندھی جی نے مسلمانوں کو دھوکا دینے کے لیے قائداعظم کے الفاظ میں ایک قیاسی "دھندلا" غیر واضح لنجا پنجا اور کرم خوردہ پاکستان پیش کیا۔ اس پر دونوں کی باہمی خط و کتابت اور ملاقات بھی ہوئی مگر کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ جس پر لوئی فیشر نے دی لائف آف مہاتما گاندھی میں لکھا۔

"گاندھی اور جناح کے درمیان دو قومی نظریہ، دیوار بن کر حائل ہوگیا۔ ایک اخباری نمائندے نے قائداعظم سے دریافت کیا کہ مستقبل قریب میں گاندھی جی سے آپ کی ملاقات کا کوئی امکان ہے؟ قائداعظم نے ازراہ مزاح فرمایا! "مسٹر گاندھی فرماتے ہیں کہ اس کا انحصار ان کے دل کی آواز پر ہے اور میرا وہاں تک گزر نہیں، اس لیے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

قدسیہ یاسمین..... بھکر

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

بینگن اور گوبھی کی بھاجی

ضروری اشیا:-

بینگن	ایک پاؤ
گوبھی	آدھا کلو
ٹماٹر	ایک پاؤ
ہری مرچیں	چھ عدد
رائی	ایک چائے کا چمچہ
سفید زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
ہلدی پاؤڈر	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
سیاہ مرچ پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
ہینگ	ایک چٹکی
نمک	حسب ذائقہ
تیل	آدھا کپ
ہرا دھنیا	آدھا کپ
ادرک، لہسن پسا ہوا	دو چائے کے چمچے
ادرک	ایک چائے کا چمچہ

ترکیب:- سوس پین میں تیل گرم کریں، بینگن اور گوبھی موٹی موٹی کاٹ کر تل کر نکال لیں۔ اسی تیل میں رائی، سفید زیرہ ڈالیں۔ اس میں ادرک، لہسن پیسٹ، ٹماٹر، سیاہ مرچ پاؤڈر، ہری مرچیں، ہلدی پاؤڈر اور نمک ڈال کر بھونیں۔

تلی ہوئی سبزیاں ڈالیں، ہینگ کو تھوڑے سے پانی میں گھول کر ڈالیں، تھوڑی دیر دم پر رکھ دیں، ہرا دھنیا اور ادرک سے سجا کر پراٹھے یا چپاتی کے ساتھ پیش کریں۔

مچھلی کا سالن

ضروری اشیا:-

مچھلی	آدھا کلو
ہری مرچ	دس عدد
ہرا دھنیا	پانچ کھانے کے چمچے
لہسن	آٹھ جوے
املی کا پانی	چھ کھانے کے چمچے
تیل	آدھا کپ
دھنیا (پسا ہوا)	ایک کھانے کا چمچہ
ہلدی	ایک چائے کا چمچہ
ہرا دھنیا	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب:- ہری مرچ، ہرا دھنیا، چھ جوے لہسن، ہلدی اور دھنیا پسا ہوا، ان سب کو مکس کرلیں۔ کڑاہی میں تیل گرم کرکے دو جوے لہسن کا بگھار دیں۔ لہسن ہلکا براؤن ہونے پر یہ مسالا ڈال کر بھونیں۔

جب بھننے کی خوشبو آنے لگے تو مچھلی ڈال دیں۔ ساتھ میں نمک ڈالیں اور اچھی طرح سے بھون لیں۔ بھون کر ایک گلاس پانی ڈال دیں۔ جب ابال آئے تو املی کا پانی ڈالیں۔ آنچ ہلکی کریں۔ پانچ منٹ بعد سالن تیار ہوجائے گا۔ اب ڈش میں نکال کر ہرا دھنیا سے گارنش کرکے پیش کریں۔

پنیر کوفتہ

ضروری اشیا:-

پیاز	ایک پاؤ
پانی	ایک کپ
تیل	تین چمچے
ادرک لہسن پیسٹ	ایک چمچہ
دھنیا	ایک چمچہ
ہلدی	ایک چمچہ

گرم مسالا	ایک چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
ٹماٹر پسے ہوئے	دو عدد
سرخ مرچ	آدھا چمچہ
تازہ کریم	دو کھانے کے چمچے

کوفتے کے لیے اجزا:۔

پنیر	سو گرام (کدوکش کرلیں)
آلو	ایک پاؤ
ہری مرچ	چار عدد
کارن فلور	دو چمچے
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب:۔ دیگچی میں تیل ڈالیں اور پیاز پیس کر شامل کرکے پانچ منٹ پکائیں۔

اب اس میں ادرک، لہسن، دھنیا پاؤڈر، ہلدی پاؤڈر، گرم مسالا اور نمک شامل کرکے ایک منٹ پکائیں اور چمچہ چلاتی جائیں۔

اب اس میں پسے ٹماٹر اور سرخ مرچ شامل کرکے خوب بھونیں، یہاں تک کہ تیل اوپر نظر آنے لگے۔

اس میں نمک ڈالیں اور حسب ضرورت پانی شامل کردیں۔ سالن میں تازہ کریم شامل کریں اور اسے دھیمی آنچ پر پکائیں۔ درمیان میں چمچہ بھی چلاتی جائیں، تاکہ مسالا یکجان ہوجائے، آنچ دھیمی ہو، اس بات کا خصوصی دھیان رکھیں۔

کوفتہ کے لیے:۔ ایک پیالے میں پنیر کدوکش کریں، ابلے پسے ہوئے آلو، ہری مرچ، کارن فلور اور نمک ڈال کر یکجان کرلیں۔

اب اس مرکب کے درمیانے سائز کے گول کوفتے بنائیں۔

اب ایک علیحدہ پیالے میں کارن فلور رکھیں اور کوفتے پر کارن فلور کی تہہ چڑھا کر تل لیں۔

اب تمام تلے ہوئے کوفتے ایک سرونگ ڈش میں رکھیں اور اس پر گرما گرم سالن ڈال دیں۔ پنیر ملائی کوفتہ تیار ہے۔

بیسن کی مٹھائی

اجزا:

بیسن	2 کپ
سوجی	1 کپ
چینی	1/2 کلو
ناریل پاؤڈر	1 کپ
خشک دودھ	1/2 کپ
زعفران	چٹکی بھر
بادام، پستے	حسب پسند
گھی	1 پاؤ

ترکیب:

چینی میں ایک کپ پانی اور زعفران ڈال کر گاڑھا شیرہ بنالیں۔ ایک برتن میں آدھا گھی ڈال کر بیسن بھون لیں۔ پھر علیحدہ برتن میں نکال لیں۔ پھر اسی برتن میں باقی گھی ڈال کر سوجی ڈال کر بھونیں۔

اب بیسن میں، ناریل اور خشک دودھ شامل کریں پھر بھنی ہوئی سوجی ڈال کر اچھی طرح مکس کریں۔ پھر آہستہ آہستہ شیرہ ڈال کر مکس کرتی رہیں۔ جتنا شیرہ یہ جذب کرسکے اتنا ڈالیں۔ پھر ڈش میں ہلکا سا گھی لگا کر یہ آمیزہ جمالیں۔ آخر میں پستہ، بادام اور ناریل سے سجادیں۔

خوبصورت بنیے

وزن کم کرنے کے ٹوٹکے

اکثر افراد کو جب خوش اندامی کا شوق چراتا ہے تو وہ بڑے جوش و خروش سے "ڈائٹنگ" پلان تیار کرتے ہیں، کچھ عرصہ تک اس پر سختی سے کاربند رہتے ہیں۔ کھانے کی ہر اچھی چیز کو رد کر دیتے ہیں۔ لیکن جلد ہی ان کی قوت برداشت جواب دے جاتی ہے۔ دبلے ہونے کا یہ بہت نامناسب طریقہ ہے۔ ہم جو طریقہ بتا رہے ہیں، اس پر عمل کرکے آپ ہمیشہ صحت مند کھاتے پیتے مگر دبلے نظر آئیں گے۔

1: صرف اس وقت کھائیں جب آپ کو بھوک لگے، عادتاً نہ کھائیں یا حسب وقت کھائیں۔

2: بھوک ختم ہوجائے تو کھانے سے ہاتھ کھینچ لیں۔

3: صرف اس وقت کھائیں جب آپ کو اس کی ضرورت ہو۔ جسم کی ٹیوننگ از خود ہوجائے گی۔

4: غذا کو جسم کا ایندھن خیال کریں۔ اسے اپنی کوئی خوشی منانے کا وسیلہ، پریشانی کی تسکین یا بوریت دور کرنے کا ذریعہ نہ بنائیں۔

5: ہمیشہ دسترخوان پر کھائیں۔ چلتے پھرتے کھانا اچھا نہیں ہے۔

6: جب آپ کھانا کھائیں تو اس دوران مطالعہ یا ٹیلی ویژن نہ دیکھیں۔

7: باہر جائیں تو آئس کریم یا مٹھائی کھانے سے انکار کردیں۔

8: ڈائیٹ ڈائری اپنے پاس رکھیں تاکہ آپ کو یاد رہے کہ آپ نے کیا اور کب کھایا تھا۔

9: کیلوری گائیڈ اپنے پاس رکھیں تاکہ آپ ضرورت سے زیادہ کیلوریز نہ کھائیں۔

10: ان کیلوریز کی مقدار معلوم کریں جن سے آپ کا صحیح وزن برقرار رہے۔

11: ڈائری میں یہ بات درج کریں کہ آپ نے فلاں چیز کیوں کھائی، کیا آپ کو بھوک لگی تھی۔

12: یہ بھی لکھیں کہ آپ نے معمول کے خلاف کیا کچھ کھایا۔ ممکن ہے، دن کے دوران کوئی پرخطر لمحات آتے ہوں جب آپ کھانے پر مجبور ہوجاتی ہوں۔

13: حرص بڑھانے والی چیزوں سے گریز کریں۔

14: چائے اور کافی کے وقفے کو کھانے کا وقت نہ بنائیں۔

15: جب آپ کھانے کے بارے میں سوچنے لگیں تو اپنا دھیان ہٹانے کے لیے کوئی کام کرنے لگیں۔

16: ڈائری میں درج کریں کہ آپ کے کھانے کا طریقہ کیا ہے۔ کیا آپ تیزی سے کھاتی ہیں۔ چھپ چھپ کر ندیدوں کی طرح؟ آرام سے کھائیں۔ کوئی آپ سے کھانا جرم نہیں ہے۔

17: اس حقیقت کا اقرار کریں کہ اگر آپ کا وزن زیادہ کھانے سے بڑھا ہے تو بہانے بنانے سے اس کا ازالہ نہیں ہوسکتا۔

18: شدید فاقہ کشی کے مقابلے میں ڈائٹنگ کا طویل اور کم رفتار پلان زیادہ مفید ہے۔

19: سلمنگ کا مطلب کم کھانا نہیں ہے بلکہ کم کیلوریز ہے۔

20: دبلا کرنے والے نئے نئے کھانے معلوم کریں۔

21: اپنی الماری سے نمکین اور میٹھی چیزیں نکال دیں۔

22: اس کے بجائے پھل اور ایسی چیزوں کا اسٹاک رکھیں جن میں چکنائی، نمک اور شکر کم ہو۔
23: صحت بخش چیزیں یعنی گاجر، کھیرا وغیرہ رکھیں تاکہ بھوک لگنے پر کھا سکیں۔
24: بسکٹ، کیک، مٹھائیاں چھوڑ دیں۔ یہ بچکانہ چیزیں ہیں۔
25: ایسی چیزیں کھائیں جنہیں چبانے کے لیے کچھ وقت درکار ہو۔ یہ زیادہ تسکین بخش ہوتی ہیں۔
26: ہمیشہ چھوٹی پلیٹ میں کھانا ڈالیں۔
27: صرف اپنی پلیٹ صاف کریں۔
28: فرائی کی ہوئی چیزوں کو کاغذ پر رکھیں تاکہ فالتو چکنائی نکل جائے۔
29: انڈا چکنائی کے بغیر نان اسٹک پین میں بنائیں یا ابالیں۔
30: روٹی کے اندر گھی نہ لگائیں۔
31: ٹوسٹ پر میٹھا مارملیڈ لگا کر نہ کھائیں۔
32: پنیر کے باریک ٹکڑے بنائیں۔
33: بغیر ملائی کا دودھ استعمال کریں۔
34: ڈبل روٹی پر مکھن کی تہہ پتلی رکھیں۔
35: ڈبے کی مچھلی استعمال نہ کریں۔
36: ڈبے کے پھلوں سے گریز کریں۔
37: فروٹ سلاد کو رسیلا بنانے کے لیے نارنگی کا جوس استعمال کریں۔
38: دہی میں شکر ملانے کے بجائے تازہ پھل ڈال کر کھائیں۔
39: کافی بغیر دودھ کے اور چائے لیموں کے ساتھ پئیں۔
40: میٹھے کے بجائے پھل کھائیں۔
41: ہمیشہ بغیر چربی کا گوشت کھائیں۔
42: سرخ گوشت کی بہ نسبت سفید گوشت یعنی مرغی میں کم کیلوریز ہوتی ہیں۔
43: سفید مچھلی میں دیگر مچھلیوں کی بہ نسبت کم چکنائی ہوتی ہے۔
44: پکانے سے پہلے گوشت یا مرغی کو فرائی نہ کریں۔
45: ہر طرح کی پیسٹری کھانا چھوڑ دیں۔
46: کم کیلوریز والی مایونیز اور سلاد استعمال کریں۔
47: کم کیلوریز والے مشروبات استعمال کریں۔
48: بنا کیلوریز میٹھا استعمال کریں۔
49: میٹھے کی رغبت گھٹائیں۔
50: مونگ پھلی، بادام اور خشک میوے کی پیش کش ٹھکرائیں۔
51: سیریل میں میٹھے کے بجائے کچھ خشک میوہ ملائیں۔
52: کھانے سے پہلے پھل کا رس یا گریپ فروٹ کھائیں۔
53: یاد رکھیں کہ کریمی سوپ، سادہ سوپ سے کہیں زیادہ موٹا کرتا ہے۔
54: مربے نہ کھائیں۔
55: ابلے ہوئے اور بھنے ہوئے آلو کو "ہاں" اور روسٹ کو "نہ" کہیں۔
56: ابلی ہوئی یا بھاپ میں پکی ہوئی سبزیاں کھائیں۔
57: کیک کی آئسنگ اور کریم اتار کر کھائیں کبھی کبھار۔
58: مشروب میں پانی کی مقدار بڑھا دیں۔
59: کولا کے بجائے وائٹ پئیں۔
60: چاول اور روٹی گھٹا کر پھل کی مقدار بڑھا دیں۔
61: پیٹ بھر کر کھانا دن کے وقت کھائیں۔ تاکہ آپ کو کیلوریز جلانے کا وقت مل سکے۔
62: کھانے کے اوقات کے دوران پانی پئیں۔
63: اپنے کھانوں کی رونق کش کی ہوئی سبزیوں، تازہ پھل کے ٹکڑوں سے بڑھائیں۔
64: اگر کچھ کھانے کو جی چاہے تو اپنے کھانے کے آئندہ مینو میں سے کچھ کھالیں۔ اسنیک نہ کھائیں۔
65: سینڈوچ بناتے وقت کوئی گیلی فلنگ ڈالیں مثلاً ٹماٹر تاکہ مکھن یا مارجرین نہ لگانا پڑے۔
66: دن میں دو سے زیادہ بار نہ کھائیں۔ ☆☆